

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
جولائی 2016
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1

سسپنس ڈائجسٹ

عید مبارک

جلد 46 • شمارہ 07 جولائی 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

CPNE
MEMBER APNS

عید مبارک

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ٭ مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ٭ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

حقیقتِ حال

جون ایلیا

ہر آدمی کو وہ رائے رکھنے دو جو رائے وہ رکھنا چاہتا ہے اور یہی حق گروہوں کو بھی دو۔ لوگوں کو وہ بات ضرور کہنے دو جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ جو بس اپنی ہی کہنا چاہتا ہے اور دوسروں کی ایک نہیں سننا چاہتا اسے مان لینا چاہیے کہ وہ کہنے کی کوئی ایک بات بھی نہیں کہنا چاہتا یا پھر یوں کہہ لو کہ وہ بہت ہی بھونڈی برائیاں بولنے کی خواہش میں مبتلا ہے۔ میں تو یہ گمان کرتا ہوں کہ دنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں پایا جاتا جو دوسروں سے زیادہ بولنے کا حق رکھتا ہو۔ تمہارے ہونٹوں سے چاہے دنیا کی عجیب و غریب حکمتیں ہی کیوں نہ ٹپکتی ہوں اور دوسرے کی زبان پر بکواس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو پر ہے یوں کہ بولنے کے حق میں دونوں برابر ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے دانش مند میری اس بات کو ایک بڑے زیادہ کچھ نہ جانیں پر میں یہی کہے جاؤں گا کہ بڑی بڑی باتیں کرنے والو! مجھے بھی بڑ ہانکنے کا حق دو۔ آخر یہ کب اور کیسے طے ہوا کہ تم بولتے رہو گے اور میں چپکا بیٹھا سنتا رہوں گا؟

وجود کی فضا کا روشنی اور آواز سے جو رشتہ ہے، وہ کتنے گہرے رشتوں کا ایک رشتہ ہے۔ یہ وجود اور وجود کا رشتہ ہے۔ پر ہم نے یہ دیکھا کہ انسانوں میں سے بہت سے انسانوں میں اس رشتے کو توڑنے کی ایک بھیانک ہوس پائی جاتی ہے۔ روشنی اور آواز وجود کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جتنا دیکھ سکو دیکھ لو، جتنا بول سکو، بول لو۔ جتنا سن سکو، سن لو۔ سماج سے میرا جھگڑا اور کیا ہے؟ شاید یہی تو ہے کہ یہ سماج ایک ایسے گٹھ جوڑ کا نام ہے جس میں اوپر کے گٹھ جوڑیوں کے سوا باقی سارے لوگ بے جان چیز سمجھے جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے اور سمجھ میں آتا بھی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ سب کچھ کہنے اور سب کچھ کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں انہیں انسانوں سے بیر کیوں ہو جاتا ہے۔ میں سمجھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنے وجود سے باہر کی فضا کو اپنے حق میں ناسازگار کیوں بنا لینا چاہتے ہیں؟ وہ یہ کیوں پسند کرتے ہیں کہ انہیں ناپسند کیا جائے؟ ہے یوں کہ میں اور تم سوالوں کے آدمی ہیں اور جوابوں سے ہماری جھولی خالی ہے۔ سو میں اپنے آپ سے سوال پر سوال تو کر سکتا ہوں پر اپنے آپ کو جواب دینے کا مقدور نہیں رکھتا اسی لیے اپنی ذات کے گرد و پیش میں میرے لیے حیرتوں اور حسرتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ سو یہ ہوں میں اور یہ ہے میرا حال اور یہ شخص جو میں ہوں، اس کا ایک انبوہ ہے جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ مجھ سے بستیاں بسی ہوئی ہیں اور میں ان بستیوں میں ویران ہوں۔ سو اب میں پھر ایک سوال کروں گا اور وہ یہ کہ جب میری ذات کی ساری بستیاں ویران ہیں تو پھر یہ آبادیاں آخر کن پرچھائیوں کی آبادیاں ہیں؟ بتاؤں..... ؟ ہاں بتاؤ، بھائی بات یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے جن کا ہونا ان کے سوا باقی تمام انسانوں کا نہ ہونا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بات منوانے اور اپنا حکم چلانے کا حق رکھتے ہیں۔ پہلے تو یہ حق ان کو میراث میں ملتا تھا یا زور اور زبردستی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ کہیں کہیں یہ صورت اب بھی پائی جاتی ہے مگر اب جو عام صورت پیدا ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ حق لوگوں کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ ان عام لوگوں کی طرف سے جو یہ عجیب و غریب حق دینے کے بعد خود کسی حق کے حق دار نہیں رہتے۔ دنیا میں چاہے اور کہیں ایسا ہوتا ہو نہ ہوتا ہو مگر یہاں تو ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ بول رہے ہو تو بولنے بھی دو، نہیں تو لوگ بولا جائیں گے۔ گویائی کا شوق ایک نیکی ہے پر اس نیکی کے ساتھ اگر شنوائی کی بدشوقی پائی جائے تو پھر یہ نیکی بدترین بدی بن جاتی ہے۔ اگر گویائی انسان کی صفت ہے تو شنوائی خدا کی صفت مگر کچھ لوگ ہیں جو شنوائی کی صفت سے یکسر بے بہرہ پائے گئے۔ جن کی گویائی پر بناؤ اور بگاڑ کا دارومدار ہو ان کو تو سراپا شنوائی ہونا چاہیے۔ ان کی شنوائی تو ان کے پورے سماج کی شنوائی ہوتی ہے۔ انہیں تو وہ باتیں بھی سن سکنی چاہئیں جو کہی بھی نہ گئی ہوں۔ اب اگر ایسے لوگ ناشنوائی کو اپنا روگ بنا لیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ سماج میں کوئی بھی کسی کی نہیں سن رہا۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ جیسے کوئی بھی کسی کی نہ سن رہا ہو اور ایسا یوں ہے کہ جنہیں سب کی سننی چاہیے وہ کسی کی نہیں سنتے۔ سنو اور سمجھو کہ جہاں شنوائی نہیں وہاں دانش اور دانائی نہیں۔ جتنا سنو گے اتنا ہی سیکھو گے سو اپنی شنوائی سے سیکھو اور اپنی گویائی سے سکھاؤ۔ یہ بات کہ حقیقت حال کیا ہے، جاننے کی بات ہے یا نہ جاننے کی۔ میرے خیال میں یہ جاننے کی بات ہے۔ خواہش یہ رکھی جائے اور کوشش یہی کی جائے کہ تمہاری شنوائی تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کی گویائی کا فیض پہنچے۔ یہ جدا جدا مزاجوں اور جدا جدا مسلکوں کی گویائیاں ہوں۔ یہ نہیں کہ کسی ایک ہی مزاج اور ایک ہی مسلک کی گویائی پر قناعت کر لی جائے۔ اب ذرا سوچو تو سہی کہ وہ لوگ حقیقت حال سے کس قدر بیگانہ ہوں گے اور دانش و دانائی سے کس درجہ بیزار جو زبان بندی کو روا رکھیں۔ یہ کتنا بڑا خسارہ ہے اور اس سے بھی بڑا خسارہ یہ ہے کہ اس خسارے کی خواہش رکھی جائے اور یہاں میں یہ بھی کہہ دوں کہ زبان بندی زبانوں کو بڑے غضب ناک لہجے سکھاتی ہے۔ یہی ہے اور یہی ہوا بھی ہے۔

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

جولائی 2016ء کا دلچسپ شمارہ رمضان المبارک اور عیدالفطر کے لمحات کو چار چاند لگاتے ہوئے حاضر ہے۔ تمام اہالیانِ وطن کو ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے دلی عید مبارک...... اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان المبارک کی ساعتوں سے فیضیاب ہونے اور عید کے خوشگوار لمحات میں مستحقین کو بھی یاد رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) ہم مہذب دنیا کے تہذیب یافتہ باشندے...... کہیں ترقی پذیر تو کہیں ترقی یافتہ اور اکثریت تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ مختلف ناموں سے ''وابستہ دن'' منانے کتنے ضروری ہوتے ہیں اور ان کے مقاصد سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ پورے سال ہم کوئی نہ کوئی دن منا رہے ہوتے ہیں۔ میڈیا پر کوریج ہوتی ہے۔ جلسے، جلوس، سیمینارز منعقد ہوتے ہیں مگر...... افسوس ان سب کاوشوں اور شور شرابے کے نتائج...... گویا ہوا میں خاک اچھال دی گئی ہو...... کیونکہ ہم نے صرف دن منانے کا فیشن اپنایا ہے...... اور فیشن تو بس ایک چلن کا نام ہے، چلنا آئے یا نہ آئے چلنا پڑتا ہے۔ مثلاً فادرز، مدرز ڈے، ارتھ ڈے، آزادیٔ صحافت کا دن، اسپیشل لوگوں کا دن، عورتوں کا عالمی دن، نابینا افراد کے لیے سفید چھڑی کا دن وغیرہ وغیرہ اور بے شمار دن۔ اگر کبھی سنجیدگی سے ان کے مقاصد اور اثرات پر توجہ دینے کی کوشش کی جائے اور مختلف پروگراموں کے نام پر لٹائی جانے والی دولت ان کے ثمرات کی تقسیم پر خرچ کی جائے تو ان دنوں کو منانے کی افادیت اور لطف دوبالا ہو جائے مگر...... بدقسمتی سے پاکستان کو شاید سیاست کی ایسی دیمک لگ چکی ہے جو قابل اذہان کو بھی سنجیدگی سے اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ سال کے 365 دن مہنگائی کا جو حال رہتا ہے وہ تو اپنی جگہ مگر بجٹ کی دھما کا خیز آمد سے ماشاءاللہ اس میں جو باقاعدہ ترقی نظر آتی ہے وہ زندگی کے کسی اور حوالے سے محسوس نہیں ہوتی۔ اب رمضان المبارک میں ہی دیکھ لیجیے اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ جس ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے اور اس کی پشت پناہی کرنے والا ارباب اختیار طبقہ کس قدر بے فکری سے اپنے مشاغل میں گم رہتا ہے بلکہ آج کل تو ارکان پارلیمنٹ کے پورے حلقے کا زور اپنی تنخواہوں اور دیگر مراعات میں بے تحاشا اضافے پر ہے۔ جو پہلے سے کروڑ پتی ہیں اور جو ٹیکسوں کی چوری میں ماہر ترین بھی ہیں جن میں سے اکثریت ان کی ہے جنہوں نے کبھی عوامی مسائل پر لب کشائی کی بھی زحمت گوارا نہیں کی ہوگی...... البتہ تنخواہوں کے نام پر ان کا آپس میں اتحاد اور لاکھوں روپے کا مطالبہ...... بلکہ میڈیا پر دکھائی جانے والی مختلف جلسے جلوس کی تیاری پر خرچ کیا جانے والا تخمینہ اور ان جلسے جلوس میں ایک دوسرے پر الزامات کی بھرمار دیکھ کر عوام کی بے چارگی کا احساس خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہے۔ جن کے مسائل کے نام پر سیاست چمکائی جاتی ہے ان پر وسائل کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں مگر ہماری محفل کے شرکا بڑے دل کے مالک ہیں۔ جو ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ رمضان المبارک اور عید کی خوشیوں میں ان کا حصہ بھی ادا کرتے رہیں گے جو خاموشی سے ہماری توجہ کے منتظر رہتے ہیں۔ اللہ ان کا بھرم اور ہماری عزت قائم رکھے۔ آمین۔ ارے محفل کی جانب قدم بڑھایئے بھئی کتنی دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں۔

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے کرسیٔ صدارت پر براجمان ہیں ''انتہائی سادہ لیکن خوش رنگ جامنی رنگ سے مزین سرورق ایک مدبر اور پرکشش دوشیزہ کا دوپٹے کی آڑ لیے ہوئے انداز بہت دلفریب ہے۔ انشائیے میں 'دکن سے ایک خط' پڑھ کر ذہن میں اردو ادب سے متعلق کئی دریچے کھل گئے۔ اس کی خاص وجہ کہ میرا تعلق بھی حیدرآباد دکن سے ہی ہے اور کئی سال قبل میرا وہاں جانا ہوا۔ میرے ماموں وہاں حکیم طبیب ہیں۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی ادبی شخصیات سے مل بیٹھنے کا موقع ملا۔ پاکستان کے اردو رسائل، ناول، ڈائجسٹ ماہناموں کی تعریف پاکستانی شعراء کے کلام کی تعریف سے ان کی زبان تھک نہیں رہی تھی۔ مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔ ان حضرات کی خواہش پر میں نے 10 مختلف ڈائجسٹ حیدرآباد دکن بھجوائے اور وقتاً فوقتاً وہاں جانے والے لوگوں کے ہاتھ بھی کتابیں و رسائل بھیجتا رہا۔ جس کی بہت پذیرائی ہوئی (بہت خوشی ہوئی یہ سب جان کر) اب اپنی پیاری خطوط کی محفل کی طرف رخ موڑ لیا۔ سب سے پہلے اپنی عزیز بہن طاہرہ گلزار پشاور جنہوں نے میری آنکھ کے آپریشن کی کامیابی پر عیادت کی۔ جب بہنوں کی دعائیں شامل حال ہوں تو بھائیوں کو کچھ نہیں ہوتا۔ شکریہ۔ سو بار رضوان کورنگی سے صدارت پر فائز ہونے پر بہت مبارک ہو۔ آپ کو میری کورنگی والی بہن ہونے کے لیے بھی مبارکباد۔ آپ کی تحریر بہت فصیح اور سلجھی ہوئی ہے۔ آپ کے تیسرے خط نے کیا کمال دکھایا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ خطوط میں طاہرہ گلزار بہن دوسرے نمبر پر۔ لگتا ہے خواتین بڑی توجہ سے پڑھ کر دلی جذبات سے خط تحریر کرتی ہیں۔ ہم مرد حضرات شاید غم روزگار اور بجلی کی ناگہانی آفتوں کا شکار ہونے کے باوجود خطوط کے ساتھ جسم و جاں کو یکجا کر کے لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسما قادری کی شیش محل پڑھی۔ اس دفعہ انہوں نے حیدرآباد کی بہت ہی ٹکسالی زبان کو کہانی میں شامل کیا، حیدرآبادی زبان کا ایک ایک لہجہ بہت ہی اصلی ہے۔ کیا مصنفہ کو حیدرآبادی زبان پر اتنا عبور ہے یا وہ خود حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتی ہیں؟ کہانی میں بڑی تیزی آئی ہے۔ دلہن دادا کی معاملہ فہمی بہت عمدہ ہے۔ تمام کرداروں کو بڑی عمدگی سے ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ جونیئس کے مزے آگئے۔ اب یہ عالم ہے بجلی ڈھائی گھنٹے بعد آئی اور 5 منٹ بعد پھر چلی گئی۔ دماغ تو دہی بن گیا ہے۔ یااللہ تو رحم کر۔ معمولی عورت ایک خاتون نے غلط آدمی کا انتخاب کیا۔ مجبوری میں کیونکہ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ جیک ایک عیار آدمی تھا۔ وہ اس کو زہر بھی دیتا رہا اور بے اعتنائی برتتا تھا۔ خاتون نے ایک نیکی کی۔ بیمار عورت کو طوفان کے باوجود زندگی دی اور نیکی نے اس کی زندگی بچائی اور ایک بامقصد زندگی کی راہ بھی دکھا دی۔ بڑی دلچسپ کہانی اور

منظر نامہ تھا۔ درحقیقت۔ ملک صاحب کا ایک اور منفرد کارنامہ۔ خودکشی کے سادہ کیس کو ہاتھ میں لیا تو ایسی حقیقتیں سامنے آئیں کہ عقل حیران ہو گئی۔ پیاز کی تہیں کھلنے لگیں۔ یہ خودکشی نہ تھی بلکہ ایک سفاک اور جاہل ماں نے سارا کھیل رچا ڈالا تھا۔ آخر سارا معاملہ حل ہو گیا۔ خود اپنے دام میں آ گئی۔ چور اور طریقۂ واردات۔ بہت کارآمد لیکن حرص و ہوس نے ان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے۔ وہ ساری چالاکی عیاری خدا کی ایک ہی ضرب میں پاش پاش ہو گئی۔ بڑی نصیحت آمیز کہانی۔ بیچ ڈاؤن۔ ایک ذہین عورت جس نے مجرم کے ہتھے چڑھ جانے والی سہیلی کے حالات کو اپنے تخیل اور بہترین ذہنی صلاحیت کو بروئے کار لا کر نہ صرف اپنی سہیلی کی زندگی بچائی بلکہ مجرم کو بھی گرفتار کروا دیا۔ مختصر لیکن بڑی منفرد کہانی۔ نیلی کہانی۔ ایک کہانی جو جوانی کی بے لگام گھوڑی پر سوار بڑا قدم اٹھا بیٹھتی ہے۔ نہ صلے کی پروا نہ بدنامی کا خوف۔ جہالت سے بھرپور تھا۔ پرانے وقتوں میں سمجھدار بوڑھی خواتین اس کا خیال رکھتی تھیں مگر آج کل ان کو خبطی سمجھتی ہے یہ نوجوان نسل۔ قدرت نے عجیب انتقام لیا۔ بہشت زار منگولوں کا دور اور جنت کی جستجو۔ کہانی میں عجیب و غریب واقعات اور جدوجہد۔ کہانی قدیم دور کی ایک دلچسپ داستان۔ قرض۔۔۔۔ حرص و ہوس، رشوت ستانی کی داستان الم، ہمارے دین نے جس کو منع کیا وہ ہم ضرور کرتے ہیں اور عذاب الٰہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نیاز احمد نے بے ایمانی سے پیسا کمایا۔ اپنے اہل و عیال اور اولاد کو بھی برباد کر دیا۔ غم گسار۔ ایک عجیب طرح سے شروع ہوئی۔ ایک گھبرائی ہوئی لڑکی جو کسی کے ڈر سے بھاگ رہی تھی۔ وہ غم گساروں نے خوف سے نجات تو دلا دی مگر افسوس موت سے شکست کھا گئی۔ مات۔ دو کہانیوں کو ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے آخر یکجا کر دیا گیا۔ شروع میں خاص مزہ نہ آیا لیکن جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نسل نے کہانی کو نیا موڑ دیا اور اختتام ایک شخص کے ایمان کی مضبوطی، حوصلہ، وطن پرستی کی لازوال داستان۔ کتر نیں اس دفعہ کچھ کم نظر آئیں لیکن بہت شاندار۔ اشعار کی محفل بھی لاجواب تھی۔" (آپ کا انداز اور شمارے پر گہری نظر تو ہمیں بھی چونکا دیتی ہے)

✠ **اشفاق شاہین**، کراچی سے محفل میں شریک ہیں "ٹائٹل بہترین تھا۔ انشائیے میں جون ایلیا نے اردو کے ارتقا و تاریخ سے پردہ اٹھایا۔ محفل میں پہنچے تو مونا رضوان کرسیٔ صدارت پر براجمان تھیں، بہترین خط کے ساتھ۔ طاہرہ گلزار، صفدر معاویہ، عمران جونانی بھی بہترین خطوط کے ساتھ شاملِ بزم تھے۔ باقی دوستوں کے خطوط بھی لاجواب تھے۔ اپنی غیر حاضری کھٹکی۔ دو تین ماہ پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ سے نہ لکھ پائے، اب سے باقاعدہ۔ بہشت زار عام تاریخی کہانیوں سے ذرا ہٹ کر تھی، بہترین رہی۔ طاہر جاوید مغل مختصر مگر پُراثر کہانی کے ساتھ موجود تھے۔ طاہر صاحب آخری صفحات کے لیے کچھ جلد لکھیے پلیز۔ شیش محل میں دوسروں کی طرح ہم بھی فاروق کی صحت یابی اور جولیٹ کے ساتھ ملاقات کے منتظر ہیں۔ ربن کے دن بھی برے لگ رہے ہیں۔ دیکھیں اس معرکے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ایک بندے کا نقصان تو ہو چکا اس بار ایسا لگا کہ صفحات کم تھے۔ ساتھ، پتا ہی نہ چلا کہ ختم ہو گئی۔ ہاں جوزفین کے کردار میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے جس سے کہانی پر بھی اثر پڑ سکتا ہے اس کو جلد ختم کریں، مطلب ڈائری کو۔ ملک صفدر حیات بھی معمول سے ہٹ کر مختصر مگر پُراثر تحریر لے کر سامنے آئے۔ گڈ۔ نیلی کہانی مختصر کہانیوں میں سب سے بہترین گی مزہ دے گئی۔ ویلڈن نعمان اسحاق۔ ماروی میں ہم کب سے منتظر ہیں کہ اس کے کردار انسانی جون میں آئیں لیکن ہمارا امتحان لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ خدارا کچھ خیال کیجیے۔ مات آخری صفحات کی بہترین تحریر تھی۔ تمام کردار بہترین تھے۔ خصوصاً روحی اور ایان کا کردار اور انجام بھی خوب صورت رہا۔ محفل شعر و سخن میں اس بار بھی انتخاب لاجواب تھا خصوصاً صفدر معاویہ، کہکشاں فاروق اور رضیہ عمیر کا انتخاب بہترین تھا۔" (مختصر اور جامع تبصرہ بہت لاجواب رہا)

✠ **تحریم شاہ**، لاہور سے محفل میں حاضر ہیں "شدید گرمی میں ٹائٹل کے لائٹ کلرز کو دیکھ کر ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ خاص طور پر ٹائٹل گرل کی جیولری پسند آئی پھر فہرست پڑھی اور کاشف زبیر کا نام نہ دیکھ کر دکھ بھی ہوا اور مایوسی بھی۔ ساتھ ہی جون ایلیا نے دکن سے ایک خط میں میری پسندیدہ اور محبوب زبان اردو کی تاریخ اور آج کا حال واضح کر دیا جسے پڑھ کر شدت سے احساس ہوا کہ اردو کو پاکستان میں بھی جو اہمیت اور مقام ملنا چاہیے وہ نہیں مل رہا اور انگلش کے مقابلے میں اردو آنے والی نسلوں کے لیے غیر اہم اور مشکل زبان بنتی جا رہی ہے۔ آپ نے بھی اداریے میں بالکل درست فرمایا۔ ماہِ شعبان اور رمضان آنے والے ہیں اور لوڈشیڈنگ گرمی کی طرح بڑھتی جا رہی ہے اور حکمرانوں کو آپس میں لڑنے سے فرصت ہی نہیں ہے تو ہماری تکلیف کا مداوا بھلا کون کرے گا۔۔۔۔ سوائے اللہ کے جو کسی بھی مسلمان کی پہلی اور آخری امید ہے۔ خیر اب آتے ہیں اپنی پیاری سی محفل کی طرف۔ سب سے پہلے تو بہت، بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی پیاری سی بارونق محفل میں اتنی قیمتی جگہ میرے خط کو دی اور مئی کے شمارے میں میرا پہلا خط شائع کیا۔ سسپنس سے محبت کا عالم دیکھ لیجیے کہ پیپرز میں مصروف ہونے کے باوجود خط لکھ رہی ہوں کہ کہیں آپ لوگ مجھے بھول نہ جائیں۔ مونا رضوان کو بہت مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ آخرکار تیسری کوشش میں سیدھا صدارت نصیب ہو گئی۔ طاہرہ گلزار آنٹی مجھے اتنے پیار سے ویلکم کرنے کا بہت شکریہ اور بات رہی عمر کی تو ابھی تو آپ نے بس گولڈن جوبلی مکمل کی ہے، میری دعا ہے کہ آپ ان شاء اللہ سینچری پوری کریں گی۔ مرحا گل کو اس دفعہ محفل میں مس کیا۔ سب سے پہلے عادت سے مجبور ماروی پڑھی جس میں عابد علی منگی عرف عالی کا کردار بہت پسند آیا لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔۔ اس قسط میں ماروی کو ہی مار دیا، یہ مجھے ذرا اچھا نہیں لگا۔ قرض بھی اچھی تھی لیکن انجام اچھا نہیں ہوا۔ بھلا اس معصوم چھ سال کے بچے کا کیا قصور تھا کہ اس کے باپ نے اسے حرام کھلایا۔ شاہدہ نے بھی اس بے چارے کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ یقیناً وہ بھی کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ معاشرے کا یہ بہت برا نظام ہے کہ باپ کے کیے کی سزا اولاد کو دی جاتی ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے ان شاء اللہ اگلی بار بھرپور تبصرہ کروں گی۔ ابھی پیپرز میں مصروفیت کی وجہ سے کم پڑھ پائی ہوں۔" (دیکھیے جناب۔۔۔۔ سسپنس سے محبت اپنی جگہ مگر پہلے تعلیم پر توجہ ضروری ہے۔ تبصرے کا شکریہ)

✠ **قاسم رحمان**، ہری پور سے تبصرہ کر رہے ہیں "ایگزامز کی وجہ سے سسپنس کی محفل سے غیر حاضر ضرور رہا لیکن اپنے پیارے دوست سسپنس کو بھولا نہیں (بس یہی اپنائیت تو ہے جس نے آپس میں سب کو جوڑے رکھا ہے) اس مرتبہ سسپنس اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ 20 مئی کو مل ہی گیا۔ ٹائٹل پر حسینہ دوپٹا منہ کے آگے کر کے بالی ووڈ ایکٹریس کی طرح شرمانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا

کی باتیں ہمیشہ دانائی سے بھرپور ہوتی ہیں۔ جو نا رضوان اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر قبضہ جمائے نظر آئیں۔ مبارک ہو صدارت کی۔ طاہرہ گلزار اپنے بھرپور جامع تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود تھیں۔ سالگرہ مبارک ہو اگرچہ دیر سے پیش کر رہا ہوں۔ مرزا طاہرالدین آپ کے تبصرے سے زیادہ مجھے آپ کا شعر پسند آیا۔ ناہید یوسف اور جنید احمد ملک ویلکم ان سسپنس۔۔۔۔ ایم عمران جونانی کا تبصرہ پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ کتنے مجبور انسان ہیں آپ۔ عبادت کاظمی، معراج عباسی اور رضوان تنولی کو مس کیا۔۔۔۔ کہانیوں کی ابتدا ہمیشہ شیش محل سے ہی ہوتی ہے۔ کو نے ثریا کے لیے جان دے کر حقیقی معنوں میں اپنے بھائی ہونے کا فرض نبھایا۔ ضروری تو نہیں رشتے صرف خون کے ہوں، دل کے رشتے خون کے رشتوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ جوزف اور جوزفین کی ہسٹری بھی انٹرسٹنگ لگ رہی ہے۔ چاند بانو کا کردار بھی کافی مضبوط ہے۔ آخری صفحات پر مات عمر عبداللہ کا ایک اور شاہکار ناول تھا۔ روحانہ کے کردار کی مضبوطی نے کافی متاثر کیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خدا نے شایان صدیقی کے دل کو اپنی راہ کی طرف موڑ دیا۔ ملک صفدر حیات کی تفتیش نے بھی بھرپور تفریح مہیا کی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی قرض ایک بہترین کہانی تھی۔ نیاز احمد کے گناہ کا کفارہ اس کے بیٹے کو ادا کرنا پڑا۔۔۔۔ واقعی جس کا خمیر لقمۂ حرام سے اٹھا ہو اس کا انجام دہکتی ہوئی آگ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ نعمان اسحاق کی نیلی کہانی میں ینگ مسٹرز کے لیے بہترین سبق موجود تھا۔ انسان کو اپنی کرنی کا پھل اس دنیا میں ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ نیلی آپا نے بھی جب اپنے گناہ کا کفارہ ادا کیا تو زندگی نے وفا نہ کی۔ 'خود اپنے دام میں' نادر اور وسیم اپنے ہی دام میں پھنس گئے۔ زیادہ سے زیادہ کا لالچ ہمیشہ انسان کو زندہ در گور کر دیتا ہے اور اکثر کشتیاں ساحل کے قریب آ کر ہی ڈوبا کرتی ہیں۔ ابتدائی صفحات پر بہشت زار ایک عمدہ تاریخی ناول ثابت ہوا۔ ماروی اپنے اختتام کی طرف سرپٹ بھاگے جا رہی ہے۔ مغربی شہ پاروں میں سے معمولی عورت بیسٹ رہی۔ اس معمولی عورت نے اپنے ساتھ اپنی بوڑھی پڑوسن مسز کلارے کو بچا کر ایک غیر معمولی کام سرانجام دیا۔ تیج ڈاؤن بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں شوکت علی زخمی، محمد کمال انور، انیلہ رشید اور معراج عباسی کے اشعار بہترین تھے۔ اس بار کترنیں بھی اچھی تھیں۔''

✠ **ناز امتیاز** کی ضلع سرگودھا سے آمد ''18 تاریخ کو جون کا شمارہ ملا۔ پہلی نظر چنچل حسینہ پر پڑی۔ ایک آنکھ پر دوپٹا دوسری تیر کی طرح تیز دلِ ناتواں کو کاٹتی ہوئی معلوم نہیں شرما رہی تھی یا شرمندہ تھی۔ بہرحال ٹائٹل اچھا تھا۔ اب تھوڑا سا اپنے بارے میں بتا دوں کہ بہت عرصہ سسپنس سے دور رہا ہوں۔ رسالہ تو پڑھتا تھا مگر خط لکھنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ جیسے تیسے کر کے وقت نکال کر آٹھ سال بعد خط لکھ رہا ہوں۔ (سبحان اللہ۔۔۔۔ آٹھ سال بعد خیال تو آیا۔ محفل میں خوش آمدید) اکثر دوست غائب ہیں۔ پرانا قاری ایک نہیں تھا۔ میری تمام پرانے دوستوں سے اپیل ہے کہ وہ دوبارہ محفل میں حاضر ہوں تاکہ گپ شپ ہو۔ کہانیوں کی کیا بات کریں، سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سسپنس اپنے عروج پر ہے۔ بھائی رانا نثار رنچھور سے ملاقات ہوئی تو خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ سسپنس کے لیے دعا اور تمام دوستوں کو سلام۔''

✠ **زرین آفریدی**، حیدرآباد سے محفل میں صنفِ نازک کی نمائندگی کرتے ہوئے ''شدید گرمی میں دو چکر لگانے کے بعد سسپنس کا دیدار ہوا۔ پرپل کلر کے ڈریس اور سلور جیولری میں حسینہ دلنواز کو دیکھ کر گرمی کا اثر کم ہو گیا۔ پتا نہیں سندھ کو کس کی نظر لگ گئی جو گرمی منہ پھاڑے چیخ رہی ہے۔ ہم سندھ کے نازک مزاج لوگ برداشت ہی نہیں کر پا رہے۔ اللہ سائیں سے رحم کی دعا کرنے کے بعد، ادارہ سسپنس کے شکرگزار ہیں کہ موسم کی تلخی کے باوجود ہمیں ایسا شاندار ڈائجسٹ دیا جس کے پڑھنے سے یہ گرم اور بڑے دن جلد گزر جاتے ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا محترم کے نام دکن سے ایک خط آیا ہوا تھا جو کہ اردو زبان کی زبوں حالی پر مبنی تھا۔ اردو زبان اور اردو رسم الخط کا تو جواب نہیں۔ جس کو جو کرنا ہے کر لے، اردو زندہ باد۔ اداریہ ماہ و سال کی فکر کرتا نظر آیا، احباب گرامی یہی تو زندگی ہے رواں دواں، چل سو چل، ہم اشرف المخلوقات یہ سب سختیاں، پریشانیاں سہتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ پاکستانی قوم ایک بہادر اور مضبوط قوم ہے۔ سب اللہ توکل چل رہا ہے۔ لفظ پھلواری بہت خوب صورت لگا تشکر۔۔۔۔ پھلواری کا پہلا پھول سونا رضوان، واقعی خوشبو بھی بہترین تھی۔ طاہرہ گلزار آئی پورے صفحے پر قبضہ کیے ہوئے تھیں۔ رضوانہ قریشی اچھی چیز اور اچھی بات کی تعریف اس کا حق ہوتا ہے۔ عمران جونانی اور جنید احمد ملک بھی خوب صورت تبصرے لیے ہوئے تھے۔ ماضی کا آئینہ میں بہشت زار سطر سطر جادوگر تحریر ایک ہی نشست میں ختم کی لیکن تشنگی برقرار رہی۔ اب مزید کا انتظار ہے۔ نیلی کہانی نعمان اسحاق، کہانی آف دی منتھ قرار دوں گی۔ بہترین عبرت ناک، اثر انگیز اسٹوری ہے۔ اندھے جذبات انسان کو کہیں کا نہیں رکھتے۔ ملک صفدر حیات کی ورحقیقت اس بار حقیقت تک نہ پہنچ سکی۔ اسٹوری میں ادھورا پن تھا۔ رجو جیسی لڑکیاں بزدل ہوتی ہیں، وہ خودکشی کر لیتی ہیں۔ ثمر عباس کی تیج ڈاؤن، بہرحال خوب رہی۔ ڈیانا نے اپنی دوست جولیا کو اس کے مزاج اور سوچ کو پڑھتے ہوئے جیری ہوگن جیسے خطرناک قیدی سے نجات دلوائی۔ خود اپنے دام میں، طاہر جاوید مغل صاحب کے کیا کہنے۔ نادر اور وسیم کے جرائم ابدان کا انداز انہی کے گلے پڑ گیا۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب قرض کی صورت میں ہم قارئین کے لیے بہترین تحفہ لائے۔ کرپشن، رشوت خوری، دہشت گردی جیسی آفاتِ انسانی عام ہو چکی ہیں مگر یہ سب کرنے والے جب پکڑ میں آتے ہیں تو کچھ نہیں بچتا اور ان کو آتی نسلوں تک سزا ملتی رہتی ہے۔ عمر عبداللہ صاحب کی مات، ہم قارئین کے لیے سوغات سے کم نہیں ہے۔ روحانہ کی طرح مضبوط کردار کی لڑکیاں اسلام کو قوت بخشتی ہیں۔ اس کو پانے کی لگن میں شایان صدیقی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ پروفیسر عبدالجبار جیسے اسلامی اسکالر بھی مذہب اسلام کو مضبوط کرنے میں بہترین رول ادا کرتے ہیں۔ الغرض ماہ جون کے سسپنس ڈائجسٹ میں تقریباً زیادہ کہانیاں پڑھنے کو ملیں جو آج کل کی ضرورت ہیں۔ لگتا ہے اسٹوریز کی سلیکشن میچور ہاتھوں میں ہے۔ ماروی کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ماہ جون کی قسط لاجواب رہی۔ اب یہ داستان اس معیاری ڈائجسٹ کے مزاج وا اسٹینڈرڈ کے مطابق چل رہی ہے۔ تابی کا کردار بہت دلچسپی لیے ہوئے ہے۔ شیش محل میں اسما قادری نے جوزفین کی زندگی کو فوکس کیا ہوا ہے جس سے جولیٹ کے پاس لاکٹ کی موجودگی اور حقیقت معلوم ہوگی۔ یہ داستان بھی رنگینی کا سامان لیے ہوئے ہے جس سے گرمیوں کے لیے دن سکون سے گزر

رہے ہیں۔ مراسلے سارے شاندار اور معیاری ہوتے ہیں۔ محفل شعر و سخن تو ویسے ہی میری پسندیدہ ہے۔ اشعار بار بار پڑھتی رہتی ہوں۔''

علی رحمان، سندیلیانوالی سے تشریف لائے ہیں ''ایک سال کی مسلسل غیر حاضری کے بعد میں تشریف لا رہا ہوں۔ (جی ضرور ضرور... خوش آمدید) جون سسپنس ڈائجسٹ 23 کو طویل انتظار کے بعد ملا۔ سرورق نہایت دلکش رنگوں کا امتزاج تھا۔ لڑکی پردے میں لپٹی اپنے محبوب کو شرما کر دکھا رہی تھی۔ فہرست پر نظر ڈالی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ میرے ہیرو طاہر انکل کی کہانی دیکھی۔ اس کے بعد جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا اور لفظوں کے سحر میں کھو گیا۔ کرسیِ صدارت پر سونا رضوان کا خط پڑھا اور کافی شاندار تھا، مبارکاں۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ شاندار اور طویل تھا۔ اللہ آپ کو صحت کامل دے۔ مرزا طاہر بیگ کا شعر کافی پسند آیا۔ طاہر انکل کی خود اپنے دام میں نہایت پسند آئی۔ نادر سے غلطی ہو گئی۔ وسیم صاحب کہتے بھی رہے کہ دبئی چلنا چاہیے مگر نادر نہ مانا۔ انجام اس کا سامنے ہے۔ اسما قادری کی کہانی نہایت شاندار ہے لیکن یہ قسط بوریت سے بھرپور ہے۔ جولیٹ اور فاروق کی کہانی آگے نہیں بڑھ رہی۔ ہر قسط میں پانچ چھ قتل تو ہو جاتے ہیں۔ ماروی پڑھی ساری کی ساری دیوتا جیسی۔ ایک گیارہ سالہ نوجوان لڑکا یہ کرے، حیرت اور ناممکن بات۔ آج بیس سالہ نوجوان یہ نہیں کر سکے گا۔ لیچ ڈاؤن ثمر عباس کی مختصر اور اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں ماہا ایمان، معاویہ مغل، نجمی رحمان، ماسٹر جمیل انور کے شعر پسند آئے۔''

ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ''ٹائٹل ذاکر صاحب کی مہارت کا آئینہ دار تھا۔ اندر انشائیہ بھی اردوئے معلی کا فسانہ سنا رہا تھا۔ اداریے میں بھی حالات و واقعات کی وہی ذکر کاذکر تھا۔ البتہ امید ضرور تھی، امید جس پر دنیا قائم ہے۔ جو زندگی کا پیام ہے۔ ناموں کی محفل میں سر فہرست سونا رضوان تھیں۔ طاہرہ گلزار کا نام بھی جلوہ گر تھا۔ اچھا تاثر دیا، مبارکباد۔ سب سے پہلے بہشت زار پڑھی۔ الیاس سیتاپوری کی کہانی میں کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اختتام اچھے انداز میں ہوا۔ طاہر جاوید کی کہانی 'خود اپنے دام میں' نادر اور وسیم کی سوچ کے مطابق ایسا نہیں ہوا بلکہ ویسا ہوا جیسا ان کے انجام کے مطابق لکھا جا چکا تھا۔ تیسرے نمبر پر اسما قادری کی شیش محل دلچسپ انداز میں آگے چل رہی ہے اور قاری کی دلچسپی کا بھرپور احاطہ کرتی ہوئی یہ تحریر بہت پُراثر ہے۔ معمولی عورت میں غیر معمولی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ملک صفدر حیات کی درحقیقت بس ٹھیک تھی۔ لیچ ڈاؤن بھی اچھی تحریر تھی۔ ڈیانا نے ہمت اور سمجھداری سے کام لیا اور پولیس سے رابطہ کر کے خطرناک مجرم کو گرفتار کروا دیا۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے بھی لطف اندوز کیا اور آگہی کے در وا کیے۔ اشعار کی محفل میں اچھے اور معیاری اشعار نے کافی محظوظ کیا۔ اس کے بعد باری آئی نیلی کہانی کی۔ اس سے یہ تاثر ملا کہ کسی کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے۔ نیلی نے جوانی کے خمار میں گلے گلے تک ڈوب کر امام مسجد کو بھی اپنی اس آگ میں جلانا چاہا مگر ثابت قدم امام صاحب نے واقعی اللہ کی محبت اور عبادت میں خود کو اتنا منہمک کر لیا تھا کہ نیلی کی لگائی آگ سے اپنے آپ کو صاف بچا لیا۔ دنیا کے سامنے نیلی کو ایسی عبرت ناک بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا یہ ہاتف غیبی کا وہ فیصلہ تھا جو اٹل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی قرض نے بھی متاثر کیا۔ پیسے کی حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر ایک انسان اپنے اعزہ و اقربا پر بھی مصیبتوں کے در کھول دیتا ہے۔ نیاز احمد کے ساتھ یہی ہوا۔ حرام کی کمائی نے پورے گھر کو ختم کر دیا۔ ولیوں کے سلسلے میں شاہ عبدالرحمٰن پاک نے بھی دل کو نور کی روشنی سے منور کیا۔ غم گسار میں دو بہنوں نے خوف کا شکار دوسری عورت کے لیے کافی ابھار کیا اور خوف کے اس سلسلے کا خاتمہ کر دیا جو اسے اپنی زندگی کا بھی تعین نہ کرنے دے رہا تھا۔ آخری صفحات کی کہانی مات، بہت خوب صورت اور بامقصد کہانی تھی جس نے وطن پرستی کی محبت کو اجاگر کیا اور وطن کی محبت میں سرشار شایان نے سرخروئی سے وطن کی محبت کا حق ادا کیا اور اسے محبت کی طاقت نے بھی کامیابی سے ہمکنار کیا۔''

صادق معاویہ سعیدی، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے تبصرہ کر رہے ہیں ''مئی 16ء کے سسپنس میں اپنا خط پڑھا تو پتا چلا کہ آپ نے ہمارے خط پر محبت کی قینچی چلا دی ہے۔ ہم آپ کو قینچی چلانے سے تو نہیں روک سکتے۔ البتہ احتجاج ہمارا حق ہے لہٰذا اپنا انوکھا احتجاج ریکارڈ کرا رہے ہیں۔ اپنا نامکمل خط پڑھا اور...... اور پھر سسپنس بند کر کے رکھ دیا اور مئی کے شمارے پر تبصرہ بھی گول کر دیا۔ بے قراری بھی بہت رہی مگر ہم بھی اپنے ضدی ہیں کہ دوبارہ ہاتھ نہیں لگایا۔ زندگی نے وفا کی تو اب مئی کا سسپنس عیدالفطر کے بعد ہی پڑھیں گے (اتنی ناراضگی بھی اچھی نہیں ہوتی...... کبھی کبھی جگہ کی قلت ہو جاتی ہے اور جب جگہ ہوتی ہے تو بڑے خطوط بھی لگا دیے جاتے ہیں) اور اب جون 16ء کا سسپنس زیب نظر ہے۔ فہرست پر نگاہ ڈالی۔ کاشف زبیر کا نام نہ پا کر دل دکھ سے بھر گیا۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ سونا رضوان صدارت مبارک ہو۔ آپ کا طرز تحریر دل کو چھو گیا۔ لکھتی رہیے گا۔ پیکر غیرت نسوانی عذرا ہاشمی کی طرح غائب نہ ہو جانا۔ طاہرہ گلزار شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ رضوانہ قریشی آپ تو کمال کرتی ہیں۔ ثنا صادق کا الف لیلوی تبصرہ اچھا لگا۔ صفدر معاویہ بھائی آپ کا۔ میرا ہم سب کا رونا یہی تو ہے کہ ارباب اقتدار معاشرے سے ناانصافی کا خاتمہ کریں۔ اللہ کرے کسی بھی طرح ہمارے معاشرے سے ناانصافی کا خاتمہ ہو۔ آمین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ کیا کہنے جی تیز رفتار کہانی پر مضبوط گرفت اسما قادری کا کمال ہے۔ ویسے اگر اسما جی! فاروق اور جولیٹ پر تھوڑا سا ترس کھائیں تو کیسا رہے گا۔ پھر ماروی پڑھی۔ انکل نواب کے بعد تو ماروی کچھ زیادہ ہی اچھی لگنے لگی ہے۔ اللہ پاک انکل کی مغفرت فرمائے۔ ملک صفدر حیات کی درحقیقت ڈھیلی ڈھالی کہانی تھی۔ طاہر جاوید مغل کی خود اپنے دام میں ایک منفرد اور دلچسپ کہانی تھی۔ نادر اور وسیم اپنے انجام کو ٹھیک پہنچے۔ نیلی کہانی نعمان اسحاق کی شاندار کاوش تھی۔ نیلی نے اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹی۔ کسی کی پگڑی اچھال کر خود آبرو سے رہ لیں، ایسا ممکن تو نہیں۔ مولوی احمد پر ہونے والے ظلم کا انتقام بھورے ریچھ نے لیا۔ کیا عجب اور دلچسپ کہانی ہے۔ آخر میں عمر عبداللہ کی مات پڑھی۔ بھارتی درندوں کا وحشیانہ تشدد دل دہلا گیا اور شایان کی استقامت نے دل خوش کر دیا۔ یقین جانیے مات دل کی آنکھوں سے پڑھنے کی چیز ہے۔ کہانی میں معلومات کا سمندر موجزن اور جابجا تاریخ اسلامی کے حوالے لطف دوبالا کر گئے۔ مات عمر عبداللہ کی شاہکار تخلیق ہے۔ پڑھ کر لطف آ گیا۔ 3 مرتبہ پڑھ چکا ہوں مگر ابھی تک تشنگی باقی ہے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ حیات باقی، ملاقات باقی۔ منتظمین و کارکنان سسپنس اور احباب محفل کو ایڈوانس عیدالفطر مبارک۔''

✠ **حافظ شعیب معاویہ** کی خان پور، ضلع رحیم یار خان سے پہلی بار شرکت ''سسپنس سے دوستی تو کافی دیر سے ہے لیکن بزمِ دوستاں میں شرکت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔ (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے، خوش آمدید) یوں تو پورا سسپنس ہی زبردست ہوتا ہے مگر میرا ذوق ہے کہ بزمِ دوستاں ہی سسپنس کی جان ہے۔ اس مرتبہ مونا رضوان الفاظ کے بہترین چناؤ کے ساتھ ایک مکمل اور جامع تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر جلوہ فگن تھیں۔ ڈھیروں ڈھیر مبارکاں۔ آغا سلمان پاشا اور عذرا ہاشمی کو بھی صدارت ملی تھی لیکن وہ ایسے غائب ہوئے کہ---- جیسے... مونا رضوان جی آپ خیال کرنا غیر حاضر نہ ہونا۔ طاہرہ گلزار، بشریٰ افضل، صفدر معاویہ، ایم عمران جونانی، قدرت اللہ نیازی کے تبصرے محفل کی جان اور پہچان ہیں۔ سب سے پہلے آخری کہانی پڑھتا ہوں۔ اس دفعہ عمر عبداللہ آخری صفحات کے لیے مات لے کر آئے۔ مات پڑھنا شروع کی تو عمر عبداللہ کے جادو میں جکڑے گئے۔ ایک دل پر اثر کرنے والی تحریر کہ متعدد بار آنکھیں بھیگ گئیں۔ بھارتی درندوں کی وحشت و بربریت کے دلدوز مناظر، پاک وطن سے والہانہ محبت کے اجلے مناظر، معلومات کی فراوانی، جگہ جگہ تاریخ اسلام کے روشن کرداروں کے حوالے اور شایان کی بے پناہ استقامت دل باغ باغ کر گئی اور اسما قادری کی شیشں محل تو محتاجِ تبصرہ ہی نہیں۔ زبردست کہانی، جاندار کردار خصوصاً فاروق اور ربن دادا کاش کہ ہمارے کرتا دھرتا شیشں محل میں ربن دادا کا کردار پڑھ کر اپنی عوام پر ذرا سا ترس کریں اور ماروی تو اپنی مثال آپ کہانی ہے۔ نعمان اسحاق کی نیلی کہانی بھی زبردست رہی۔ نیلی نے مولوی احمد پر تہمت لگائی۔ مولوی احمد کے ساتھ تو جو کچھ ہوا سو ہوا مگر نیلی بیچاری اپنی آبرو بھی گنوا بیٹھی۔ سچ ہے کہ کسی پر کیچڑ اچھال کر اپنا دامن صاف رکھ لینا ممکن ہی نہیں۔ طاہر جاوید مغل کی کہانی خود اپنے دام میں اچھوتی اور ٹاپ کلاس کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی معمولی عورت اور ملک صفدر حیات کی درحقیقت بھی اعلیٰ معیار کی تھیں البتہ بیچ ڈاؤن نے تھوڑا سا بور کیا۔'' (اب محفل سے غیر حاضری پر جرمانہ عائد کرنا پڑے گا)

✠ **سید عبادت کاظمی**، ڈیرہ اسماعیل خان سے محفل میں حاضری لگا رہے ہیں ''جاسوسی و سسپنس سے میرا رشتہ ایسا ہے کہ میں چاہوں بھی تو نہیں توڑ سکتا۔ دو ماہ سے محفل میں حاضری نہیں دی تھی، کسی دوست نے یاد بھی نہیں کیا۔ (جب آپ کے دوست احباب پکار پکار کر کہتے ہیں کہ بہت ہو گئی غیر حاضری اب حاضر ہو جائیں تو...... کوئی کان نہیں دھرتا) 22 مئی کو سسپنس خریدا۔ ٹائٹل ٹھیک تھا موسم کی مناسبت سے مگر کہتے ہیں نا کہ دل کا موسم اچھا نہ ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ 19 مارچ کو میرے ابو جان ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تب سے لگتا ہے زندگی رک سی گئی ہے۔ (اوہو...... بہت افسوس ہوا۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے) مونا رضوان کرسی صدارت کی حق دار پائیں۔ طاہرہ آپی کا طویل تبصرہ محفل کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ واقعی ہم نے محبت کو نفرت میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہاں ہر کسی کو اپنی پڑی ہے۔ عبدالجبار رومی کا تبصرہ عمدہ تھا۔ اپنے بہترین لفظوں کے ساتھ جونانی بھائی بھی محفل میں موجود تھے۔ ثنا صادق، انجم کمال، اور یس احمد خان عمدہ تجزیے کے ساتھ شریکِ محفل تھے۔ ہمیشہ کی طرح شیشں محل سے شروع کیا۔ ربن دادا کی باتیں ہمیشہ اچھی لگتی ہیں۔ لگتا ہے گہری چوٹ کھائی ہوئی ہے۔ فاروق اور بملا کی قربت کیا رنگ لائے گی۔ چاند بانو کا کردار اچھا لگتا ہے۔ ماروی بس ٹھیک جا رہی ہے۔ آخری صفحات پر مات نے محفل سسپنس کی رونق بڑھا دی۔ شایان کی جرأت اچھی لگی۔ روحانہ کا کردار زبردست تھا۔ خود اپنے دام میں زبردست کہانی تھی۔'' (دل کا موسم چاہے جیسا بھی ہو، جینے کی ہمت تو کرنا ہی پڑتی ہے)

✠ **رانا بشیر احمد ایاز**، ناظم آباد کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''چلچلاتی گرم دوپہر کو اچانک سسپنس کا ملنا گویا صحرا میں نخلستان مل جانے جیسا محسوس ہوا۔ دوشیزہ سرورق پر پِل کلر کے سوٹ میں ملبوس، پر پل کلر کا ہی دوپٹا اوڑھے، صاف و کتنے بھی نہیں اور چھیتے بھی نہیں کی مکمل عکاسی کرتی نظر آئی۔ آنکھوں میں کاجل، گوری کلائیوں میں ہم رنگ چوڑیاں، گلے میں ہار اور کانوں میں چنبیلی کے پھولوں جیسے جھمکے پہن کر کافی اچھی لگی۔ ویلڈن ذاکر انکل۔ اشتہارات کی دنیا سے آگے چل کر انشائیہ میں جون ایلیا دکن سے آیا ہوا ایک خط پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان سے اجازت لے کر سیدھے اپنی محفل میں آئے جہاں پر اس دفعہ وکٹری اسٹینڈ پر کورنگی کراچی سے مونا رضوان دو بار کی کوششوں کے بعد آخرکار پہلے نمبر پہ آنے میں کامیاب ہو گئیں۔ بہت خوب صورت لکھا آپ نے۔ محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ پشاور سے اس مرتبہ دوسرے نمبر پہ رہیں اور بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ پاک حیاتِ خضر عطا فرمائے۔ آپ نے محفل میں خوش آمدید کیا، بہت اچھا لگا کہ کسی نے ہم جیسے نوآموز کی حوصلہ افزائی کی۔ (یہ محفل آپ کی اپنی ہی تو ہے) محمد صفدر معاویہ گندم کی کٹائی میں مصروف نظر آئے پھر بھی بہت اچھا لکھا۔ جناب غلام یاسین بہت شکریہ اس دل والی محفل میں اتنے خلوص سے خوش آمدید کہنے کا۔ اب تو مستقل ہی لکھنا ہے۔ کافی اچھا لکھا ہے آپ نے۔ عبدالجبار رومی، انجم کمال، احمد خان توحیدی، ثنا صادق، جنید احمد ملک بھی اس دفعہ اچھی فارم میں دکھائی دیے۔ جناب ایم عمران جونانی بہت شکریہ تبصرے کو پسند کرنے کا۔ کہانیوں پر تبصرے سے پہلے تعارف کرواتا چلوں۔ سسپنس سے عرصہ دس سال سے وابستہ ہوں۔ بادولت عمر عزیز کے 20 ویں سال میں قدم رکھ چکے ہیں اور دس سال سے سسپنس سے تعلق ہے (ماشاء اللہ) حیران مت ہوں، دس سال کی عمر سے سسپنس پڑھنا شروع کیا تھا (مگر سچ بتائیے کہ تعلیم تو متاثر نہیں ہوئی---- یہ اچھی بات لگتی ہے بچے آج بھی کتاب بینی کا شوق رکھتے ہیں۔ پہلے تعلیم پھر مطالعے کا شوق ہو تو دل کو خوشی ہوگی) پڑھنے کا شوق ابا حضور کو دیکھ کر ہوا۔ ابا حضور اکثر رات کو لالٹین جلا کر جب رات گئے مطالعے میں مصروف رہتے تو مجھے بڑا تجسس ہوتا تھا کہ آخر اس میں ہے کیا جو رات کو اتنی دیر تک پڑھا جا رہا ہے۔ اس وقت اسکول کی کتاب کے علاوہ کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔ پھر بڑے بھائی سجاد احمد ساحر کراچی سے گاؤں آئے تو ان سے پوچھا پھر کیا تھا انہوں نے نیا شمارہ مجھے دے دیا۔ اسکول میں، میں سسپنس چھپا کر لے جاتا تھا اور فری پیریڈز میں پڑھتا تھا۔ بڑے بھائی اور ہم سب مل کر پڑھتے ہیں اور اب ابا حضور سب سے پہلا کام یہ کرتے ہیں جیسے ہی میں ڈائجسٹ لے کر آتا ہوں، پہلے ہی سنبھال لیتے ہیں۔ بھشت زار الیاس سیتاپوری کے قلم کا شاہکار۔ بہت اچھی رہی۔ طاہر جاوید مغل اس دفعہ اپنے دام میں خود نظر آئے۔ بہت سبق آموز کہانی تھی۔ چوروں کو بھی مور پڑ سکتے ہیں لیکن نادر اور وسیم یہ بات بھول گئے۔ محمد اسحاق نعمان

نیلی کہانی کے ساتھ موجود تھے۔ بہت اچھی کاوش تھی۔ نائلہ نے جو یاد ہی کا نا۔ مولوی محمد احمد کا کردار جاندار تھا۔ شیش محل اس دفعہ فاروق اور بلال کی آپس میں دو بدو نوک جھونک گفتگو اچھی لگی۔'' (تبصرے کا شکریہ..... اب غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے)

✠ **محمد صفدر معاویہ، تحصیل و ضلع خانیوال** سے تبصرہ کررہے ہیں '' جون کا شمارہ بآسانی 15 مئی کی تپتی دھوپ میں ملا۔ سرورق کو ایک بہت ہی خوب صورت، خوبرو دلنشین کان میں چنبیلی کے پھول سے مشابہ ٹاپس اور گلے میں خوب صورت ہار پہنے دلکش ماڈل سے سجایا گیا۔ کہانیوں کی فہرست کو بھی اچھے طریقے سے پیش کیا گیا۔ جون ایلیا محترم دکن سے ایک خط لے کر آئے۔ دواردو کی تاریخ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہ کس نے اس کا ستیاناس کیا، کس نے عروج بخشا۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ کے الفاظ آپ کے نہیں بلکہ ہم سب کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ یقین جانیے اگر ہم عوام اپنا قبلہ درست کرلیں اور حکومت کے سامنے سیدھے ہوجائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ حکمران طبقہ سیدھا نہ ہو بس پہلے اپنے اعمال درست کرنے ہیں۔ اپنی محفل میں پہنچے تو کراچی سے مونا رضوان کو بہت ہی عمدہ تبصرہ کرتے ہوئے کرسی صدارت پر پایا۔ بہترین کاوش مبارکاں جی۔ مرزا طاہر الدین بیگ بھی اپنے منفرد انداز کے ساتھ محفل میں جلوہ افروز۔ رضوانہ قریشی صاحبہ آپ اتنا خوب صورت لکھتی ہیں تو پھر تھوڑی بہت تعریف تو بنتی ہے۔ رانا بشیر احمد ایاز کی بھی بھرپور شرکت۔ ادریس احمد خان آپ خود بھی بہترین انداز میں تبصرہ لکھتے ہیں۔ احمد خان توحیدی دیکھا ارے والے کیسے دل میں اترتے ہیں۔ جو ادارہ جاسوسی سے وابستہ ہو گیا تو سمجھو کہ وہ تو اسی کا ہو گیا۔ ایم عمران جونانی آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا۔ بہت ذرہ نوازی آپ کی آپ خود بھی تو کمال لکھتے ہیں۔ آخر میں ثنا صادق اور جنید احمد ملک کی بھی بہترین تبصرہ نگاری۔ کہانیوں میں شروعات شیش محل سے کی، بہت ہی اچھی رہی یہ قسط بھی۔ ثریا کی شادی ہو گئی تو کمو نے اس پر جان واردی۔ فاروق کو لاعلم رکھا گیا۔ جزنین کے ماضی کی پرتیں کھل رہی ہیں۔ نواب خاندان کا اضافہ بھی اچھا لگا۔ تنویر ریاض کی معمولی عورت میں غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیا مسز جیک نے۔ درحقیقت ملک صاحب کی ڈائری سے ایک کیس، رجو نے اپنے ساتھ خود ظلم کیا۔ نہ دنیا کی رہی نہ آخرت کی۔ اس طرح کے واقعے پر ماں باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ میرے اندر درد اتنا بھرا ہے کہ لکھنے پر آؤں تو آپ کے ڈائجسٹ کے صفحات ہی تھوڑے پڑ جائیں ایسے واقعات دیکھ کر سن کر اور پڑھ کر میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ ثمر عباس کی کچ ڈاؤن بھی عمدہ رہی جہاں زیانا نے جولیا کا اشارہ سمجھ لیا اور مجرم کو جیل کی سلاخوں میں پہنچایا۔ محفل شعر و سخن میں ہر شعر مزاج کے مطابق لگا۔ نعمان اسحاق کی نیلی کہانی آپا کی نوجوانی میں کی گئی ایک غلطی کا کتنا بڑا کفارہ ادا کرنا پڑا اسے۔ کافی سبق آموز تحریر تھی کہ اپنا ہر عمل سوچ سمجھ کر کرنا کہ بعد میں پھر پچھتانا پڑے۔ نواب انکل مرحوم کی ماروی تک پہنچے۔ یقین تو نہیں آیا کہ ماروی مرگئی۔ ناقابل یقین جس کے نام سے کہانی تھی وہی چل بسی۔ عالی بھی رشتوں کو ٹھیک پڑ رہا ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے والی بات ہے۔ رہیں اسے ہدر بھی میسر آرہے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے قرض تھی۔ رشوت کے موضوع پر بہت عمدہ لکھا۔ رشوت بہت بڑی لعنت ہے جو سب کچھ برباد کر کے رکھ دیتی ہے لیکن آخر میں شہزادیا آفتاب کے انجام کا دکھ ہوا۔ وہ تو چھوٹا بچہ تھا، اسے کیا معلوم کہ باپ حلال کما رہا ہے یا حرام۔ شاہ عبدالحق پاک ایک رلی کال کے حالات زندگی کے بارے میں جاننا اچھا لگا۔ سلیم انور کی غم گسار میں میاں مسٹر نے مارسیلا جونسن کو تمام سوور ز سے چھٹکارا دلایا۔ بہت عمدہ۔ عمر عبداللہ مات لے کر آئے۔ بہت ہی نائس تحریر رہی۔ جہاں پر شایان نے پہلے تو صحیح معنوں میں دولت شہرت گلوکاری چھوڑ کر پھر اپنے ملک کی خاطر اپنی جان تک کو داؤ پر لگا دیا لیکن اپنا مقصد پورا کیا۔ ساتھ میں پروفیسر عبدالجبار اور روحانہ کا کردار بھی بہت عمدہ رہا۔ روحانہ کی محبت نے ہی اس کو کامیابی دلائی۔ الیاس سیتاپوری کے قلم سے بہشت زار بس گزارہ لائق ہی ہے۔ طاہر جاوید مغل خور اپنے دام میں لے کر آئے جہاں پر نادر کو اس کے لالچ نے مروا دیا۔ وسیم نے تو اچھا مشورہ دیا تھا پر جب بندہ پھنستا ہے تو اپنے ہی جال میں پھنس جاتا ہے اور پھر حرام کہاں بچتا ہے۔ باقی کترنوں نے بھی بہت لطف دیا۔ اس دفعہ کا سسپنس بہت عمدہ رہا کیونکہ اس دفعہ ترجمہ شدہ مغربی کہانی کم رہیں۔ تمام پاکستانیوں، ادارے سے وابستہ افراد اور قارئین کو رمضان کی آمد مبارک ہو۔'' (آپ سب قارئین کو بھی بے حد مبارک)

✠ **مرحا گل،** ودرابن سے محفل میں شرکت کررہی ہیں '' خود کو ٹائٹل پر دیکھ کر حیرانی ہوئی (کیوں بھئی..... کہیں خود کو دیکھ کر ڈر تو نہیں لگا) انشائیہ پڑھا جہاں اردو کی زبوں حالی کا رونا رویا گیا۔ گھوم کر اندر آئے تو اپنے محبوب ڈائجسٹ کو کچھ نہیں بہت بدلا بدلا محسوس کیا۔ بہت سے نئے دوست آئے اور رنگینی بکھیرتے گئے۔ ساتھ ہی اپنا تبصرہ تو کیا، نام بھی بلیک لسٹ (کالی بلا) میں نظر نہ آیا۔ (رل بزار کھیں) قدرت اللہ انکل اینڈ عبادت جی کہاں ہیں۔ ماہ جون کی کرسی صدارت پر مونا رضوان اپنے دلچسپ تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ پہلا نمبر حاصل کرنے پر مبارکباد۔ دوسرا نمبر طاہر بگزار آپی کا لگا۔ بھئی بے حد مبارکباد، صنف نازک کی جیت ہماری جیت ہے۔ بالکل صحیح فرمایا آپ نے، قدرت اللہ جی کو جانے کیوں کچھ کچھ ہو جاتا ہے صنف نازک کو دیکھ کر ہم سے تو..... اللہ معاف فرمائے تنقید کرنے میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بار تار اینڈ شاندار تھا، ویلڈن۔ رضوانہ قریشی کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ ایم عمران جونانی کا اچھوتا منفرد تبصرہ دل و دماغ میں جگہ بنا گیا۔ اسٹارٹ سے ہی کہانیوں پر تبصرہ زبردست۔ اگر دفتر ہمارے راستے میں پڑتا تو ہم دھرنا دیتے ورنہ نہیں کیونکہ ہمارا ہر دفعہ آدھا تبصرہ حاضر ہوتا ہے اس دفعہ شائع کریں ورنہ..... (اک اور دھرنا..... شکر ہے آپ کے راستے میں دفتر نہیں آتا) جنید احمد ملک کے تبصرے کی داد دینی پڑے گی، خوب صورت انداز لیے ہوئے تھا۔ انعم کمال کا تبصرہ حساسیت لیے ہوئے تھا۔ باقی رانا بشیر، ادریس احمد اینڈ احمد خان توحیدی برادرز کے تبصرے بھی پسند آئے۔ اس دفعہ چودھری سرفراز صاحب اینڈ معراج محبوب عباسی، بلقیس خان، احتشام مرتضیٰ کی کمی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے نعمان اسحاق کی کہانی کو پڑھنا شروع کیا۔ دل رکھ سے بھر گیا جہاں صنف وجاہت یعنی (کرخت) پر غصہ آیا وہاں صنف نازک پر بھی دل رکھ سے بھر گیا اینڈ میں کافی نفرت ہوئی نیلی سے۔ اس انجام کی مستحق تھی وہ، سبق آموز اسٹوری تھی۔ شیش محل بور سے بور ہوتی جارہی ہے۔ اس دفعہ گرفت قائم کرنے میں ناکام رہی۔ اگر فاروق کو بھی واپس لا کر پرانی روٹین میں لایا جائے تو کچھ چینج آئے گا ایسے تو..... ماروی کو تو ویسے بھی بیچ بیچ میں پڑھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ تنویر ریاض کی اسٹوری بے حد پراثر تحریر تھی۔ ایسے مرد کو رد کیا جانا ہی بہتر ہے، وہ اس سزا کا مستحق تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ ایک بہترین تحفہ لائے۔ دولت واقعی انسان کو اندھا

کررہی ہے لیکن حرام کی دولت آخرکار آخری فرد بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ شاہ عبدالرحمن پاک کے علم سے سیراب ہوئے بابرکت مہینے میں لطف دوبالا ہوگیا۔ غم گسار ایک نہ بھولنے والی کہانی تھی۔ ہمارا خیال بھی آپ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانیوں کا تو ہمیں ہمیشہ انتظار رہتا ہے۔ کمال کا جادو ہوتا ہے ملک صاحب کی تحریروں میں۔ درحقیقت ایک افسوس بھری تحریر تھی۔ کسی کا راز رکھنا بھی راز ہی ہے یعنی راز کی بات ہے۔ جیراں اور یوسف ماچھی کی بے اولادی پر افسوس ہوا۔ بچ ڈارن خوشگوار سی تحریر تھی اینڈ زہانت سے بھرپور دوستی نبھانے والی موسٹ فیورٹ رائٹر طاہر جاوید کی تحریر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ نادر کے لیے اینڈ ہمارے لیے بھی شاید اسے مکافات کہتے ہیں اپنی چھٹی حس کے کہنے پر ندر کے تو پانچیں حس پر رک جاتے بے چارے۔ شمارے کی بیسٹ کہانی مات عمر عبداللہ کی کیا کہوں الفاظ ہی نہیں مگر نہیں الفاظ بنانے پڑیں گے۔ اتنی مضبوط گرفت ہر کردار اپنی جگہ نگینے کی طرح فٹ ہوگیا کہنے۔ روحانہ کے کردار کی مضبوطی نے گرویدہ کرلیا۔ رہاں شایان کی محبت اور فیصلے کی مضبوطی نے بھی ہمیں لوٹ لیا۔ اس ماہ کہانی اپنے پورے شانِ شایان سے حق ادا کرگئی۔ شعروسخن میں محمد صفدر معاویہ کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ واقعی حقیقت میں ایسا نہیں۔ باقی محبوب عباسی وردی انصاری، کشور جہاں کے انتخاب پسند آئے۔ ردی انصاری صاحب کو منگنی کی بے حد مبارک باد اینڈ ڈھیر ساری دعائیں۔ باقی سب دوستوں کو رمضان المبارک مبارک ہو اینڈ ایڈوانس عیدالفطر کی مبارک باد۔''

وارث علی ملاح، سندیلیانوالی سے تبصرہ کررہے ہیں ''وقت کا کام ہے گزر جانا..... ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ماہ رمضان گیا اور جا بھی نہیں چلا پھر آرہا ہے۔ اللہ ہم سب کی دعائیں، ہم سب کی گری کی عبادتیں قبول و منظور فرمائے۔ نہ جانے اگلے سال ہم میں سے کون حیات ہو اور کون..... اسی طرح رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے ملک کو ہمارے پاکستانیوں کو ہر سال عیدالفطر کی خوشیاں نصیب فرمائے۔ اس دفعہ کا شمارہ 17 کو فیصل آباد سے ملا۔ ہمارے شہر میں تو 21 کو آتا ہے۔ تبصرہ نگاروں میں ایک سے بڑھ کر ایک شخص موجود تھا ہر کسی نے خوب تحریر کیا۔ مونا رضوان کی تیسری انٹری اچھی لگی اور صدارت کی مبارک دینے کو دل چاہا۔ وزارت عظمیٰ کے لیے محترمہ طاہرہ گلزار ہماری سب کی بہت پیاری آپا موجود تھیں۔ بھئی آپی جی اتنا بڑا تبصرہ کیسے لکھ لیتی ہو۔ بھائی صفدر معاویہ امید ہے اس دفعہ بہشت زار آپ کے تنھی منی سے عقل میں پڑ جائے گی۔ ایم عمران ''جونی'' بھئی بہت بہت شکریہ حوصلہ افزائی کا۔ عمران نام مجھے بہت اچھا لگتا ہے..... ابتدا حسب معمول شیش محل سے ہی کی..... لیکن چار صفحوں کے بعد بریک لگانا پڑے کہ شیش محل کے پیجز ہی آگے نہیں تھے۔ 64 سے لے کر 99 صفحے تک سب غائب۔ قسم سے بہت رکھ دوا۔ (ایسا اکثر بائنڈنگ میں غلطی سے ہو جاتا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اپنے ہاکر کو واپس کر کے دوسرا پرچہ طلب کرتے) شیش محل کی وجہ سے تو ہم سسپنس لیتے ہیں۔ آخری صفحات میں عمر عبداللہ کو پڑھا، بہت مزہ آیا۔ شایان نے محبت پاکیزگی سے کی اور پاکیزہ محبت کا ان دونوں کو صلہ مل گیا۔ بیچ میں غلط فہمیوں نے جنم لیا تو تھا لیکن وہ غلط فہمیاں شایان کے اس کام کے آگے کچھ نہ تھیں جو اس نے انجام دیا۔ نیلی کہانی کو اسٹوری آف منتھ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ نعمان اسحٰق نے بہت نازک اور بہت اچھوتا موضوع چنا اور زبردست طریقے سے انصاف کیا۔ نیلی نے جزا احمد جیسے پاک دامن مرد کے ساتھ کیا، اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔ قدرت نے ایک بے زبان جانور کے ذریعے احمد کی سچائی ثابت کردی..... سچ ہے اچھے اور مومن لوگوں پر آزمائشیں آتی ہیں اور وہ سرخرو بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ترغیب نے جھنجوڑ کر رکھ دیا شہزاد بے چارہ معصوم اور بے گناہ ہو کر بھی اپنے والدین کے حرام رزق کی وجہ سے حرام موت مرا۔ یہ کہانی بھی نصیحت آمیز تھی۔ ملک صفدر حیات نے اس دفعہ کافی رازداری سے کام لیا اور حقیقت تک پہنچ ہی گیا تھا لیکن مزید حقائق کو نہ بتا کر اس نے اچھا ہی کیا۔ خود اپنے دام میں، طاہر جاوید انکل کی بہت زبردست مختصر تحریر تھی لیکن سبق سکھا گئی۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے کے مصداق تھی۔ یہ کہانی لالچ، حرص و ہوس پر مشتمل سبق آموز کہانی تھی جس نے بہت کچھ سکھایا۔ ماردی انتہائی عجیب موڑ اختیار کرتی جارہی ہے..... حیرت کی بات ہے ننھے سے بچے سے کیسے عجیب عجیب کردار کروائے جارہے ہیں کہ عقل تسلیم ہی نہیں کرتی۔ شاہ عبدالرحمن پاک المعروف بھٹری والا کا فسانہ حیات دلوں کو چھو گیا۔ محفل شعروسخن میں سارے اشعار بیسٹ تھے۔ گنتر نیں کچھ خاص نہ تھیں۔ پچھلے شمارے میں بھائی حبیب الرحمن نے مجھ سے سوری کیا تھا تو جواب میں میں یہی کہوں گا کہ میں ناراض ہی نہیں تھا بس مصروفیت میں وقت ہی نہیں مل رہا۔ اللہ ہم سب کو عیدالفطر اور مبارک رمضان کی مبارک ساعتوں سے فیض یاب فرمائے۔ آمین۔'' (اتنے خوب صورت تبصرے کا شکریہ)

عبدالغفار فردوس، نواں شہر، ایبٹ آباد سے تشریف لائے ہیں ''ارن کی چلچلاتی دھوپ، ناساز طبیعت کے کارن جب میں گھر سے اسپتال چیک اپ کے لیے نکلا تو دل میں عجب سی خوشی مچل رہی تھی کہ آج سسپنس کا تازہ شمارہ بھی لیتے آئیں گے۔ جو خوب صورت کہانیوں، دلفریب ٹائٹل اور میری احوال اور شعروسخن میں انٹری کے ساتھ شاپ پر جلوہ افروز ہوگا۔ کافی دیر بعد اسپتال سے ہم فارغ ہوئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی بازار کی طرف چل پڑے۔ کافی دکانوں سے پوچھ تاچھ کے بعد آخر کو ایک پر میرے پسندیدہ کلر کے ڈریس میں ملبوس دوشیزہ ادائے دلربا کے ساتھ ٹائٹل پر نمایاں تھی۔ جلدی سے پیسے دے کر کھولا تو ہم احوال میں تو کیا بلیک لسٹ میں بھی کہیں نہ تھے اور نہ محفل شعروسخن میں۔ پھر ذہن میں یہ خیال آیا شاید خط ادارے کو پہنچا ہی نہ ہو۔ پر ایسا بھی میرے ساتھ ہوا نہیں پھر جب اپنے دوسرے پسندیدہ شمارے کو لے کر خط اور اپنے اشعار شائع دیکھے جہاں میرا پہلا خط تھا، وہاں سب شاملِ احوال اور شعروسخن تھا۔ خوشی کے ساتھ بہت دکھ ہوا۔ جس رسالے کے پرانے قاری تھے وہاں سے کیسے ریجیکٹ کیا گیا کہ ایک دکھ سا پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ احوال میں ہم اپنے پسندیدہ رائٹرز کی موت پر نوحہ کناں ہی تو تھے ایسا ہم کیا غلط لکھے کہ.....؟ آخری بار احوال میں شرکت کررہے ہیں، صرف اس جانکاری کے لیے کہ ہمیں کیوں شاملِ احوال و شعروسخن نہ کیا گیا؟ کہانیوں میں بہشت زار نے اول سے آخر تک پراسراریت کی دھند میں لپٹائے رکھا۔ کہانی کی شروعات اور اختتام دونوں بہترین ہوئے۔ باقی کہانیوں میں مات، درحقیقت، غم گسار اور خود اپنے دام میں بہترین کہانیاں تھیں۔ ماردی جب بھی پڑھتے ہیں تو بے اختیار محی الدین نواب صاحب کی یاد تڑپا جاتی ہے۔ اب ان کی اور کوئی نئی کہانی کبھی پڑھنے کو نہیں ملے گی۔ نہ جانے ماردی بھی کب اختتام پذیر ہو جائے۔ کافی عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ مغربی کہانیوں میں اب وہ پہلے والا سسپنس ودہ مزہ نہیں رہا جو آج سے ایک عرصے پہلے ہوا کرتا تھا۔ آخر ایسا کیوں؟'' (کبھی کوئی نہ کوئی وجہ

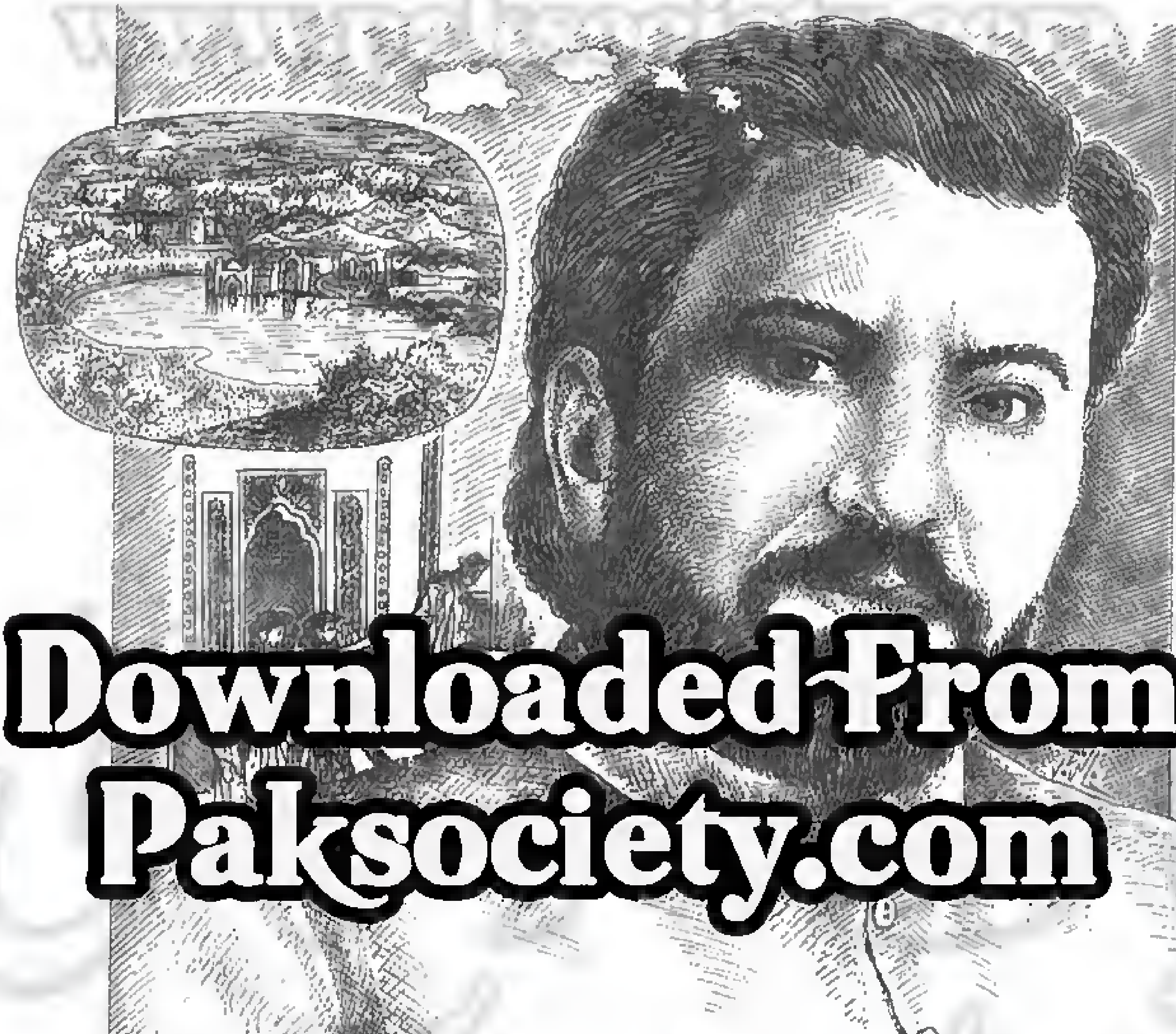
ہوجاتی ہے۔ آپ کے خط شایع نہ ہونے کی۔ جو خطوط وقت پر مل جاتے ہیں انہیں نظرانداز نہیں کیا جاتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی دھمکیاں۔۔۔ شاید یہ آپ لوگوں کی محبت کا ہی انداز ہو۔ برائے مہربانی اشعار، اقتباس اور خطوط الگ الگ صفحات پر تحریر کیا کریں)

✠ **رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی** سے محفل میں شریک ہیں ''معذرت کہ میں بوجۂ علالت گزشتہ ماہ محفل میں حاضر نہ ہوسکا (اوہو۔۔۔ تو اب کیا حال ہے۔۔۔ اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے) جون 2016ء کا سسپنس 16 تاریخ کو مل گیا۔ اس دفعہ کا گیٹ اپ بہت عمدہ تھا، پس ورق بھی قابلِ داد تھا۔ البتہ فہرست بالکل سادہ۔ انشائیہ اس بار قابلِ فہم زبان میں تحریر کیا تھا اور تحریر معلوماتی بھی تھی۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ سونا رضوان صاحبہ کو مبارکباد، ان کا تبصرہ پسند آیا۔ محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ! میں الفاظ میں کنجوسی نہیں کرتا، بہت ضروری بات کو مختصر کر کے اس لیے لکھتا ہوں کہ دوسروں کو موقع ملے۔ تحریم شاہ تعجب ہے آپ کو میرا صرف نام اچھا لگا کام نہیں؟ نام میں کیا رکھا ہے کام دیکھیے یعنی تبصرہ پڑھیے، مختصر اور جامع! بہشت زار، یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ خود اپنے دام میں، ارے یہ کیا؟ مغل صاحب اپنے ٹریک سے ہٹ گئے۔ ان کا میدان تو رومان تھا، اب یکایک جرائم کی دنیا میں آگئے۔ کہانی اچھی تھی۔ شیش محل کی یہ قسط بہت ہی دبنگ تھی۔ خوب دھیمی پٹاس اور اٹھا پٹخ ہوئی، خوب لطف آیا۔ معمولی عورت مثبت جوش اور ولولہ بھر جائے تو یہ بڑے بڑے پہاڑ کی چوٹی سر کرلیتی ہے، ہوائی جہاز اڑا لیتی ہے۔ درحقیقت ملک صاحب کا اس دفعہ کا کیس بہت ہی ٹیکنیکل تھا، آخرکار ملک صاحب نے مجرم پر ہاتھ ڈال ہی دیا۔ ہمیں تو گمان بھی نہ تھا کہ ماں خود قاتل ہوگی۔ کہانی میں مزہ آگیا۔۔۔ پنچ ڈاؤن بہت ہی مختصر اور بہت اچھی کہانی۔ نہ سراغ رسانی نہ مار دھاڑ اور مجرم بھی گرفت میں آگیا، کیا خوب۔ ماروی کی یہ قسط پڑھتے ہوئے اس کے اختتام کا سوچ کر بہت دکھ ہوا۔ قرض کافی اثر انگیز اور سبق آموز تھی۔ تمکسار کا پلاٹ بالکل اچھوتا تھا، کہانی پسند آئی۔ مات ایسی کہانی لکھنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے اور عمر عبداللہ نے یہ معرکہ سر کرہی لیا۔ یہ اس مہینے کی بہترین کہانی ہے، وی اسٹوری آف منتھ۔۔۔ اشعار کی محفل میں احمد خان توحیدی کا شعر سرفہرست لگانا چاہیے تھا۔ اظہر حسین بچار اور محمد صفدر معاویہ کے اشعار دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہوتے تو اچھا تھا۔''

✠ **عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی، لاہور** سے چلے آرہے ہیں ''جون ایلیا کی اردو سے متعلق تحریر زبردست رہی بہت پسند آئی۔ آپ کے خط میں سونا رضوان کی مایوسی بھی ختم ہوئی اور ایک دم سے صدرِ محفل بن بیٹھیں۔ بہت بہت مبارک ہو جی۔ ویسے طاہرہ جی پنک کلر بھی لڑکیوں کو بہت پسند ہوتا ہے دیکھیے لیں اس دفعہ ٹائٹل گلابی گلابی ہورہا ہے۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ منگنی کی خیر مبارک جی اور ہم منگیتر کو بول دیں گے۔ سرورق میں آپ ہی آپ نظر آتی ہو۔۔۔ آپ کا بھرپور تبصرہ بہت پسند آیا، مبارک ہو۔ مرزا طاہر الدین نے بھی اچھا لکھا ہے۔ محمد صفدر معاویہ آپ تو سفر میں ہی مسرور رہتے ہیں بھی بوہڑ کی چھاؤں میں تھکاوٹ دور کرتے ہیں۔ رضوانہ قریشی نامہ بر کا جادو سر چڑھ کر بولے ہے۔۔۔ جے ڈی، پی اور قارئین میں ایک مقام بنالیا ہے۔ اب آپ کہانیوں پہ بھی کچھ تبصرہ کردیا کریں۔ بہت اچھا لگے گا۔ رانا بشیر احمد ایاز حیران تو آپ بھی ہورہے۔۔۔ ٹائٹل گرل کو دیکھ کے۔ نائس تبصرہ۔ اویس احمد اور احمد خان توحیدی ایک ساتھ اچھے لگے، روی حکمرانوں، سیاستدانوں کے وعدے تو وعدے رہے لیکن عوام بھی تو کوئی کردار ادا کرے نہ کہ یہ بس جلسے جلوسوں میں ہی شرکت کرنے کو رہ گئی ہے۔ انجم کمال کی رائے بھی اچھی لگی۔ ناہید یوسف نے تو واقعی حیران کردیا۔ ایسے لگا جیسے پرانی تبصرہ نگار ہوں۔ خوش آمدید۔ اشان، منظرنگاری اور پلاٹ، عمران جونانی تو تکنیکی ماہر لگتے ہیں۔ ویلڈن جناب۔ ثنا صادق آپ تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ امید ہے لکھتی رہیں گی۔ جذبۂ جنون جنید احمد ملک کی ہمت کو داد دیتے ہیں بہترین تبصرہ لکھا ہے اور جو دوست محفل میں شریک نہیں ہوسکے ان سب کو سلام اور جلدی تشریف لائیں۔ بہشت زار میں اسد اور جبار تو اپنے طور پر کچھ کرنہ سکے اور تیمرے حسن کے ملنے پر ان میں بھی ہمت آگئی اور پہنچ گئے جنت میں۔۔۔ دیکھو اب اور کیا کیا دیکھنے کو ملتا ہے بہشت زار میں۔۔۔؟ کافی دلچسپ لگ رہی ہے۔ شیش محل میں کوکے قتل ہونے پر اب جنگ شروع ہوگئی۔ اب بھرپور ایکشن دیکھنے کو ملے گا اور فاروق کی بے چینی سے لگ رہا ہے وہ بھی جلد بمبئی پہنچنے والا ہے۔ جوزفین نوابی اصولوں میں گھری دلچسپ لگ رہی ہے۔ یوں پوری شیش محل ہی دلچسپ ہورہی ہے۔ ایک چہرہ کئی روپ، عابی کی شکل میں تو اسپائیڈر مین مل گیا ہے، وہ بھی گیارہ برس کا حیرانی کی بات ہے۔ اچھل کود کے علاوہ عابی بالکل اپنے باپ پر گیا ہے اور آنے والی قسطوں میں بجو یہ ''ماروی'' کیا کیا رنگ دکھاتی ہے شدت سے انتظار ہے۔ درحقیقت بھی ایک طرح سے غیرت کے نام پر قتل تھا جو ایک ماں نے بیٹی کو مارنے کے لیے کیا اور اس کے اسباب رجو کے ماں باپ اور سسرالی بھی قصوروار ہیں جو ایک حوا کی بیٹی کو نہ سنبھال سکے۔ زندگی تو بہرحال گزر جائے گی۔ اس لیے انسان کی نظر آخرت کے ہمیشہ رہنے والے اصل قاعدے کی طرف ہونی چاہیے اور شایان صدیقی نے گانے بجانے کو مات دے کر راہِ ہدایت پر قدم رکھ دیا تھا جس سے انڈیا میں اسے صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور روحانہ کی دعائیں بھی رنگ لے آئیں۔ جرم چھوٹا ہو یا بڑا، ہوتا تو جرم ہی ہے نا اور جب اس کی پکڑ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے سارے حساب بے باک ہوجاتے ہیں اور پھر وہ اپنے ہی دام میں پھنستے چلے جاتے ہیں جیسے نادر اور وسیم کے ساتھ ہوا۔۔۔ سراغ رساں سے بڑھ کر تو جولیا اور ڈیانا بہت اچھی سراغ رساں ثابت ہوئیں۔ بس پیزا کھاؤ اور پنچ ڈاؤن۔۔۔ حضرت شاہ عبدالرحمٰن پاک مست ولی اللہ جن کی کرامات پر دل اش اش کراٹھے۔ دریا میں گرے تو کئی روز بعد زندہ و سلامت نکل آئے۔ دمدورام کے بھیجے سانپوں کا۔۔۔ سارا زہر کھینچ لیا۔ مخلوق کی خدمت پہ آئے تو بیلوں کی جگہ خود جت گئے اور کنوئیں سے پانی نکالا۔ اللہ کے ولی جب وجد ولایت کو پہنچتے ہیں تو بڑے بڑے کام اللہ کے حکم سے ہوجاتے ہیں تو پھر کیسے نہ ان کا نام روشن ہو جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی برگزیدہ ہستیوں میں شامل فرمائے۔ محفل شعر و سخن میں شوکت علی زخمی، معراج محبوب عباسی، انیلہ رشید سیال اور طلعت نظامی کا انتخاب بہت اچھا لگا جبکہ کترنوں میں ریاض بٹ فوجی بشیر اور اظہر حسین کا تعاون بہترین رہا۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

کامران احمد انصاری، راولپنڈی۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپورخاص۔ ارشاد بیگ، کراچی۔ خورشید عالم، لاہور۔ ثوبیہ ارشد، سیالکوٹ۔ زرمین نیازی، کوئٹہ۔ مہوش، ملتان۔ مدثر رضا، نواب شاہ۔ جہانزیب احمد، حیدرآباد۔ صفدر شاہ، اسلام آباد



بہشتِ زار

الیاس سیتاپوری

منگول قلعہ الموت کا رخ کرتے ہیں... تاریخ اسلام کے زبردست لوگ جو فدائی کہلاتے تھے اور جن سے بڑی بڑی طاقتیں خوفزدہ رہتی تھیں، ان کی داستان ... جن سے نہ تو مسلمان محفوظ تھے، نہ عیسائی .. .ان کی بہشتِ ارضی میں جنت کی آسائشیں اور نعمتیں یکجا کردی گئی تھیں۔ ایک لائق ترین انسان نے اپنی استطاعت، ذوق اور وسائل کو بروئے کار لاکر ایک ایسا نظام اور سامان مہیا کرکے اس کی مدد سے انسانی نفسیات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑا اور کام میں لیا ..... لیکن اس طلسم کو متمدن دنیا کی کوئی طاقت بھی نہ تو دبا سکی اور نہ ان کا مقابلہ کرسکی ان تمام معاملات کو وحشی جبلت کے چالاک اور ذہین منگولوں نے صفحہ ارض پر داستانِ پارینہ کی صورت رقم کردیا۔ تاریخ کا عجیب و غریب دور، ماضی کے انوکھے اور حیرت انگیز لوگوں کی کہانی

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



حسین لڑکی نے ان دونوں کو ایک برج میں پہنچا دیا۔ پتھروں کو تراش کر بنایا جانے والا یہ برج اندر سے بہت حسین تھا۔ یہاں سب کچھ سنگِ مرمر کا تھا۔ دودھ میں نہائے ہوئے اس ماحول میں سنگِ موسیٰ اور شنگرفی پتھر بھی کام میں لایا گیا تھا۔ یہ برج کافی بڑا تھا۔ اس میں تعیشاتِ زندگی کی ضروری چیزیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ شیشے کے آلاتِ مے کشی، اعلیٰ درجے کی شراب ایک چھوٹے سے حوض میں بھری ہوئی تھی۔ منقش کرسیاں، میز اور مسہری خوب صورت اور قیمتی قالین جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھا ہوا تھا اور اس میں کہیں بھی جوڑ نہیں تھا۔ دیواروں میں چھپے ہوئے نل، جن کی صرف ٹونٹیاں ہی نظر آتی تھیں۔ ان نلوں میں دودھ اور شہد شریانوں میں خون کی طرح رواں دواں تھے۔ برج کے اندر ہی کنارے کنارے موسمی پھولوں کے درخت لگے ہوئے تھے اور وہ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہاں سبزہ بھی تھا اور ایک جگہ چھوٹا سا آبشار بھی گر رہا تھا۔ جہاں یہ آبشار گرتا تھا، وہ ایک حوض تھا۔ حوض کا پانی دوبارہ آبشار میں واپس چلا جاتا تھا۔

حسین ترین لڑکی نے ان دونوں کو قالین پر بٹھا دیا اور خود چند غلاموں کو بلوا کر کھانے پینے کا سامان منگوایا۔ اس نے ان دونوں سے کہا۔ ''صاحبان! معاف کیجیے گا۔ یہ بہشتِ اعلیٰ ہے یہاں آگ کا کوئی کام نہیں اور جب آگ ہی نہ ہو تو کھانے کی تیاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں تمہیں جو کھانا کھلاؤں گی وہ جنت کا نہیں، کہیں اور کا پکا پکایا کھانا آپ دونوں کی خدمت میں پیش کروں گی۔''

''میں نہیں جانتا کہ یہاں آگ ہے یا نہیں اور کھانا کس طرح تیار کیا جائے گا اور پانی کی جگہ شراب کیوں پیش کی جائے گی۔'' جبار بولا۔

اسد کو یہاں کی خوشبو مدہوش کیے دے رہی تھی، سرشار آواز میں کہا۔ ''چاند کے ٹکڑے! اگر میں تجھ سے تیرا نام پوچھوں گا تو تُو یہی جواب دے گی کہ بہشت میں کسی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔''

جبار نے کہا۔ ''لڑکی! یہاں کیوں بھیجا گیا ہے ہم دونوں کو؟ ہمیں نہیں معلوم لیکن جب ذہن پر زور دیتے ہیں تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم دونوں بہشتِ اعلیٰ میں عیش کرنے آئے ہیں۔'' پھر لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

کچھ دیر بعد ہی زرق برق لباسوں میں ملبوس مہ پارے ان دونوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ جبار نے کہا۔ ''یہ تو ہوئیں میرے حصے کی حوریں، میرے ساتھی کے حصے کی کہاں چلی گئیں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''وہ بھی آرہی ہیں۔''

لڑکی کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پانچ حسین ترین لڑکیاں اور آگئیں۔ میزبان لڑکی نے اسد سے کہا۔ ''یہ تیرے حصے کی ہیں۔''

جبار نے ازراہِ شرارت میزبان لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور شوخ و شریر لہجے میں پوچھا۔ ''اور تو خود کس کے حصے کی ہے؟''

لڑکی نے بھی شوخ و شریر لہجے میں جواب دیا۔ ''جو بھی مجھے پسند کرلے۔''

جبار اور اسد نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ''ہم نے تجھے بھی پسند کیا۔''

اس کے بعد شوخی و شرارت آمیز جملوں کے تبادلے کا کھیل شروع ہوگیا۔ ان دونوں کو شرابیں پلائی گئیں مگر انہوں نے ہر کام نہایت سوجھ بوجھ اور ہوش مندی سے کیا کیونکہ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ انبساط اور موت کی حدیں ملی ہوئی ہیں اور ذرا سی غفلت یا بے پروائی انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دے گی۔ وہ دونوں یہ سوچ سوچ کر کوفت محسوس کررہے تھے کہ انہوں نے اس بہشت اور ان حوروں کے لیے خود کو کتنا گرالیا تھا اور کس طرح اپنی جان کی بازیاں لگادی تھیں۔ انہیں شیخ الجبال کی ذہانت پر حیرت تھی اور خباثت پر غصہ۔ ان کے لطف و انبساط کو شیخ الجبال کا خیال اور اس کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت اور کدورت بدمزہ کررہی تھی۔

جبار کو ذنوبیہ یاد آگئی، اس نے کہا۔ ''لڑکی! بہشتِ اعلیٰ کا مزہ ذنوبیہ کے بغیر پھیکا ہے۔ اگر تو بہشتِ عام اور بہشتِ اعلیٰ میں آباد اور موجود حوروں میں ذنوبیہ کو ڈھونڈ نکالے تو میں تیرا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔''

میزبان لڑکی نے جواب دیا۔ ''میں تیرا یہ کام کرسکتی ہوں لیکن یہاں کسی کو نام سے نہیں پکارا جاتا۔ یہاں حوریں رہتی ہیں۔ عورتیں یا ارضی لڑکیاں نہیں، جن کے نام ہوتے اور پتے ہوتے ہیں۔ اگر ذنوبیہ کے چہرے کی بعض اہم علامات اور نشانات کی بابت کچھ معلوم ہو تو ہمیں بتاؤ، ہم اسے بھی تلاش کرالیں گے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''اس کے گلے پر ایک تل ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی مگر سرمگیں۔ پیشانی پر بائیں جانب ہلکا سا چوٹ کا نشان۔ جب وہ ہنستی ہے تو اس کے ساتھ پوری کائنات ہنسنے لگتی ہے۔ اس کی آواز میں موسیقی کی کھنک

ہے۔ اس کی چال میں وقار ہے اور کیف ومستی بھی، نہ ہر وقت سوئی سوئی سی لگتی ہے۔ وہ رقص کی ماہر ہے اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پوری بہشت میں اس جیسی رقاصہ ایک لڑکی یا حور بھی نہ ہوگی۔''

جبار ازخود رفتہ ہوتا جارہا تھا۔ میزبان لڑکی اپنے حافظے پر زور دے رہی تھی کہ اس نے اس حلیے کی لڑکی کہیں دیکھی بھی ہے یا نہیں۔ بظاہر دونوں نشے میں مست و مدہوش ہوگئے۔ حوروں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر کنارہ کشی اختیار کی۔ اس دوران میزبان لڑکی نے دوسری لڑکیوں سے پوچھا۔''کیا تم نے کسی ذنوبیہ نام کی لڑکی کو دیکھا ہے کہیں؟''

ایک لڑکی نے کہا۔''طاہرہ! یہ کیا غلطی کررہی ہو؟ اس کا نام لے رہی ہو، اگر ان دونوں میں سے کوئی ہوش میں ہوا تو؟''

میزبان لڑکی کا نام طاہرہ تھا، اس نے ہنس کر جواب دیا۔''تو مجھ کو تو نام لینے سے روک رہی ہے اور خود میرا نام لے رہی ہے۔''

لڑکی نے کھسیا کر منہ چھپالیا اور دبی دبی ہنسی میں کہا۔''میری توبہ! کیا غلطی کردی میں نے۔''

ایک اور لڑکی نے میزبان لڑکی طاہرہ سے پوچھا۔''کیا یہ دونوں مدہوش ہوچکے ہیں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔''خوب اچھی طرح۔ ابھی کئی گھنٹے تک ہوش میں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

ایک لڑکی نے کہا۔''میں ذنوبیہ نامی لڑکی سے واقف ہوں لیکن وہ یہاں نہیں ہے وہ بہشتِ عام میں رہتی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ کہاں سے لائی گئی ہے۔ نیہ میں مقیم ایل خانی لشکر میں ایک مسلمان تاجر ذنوبیہ کو اصفہان لیے جارہا تھا، یہ اس کی لونڈی تھی۔ مسلمان تاجر اس کو بیچنا چاہتا تھا۔ اسی تاجر کے پاس ایک نوجوان غلام جبار تھا۔ خاصا خوب صورت مگر جنونی، ذنوبیہ جبار کو پسند آگئی تھی۔ شیخ الجبال کے آدمی تو ایسوں کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ ذنوبیہ کو اغوا کرلائے اور اسے بہشتِ عام میں داخل کردیا اور بعد میں جبار کو بھی بہشت عام میں داخل کرکے ذنوبیہ سے ملوادیا۔ حسب دستور چند دنوں بعد جبار کو بہشت سے نکال دیا گیا اور شیخ الجبال نے اس کے ذمے ہلاکو خان کا قتل کردیا۔ شاید یہ نوجوان اسی ذنوبیہ کا ذکر کررہا ہوگا۔''

اس مختصر داستان نے ہر لڑکی کو چوکنا کردیا۔ طاہرہ ضرورت سے زیادہ حیران ہوئی، اس کی اس حیرانی میں پریشانی بھی شامل تھی۔ اس نے پوچھا۔''تجھ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائیں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔''کچھ تو ذنوبیہ نے بتائی تھیں اور کچھ شیخ الجبال کے ان کارندوں نے جنہوں نے جبار کو بہشت میں پہنچایا تھا۔''

طاہرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔''غور طلب بات یہ ہے کہ یہ نوجوان جو ذنوبیہ کو پوچھ رہا ہے، کون ہے؟''

لڑکی نے پوچھا۔''ان دونوں کو یہاں تک پہنچایا کس نے؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔''پتا نہیں، انہیں یہاں تک کس نے پہنچایا ہے۔ بظاہر تو یہ دونوں یکے بعد دیگرے آگے پیچھے یہاں تک آئے ہیں۔''

لڑکی نے طاہرہ کو متنبہ کیا۔''میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دے رہی ہوں کہ اس نوجوان کی تفتیش اور تحقیق بہت زیادہ ہوشیاری سے کی جائے۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آرہی ہے اس میں۔''

جبار اور اسد ان کی باتیں سن سن کر خوفزدہ ہورہے تھے۔ اسد نے جبار کے کان سے منہ بھڑادیا، بولا۔''استاد! خطرہ۔ سنگین خطرہ۔ کچھ سوچو ورنہ گئے ہم دونوں اس جہان سے۔ اب کیا ہوگا؟''

جبار نے ہنس کر جواب دیا۔''وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔''

اسد نے اصرار کیا۔''تم معاملے کی نزاکت اور اس کے خطرناک پہلو پر غور نہیں کررہے ہو شاید۔ ورنہ اس طرح مسکرا کر جواب نہ دیتے۔''

جبار نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔''ادھر دیکھو۔ اس طرف۔ لڑکیاں ہم پر غور کررہی ہیں۔ انہیں کسی قسم کا شبہ ہوگیا ہے ہم دونوں پر، اب ہمیں کچھ دیر کے لیے چپ ہوجانا چاہیے۔''

دونوں مدہوشی کی اداکاری کرکے بے سدھ پڑ رہے۔ کئی لڑکیاں ان دونوں کے پاس آئیں، ان پر جھکیں اور ان کا جائزہ لیا مگر مدہوش سمجھ کر واپس چلی گئیں۔ سب سے آخر میں طاہرہ گئی اور جاتے جاتے برج کو باہر سے مقفل کردیا۔

ان کے جاتے ہی جبار اٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔''دوست! بات تو بہت بری ہوگئی مگر اس میں ایک بات خوشی کی بھی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی ساری باتیں ہم نے سن لیں۔ اگر ہم یہ باتیں نہ سنتے تو معلوم نہیں لاعلمی میں کیا کچھ ہوجاتا۔''

اسد نے پوچھا۔''اب جو کچھ ہونے والا ہے، اس کی بابت بھی کچھ سوچا ہے تم نے؟''

جبار نے بے پروائی سے جواب دیا۔''اس پر بھی غور کرلوں گا۔ جلدی کس بات کی ہے۔''

اسد نے ہنس کر مبارکباد دی، بولا۔''بہرحال خوشی

کی بات یہ ہے کہ تمہیں ذنوبیہ مل گئی۔''
جبار نے جواب دیا۔ ''میں بہت خوش ہوں، اچانک خوشی مل جانے سے میرے نشے میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔''
اسد کو اپنا گھر یاد آنے لگا۔ دونوں بڑی دیر تک اپنے موجودہ حالات پر غور کرتے رہے۔ غور کرتے کرتے جب وہ دونوں بہشت کی طرف آتے تو واقعی پریشان ہو جاتے۔ بعد میں وہ دونوں اس تیرہ و تار جگہ کو ترستے اور یہاں دوبارہ آنا تک نصیب نہیں ہوتا۔
ان دونوں نے اٹھ کر اور چل پھر کر اس برج کا جائزہ لیا۔ یہاں کی بلندی سے سامنے کا نظارہ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہاں سے بڑی احتیاط کے ساتھ مرغزاروں اور باغوں کا مشاہدہ کیا۔ برج کے نیچے رواں دواں حوریں کٹھ پتلی معلوم ہو رہی تھیں۔ باہر کے نظارے سے فارغ ہونے کے بعد ان دونوں نے برج کی اشیا کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہاں کی ہر چیز باہر کی دنیا سے مختلف اور نرالی تھی۔
جبار نے ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جی چاہتا ہے یہ ساری چیزیں یہاں سے اٹھا لے چلوں۔''
اسد نے اسے سمجھایا۔ ''یار! یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ کوئی سنے تو کیا کہے؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''مجھے ذنوبیہ سے ملنے کی خوشی نے پاگل کر دیا ہے۔''
اسد نے کہا۔ ''میں بری بات اپنے منہ سے نکالنا نہیں چاہتا ورنہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری یہ خوشی عارضی اور خطرناک ہو سکتی ہے۔ بہشت کی لڑکیاں تم دونوں کی داستانِ معاشقہ سے واقف ہیں اور یہ امکان پیدا ہو چکا ہے کہ تمہارے بارے میں چھان بین کی جائے۔ یہ وقت خوشی سے پاگل ہو جانے کا نہیں۔ عقل اور ہوش و حواس سے کام لینے کا ہے۔''
جبار نے منہ بنایا۔ کاندھے اچکائے اور سر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''دوست اسد! میں تیری باتیں سمجھ رہا ہوں لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ قسمت میرا ساتھ دے رہی ہے۔ خدا مجھ پر مہربان ہے۔ اللہ نے چاہا تو واپسی میں ذنوبیہ میرے ساتھ ہوگی اور میں بہشت سے نکل کر پہلا کام یہ کروں گا کہ شیخ الجبال کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔''
اسد چونک کر بولا۔ ''شیخ الجبال کی اینٹ سے اینٹ تم کس طرح بجا دو گے بھلا؟''
جبار نے جواب دیا۔ ''میں اس تدبیر سے واقف ہوں اسد! تو یقین کر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہی ہوگا۔''
اسد نے باہر کسی کی آہٹ محسوس کی۔ گھبرا کر بولا۔ ''دوست! کوئی آ رہا ہے، مدہوش ہو جاؤ۔''
جبار فوراً ہی مدہوش ہو گیا اور اسد بھی نشے میں دھت، اپنے منہ سے رال گرانے لگا۔ کچھ دیر بعد طاہرہ تنہا اندر داخل ہوئی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی ان دونوں کا جائزہ لیا۔ باری باری دونوں کو جھک کر دیکھا، اسد کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور پوچھا۔ ''تیرا کیا حال ہے؟ میں تجھ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ چند حوریں باریابی کی منتظر کھڑی ہیں۔''
اسد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور مدہوش رہا۔ طاہرہ نے اس کی باچھوں سے بہتی ہوئی رال کو دیکھا اور مسکرانے لگی۔ ''خدا تجھ پر رحم کرے، اس وقت تو تو مُردوں سے بھی بدتر ہے۔''
اسد کو چھوڑ کر وہ جبار کے قریب گئی اور اسے بھی جھنجھوڑ کر مخاطب کیا۔ ''اور یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اٹھ اور ان حوروں سے ملاقات کر جو اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں۔''
لیکن جبار کی طرف سے بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ طاہرہ نے اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا، بولی۔ ''تم لوگ اتنی زیادہ کیوں پی جاتے ہو کہ پھر اپنی ان حوروں کا بھی ہوش نہیں رہتا جو برسوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''
جبار نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ طاہرہ نے آہستہ سے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ان دونوں کو کچھ خبر نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''
طاہرہ چپ چاپ برج کے باہر گئی اور وہاں سے ایک شخص کو لے کر واپس آ گئی۔ یہ پچیس چھبیس سالہ تنومند خوب صورت نوجوان دبے قدموں اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے طاہرہ سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا تم نے اچھی طرح اس بات کا اطمینان کر لیا ہے کہ یہ دونوں نشے میں مدہوش ہو چکے ہیں؟''
طاہرہ نے جواب دیا۔ ''خوب اچھی طرح۔ میں نے ان دونوں کو حوروں کا لالچ دیا مگر ان دونوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر یہ ہوش میں ہوتے تو حوروں کی طمع میں خاموش نہ رہ سکتے تھے۔''
یہ نوجوان پہلے تو اسد کے پاس کھڑے ہو کر اس کی صورت دیکھتا اور پہچاننے کی کوشش کرتا رہا مگر نہیں پہچان سکا، بولا۔ ''میں نے اس نوجوان کو پہلے کہیں یا کبھی نہیں دیکھا اور جو نوجوان میرے ذریعے اس بہشت زار میں داخل ہوئے ہیں، ان میں یہ نوجوان شامل نہیں رہا ہے۔''
طاہرہ نے جبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور یہ نوجوان ...... اسے بھی غور سے دیکھنا۔''

نوجوان جبار کی طرف چلا گیا اور اس کو بغور دیکھ کر بولا۔ ''ہاں اس نوجوان کو میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔''

طاہرہ گھبرا کر بولی۔ ''یعنی اس کو پہلے بھی تم کہیں دیکھ چکے ہو؟''

نوجوان جبار کو برابر غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے کرب سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ یاد آنے اور کچھ یاد نہ آنے کے کرب میں مبتلا ہے۔ اس نے بمشکل جواب دیا۔ ''میں نے اس کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔''

طاہرہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اگر اس کو تم نے کہیں واقعی دیکھا ہے تو اپنے ذہن اور حافظے پر زور دے کر بتاؤ کہ کہاں دیکھا ہے؟ یہ بہت ضروری ہے۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''سردست میں تم سے ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔''

طاہرہ نے پوچھا۔ ''کون سی بات؟ پوچھو، تکلف کیوں؟''

نوجوان نے کہا۔ ''ان دونوں کو یہاں لایا کون ہے؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں۔ یہ دونوں میرے پاس تو تنہا آئے تھے، آگے پیچھے...... پہلے یہ آیا تھا، اس کے کچھ دیر بعد یہ دوسرا اس کا ساتھی۔''

نوجوان نے تشویش ظاہر کی۔ ''طاہرہ جی! میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں ہی مشتبہ نوجوان ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کے بارے میں جستجو کروں اور انہیں بے نقاب کر دوں۔''

نوجوان وہاں سے جانے لگا تو طاہرہ نے اس سے درخواست کردی۔ ''عزیز من! میں نے اس نوجوان کی زبان سے کسی ذنوبیہ کا نام کئی بار سنا ہے، میرا خیال ہے اگر ذنوبیہ کے پاس لے جا کر تحقیق کی جائے تو ان کی بابت کچھ کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان دونوں کو یہاں تک لایا کون ہے؟ اگر میرے اس سوال کا کسی نے جواب دے دیا تو میں شیخ الجبال کو بہت کچھ بتا سکوں گا۔''

وہ نوجوان چلا گیا۔ طاہرہ اسی برج میں رہی، ان دونوں کے پاس۔ اسد اور جبار ان کی باتیں سن چکے تھے۔ وہ دونوں دیر تک پڑے رہے۔ کئی گھنٹے بعد جب ان دونوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب مزید مدہوشی بے کار ہے تو وہ ہوش میں آنے لگے۔

☆☆☆

وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اسد کا خیال تھا کہ اب وہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ جبار کو بار بار یہی مشورے دے رہا تھا۔ ''دوست! جتنی بھی جلد ممکن ہو سکے، یہاں سے نکل بھاگو۔ ہماری تحقیقات شروع ہو چکی ہے۔ میں نے تو یہاں تک سن رکھا ہے کہ یہ تحقیقات کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔ وہ ہم پر اعتبار نہیں کرتے لیکن ہمیں اعتماد میں لے کر کسی نہ کسی دن ہمیں ذلیل و رسوا کر دیں گے۔''

اسد نے جبار سے کہا۔ ''دوست! میری ایک بات کا جواب دو۔ ہمیں بہشت زار کا راستہ اتفاقیہ معلوم ہو گیا ہے، شاید ہم جاننا بھی یہی چاہتے ہیں۔''

جبار نے چشم نم پوچھا۔ ''کیا ذنوبیہ ہمیں مل جائے گی؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''ضرور مل جائے گی لیکن خدا کے لیے جو کچھ بھی کرنا ہے، جلد از جلد کر ڈالو۔ خطرے کی تلوار ہمارے سروں پر مستقل لٹک رہی ہے۔''

جبار نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کافی فاصلے پر کچھ نوجوان چند حوروں کے ساتھ ہنسی مذاق اور چہل قدمی میں مصروف تھے۔ جبار نے مسکرا کر منہ پھیر لیا، بولا۔ ''جنت والوں کی سمجھ میں یہ نکتہ کیوں نہیں آتا کہ حوروں سے ان کا ہمہ وقت کا ساتھ ان کی صحتیں اور ان کی تندرستیوں کو برباد کر دے گا۔''

یہ دونوں ان لڑکیوں کی طرف چل دیے۔ اسد نے کہا۔ ''مگر میں یہ سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاؤں گا کہ......''

جبار نے مسکرا کر کہا۔ ''دیوانہ بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سارے کام یوں ہی ہو جائیں گے۔''

اچانک ایک جھاڑی سے چند لڑکیاں نکلیں اور تیز تیز قدموں سے چل کر ان دونوں کے پاس پہنچیں۔ اسد اور جبار ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی نے اسد کو زور کا دھکا دیا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا نیچے جبار کے قدموں میں گر گیا۔ جبار نے اس کو سنبھالا تو دھکا دینے والی لڑکی ان دونوں کے بیچ میں آ گئی، جبار سے بولی۔ ''نوجوان! چند لمحے، چند سوال۔ براہِ کرم توجہ!''

جبار نے اکڑ کر جواب دیا۔ ''اجازت ہے۔ تو سوال کر سکتی ہے۔''

لڑکی نے عرض کیا۔ ''تم دونوں نوجوان ہو، مرد ہو۔ یہاں تم دونوں کے جوہر کھل جائیں گے۔''

جبار نے سوچا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟''

لڑکی نے مزید کہا۔ ''ساکنانِ جنت ایک بات جاننا چاہتے ہیں۔ ایک سوال، ایک استعجابیہ اور ایک سوال ہر

ایک کے دل و دماغ میں موجود اسے تنگ کر رہا ہے۔ براہ کرم اس الجھن کو دور کر دو۔''

جبار نے سختی سے کہا۔''وقت نہ برباد کر لڑکی، سب کچھ صاف صاف بتا دے۔''

لڑکی نے پوچھا۔''ساکنانِ بہشت زار یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جنت میں دو مردوں کے درمیان دوستی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہاں پر تو حوروں سے دوستی ہوتی ہے مگر تم دونوں مرد ہو اور تم دونوں میں دانت کاٹی دوستی ہے، آخر کیوں؟ کیا اس الجھن کا جواب مل جائے گا ہمیں؟''

جبار نے درشت لہجے میں کہا۔''لڑکی! مجھے آدابِ جنت کو بالائے طاق رکھنا پڑ رہا ہے۔ میرے پاس تیرے سوال کا کوئی جواب نہیں۔''

لڑکی نے اسی اکڑ سے کہا۔''اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میری ہی طرح دوسری بہت ساری لڑکیاں تمہیں گھیر لیں گی اور تم سے اس سوال کا جواب مانگیں گی۔''

جبار نے جواب دیا۔''میں انہیں بھی یہی جواب دوں گا۔''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں، ایک نے کہا۔''پانی نشیب میں مر رہا ہے۔''

اسد نے جبار کے کان میں کہا۔''بات نہ بڑھاؤ جبار۔ یہاں سے بھاگ چلو۔ یہ کسی بڑے مسئلے کی تمہید معلوم ہوتی ہے۔''

یہ بات جبار کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ اس نے اسد کا ہاتھ پکڑ لیا اور لڑکیوں کا حصار توڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ جلد از جلد اس برج میں پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں طاہرہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب یہ دونوں برج کے دروازے پر پہنچ گئے تو انہیں کسی کے ساتھ طاہرہ کے بات کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اسد نے جبار سے سرگوشی میں کہا۔''سنو اور غور سے سنو کہ اندر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔''

جبار نے بڑی کوشش کی کہ اندر کی باتیں سن لے مگر ناکام رہا کیونکہ وہاں بھی سرگوشی میں باتیں کی جا رہی تھیں۔ آخر دونوں ایک ساتھ برج میں داخل ہوئے۔ یہاں طاہرہ دو ادھیڑ عمر خوب صورت اجنبی مردوں سے باتیں کر رہی تھی۔ ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر سبھی پریشان ہو گئے لیکن ہر کسی کی کوشش یہی تھی کہ اس پریشانی کے آثار چہروں پر نمودار نہ ہوں۔

طاہرہ کھڑی ہو گئی اور جبار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔''نوجوان! میں نے ذنوبیہ کو تلاش کر لیا ہے۔ وہ بہشتِ عام میں موجود ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے یہیں بلوا لیا جائے کیونکہ تمہیں بہشتِ اعلیٰ سے وہاں نہیں بھیجا جا سکتا۔''

جبار نے جواب دیا۔''اس کو فوراً بلوا لیا جائے۔''

طاہرہ نے مزید کہا۔''ذنوبیہ کو تمہاری وجہ سے یہ اعلیٰ مقام مل رہا ہے، وہ خوش قسمت ہے۔''

جبار نے جواب دیا۔''پھر میں اس سلسلے میں کس کا شکریہ ادا کروں، تیرا یا شیخ الجبال کا؟''

طاہرہ نے کہا۔''کسی کا بھی نہیں کیونکہ تمہیں جو کچھ بھی ملے گا تمہاری خدمات اور تقویٰ کے صلے میں ملے گا۔''

جبار نے سوچا طاہرہ نے پہلے تو کبھی اتنی باتیں نہیں کی تھیں پھر یہ اس وقت اس کو کیا ہو گیا ہے پھر جس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا تھا اسی طرح اچانک اس کا جواب بھی مل گیا۔ اس نے دونوں مردوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی شاید طاہرہ اس کو باتوں میں لگا کر دونوں مردوں کو یہ موقع فراہم کر رہی تھی کہ وہ جبار کو اچھی طرح دیکھ کر اس کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کریں۔ جبار نے اسد سے کہا۔''اسد! تم ان دونوں مردوں سے باتیں کرو، شاید یہ دونوں ہم ہی سے ملنے آئے ہیں۔ ان کے چہروں پر موجود سوالات ہمیں یہی بتاتے ہیں، آگے اللہ جانے۔''

اسد فوراً ان دونوں مردوں سے گھل مل گیا۔ جبار نے طاہرہ سے پوچھا۔''طاہرہ! تو میرے ایک سوال کا جواب دے۔''

طاہرہ نے سوالیہ نظروں سے جبار کو دیکھا مگر سوال نہیں کیا۔

جبار نے پوچھا۔''طاہرہ! کیا تو اس بہشت میں خوش ہے؟''

اس سوال نے سبھی کو چونکا دیا۔ طاہرہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ دونوں مرد بھی جبار کو گھور رہے تھے۔

جبار نے کہا۔''طاہرہ! تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا تو اس بہشت میں خوش ہے؟''

طاہرہ برہم ہو گئی۔ جبار کو دھکا دے کر دور کر دیا، بولی۔''نوجوان! یہ تو طاہرہ کس کو کہہ رہا ہے؟ میرا نام طاہرہ نہیں ہے اور اگر تو سمجھتا ہے کہ میرا نام طاہرہ ہے تو، تو ایسا کیوں سمجھتا ہے اور تجھے یہ بات کس نے بتائی؟''

جبار نے جواب دیا۔''میں خوب جانتا ہوں کہ تیرا نام طاہرہ ہے۔ میں ایک روحانی انسان ہوں۔ خدا نے مجھے روحانی قوت دے رکھی ہے اور جب میں اس قسم کی بات کرتا ہوں تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے، وہ یہ کہ میرے

رب نے مجھے غیب کی بات بتادی۔''

طاہرہ نے سختی سے انکار کیا۔ ''لیکن میں کہتی ہوں کہ میرا نام طاہرہ نہیں ہے۔ رہا تیرا دوسرا سوال کہ کیا میں اس بہشت میں خوش ہوں تو میرے پاس تیری یاوہ گوئی کا ایک ہی جواب ہے، بھلا بہشت میں رہ کر بھی کوئی شخص ناخوش یا ملول ہوسکتا ہے؟''

جبار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تیرا غصہ اور تیری اضطراری حالت مجھے یہ بتارہی ہے کہ تو حور کے علاوہ بھی کچھ ہے کیونکہ بہشت میں غم وغصہ اور اضطرار اور اضطراب کا کیا کام۔ یہ چیزیں اور یہ اوصاف وخصائص دنیاوی اور بشری ہیں۔''

طاہرہ جبار سے پریشان ہورہی تھی۔ اس نے دونوں مردوں سے پوچھا۔ ''تم دونوں کو کچھ ملا یا نہیں؟''

دونوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ''ملا، خوب ملا۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے پھر کبھی کسی دن بتاؤں گا۔''

طاہرہ نے ان دونوں مردوں سے کہا۔ ''آپ دونوں جانا چاہیں تو چلے جائیں۔''

دونوں مرد گویا اجازت کے منتظر ہی تھے، فوراً چلے گئے۔

جبار نے طاہرہ کو چھوڑ دیا، بولا۔ ''طاہرہ! میں پھر کسی وقت تجھ سے بات کروں گا اس وقت تو بہت جذباتی ہورہی ہے۔''

طاہرہ کانپ رہی تھی، خوشامدانہ لہجے میں بولی۔ ''نوجوان! تو خدا کے لیے مجھے طاہرہ نہ کہہ۔ تو نے ان دونوں مردوں کے سامنے طاہرہ کہہ کر بہت ہی برا کیا۔ ہوسکتا ہے تیری اس بات سے میں کسی قسم کی سزا پاجاؤں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیوں؟ یہ سزا کیوں؟ تو نے ایسی کون سی بات کردی کہ تو سزا کی مستحق قرار دی جائے؟''

طاہرہ نے کہا۔ ''تو بار بار مجھے طاہرہ کہہ رہا ہے حالانکہ میں تجھ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میرا کوئی نام نہیں۔ میں طاہرہ نہیں ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''میری یہ شکایت شیخ الجبال کو پہنچادی جائے گی۔ وہاں سے جو سزا تجویز ہوگی، میں اسے بھگتنے کی پابند ہوں گی۔''

جبار نے طاہرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسد کو لے کر برج کے ایک گوشے میں چلا گیا اور زور سے طاہرہ سے کہا۔ ''حوریں حاضر کی جائیں۔ فوراً اسی وقت...... اسی لمحے۔''

طاہرہ نے آہستہ آہستہ تالی بجائی، کئی عورتیں اور غلمان ایک ساتھ حاضر ہوگئے۔

طاہرہ نے ان سے کہا۔ ''اس نوجوان کے حصے کی حوریں حاضر کی جائیں۔''

اسد نے طاہرہ سے کہا۔ ''طاہرہ بی بی! آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ میرے لیے میرے حصے کی حوریں نہیں بلوائی گئیں؟''

طاہرہ کو ایک بار پھر تالی بجانا پڑی اور جب عورتیں اور غلمان حاضر ہوئے تو انہیں پھر وہی حکم دیا گیا کہ دوسرے نوجوان کے حصے کی حوریں بھی حاضر کی جائیں۔ عورتیں اور غلمان پھر واپس چلے گئے اور انہوں نے اسد کے حصے کی حوریں روانہ کردیں۔

اسد نے اپنے حصے کی حوروں کو لیا اور برج کے دوسرے گوشے میں ان کے درمیان بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنے لگا۔ جبار کن انکھیوں سے طاہرہ کی حالت پر غور کررہا تھا۔ وہ ملول اور غمزدہ سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ جبار نے اس کو آواز دی۔ ''طاہرہ! میرے پاس آجا۔ تو وہاں اتنی دور کیوں بیٹھی ہے؟''

طاہرہ بے چون وچرا اٹھ کر جبار کے پاس چلی گئی اور اس سے درخواست کی۔ ''نوجوان! کیا تو طاہرہ طاہرہ کی رٹ سے باز نہیں آئے گا۔ آخر تو چاہتا کیا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''جس بات کو میں حق اور سچ سمجھ رہا ہوں، اس سے کیوں باز آجاؤں؟'' پھر ایک سوال کیا۔ ''اور طاہرہ! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو میرے حصے کی حور ہے یا نہیں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''میں کس کے حصے کی حور ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ جو جنتی مجھ کو اپنے پاس بلائے گا، میں اس کے پاس جانے کی پابند ہوں۔''

جبار نے کہا۔ ''تب پھر میں نے تجھے بلالیا اور میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے کہیں اور نہ جانا۔''

جبار نے بہشتی میووں سے دل بہلانا شروع کردیا۔ اس کے آگے خشک میوے کا ڈھیر تھا۔ وہ خشک میوہ کھائے جارہا تھا اور طاہرہ سے باتیں کرتا جارہا تھا۔ اس نے حوروں کو حکم دیا۔ ''حورو! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ طاہرہ کا دل بہلاؤ، یہ آج ملول اور غمزدہ نظر آرہی ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟''

طاہرہ چیخ پڑی۔ ''تم خدا کے لیے مجھے طاہرہ نہ کہو، ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی۔''

جبار سہم گیا، آہستہ سے کہا۔ ''اچھا، اگر تیری یہی خواہش ہے کہ تیرا نام نہ لیا جائے تو میں آئندہ تیرا نام نہیں

لوں گا اور تیرا دکھ درد دور ہو جائے گا۔"

حوروں نے طاہرہ کی طرف جام بڑھائے، طاہرہ نے یکے بعد دیگرے کئی جام چڑھا لیے اور پھر ہنس ہنس کر اصرار کرنے لگی کہ جبار بھی شراب پیے۔ جبار نے بھی شراب پی مگر بہت کم کیونکہ اس کو یہ بات معلوم تھی کہ شراب عام تو ہے مگر اس عام شے کو بہت زیادہ پی کر وہ مست و سرشار اور مدہوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے دور برج کے مخالف گوشے میں اسد کو مے نوشی میں مشغول دیکھا۔

کچھ دیر بعد معلوم نہیں کیا سوچ کر جبار نے حوروں کو حکم دیا۔ "تم سب کچھ دیر کے لیے دفع ہو جاؤ۔"

حکم کی بندی حوریں اٹھ کر گئیں تو ان کے ساتھ طاہرہ بھی چلی مگر طاہرہ کو جبار نے روک لیا۔ "میں نے تجھ کو جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔"

طاہرہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے جبار کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر سناٹا طاری رہا۔ جبار کی نظریں طاہرہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں مگر خود طاہرہ سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ جبار سے نظریں چرا رہی تھی، آنکھیں ملاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ اس سکوت کو جبار ہی نے توڑا۔ بولا۔ "طاہرہ! تو چپ کیوں ہے؟ کیا مجھ سے واقعی ناراض ہو گئی ہے؟"

طاہرہ نے جواب دیا۔ "میں کیا کہوں؟ کچھ کہتے نہیں بنتا۔"

جبار نے طاہرہ کو گھورا۔ "طاہرہ! اداکاری کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں اس جنت کی بات کرتا ہوں تو یہ جانتے ہوئے کرتا ہوں کہ یہ سب ذہین ترین لوگوں کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

طاہرہ نے حیرت سے پوچھا۔ "تو تمہیں اس جنت کی بابت کیا کچھ معلوم ہے؟"

جبار نے جواب دیا۔ "یہ کہ یہ جنت سادہ لوح سیدھے سادے نوجوانوں کو بے وقوف بنا کر ان سے کام لینے کے لیے بنائی گئی ہے۔"

طاہرہ نے سہم کر پوچھا۔ "میں پوچھتی ہوں کہ تم دونوں ہو کون؟"

جبار نے جواب دیا۔ "ہمارا کوئی خاص تعارف نہیں۔ اگر دو چار لڑکیاں ہمارا ساتھ دے دیں تو ہم انہیں اس جنت ارضی سے کہیں اور پہنچا سکتے ہیں۔ ذرا سوچو تو طاہرہ! کتنی اذیت ناک اور سوہانِ روح بات ہے کہ ایک شخص یا چند آدمی اپنے مطلب کے لیے جوانی بھر خوب صورت لڑکیوں کو گناہ و معصیت کی راہ پر چلاتے رہیں۔"

طاہرہ نے جبار کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا، خاموش ہو گئی۔ دوسری طرف اسد اس بات پر حیران اور فکرمند ہو رہا تھا کہ جبار کے پاس سے حوریں کیوں اور کہاں چلی گئیں؟ وہ جبار کے اس تغیر کا سبب معلوم کرنے آیا تو طاہرہ نے اسد سے پوچھا۔ "کیا تو بھی اس بہشتِ ارضی میں بن بلایا مہمان ہے؟"

اسد نے جبار کی طرف دیکھا۔ جبار مسکرا رہا تھا۔ اسد نے جبار سے پوچھا۔ "طاہرہ کیا کہہ رہی ہے؟"

جبار نے جواب دیا۔ "میں نے طاہرہ کو بتا دیا ہے کہ ہم یہاں بن بلائے مہمان ہیں اور یہاں کی مظلوم اور چاند جیسی نورانی اور حسین لڑکیوں کو اس قعرِ مذلت سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔"

اسد نے آہستہ سے کہا۔ "بہرحال تم نے طاہرہ کو جو کچھ بتایا ہے، وہ اچھا نہیں کیا۔ یہ بہت برا ہوا۔" پوچھا۔ "حوروں کو کیوں چلتا کر دیا؟" پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔ "شاید اس لیے کہ اب تمہیں ان لڑکیوں پر رحم آنے لگا ہوگا۔"

جبار نے جواب دیا۔ "بے شک، مجھے ان پر رحم آنے لگا ہے۔"

طاہرہ یہ کہہ کر باہر چلی گئی۔ "میں کچھ دیر میں واپس آجاؤں گی۔"

اسد طاہرہ کے پیچھے پیچھے گیا اور پھر اسے جاتا ہوا دیکھ کر واپس آ گیا۔ اس وقت وہ جبار سے بہت ناخوش تھا۔ وہ واپس آ کر کچھ دیر کھڑا خشمگیں نظروں سے جبار کو گھورتا رہا پھر اچانک سوال کیا۔ "جبار! میں چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم ان کے جواب دو گے؟"

جبار نے بےپروائی سے جواب دیا۔ "کرو سوال، میں جواب ضرور دوں گا۔ اگر تمہارے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ میں لاجواب ہو گیا۔ میں اس سوال کا جواب بعد میں بھی دینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

اسد نے نہایت تلخ لہجے میں پوچھا۔ "تم نے طاہرہ کو سب کچھ کیوں بتا دیا؟"

جبار نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ عنقریب اس کو سب کچھ دوسرے ذرائع سے معلوم ہو جائے گا۔"

اسد نے کہا۔ "اگر سب کچھ طاہرہ کو دوسرے ذریعے سے معلوم ہونے والا تھا تو ہم اسے دھندلا سکتے تھے۔"

جبار نے کہا۔ ''نہیں، ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ ہمیں ان حالات میں یہاں اپنے حمایتی پیدا کرنے ہیں۔''

اسد نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''کیا تم کو یقین ہے کہ تم یہاں اپنے حمایتی پیدا کرلو گے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں پیدا کرلوں گا۔ ضرور پیدا کرلوں گا۔''

اسد نے کہا۔ ''اگر ہم دونوں کا اتحاد ٹوٹ جانے سے ہمیں کسی خطرے کا احساس نہ ہوتا تو میں نے اسی وقت تم سے علیحدگی اختیار کرلی ہوتی۔''

جبار نے ایک دم اپنا رویہ سخت کرلیا۔ ''اسد! تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے۔ اب ہم یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتے۔ ہمیں یہاں اپنے ہمدرد بنانے ہیں اور پھر تم یہ تو سوچو کہ جب ہم لوگ یہاں سے نکل کر اپنی دنیا میں پہنچیں گے تو وہاں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ ہم دونوں ہلاکو خان کے مجرم ہیں۔ منگولوں کے معتوب ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ہمیں ان کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ ان سے مدد لینی ہے کیونکہ ان کے تعاون اور مدد کے بغیر ہم شیخ الجبال کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''

اسد اپنے گوشے میں جاتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال اس معاملے میں، میں تم سے اتفاق نہیں کروں گا۔''

آپس کی تلخ کلامی نے جبار کو منغص کردیا تھا۔ اس کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ وہ برج سے نکل کر باہر چلا گیا۔ وہاں ذرا نشیب میں ایک پہاڑی چٹان پر چند مرد اور چند خوب صورت لڑکیاں اکٹھا کسی وقتی مسئلے پر اظہار خیال کررہی تھیں۔

جبار نے اکتا کر اس پہاڑی چٹان کا رخ کیا۔ پہلے تو اسے اس ہجوم میں جاتے ہوئے ہچکچاہٹ اور رکاوٹ سی محسوس ہوئی مگر اب اٹھتے ہوئے قدم واپس نہیں ہوسکتے تھے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا، ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔

جبار اس ہجوم میں داخل ہوگیا۔ ہجوم نے جبار کو دیکھا تو سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں۔ وہ سرگوشیاں بھی کررہے تھے اور جبار کو دیکھ بھی رہے تھے۔

جبار نے ہجوم سے پوچھا۔ ''یہاں یہ مجمع کیوں لگا ہوا ہے؟''

کسی نے بھی جبار کو جواب نہیں دیا اور وہ سب آہستہ آہستہ وہاں سے کھسکنے لگے۔ جبار نے ایک نوجوان، مہ شکن حسن کی مالک حسینہ کو بال بکھرائے اس طرح اور اس حال میں کھڑا دیکھا کہ اس کے دونوں رخساروں سے خون جاری تھا اور اس کے بال بالکل اجڑے ہوئے اور منتشر تھے۔

اس لڑکی سے دس بارہ قدم دور ایک نوجوان کھڑا تھا۔ شاید وہ نشے میں تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب تھی اور دوسرا خالی تھا۔ اس نے غصے کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھنا شروع کیا، بولا۔ ''ہم دونوں کے معاملے میں کوئی اور کیوں بولے، آ میرے ساتھ گھر چل۔ بہشت زار کے اس گوشے میں، جو ہمارے لیے مختص کردی گئی ہے۔''

جبار نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ''لڑکی! تو میرے ساتھ چل۔ ان برے لوگوں سے دور، الگ تھلگ، میرے ساتھ چل۔ تو میرے ساتھ رہ کر بڑی خوشی محسوس کرے گی۔''

لڑکی نے کوئی جواب تو دیا نہیں مگر جبار سے ہاتھ ضرور چھڑا لیا۔ اسی عالم میں اچانک ایک پینتیس چھتیس سالہ جوان جبار کے پاس گیا اور نہایت بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ ''جبار! تو یہاں کہاں؟''

جبار نے اس شخص کو دیکھا تو شکل جانی پہچانی لگی۔ بالکل پہچان لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہ شخص اس کو ہلاکو خان کے لشکر میں نور محمد حداد کے ہاں مل چکا تھا۔ جبار اس کا نام نہیں جانتا تھا لیکن جبار گھبرا گیا، پوچھا۔ ''اور تو یہاں کہاں؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں شیخ کی مہربانی سے یہاں آگیا ہوں مگر تم یہاں کیسے آگئے؟ کیا شیخ الجبال کی مہربانی سے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، شیخ الجبال کی مہربانی سے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''میرا نام رضوان ہے۔ میں نے سنا ہے ہماری بہشت میں چند نوجوان شیخ الجبال کی اجازت یا علم کے بغیر ہی داخل ہوچکے ہیں۔ تم تو صاحب کشف ہو۔ ذرا مکاشفے سے معلوم تو کرو کہ وہ کون لوگ ہیں جو شیخ کی مدد کے بغیر ہی داخل ہوسکتے ہیں۔''

جبار کو ایسا لگا، گویا یہ سب کچھ اسے سنانے کے لیے کہا جارہا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ مکاشفے سے تیرے سوالوں کے جواب حاصل کرلوں مگر تو کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟ کیا ہماری دوبارہ ملاقات نہیں ہوسکتی؟''

رضوان نے جواب دیا۔ ''میں یہاں قریب ہی اس سامنے والے نیلے برج میں مقیم ہوں۔ وہ نیلا برج جو تکونا ہے۔''

جبار نے اس نیلے برج کو دیکھا۔ وہ جبار کے برج کے عین مقابل تھا، بولا۔ ''اس وقت تو میں چلتا ہوں، شاید

میں نکل تک ملنے کی کوشش کروں گا۔''

جبار وہاں سے چلا آیا۔ اب وہ اپنے برج میں جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا لیکن اسد سے ملاقات اب اور زیادہ ضروری ہو گئی تھی۔ وہ سیدھا اپنے برج میں پہنچا اور اسد کو تلاش کرنے لگا۔ اسد ابھی کہیں جا چکا تھا لیکن اب طاہرہ آ چکی تھی۔ جبار نے طاہرہ سے پوچھا۔ ''یہ اسد کہاں چلا گیا؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں لیکن ابھی ذرا دیر پہلے جب میں یہاں آئی تھی تو اسد نہیں تھا۔''

جبار نے واپسی کے لیے جیسے ہی منہ پھیرا، طاہرہ کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ''ذرا ٹھہرنا تو، چند باتیں میری بھی سنتے جاؤ۔''

جبار ٹھہر گیا۔ مڑ کر طاہرہ کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ ''چند باتیں؟ کرو چند باتیں۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''آج کافی دیر پہلے تم نے مجھے جو پیشکش کی تھی، میں نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ تم کو میرا نام معلوم ہو گیا ہے اور تمہیں جنت کی حقیقت کا علم بھی ہو گیا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو گے کہ اس طرح تم مجھے بہ آسانی ورغلا لو گے لیکن ایسا ناممکن ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ میں حقیقی جنت نہ سہی ایک نام نہاد جنت میں تو مقیم ہوں۔ یہاں میں خوش بھی ہوں اور ناخوش بھی لیکن اگر کوئی ایسی ترازو ہو جس میں میری خوشی اور ناخوشی کو تولا جا سکے تو معلوم ہوگا کہ میں خوش زیادہ ہوں ناخوش کم...... ان حالات میں، میں تمہارا یا کسی اور کا کس طرح ساتھ دے سکتی ہوں؟''

جبار نے زور دیا۔ ''لیکن طاہرہ! یہاں معصیت ہی معصیت ہے، گناہ ہی گناہ ہے۔ تم جیسی شریف لڑکی کو یہاں سے نکلنا چاہیے۔''

طاہرہ نے سخت لب و لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ صرف میں ہی نہیں، یہاں کی ایک لڑکی بھی باہر جانا پسند نہیں کرے گی۔''

جبار نے کہا۔ ''بہرحال تم سوچ لو اور یہ بھی جان لو کہ عنقریب اس بہشت زار پر تباہی اور بربادی کے لشکر حملہ آور ہوں گے۔ اس وقت تم پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی پھرو گی اور کوئی شخص بھی تمہارا ساتھ نہیں دے گا، تمہیں پناہ نہیں دے گا۔''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''میں نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ میں اس ماحول اور اس زندگی کی عادی ہو چکی ہوں۔ میں اس زندگی سے کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتی۔''

جبار نے باہر جانے کے لیے منہ پھیرا، بولا۔ ''اچھا پھر میں ابھی واپس آتا ہوں اور اس موضوع پر میں کھل کر گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ تم جیسے بہانے چاہو، تراش لو لیکن تم کو میرے یا ہمارے ساتھ ہی اس بہشت زار سے نکلنا ہوگا۔''

طاہرہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولی۔ ''گیا تم کو یہ یقین ہے کہ تم تینوں اس بہشت زار سے بہ آسانی نکل جاؤ گے؟ کیا تم کو فرار ہونے دیا جائے گا؟ شاید اب ایسا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔''

جبار کے ہوش و حواس جاتے رہے، اس نے پوچھا۔ ''میرے یا ہمارے بارے میں بہشت والوں کو کیا معلوم ہے؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''کسی کو کچھ پتا نہیں کہ بہشت کے در پر متعین دربانوں کو کس نے اور کس طرح ہلاک کر دیا، جب ان کی لاشیں سڑنے لگیں اور بدبو کے بھبکے بہشت میں داخل ہو گئے تو یہاں کے منتظمین کو فکر لاحق ہوئی کہ یہ بدبو کے بھبکے کہاں سے آ رہے ہیں؟ آخرکار چند آدمی دربانوں کی سڑی ہوئی لاشوں تک پہنچ گئے۔ اب انہیں دربانوں کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ شاید انہوں نے معاملے کی نوعیت کو سمجھ لیا ہے اور اصل واقعہ معلوم کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حسن نامی ایک نوجوان کو گرفتار بھی کر لیا ہے۔ حسن نے ابھی تک اپنے ساتھیوں کی بابت کچھ نہیں بتایا لیکن پتا یہی چلا ہے کہ حسن کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ وہ دو آدمی کون تھے، بس اسی سوال کا جواب معلوم کرنا ہے۔''

جبار نے اپنی دونوں پنڈلیوں میں سنسناہٹ اور کمزوری محسوس کی۔ فدائیوں کے، زہر میں بجھے ہوئے چھرے جبار کو اپنے پیٹ میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ حسن کون ہے؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''ان دونوں کا ساتھی جنہوں نے دربانوں کو ہلاک کیا ہے۔''

اب اسد سے ملاقات بہت ضروری ہو گئی تھی اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں، ذرا اسد کو دیکھوں کہاں چلا گیا۔ میرا دوست معلوم نہیں کیوں مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔''

جبار اسد کو تلاش کرتا ہوا ایک آبشار کے قریب پہنچ گیا جہاں سے آبشار کی چادر نیچے گر رہی تھی۔ اسد وہیں بیٹھا اس کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جبار اس کے پیچھے

کھڑا اسد کی محویت پر غور کرنے لگا پھر آہستہ سے آواز دی۔ ''اسد میرے دوست!''

اس نے مڑ کر جبار کو دیکھا اور بے اعتنائی سے پوچھا۔ ''مجھ سے کیا کام ہے؟ یہاں کیوں اور کیا لینے آئے ہو؟''

جبار نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ پتا ہے، حسن گرفتار ہو گیا ہے۔''

اس کو گویا بچھو نے ڈنک مار دیا تھا، بولا۔ ''حسن گرفتار ہو گیا؟ مگر کیوں؟ اس کا جرم؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، واقعی مجھے تو یہاں تک معلوم ہو چکا ہے کہ بہشت زار کے منتظمین کو حسن کے دونوں ساتھیوں کی تلاش ہے کیونکہ حسن نے ابھی تک اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتائے۔''

اسد نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر حسن نے ہم دونوں کے نام بتا دیے تو؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہمیں جلد از جلد روپوش ہو جانا چاہیے ورنہ کسی بھی لمحے گرفتار کر لیے جائیں گے۔''

اسد نے طنزاً پوچھا۔ ''اور وہ جسے تو نے اپنا رازدار و غمگسار بنا لیا تھا، اس کا کیا حال ہے؟ کیا وہ وقت پڑنے پر ہمارا ساتھ دے گی؟ ہماری مدد کرے گی؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''یہ اسی کی مہربانیاں ہیں جو ہمیں اتنی ساری اطلاعات مل گئیں۔ میں چاہتا تھا کہ جب یہاں سے جاؤں تو ذنوبیہ اور طاہرہ کو بھی اپنے ساتھ لیتا جاؤں لیکن طاہرہ نے واپسی کے سفر میں ہمارا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔''

اسد نے کہا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔ ہم حسن کو بھی بہشت والوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم اس کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں نے بھی اپنے دل میں یہ عہد کر رکھا ہے۔''

وہ دونوں آبشار کے پاس بیٹھ کر دیر تک صلاح و مشورے کرتے رہے۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ آگے کنواں پیچھے کھائی...... آخر جائیں تو جائیں کہاں؟ کافی دیر تک صلاح مشورے کے بعد دونوں میں اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ جتنی بھی جلدی ممکن ہو، یہاں سے نکل جایا جائے۔ حسن کو اپنے ساتھ لیا جائے اور اس سلسلے میں ابھی سے اس کی تلاش شروع کر دی جائے اور یہ کہ اس برج کو جلد از جلد چھوڑ دیا جائے۔ طاہرہ اور ذنوبیہ کو یہاں سے نکال لیا جائے اور ان دونوں کو ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا جائے۔

ان دونوں نے ایک ساتھ اس جگہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا جہاں وہ لوگوں کی نظروں سے دور اوجھل رہیں۔ آبشار کے قریب ایک غار تھا۔ اس غار کے دہانے پر کائی جمی ہوئی تھی اور اس کے در کے آثار ایسے تھے گویا اس میں سالوں سے کوئی اندر نہیں گیا تھا۔ اسد کو یہ جگہ پسند آ گئی۔ اس نے جبار سے کہا۔ ''میرے خیال میں اس سے اچھی کوئی دوسری جگہ نہیں ملے گی۔''

جبار کچھ کہنا ہی چاہتا تھا مگر اس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا اور فوراً ہی غار کے اندر چلا گیا۔ جبار اس سادہ لوح نوجوان کی دلیری اور جرأت پر حیران رہ گیا۔ وہ کافی دیر تک اندر ہی رہا۔ اس کے بعد باہر آیا۔ جبار نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی اور کہا۔ ''مجھ کو تیری دوستی پر ناز ہے۔ تیرے جیسا بہادر اور حوصلہ مند کوئی دوسرا کم از کم میں نے نہیں دیکھا۔''

اسد نے جواب دیا۔ ''میں تنہا آدمی ہوں اس لیے موت سے نہیں ڈرتا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''اس غار میں رہائش کس طرح ہوگی؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''دو چار دن رہ جانے کے لیے اچھی جگہ ہے۔''

ان دونوں میں طے یہی پایا کہ وہ نہایت ہوشیاری اور چوکنے پن سے حالات اور واقعات پر اپنی نظریں رکھیں گے اور اس وقت تک غار میں پناہ نہیں لیں گے جب تک کہ وہ غار کے باہر محفوظ اور خبردار ہیں۔ جبار کو ذنوبیہ کا انتظار تھا۔ طاہرہ نے اس سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن ذنوبیہ کو اس کے پاس لے آئے گی۔

☆☆☆

تقریباً تین دن تک حالات پُرسکون رہے لیکن دونوں کے دل و دماغ کا سکون تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ دونوں کی نیند اڑ چکی تھی اور خوف نے معدے کو سہما دیا تھا۔ اس میں ہلکا ہلکا درد رہنے لگا۔ دونوں کی طبیعتوں میں عیش و عشرت کے لیے گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ حوریں آتیں اور اپنا سا منہ لے کر رہ جاتیں۔ طاہرہ میں پہلی سی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ جبار جب تب اس کے تار ہلانے کی کوشش کرتا تو ناکام رہتا۔

چوتھے دن جبار نے بے پروائی سے پوچھا۔ ''آنسہ ذنوبیہ! او معاف کرنا، آنسہ طاہرہ!''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''اس میں معافی کی کیا بات

ہے؟ تم دونوں نے مجھے میزبانی کا شرف بخشا، میرے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے؟''

جبار نے بات کو گھما پھرا کر کہہ دیا۔ ''طاہرہ! تم اپنی فطرت ہی سے نیک اور صالحہ ہو۔ میں ایک بار پھر تم سے یہی کہوں گا کہ آؤ میرے ساتھ چلو اور اندر......''

اسد نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''بھائی جبار! اس پاک باطن و پاک دل خاتون کا کیا کہنا، اگر یہ ہمارے پاس رہیں اور......''

جبار نے اسد کی طرف دیکھا اور طاہرہ کو مخاطب کیا۔ ''طاہرہ! لائق صد احترام خاتون طاہرہ!''

طاہرہ کو ان شاندار کلمات نے بے زر کا غلام بنالیا۔ ادب سے کھڑی ہوگئی اور جبار سے پوچھا۔ ''آپ کو مجھ سے کوئی کام؟ بخدا! میں تو ہمیشہ دن رات یہی دعا کرتی ہوں کہ خدایا میرے......''

جبار نے اس کی بات کاٹ دی، بولا۔ ''اگر تم واقعی یہ چاہتی ہو کہ ہم دونوں خوش رہیں تو اس کے لیے ذنوبیہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کم از کم میرے لیے۔''

طاہرہ نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میں دو دن اور چاہتی ہوں۔ بس ان دو دنوں میں ذنوبیہ یہاں آچکی ہوگی لیکن میں ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ذنوبیہ کو یہاں تک لانے کی کوشش کروں اور ہمارے حاسد اور مخالفین وہاں موجود ذنوبیہ کے ماحول اور معاشرے کو گندا کر رہے ہوں۔''

جبار نے عرض کیا۔ ''خاتون! آپ نے مجھے ابھی تک اچھی طرح......''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''میں نے تم کو اچھی طرح پہچان لیا ہے، شاید اس بہشت زار میں تنہا میں ہی ایسی ہوں جس نے تمہیں پہچانا ہے ورنہ دیکھا تو بہتوں نے تمہیں مگر پہچانا ایک نے بھی نہیں۔''

جبار اس اندازِ گفتگو اور تیز لب و لہجے پر چونک گیا، پوچھا۔ ''خیریت تو ہے طاہرہ! کوئی خاص بات تو نہیں ہے؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''خاص بات یہ ہے کہ حسن پر سختیاں ہو رہی ہیں اور لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''تمہیں یہ ساری معلومات کس طرح حاصل ہو جاتی ہیں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''تم لوگ بہشت زار میں چند دن رہ کر چلے جاتے ہو، میں یہاں مستقل رہ رہی ہوں۔ یہ راز کی بات میں تمہیں کس طرح بتادوں کہ یہاں کی ساری اطلاعات مجھے کیونکر مل جاتی ہیں؟''

جبار نے پھر پوچھا۔ ''کیا یہ یقین ہوگیا ہے کہ حسن اپنے ساتھیوں کی بابت بہت جلد بتادے گا؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''ہاں مجھے یہی معلوم ہوا ہے۔''

جبار ایک بار پھر بری طرح پریشان ہوگیا۔ وہ اس سلسلے میں اسد کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر طاہرہ کی لاعلمی میں۔ اس نے طاہرہ کو پرچایا۔ ''طاہرہ! عزیز ترین خاتون! حسن جیسے آدمیوں کو رکھا کہاں جاتا ہے؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''اسی بہشت زار میں ایک ایسی جگہ ہے، جہاں ایسے مجرموں کو قید کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اس جگہ کو دارالعقوبت کہا جاتا ہے۔ دارالعقوبت میں سختیوں کے طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں اور آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی مجرم کو یہاں پہنچایا گیا ہو اور اس نے سب کچھ اگل نہ دیا ہو۔''

جبار نے کہا۔ ''کیا ایسا ممکن ہے کہ اس عجیب وغریب جگہ کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''ایسا ناممکن کام بھی نہیں۔ پہلے تو یہی طریقہ تھا کہ بہشت زار میں مقیم حضرات کو ایک آدھ بار دارالعقوبت کی سیر ضرور کرادی جاتی تھی مگر پھر یہ سلسلہ بند کردیا گیا اور دارالعقوبت کو ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔''

جبار نے اصرار کیا۔ ''طاہرہ! مجھے دارالعقوبت کی سیر ضرور کرادو۔ تم چاہو تو یہ کام ہوسکتا ہے۔''

طاہرہ نے پوچھا۔ ''لیکن تم دارالعقوبت کو کیوں دیکھنا چاہتے ہو...... وہاں تمہیں کیا ملے گا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''بس شوق ہے۔''

طاہرہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''بس اس میں ایک خرابی ہے۔ جب میں دارالعقوبت کے منتظمین سے یہ کہوں گی کہ بہشت زار کے چند یا ایک مہمان دارالعقوبت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں فوراً یہ شبہ گزرے گا کہ کہیں یہ شخص حسن کے ساتھیوں میں سے ایک تو نہیں۔ اس طرح بات بڑھ سکتی ہے اور مسئلہ پیچیدہ ہوسکتا ہے۔ پہلے اس پر غور کرلو، سوچ لو۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں اس خطرے سے نہیں ڈرتا۔ میں بہرحال دارالعقوبت کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گی کہ تمہیں دارالعقوبت کی سیر کراسکوں۔''

جبار نے محسوس کیا کہ بہشت زار بھی دنیا بن چکی

ہے۔یہاں بھی وہی انکار، وہی جوڑ توڑ، وہی کاروبار، وہی سازشیں، وہی آلامِ حیات۔ وہ حسن کی گرفتاری اور دارالعقوبت کی سختیوں کا حال سن کر اس نتیجے پر ضرور پہنچ گیا تھا کہ اب خیریت اس کی بھی نہیں۔ کسی بھی وقت اس کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ باتیں اسد کو بتانا چاہتا تھا لیکن اسد اچانک ایسا غائب ہوا کہ کہیں نظر ہی نہیں آیا۔ وہ اپنے برج نما مکان سے نکل کر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ آبشار کے پاس بھی گیا۔ اس نے سبزہ زار میں بھی اسد کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔

جب وہ تھکا ہارا برج میں داخل ہوا تو اس نے طاہرہ کے ساتھ دو آدمی بیٹھے دیکھے، طاہرہ نے پوچھا۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟ یہ دونوں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کررہے ہیں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''ان دونوں کی تعریف؟ یہ میرا کیوں انتظار کررہے ہیں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''میں نے ان دونوں سے تمہاری بابت یہ ذکر کیا تھا کہ تم دارالعقوبت دیکھنا چاہتے ہو۔ یہ دونوں رضامند ہوگئے اور اس وقت یہ تمہیں لینے آئے ہیں۔''

جبار نے ان دونوں کو غور سے دیکھنے کے بعد منہ پھیرلیا، بولا۔ ''لیکن میں دارالعقوبت تنہا نہیں جاؤں گا۔ میرا ساتھی اسد میرے ساتھ ہوگا۔''

طاہرہ نے ان دونوں سے پوچھا۔ ''آپ دونوں کیا کہتے ہیں؟''

ایک نے کہا۔ ''ان کا ساتھی اسد اس وقت ہے کہاں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں، یہیں کہیں ہوگا۔ اس کو آلینے دیا جائے۔''

لیکن دوسرے نے اپنے ساتھی کی مخالفت کی، بولا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ انہیں اگر چلنا ہے تو اسی وقت ہمارے ساتھ چلیں، ورنہ ملتوی کریں۔ ہمیں ان کے جانے نہ جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

طاہرہ نے جبار کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ ''میرا خیال ہے تمہیں اسی وقت ان کے ساتھ چلے جانا چاہیے۔ جب اسد آجائے گا تو وہ بھی کسی کے ساتھ وہیں پہنچ جائے گا۔''

جبار کی چھٹی حس اسے خبردار کررہی تھی کہ بیٹے ان کی باتوں میں مت آنا کیونکہ یہ جھوٹے اور دغاباز لوگ ہیں۔ یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ جبار نے برج کے ایک گوشے میں جاکر اپنے کپڑے اتارنا شروع کردیے کہ باہر سے کسی نے چاند ماری شروع کردی۔ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ جبار نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے اسد کو کھڑا دیکھا۔

جبار خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کرلیا، گلے لگا کر بولا۔ ''میں کتنی دیر سے تیرا انتظار کررہا ہوں، یہ تو کہاں چلا گیا تھا؟''

اسد نے پوچھا۔ ''کیا تو نے مجھ کو تلاش کیا تھا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے تجھ کو تلاش کیا مگر تو نہیں ملا۔ بخدا میں بہت خوش ہوں کہ بالآخر تجھ کو پالیا..... میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سی وجہ تھی جس نے تجھ کو کافی دیر کے لیے لاپتا کردیا تھا؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''اندر کون کون ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں، طاہرہ اور دو آدمی جنہیں میں نہیں پہچان رہا۔''

اسد نے گھبرا کر کہا۔ ''تب پھر میں یہیں سے واپس چلا جاؤں گا اور روپوش ہوجاؤں گا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''آخر یہ معاملہ کیا ہے، کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو؟''

طاہرہ نے دور ہی سے پوچھا۔ ''کون آیا ہے، اسے اندر لے آؤ۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''اسد آیا ہے۔''

لیکن اسد پھر باہر نکل گیا، بولا۔ ''دوست! طاہرہ سے بھی ہوشیار رہنا۔ یہ شیخ الجبال کی خاص عورت ہے۔''

جبار نے ہنس کر جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ طاہرہ نہایت قابلِ اعتبار انداز میں ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ دارالعقوبت کی سیر کرنا چاہتا ہوں چنانچہ وہ دونوں ہمیں دارالعقوبت لے جائیں گے۔''

اس نے آہستہ سے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''جبار! میں تجھ کو کس طرح سمجھاؤں کہ ہم دونوں کے خلاف ایک زبردست کھیل کھیلا جارہا ہے۔ یہاں کی انتظامیہ کو یہ شبہ ہے کہ ہم دونوں حسن ہی کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ ابھی تک حسن نے ہمارا نام نہیں لیا ہے۔ اب ان لوگوں کی کوشش یہی ہے کہ اگر حسن ہمارا نام نہیں لیتا تو نہ لے۔ یہ لوگ اپنے طور پر اپنے وسائل سے ہمیں اپنی گرفت میں لے لینا چاہتے ہیں۔''

ایک بار پھر طاہرہ نے آواز دی۔ ''ارے دروازے پر کھڑے دونوں کیا باتیں کرنے لگے..... اندر کیوں نہیں آتے؟''

جبار نے کہا۔ ''اسد! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے اندر

آجانے سے ہمیں خطرہ لاحق ہوجائے گا تو اندر مت آؤ اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم سے کب اور کہاں مل کر تفصیلی باتیں کروں؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''میں فوراً ہی واپس جارہا ہوں۔ تم کل ہی علی الصباح آبشار کے پاس مل لینا، پھر باتیں ہوجائیں گی۔''

طاہرہ نے جواب نہ پاکر جبار کے پاس جانے کا ارادہ کرلیا لیکن اسد یہ محسوس کر کے کہ طاہرہ آرہی ہے، واپس چلا گیا۔ جب طاہرہ نے اسد کو نہیں پایا تو پوچھا۔ ''تم تو کہتے تھے کہ اسد آیا ہوا ہے مگر یہاں تو اسد کا کوئی پتانہیں۔ اگر وہ آیا تھا تو کہاں چلا گیا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''طاہرہ! بہشت زار کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ اسد آیا تھا مگر واپس چلا گیا۔ وہ پریشان تھا۔ کل صبح آنے کا وعدہ کیا ہے۔''

طاہرہ نے برا سا منہ بنایا۔ ''تم نے کہا تھا دارالعقوبت دیکھوں گا، تب ہی میں نے ان دونوں کو بلوالیا۔ وہ دونوں کہہ رہے تھے کہ اسد یہاں نہیں آسکتا۔ انہوں نے ایسا کیوں کہا، پتانہیں لیکن ان کی بات درست ثابت ہوسکتی ہے۔''

جبار، طاہرہ کے ساتھ دونوں اجنبیوں کے پاس واپس آگیا۔ ان دونوں نے متجسسانہ نظروں سے شاید اسد کو تلاش کیا اور اس کو نہ پاکر وہ دونوں مسکرائے، ایک نے کہا۔ ''اسد یہاں نہیں آسکتا، میں جانتا ہوں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''میرے دوستو! اسد یہاں کیوں نہیں آسکتا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ وہ کافی دیر پہلے معلوم نہیں کس طرح دارالعقوبت پہنچ گیا تھا اور وہاں کے لوگ اس سے کسی موضوع پر طویل گفتگو کررہے تھے۔ ان حالات میں اسد کا یہاں آجانا حیرت کی بات ہے۔''

جبار نے کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا، بولا۔ ''میں اس وقت دارالعقوبت نہیں جاسکتا۔ کل دوپہر کے بعد چل سکتا ہوں۔''

دونوں نے برے سے منہ بنائے، ایک نے کہا۔ ''ہم جنت کی انتظامیہ کے اس اصول سے پریشان اور مجبور ہیں کہ وہ بہشت زار میں کسی قسم کا ہنگامہ پسند نہیں کرتی۔ ورنہ ہم تمہیں اسی وقت دارالعقوبت لے جاسکتے تھے۔''

جبار نے اس کے خطرناک تیور سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ وہ اس کو ہر حال میں دارالعقوبت لے جائیں گے اور اس سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کریں گے۔ وقت کی نزاکت کے پیش نظر اس نے نرمی سے جواب دیا۔ ''میں کل دوپہر کے بعد دارالعقوبت ضرور چلوں گا۔ میں خود بھی اس عجیب وغریب شعبے کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

دوسرے نے پوچھا۔ ''تب پھر یہ بات طے پاگئی کہ آپ کل دوپہر کے بعد دارالعقوبت چلیں گے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بات طے پاچکی ہے۔''

وہ دونوں فوراً ہی کھڑے ہوگئے۔ طاہرہ ان دونوں کو دروازے تک چھوڑنے گئی۔ وہاں ان دونوں نے کچھ دیر ٹھہر کر طاہرہ سے معلوم نہیں کس قسم کی باتیں کیں کہ طاہرہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ ''ہاں کل صبح اور دوپہر کے درمیان وہ بھی آجائے گی۔''

وہ دونوں چلے گئے اور طاہرہ واپس آکر چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کسی پس وپیش یا کشش وپنج میں مبتلا کچھ سوچ رہی تھی پھر آپ ہی آپ پوچھا۔ ''کیا یہ بات درست ہے تمہاری کہ اس وقت اسد آیا تھا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اسد آیا تھا اور ان دونوں کو یہاں بیٹھا دیکھ کر واپس چلا گیا۔ کہہ رہا تھا پھر کسی دن آؤں گا۔''

طاہرہ نے بے تکلفی سے صاف صاف سوال کردیا۔ ''سچ بتانا، کیا تم دونوں کا حسن سے کوئی تعلق رہا ہے یا نہیں؟''

جبار نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ ممکن ہے کیونکہ صاحبزادے......''

طاہرہ نے ایک دم برہم ہوکر جبار کی بات دہرائی۔ ''ہاں، یہ ممکن ہے کا کیا مطلب ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''جب تم لوگ ہم دونوں پر یقین کی حد تک شبہ کیے جارہے ہو تو میں کیا کروں؟''

طاہرہ نے کہا۔ ''یہاں کی انتظامیہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ تم دونوں یہاں کس کے ساتھ آئے تھے؟ تمہیں بہشت زار تک کس نے پہنچایا تھا؟''

جبار نے سختی سے جواب دیا۔ ''اس سوال کا جواب انتظامیہ کے پاس ہونا چاہیے۔''

طاہرہ بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ ''اسد کو آنا چاہیے لیکن وہ اسی وقت یہاں آئے گا جب انتظامیہ کے لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔''

جبار نے چیخ کر کہا۔ ''اگر انتظامیہ نے اسد کو اپنے پاس جبراً روک رکھا ہے تو یہ بری بات ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہورہا ہے اس کا طاہرہ کو علم ہے مگر کسی وجہ سے وہ چھپا رہی ہے۔ جبار طاہرہ کو گھر میں چھوڑ کر نکل گیا اور کئی گھنٹے ادھر اُدھر گھوم پھر کر وقت ضائع

کرتا رہا۔ اب وہ بظاہر تنہا رہ گیا تھا۔ خوف میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، وحشت بڑھتی جارہی تھی۔ دہشت تھرتھری پیدا کر رہی تھی۔ اس کو یقین ہو چکا تھا کہ بہشت زار کی انتظامیہ نے ان تینوں کی بابت بہت کچھ جان لیا ہے اور وہ ان تینوں پر فرداً فرداً ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ وہ دونوں آدمی جو جبار کو دارالعقوبت لے جانا چاہتے تھے، اسی سلسلے کی کڑی تھے اور دارالعقوبت جانے کا یہ مطلب تھا کہ حسن کی طرح اس پر بھی سختی شروع کردی جائے۔ وہ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ جب انتظامیہ اس کی طرف سے بالکل مجبور ہوجائے گی تو کسی فدائی کے ذریعے چھرا مار کر ہلاک کرا دے گی لیکن جبار اس طرح نہیں مرنا چاہتا تھا۔ وہ ان عیاروں سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب اسے بہشت زار کو چھوڑ دینا چاہیے۔

☆☆☆

علی الصباح وہ آبشار کے پاس پہنچ گیا۔ پانی کی چادر شور کے ساتھ نیچے گر رہی تھی۔ وہاں کا ماحول بڑا پُرسکون تھا۔ آس پاس صنوبر کے درخت چھتری کی طرح سایہ کیے کھڑے تھے۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جبار نے صنوبر کے درختوں کی آڑ میں گھوم پھر کر اسد کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا۔ پھر وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر اسد کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی نظریں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس نے وہیں درختوں کے جھنڈ میں بہت سی حوروں اور غلمان کو گھومتے ہوئے دیکھا۔ اسی عالم میں معلوم نہیں کس طرف سے اسد بھی آگیا۔ جبار نے پوچھا۔ ''تم کب آئے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''میں یہاں بہت دیر کا آیا ہوا ہوں۔ اس وقت تک تم نہیں آئے تھے۔''

جبار نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ ''ہماری باتیں کہاں ہوں گی؟ یہاں یا کہیں اور؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''شیخ کے کتے مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں پھر جب میں پکڑا جاؤں گا تو شیخ تم پر کمندیں پھینکے گا اور اس وقت تم جو کچھ بھی کرو گے غصے، جوش اور جذبۂ ایثار کے زیرِ اثر جو کام بھی ہوگا، وہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''اس طولانی تمہید کا مطلب؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ بہشت زار کو چھوڑ دیا جائے۔''

جبار نے کہا۔ ''میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''ہاں، یہ بات تو بتاؤ کہ......''

اسد نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''دیکھو جبار! انتہائی دشواری سے میں یہاں آیا ہوں۔'' اس کے بعد وہ ایک غار میں داخل ہوگیا، بولا۔ ''یہاں میرے ساتھ آؤ تاکہ ہم واپسی کا منصوبہ تیار کرلیں۔''

جبار اس غار میں چلا گیا۔ اسد نے کہا۔ ''مجھ کو انتظامیہ کے لوگوں نے گرفتار کرلیا تھا۔ وہ لوگ مجھ کو دارالعقوبت لے گئے تھے اور وہاں حسن کے روبرو کھڑا کرکے سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ چنانچہ میں بھی انہیں ایسے ایسے جواب دیتا رہا کہ وہ اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے پھر میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔''

جبار نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''دارالعقوبت کی انتظامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میں ان کے چنگل سے نکلا ہوں۔ اب میں بھاگ دوڑ کرکے یہاں سے فرار ہوجانے کی کوشش کررہا ہوں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''پھر حسن کا کیا بنے گا؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا بنے گا۔ اس نے حالات خود بگاڑے ہیں۔''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا میں اپنے طور پر حسن کو چھڑانے کی کوشش کروں؟''

اسد نے چڑ کر جواب دیا۔ ''کرو، میں کیوں منع کروں مگر جانے سے پہلے یہ یاد رکھنا کہ اگر تم بھی پکڑے گئے تو میں دونوں کو چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

جبار نے کہا۔ ''بے شک۔ میں نے تم کو اجازت دے دی۔ میں حسن کو چھڑانے کی کوشش کروں گا۔''

اسد کو جبار کی باتیں گراں گزر رہی تھیں۔ بولا۔ ''شاید ہمارے راستے الگ الگ ہوگئے ہیں۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں ہے۔''

اسد نے سختی سے کہا۔ ''یہی بات ہے، شیخ الجبال کا نظام سخت اور شکنجے کی طرح ہے۔ ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور عقل و شعور سے جان لیا ہے، وہی کافی ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکل کر ہلاکو خان کے پاس پہنچنا ہے۔''

جبار ڈر گیا۔ ''ہلاکو خان کے پاس؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہلاکو خان کے پاس۔''

''مگر کیوں؟''

''مگر یوں کہ اس تابوت میں آخری کیل ہلاکو خان ہی ٹھونک سکتا ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ میری عقل

مندی اور تدبر کو کیا ہوگیا؟ ہم ہلاکو خان کے پاس کیوں جانے لگے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ ہمیں وہیں پناہ مل سکتی ہے۔ شیخ کے فدائی جہنم تک پیچھا کرتے پہنچ جائیں گے لیکن وہ ہلاکو خان تک نہیں پہنچ سکتے۔''

جبار نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ہلاکو خان ہم دونوں کو فوراً ہی قتل کرا دے گا کیونکہ ہم نے اس کے ایک سردار کو قتل کر دیا تھا۔''

اسد نے کہا۔ ''ہم ہلاکو خان سے مل کر پہلے جاں بخشی کی درخواست کریں گے پھر جب وہ ہمیں معاف کر دے گا تو ہم شیخ کی بہشت زار کا ذکر کریں گے اور اس کو یہاں تک لے آئیں گے اور جب ہلاکو خان اپنے لشکر کے ساتھ یہاں داخل ہوگا تو گویا ہم اپنا مقصد حاصل کر چکے ہوں گے۔''

جبار ہاتھ پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا، اس نے کہا۔ ''ہر بات اپنی جگہ لیکن میں حسن کے لیے کوشش ضرور کروں گا۔''

اسد نے نہایت افسوس سے کہا۔ ''میرا خیال ہے حسن کی طرح تمہاری قسمت بھی دغا دے رہی ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''تم جو چاہو کہہ لو لیکن میں حسن کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

اسد نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ بھی کر دیکھو۔''

وہ کسی غیر معمولی فکر میں ڈوب گیا۔ جبار نے کہا۔ ''اچھا، میں چلتا ہوں، اب کہاں ملاقات ہوگی؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''وہاں، جہاں بہشت زار کے دربانوں کو ہلاک کیا گیا تھا۔ میں وہیں موجود ہوں گا اور دو دن تک تمہارا انتظار کروں گا۔''

جبار واپس مڑا تو اسد کو اس شخص پر بہت رحم آیا۔ وہ جبار کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک نظر کام کرتی رہی اور کسی چیز نے مزاحم ہو کر دید کا سلسلہ منقطع نہیں کر دیا۔

☆☆☆

جبار واپسی میں سیدھا گھر نہیں گیا۔ وہ صنوبر کے سائے میں بیٹھ کر اپنے فیصلے پر غور کرتا رہا۔ اس نے یہاں ایک بار پھر سوچا کہ اس کو وہی کرنا چاہیے جو اسد کہہ رہا ہے یا پھر وہ، جس کا خود فیصلہ کر لیا ہے...... اور پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حسن کو لیے بغیر چلے جانا غداری کے مترادف ہوگا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے گھر کو حوروں سے بھرا پایا...... ان میں طاہرہ بھی تھی۔ اس نے جبار کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ بولی۔ ''مجھ کو تو یہ کہہ کر ڈرا دیا گیا تھا کہ شاید تم واپس نہیں آؤ گے۔''

جبار نے سرد مہری سے کہا۔ ''اگر میں واپس نہ آتا تو جاتا کہاں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''وہیں جہاں تمہارا ساتھی اسد جا چکا ہے۔ اس کا پتا چلا یا نہیں؟''

جبار نے کہا۔ ''وہ مجھ سے ملنے آتا تو اس کا پتا بھی چلتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ دارالعقوبت والوں نے اس کو بھی پکڑ لیا ہے۔''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، تمہارا شبہ غلط ہے۔ تمہارا اندیشہ فضول ہے۔''

جبار نے سختی سے کہا۔ ''میرا اندیشہ فضول نہیں ہے۔''

طاہرہ نے حوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم دونوں کے پاس آئی تھیں مگر اب تم تنہا ہو، جس کو چاہو اپنے لیے روک لو اور بقیہ کو واپس بھیج دو۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے یہاں جو بھی آ گیا ہے اس کی خاطر تواضع کر کے سب کو ساتھ واپس بھیجا جائے۔''

طاہرہ نے پوچھا۔ ''کیا ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس کے ساتھ تم کچھ وقت گزار لو؟ دوپہر کے بعد دارالعقوبت کے آدمی تمہیں لینے آ جائیں گے۔ اس سے پہلے تمہیں آرام کر لینا چاہیے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''طاہرہ! تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہیں؟''

طاہرہ برا مان گئی، بات کاٹ کر بولی۔ ''دیکھو، پھر تم نے مجھے طاہرہ کہہ کر مخاطب کیا۔ میں نے کہہ جو دیا کہ یہاں کسی حور کا کوئی نام نہیں ہوتا، پھر مجھے طاہرہ طاہرہ کہہ کر کیوں شرمندہ کر رہے ہو؟''

طاہرہ نے جبار کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور دو حوروں کو اشارے سے حکم دیا کہ وہ جبار کا دل بہلانے کی کوشش کریں۔ دونوں حوریں جبار کے پاس گئیں اور ایک ادائے خاص سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔ جبار نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

ایک حور نے شرما کر جواب دیا۔ ''جانِ من! خیریت ہی تو نہیں ہے۔ ہم کب تک صبر کریں۔''

دوسری نے کہا۔ ''کوئی پریشانی لاحق ہو تو بتائیں، بندی اس کا کوئی حل نکالے گی۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں تنہائی چاہتا ہوں، مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔''

ایک نے کہا۔ ''میری آنکھوں میں جھانکو، دیکھو اس

میں کون ہے..... یہاں بھی تم ہو، میرے دل میں اتر کے دیکھو، دل کا چپا چپا تمہاری یادوں کا چمن زار بن گیا ہے۔ یہاں تمہاری ہی مہک ہے اور تمہاری ہی لپک۔''

دوسری نے جبار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، بولی۔ ''ذرا میرے دل کی حرکت تو دیکھو، کتنی زور زور سے دھڑک رہا ہے یہ۔''

جبار نے ان دونوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر گھر کے ایک گوشے کا رخ کیا۔ یہ چھوٹا سا گھر ابہت آراستہ پیراستہ تھا۔ وہ ان سے بچنے کی خاطر گھر کے ایک گوشے میں چلا گیا تھا۔ یہ گوشہ غسل خانہ تھا۔ غسل خانے میں وہ کچھ دیر تنہائی میں وقت گزار سکتا تھا۔ وہ غسل خانے میں جیسے ہی داخل ہوا، اس نے یہاں کسی کو گٹھری کی شکل میں پڑا ہوا دیکھا۔ وہ غسل خانے سے نکل بھاگنے کے لیے جیسے ہی مڑا، اس گٹھری نے آواز دی۔ ''جبار! کہاں چلے گئے، ذرا میرے پاس تو آؤ۔''

جبار واقعی ٹھہر گیا، یہ آواز جانی پہچانی تھی اور پھر اس آواز نے جس طرح دل کی گہرائیوں سے جبار کو مخاطب کیا تھا، اس میں محبت کی تڑپ تھی، لگن تھی، خواہش تھی، چاہت تھی۔ وہ اس گٹھری کے پاس جا کھڑا ہوا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے پکارا تھا؟ کیوں؟ تم کون ہو؟''

گٹھری کا سر اٹھا اور کہا۔ ''جبار! کیا تم نے مجھے بھلا دیا؟''

جبار نے گھبرا کر اس طرف دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ذنوبیہ! یہ تم! یہ تم یہاں کہاں؟ میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش کیا۔ بہشت زار کی حوروں میں تیری جستجو کرتا رہا مگر ناکام رہا اور تو مجھے اب ملی بھی تو کہاں؟ یہاں!''

وہ ذنوبیہ کے پاس بیٹھ گیا، اس نے ذنوبیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے بالوں کی لٹ کو آنکھوں سے لگا کر ہونٹوں سے لگا لیا، بولا۔ ''میں تو اس خوشبو کو آج تک نہیں بھلا سکا۔ اس خوشبو کو میری ناک ہی نہیں، میرا ایک ایک مسام سونگھ سکتا ہے۔ میرے دل و دماغ اس کی مہک میں ڈوبے ہوئے ہیں، میرا وجود اس سے سرشار ہے۔''

ذنوبیہ آہستہ آہستہ رو رہی تھی، بولی۔ ''جب تم ادھر ادھر بادلوں کی طرح مارے مارے پھر رہے تھے، میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں تم سے ملنا چاہتی تھی، میں تمہیں آواز دینا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سب میں اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی تھی۔ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتی تھی مگر نہیں سن سکی.....''

جبار نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

''تیرے بغیر یہ بہشت زار سونی سونی تھی۔ اداس، ویران، پھیکی پھیکی۔ میں تو اس ویرانے سے کوچ کرنے والا تھا۔''

جبار نے اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ مڑ کر دیکھا، غسل خانے کے در پر طاہرہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ طبیعت سنبھلی یا نہیں، دل کی اداسی دور ہوئی یا نہیں؟''

جبار نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''طاہرہ! میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''پھر وہی طاہرہ! میں کہتی ہوں باز آجاؤ۔ یہاں کسی کا کوئی نام نہیں۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''طاہرہ! یہ تم غلط کہہ رہی ہو۔ دیکھو میری طرف، میرے پاس یہ کون ہے؟ ذنوبیہ..... اس کا نام ذنوبیہ ہے پھر یہ نام والی لڑکی بہشت زار میں کہاں سے آگئی؟''

طاہرہ نے کہا۔ ''تم خود ہی ہر کسی کا نام رکھ لیتے ہو۔ جو شاید تمہاری شناخت کے لیے ضروری ہے۔''

جبار نے ذنوبیہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کے چہرے پر سے رومال ہٹا کر بغور دیکھنے لگا، ٹکٹکی باندھ کر۔ ذنوبیہ کی دو لٹیں پیشانی کو چوم رہی تھیں۔ باریک بھویں جبار کے دل پر تلوار چلا رہی تھیں اور بڑی بڑی پلکیں دل میں تیر و سناں اتار رہی تھیں۔ ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کیف و سرشاری بخش رہی تھی۔

ذنوبیہ نے آہستہ سے پوچھا۔ ''جبار! کیا تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں شک ہے اس میں؟''

ذنوبیہ جبار کو دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی۔ ''میں کس طرح یقین کروں؟''

جبار نے کہا۔ ''افسوس کہ میں اپنا دل چیر کے نہیں دکھا سکتا۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا رواں رواں تمہارے نام کا ورد کرتا رہتا ہے۔ میں خواب ذنوبیہ تمہارے دیکھتا ہوں اور خیال پر تمہاری حکومت ہے۔''

ذنوبیہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم باتیں اچھی کر لیتے ہو، لیکن عمل ہمیشہ اس کے برعکس رہتا ہے۔''

جبار نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

ذنوبیہ نے کہا۔ ''میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھو، دل کو ٹٹول کر تو دیکھو۔''

جبار پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے ذنوبیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''جو کچھ کہنا چاہتی ہو، صاف صاف کھل کر کہو تاکہ میں اس کا واضح اور صاف صاف جواب دے سکوں۔''

ذنوبیہ نے پوچھا۔ ''تم مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے؟''

''بالکل بالکل۔ یہ بات تو کسی قسم کے شک و شبے سے بالا ہے۔''

ذنوبیہ نے کہا۔ ''اور تمہیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس بہشت زار میں داخلہ شیخ الجبال کی خدمت کے عوض ہوتا ہے، اس کی ایک قیمت مقرر ہے۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں ان ساری باتوں سے واقف ہوں...... پھر؟''

ذنوبیہ نے منہ پھیر لیا، بولی۔ ''پھر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس بار تم نے بہشت زار میں داخلے کی کیا قیمت ادا کی؟ تم نے میرے لیے کیا کیا؟ تم کس طرح اور کن لوگوں کے ساتھ اس بہشت زار میں داخل ہوئے؟''

جبار نے پوچھا۔ ''کیا ان کا جواب ضروری ہے؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، ان کا جواب بہت ضروری ہے۔''

جبار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں اسے ضروری نہیں سمجھتا۔''

ذنوبیہ بگڑ کر کھڑی ہوگئی، بولی۔ ''اگر تم اس کو ضروری نہیں سمجھتے تو میں بھی کسی بات کو ضروری نہیں سمجھتی۔ میں چلتی ہوں اور اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ ہم دونوں کسی کو بھی یاد نہیں کریں گے، سب کچھ بھلا دیں گے۔''

جبار نے اس کا راستہ روک لیا، بولا۔ ''مگر یہ تم ناراض ہو کر چلی کہاں ہو؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''میں جہاں سے آئی ہوں، وہیں واپس چلی جاؤں گی۔''

جبار نے کہا۔ ''میں تم کو جانے کب دوں گا؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔''

جبار کھسیا تا جا رہا تھا۔ ''میں راستہ روک سکتا ہوں۔''

ذنوبیہ نے جبار کو اپنی راہ سے ہٹا دیا، بولی۔ ''خدا حافظ، میں چلی۔'' جبار نے دوڑ کر پھر سے اس کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ ''ذنوبیہ! یہ بتاؤ، کس بات پر ہم دونوں کی صلح ہو سکتی ہے؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''صلح ہو سکتی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ تم صلح نہیں کرو گے۔''

جبار نے نہایت نرمی اور لجاجت سے کہا۔ ''تم نہیں جانتیں ذنوبیہ! تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔ میں تم سے صلح کر لوں گا، ہر اس شرط کو مان کر جو تم رکھو گی، جو تم پیش کرو گی۔''

ذنوبیہ نے بڑے غور سے جبار کو دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا سچ؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''بالکل سچ۔ میں ہر کسی سے جھوٹ بول سکتا ہوں مگر تم سے نہیں بول سکتا۔''

ذنوبیہ نے کہا۔ ''دیکھو، ایک بار پھر سوچ لو، کہیں مکر نہ جانا بعد میں۔''

جبار کھسایا ہوا تھا، بولا۔ ''میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں مکروں گا۔''

ذنوبیہ نہایت احتیاط سے کام لے رہی تھی، بولی۔ ''پھر بتاؤں میں اپنی شرط؟''

جبار نے کہا۔ ''بتاؤ، بیان کرو اپنی شرط۔''

ذنوبیہ نے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم بہشت زار میں کس طرح داخل ہوئے اور تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟''

جبار نے کہا۔ ''لیکن یہ جو کچھ تم پوچھ رہی ہو، اس کا ہم دونوں کی محبت سے کیا تعلق؟''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''اس کا تو ہم دونوں کی محبت سے اتنا شدید اور گہرا تعلق ہے کہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔''

جبار نے بے بسی سے کہا۔ ''ذنوبیہ! اگر میں تمہارے اس سوال کا جواب دے بھی دوں گا تو اس کے بعد میرا کیا حشر ہوگا، شاید تم نہیں جانتیں۔''

ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔''

جبار نے کہا۔ ''ذنوبیہ! مجھے نہیں معلوم کہ تم مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میرے جواب سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میرا جواب مجھے کیا نقصان پہنچائے گا۔ اللہ ہم دونوں پر رحم فرمائے۔''

ذنوبیہ نے کہا۔ ''جب تک مجھے میرے سوالوں کا جواب نہیں ملے گا، میں تم سے خوش نہیں ہوں گی۔''

جبار نے کہا۔ ''اپنا سوال ایک بار پھر دہرا دو۔''

ذنوبیہ نے اپنا سوال دہرا دیا۔ ''تم بہشت زار میں کس طرح داخل ہوئے اور تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ یہ سوال تو نہیں کر رہی ہے کوئی اور کر رہا ہے، تو میرا جواب سن۔ میں اس بہشت میں خود سے آیا ہوں۔ مجھے یہاں کا راستہ معلوم ہوگیا

ہے، میں یہاں تنہا نہیں آیا۔ میرے ساتھ کئی آدمی تھے۔ تو میرا جواب یہاں کے منتظمین تک پہنچا دے۔ وہ مجھے یہاں نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ سرزمینِ بہشت میں وہ خون نہیں بہا سکتے۔ اگر بہائیں گے تو وہ سادہ لوح بہشتی مہمان کیا سوچیں گے جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چند دنوں کے لیے یہاں داخل کیے گئے ہیں۔''

ذنوبیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، وہ کہہ رہی تھی۔

''جبار! تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ بہشت نہیں جہنم ہے جہاں انسانی روحوں کو گناہ و معصیت کی آگ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہاں عورت کی کوئی عزت نہیں۔ آزاد دنیا کی وہ عورت جو بازاری کہلاتی ہے، وہ اس بہشت زار کی عورت سے بہتر ہوتی ہے۔ اسے اپنے آپ پر اختیار تو ہوتا ہے لیکن بہشت زار کی عورت مجبورِ محض ہوتی ہے۔ تم نے اس گناہ کی سرزمین کو سمجھ لیا ہے اس لیے شیخ کے آلۂ کار تمہیں ہلاک کر دینا چاہیں گے۔ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ خدا کے لیے اپنی دنیا میں واپس چلے جاؤ۔ اب میں تمہارے کام کی نہیں رہ گئی۔ میں اور یہاں کی ساری عورتیں شاہراہ کے مانند ہیں۔ سادہ لوح، فریب خوردہ نوجوانوں کی گزرگاہیں۔''

ذنوبیہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ شاید طاہرہ اس کی باتیں سن رہی تھی، وہ بھی اندر آ گئی، اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور ذنوبیہ کو تسلی دینے لگی۔ اس نے کہا۔

''مت رو ذنوبیہ۔ مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔'' اس کے بعد وہ جبار کی طرف گھوم گئی، بولی۔ ''میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی ہیں۔ ذنوبیہ نے تم سے جو کچھ پوچھا، وہ یہاں کے منتظمین کی طرف سے تھا۔ تم نے جو جواب دیا، وہ انہیں پہنچا دیا جاتا۔ میں ان کی ایک خاص کارکن ہوں۔ ابھی تک یہاں کی انتظامیہ کی وفادار تھی مگر میں تم دونوں کے معاملے میں انتظامیہ کا ساتھ نہیں دوں گی۔ ذنوبیہ نے کیا پوچھا، تم نے کیا جواب دیا۔ تم دونوں یہ سمجھ لو کہ میں نے کچھ نہیں سنا۔'' جبار سے بطورِ خاص کہا۔ ''تم یہاں سے نکلنا چاہو تو خاموشی سے نکل جاؤ۔''

جبار نے شکرگزار نظروں سے طاہرہ کو دیکھا، کہا۔

''میں اپنے ساتھ ذنوبیہ کو لے جا سکتا ہوں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے مگر میرا مشورہ یہ ہے جبار کہ تم تنہا جاؤ۔ تم ذنوبیہ کو نکال لے جانے میں کامیاب نہیں رہو گے۔ خواہ مخواہ مصیبت مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

جبار نے طاہرہ کا مشورہ مان لیا اور ذنوبیہ سے کہا۔

''ذنوبیہ! میری خواہش تو یہی تھی کہ تو بھی میرے ساتھ چلتی لیکن میں جانتا ہوں کہ تو اس سفر میں میرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ میں جلد ہی واپس آؤں گا اور تجھ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

ذنوبیہ نے مایوسی سے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ رہ کر کیا کروں گی۔ میں تو تباہ و برباد ہو چکی اور پھر کون جانے کہ اس سوا سو سالہ عنکبوتی جال سے کبھی نجات بھی مل سکے گی یا نہیں۔ کم از کم میں تو مایوس ہی ہو چکی ہوں۔''

طاہرہ نے جبار کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔ ''کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟ تم جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ اگر وہ لوگ آ گئے تو تم یہاں سے ہل بھی نہیں سکو گے۔''

جبار نے ذنوبیہ اور طاہرہ کو الوداع کہا اور خاموشی سے برج کو چھوڑ دیا۔ وہ جس راستے سے اس بہشتِ اعلیٰ میں داخل ہوا تھا، اسی سے باہر نکل گیا اور بہشتِ عام میں داخل ہو گیا۔ وہ تیزی سے اس غار کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا جہاں داخلے کے وقت وہ چند دربانوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ پہلے اس کے ساتھ دو ساتھی بھی تھے مگر اب وہ تنہا تھا۔

راستے میں اس نے حوروں کو نووارد احمق مہمانوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھا۔ جگہ جگہ اس نے گانے کی آوازیں سنیں۔ موسیقی میں شامل اور ڈوبی ہوئی آوازیں۔ سرخ و سفید دہکتے انگاروں جیسے چہروں کو بدصورت نوجوانوں کے سفاکانہ سلوک کا نشانہ بنتے دیکھا۔ اس نے حسین ترین مغنیاؤں کو عاشقانہ بلکہ فاسقانہ کلام گاتے سنا۔ دلکش مناظر اس کے پاؤں پکڑ رہے تھے مگر وہ کہیں رکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ اس نے اپنے پاجامے کے نیفے میں زہر میں بجھا ہوا خنجر چھپا رکھا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے لیے۔

جب وہ غار کے قریب پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ اس نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ دن کے اجالے میں اس غار میں نہیں داخل ہو گا۔ وہ غار کے قریب ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور رات کا انتظار کرنے لگا۔ اس کو معلوم تھا کہ غار کے نئے دربان پہلے سے زیادہ مستعد اور چوکس ہوں گے اور ان کو دھوکا دے کر نکل جانا بہت مشکل ہو گا۔

شب کے اندھیرے میں اس نے پیچھے چھوڑی ہوئی بہشت پر نظر ڈالی۔ بہشت کے گھروں اور برجوں میں روشن چراغ اور شمعوں کا نور دور سے بہت اچھا لگ رہا تھا حالانکہ بہشت یہاں سے دور تھی۔ شب کی سیاہی میں وہ چٹان کی آڑ سے نکلنے کا منصوبہ بنا ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

جبار کی جان ہی تو نکل گئی۔ وہ پیچھے مڑ کر اس شخص کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ آنے والا کون ہے؟ بہرحال یہ شبہ تو پیدا ہوا ہوگا ہی کہ وہ پکڑا گیا اور شاید اب اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا، وہ عزت واحترام سے ہوگا۔

کاندھے پر ہاتھ رکھنے والے نے پوچھا۔ ”تو کون ہے اور اس وقت کہاں جارہا ہے؟“

جبار نے جواب دیا۔ ”تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیوں آئے تھے؟“

پشت پر ہاتھ رکھنے والا دبی دبی ہنسی میں بولا۔ ”خوب خوب! میں جانتا تھا کہ تو ضرور آئے گا۔ اب ہم دونوں کی منزل آسان ہوجائے گی۔“

جبار اس آواز پر ہنسنے لگا اور اس کی اپنی آواز میں مردانگی آگئی۔ اس نے پوچھا۔ ”حسن کا کچھ پتا چلا؟“

دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”نہیں، اس کو بھلا دو۔ حسن کو بھول جاؤ۔ اب ہم دونوں کو کسی نہ کسی طرح جلد ازجلد یہاں سے نکل جانا ہے کیونکہ بہشت کی انتظامیہ کو ہماری بابت معلوم ہوچکا ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”اسد! سوچو تو سہی، غار کے دربانوں کو کس طرح راستے سے ہٹایا جائے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں نے دربانوں کی تعداد اور ان کے طریقہ دربانی کو معلوم کرلیا ہے۔ دربان کل چار ہیں اور دو دو مخالف سمتوں میں چل کر ذرا سی دیر کے لیے ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہیں۔“

جبار نے پوچھا۔ ”پھر ہم انہیں دھوکا کس طرح دیں گے؟“

اسد نے جواب دیا۔ ”میں پتھروں کی آڑ میں غار میں داخل ہوجاؤں گا اور پھر ہم دونوں جس طرف کنارے کنارے آگے بڑھیں گے، اس کے سامنے دوسری طرف پتھروں کی بارش کردیں گے۔ دربان دوڑ کر ادھر جائیں گے اور ہم دونوں اس عرصے میں آگے بڑھ جائیں گے اور شاید اتنے آگے بڑھ جائیں گے کہ ہمیں ان دربانوں کی پھر فکر نہیں رہے گی۔“

اسد نے اس ترکیب پر عمل کرکے دکھا دیا۔ اس نے غار کے باہری حصے میں پتھروں کی اتنی زور کی بارش کردی کہ چاروں دربان غار سے باہر نکل گئے اور اِدھر اُدھر کھنڈروں اور چٹانوں کے پیچھے تلاش اور جستجو میں لگ گئے۔ اس عرصے میں یہ دونوں غار میں داخل ہوکر کافی دور پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ وہ غار کی دوسری طرف نکل گئے۔

آسمان پر چاند نہیں تھا۔ گرد وغبار سے پاک آسمان پر بے شمار چھوٹے بڑے زیادہ روشن اور کم روشن ستارے جھلملا رہے تھے۔ ان کی روشنی میں ان دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ انہیں بہشت زار سے نکلنے کا بڑا دکھ تھا۔ بار بار یہی جی چاہتا تھا کہ وہ اس جنت ارضی میں واپس چلے جائیں، اگر انہیں موت کا خوف نہ ہوتا تو وہ وہاں سے اتنی جلدی نہ بھاگتے۔

صبح ہوتے ہوتے وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ گئے۔ کیونکہ انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ انہیں منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے کئی دن کیوں نہ لگ جائیں، وہ دن کی روشنی میں سفر نہیں کریں گے کیونکہ سورج کی روشنی میں انہیں بہت دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔

وہ پہلی بار جس چٹان کے پیچھے چھپے تھے، وہ درختوں میں چھپی ہوئی تھی اور کہیں سے بھی انہیں دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ یہاں اسد نے جبار سے پوچھا۔ ”تو بہشتِ اعلیٰ سے فرار کس طرح ہوا؟“

جبار نے پوری تفصیل بتادی، بولا۔ ”اگر طاہرہ میرا ساتھ نہ دیتی تو میں وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔“

اسد نے ذنوبیہ کا ذکر دلچسپی سے سنا، بولا۔ ”افسوس کہ میں اس سے نہیں مل سکا۔ تم نے اس کی بابت جو کچھ بتایا، اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ اپنا ذہنی توازن کھوچکی ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں مگر وہ بہشت زار میں لڑکیوں اور عورتوں کے کردار واعمال سے بہت زیادہ دل برداشتہ ہے۔ شاید یہ روگ اسے گھن کی طرح کھائے جارہا ہے۔“

اسد نے کہا۔ ”اگر یہ بات تھی تو تم اسے اپنے ساتھ لے آتے۔“

جبار نے جواب دیا۔ ”میں نے تو یہی چاہا تھا کہ ذنوبیہ کو اپنے ساتھ لے لوں مگر طاہرہ نے مجھے منع کردیا۔ اس نے کہا کہ ذنوبیہ تمہارے ساتھ ہوگی تو سفر مشکل ہوجائے گا۔ ہاں بس یہ کوشش کرو کہ جلد ازجلد واپس آؤ اور اسے اپنالو۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی زندگی اور اپنے طور طریقے بدل دوں۔ گوکہ اس میں پریشانیوں کا منہ زیادہ دیکھنا پڑے گا۔“

جبار کی آنکھیں بھر آئیں، رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”اسد! سچ بتانا کبھی تم پر بھی ایسا وقت پڑا ہے کہ تم اپنی مرضی اور خواہش کے خلاف فیصلے کرنے پر مجبور ہوگئے ہو؟“

اسد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ایسا کئی بار ہوا۔

بہشتِ اعلیٰ میں میری تو بس یہی خواہش تھی کہ میں تم کو اپنے ساتھ لے لوں اور یہ راستہ ہم دونوں مل جل کر طے کریں مگر اس وقت خدا کو یہ بات منظور نہیں تھی اور ہم دونوں الگ الگ سفر کر کے بالآخر ایک جگہ ایک دوسرے سے مل گئے۔''

دن بھر چھپے رہنے کے بعد جب رات ہوئی تو وہ چٹان کے پیچھے سے نکل کر آگے بڑھے۔ انہوں نے نہایت احتیاط سے سفر شروع کر دیا اونچے نیچے راستوں نے انہیں تھکا ڈالا مگر ان کے اس احساس نے ان میں حوصلہ اور ولولہ برقرار رکھا تھا کہ وہ ہلاکو خان کو اس بہشتِ ارضی تک پہنچا کر اس سے غیر معمولی داد و تحسین حاصل کریں گے۔ انہیں اپنے آپ ہی یہ یقین بھی تھا کہ ہلاکو خان ان سے اتنا زیادہ خوش ہو جائے گا کہ ان کی سابقہ غلطیوں اور گناہوں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے گا۔

ان کے قریب ہی سے چشمے کا شور سنائی دے رہا تھا لیکن وہ کر کچھ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ شور ان دونوں کو اپنی طرف بلا رہا تھا مگر یہ دونوں وہاں جا نہیں سکتے تھے کیونکہ چشمے کے آس پاس اس بات کا امکان تھا کہ شیخ الجبال کا کوئی آدمی یا چند لوگ وہاں موجود ہوں۔ اسد کو پیاس بھی لگ رہی تھی.. اس نے جبار سے کہا۔ ''کیا تم میرے لیے تھوڑا تازہ پانی لا سکتے ہو؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''لاسکتا کیا معنی! میں پانی لا کر دکھاؤں گا۔ جان ہے تو جہان ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔''

جبار چشمے کی طرف پانی لینے چلا گیا۔ رات کے اندھیرے میں چشمے تک کا سفر کرنا بہت دشوار تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ چشمے تک پہنچا تو اس نے وہیں کہیں قریب ہی کسی کے گنگنانے کی آواز سنی۔ وہاں چند آدمی آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ جبار سمجھ گیا کہ یہ لوگ شیخ الجبال کے تازہ شکار ہوں گے جنہیں کسی بھی طرح ہلاک کر دینا شاید ثواب کی بات ہو کیونکہ یہی شکار جب بہشت سے نکل کر اپنے شکار کی تلاش میں نکلیں گے تو اس وقت ان سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہوگا۔ اچانک گنگنانے کی آواز گانے میں بدل گئی اور ایک دلکش اور حسین آواز نے پورے ماحول پر ایک سحر سا طاری کر دیا۔ وہ اس آواز کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب گانا موقوف ہوا تو وہ چپکے چپکے چشمے تک گیا اور پانی بھر کر واپس آگیا۔

اسد پریشان ہو رہا تھا، اس نے پوچھا۔ ''دیر کہاں لگ گئی تھی؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''چند دہقان بہشت زار لے جائے جا رہے ہیں، میں ان کا گانا سننے لگا تھا۔''

اسد نے جی بھر کے پانی پیا اور رب کا شکر ادا کیا، کہنے لگا۔ ''اللہ انہیں غارت کرے۔ ہمیں جلد از جلد ہلاکو خان کے پاس پہنچنا چاہیے تاکہ اللہ کے بندے ان کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جائیں۔''

وہ رات سفر میں گزار کر صبح ہوتے ہوتے ایک بار پھر چٹان کے پیچھے چھپ گئے۔ اسی طرح کئی دن بعد وہ ان کوہستانی سلسلوں سے نکل کر کھلے میدان میں داخل ہو گئے۔ دونوں نیہ کی طرف چل پڑے کیونکہ انہیں راستے ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ ان دنوں شیخ الجبال اور ہلاکو خان کے درمیان نامہ و پیام بڑی شدت سے جاری ہے۔

گرد و غبار میں اٹے ہوئے چہرے جب ہلاکو خان کے لشکر میں پہنچے تو ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ جبار نے نور محمد حداد سے ملاقات کی۔ نور محمد حداد ان دونوں کو اپنے در پر کھڑا کر کے ہلاکو خان کے پاس چلا گیا۔ جبار اور اسد کو اس بات پر حیرت تھی کہ نور محمد حداد نے کچھ زیادہ دلچسپی اور عقیدت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

دوسری طرف نور محمد حداد ہلاکو خان سے عرض کر رہا تھا۔ ''حضورِ والا! دونوں درویش میری خوش قسمتی سے ایک بار پھر میرے پاس آگئے ہیں، ان کی بابت جو حکم ہو اس پر عمل کیا جائے۔''

ہلاکو خان کو حداد کی بات پر یقین نہیں آیا، بولا۔ ''حداد! کیا تو جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر یقین بھی رکھتا ہے؟''

حداد نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں مجھے اس کی سچائی پر پورا یقین ہے۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''کیا تو جانتا ہے کہ ان دونوں پر کون سا جرم عائد ہے؟''

حداد نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں یہ بھی جانتا ہوں۔ قتل کا جرم۔''

ہلاکو خان نے اپنے چند سر پھرے سپاہیوں کو حداد کے ساتھ کر دیا۔ بولا۔ ''ان دونوں کو اسی وقت میرے پاس لایا جائے۔''

ہلاکو خان کے سپاہیوں نے اسد اور جبار کو گرفتار کر لیا۔ حداد انہیں گرفتار ہوتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

جبار نے پوچھا۔ ''نور محمد حداد! یہ تو نے کیا کیا؟''

دوسری طرف سے اسد نے کہا۔ ''حداد! تو نے شاید ہمیں پناہ دی تھی؟''

نور محمد نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں پناہ نہیں دی

تھی۔ ہاں تم مجھ سے یہ ضرور پوچھ سکتے ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں تمہارے اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔''

منگول سپاہی انہیں فوراً ہلاکو خان کے پاس لے جانا چاہتے تھے مگر حداد نے کچھ دیر کے لیے انہیں روک لیا۔ وہ ان دونوں کی زبان سے کچھ سننا چاہتا تھا۔

حداد نے پوچھا۔ ''تم دونوں نے بتایا نہیں کہ تم نے پچھلے دنوں اپنے آقاؤں کے ساتھ انسانیت سوز نازیبا سلوک کیوں کیا تھا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''وہ ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ اگر ہم انہیں نہ مارتے تو وہ ہمیں مار دیتے۔''

''منگول سردار نے تمہارا پیچھا کیا تھا یا تم دونوں کو... بہ عافیت شہر کے باہر تک پہنچانے کی خواہ مخواہ ذمے داری قبول کر لی تھی؟ میں یہ سب کچھ پہلے ہی معلوم کر چکا ہوں، تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔'' حداد بہت زیادہ خفا تھا۔

اسد نے جواب دیا۔ ''حداد! تم جس طرح چاہو سوچو، بات صرف اتنی سی ہے کہ اگر ہم اس منگول سردار اور مسلمان تاجر کو اپنے ہاتھ سے نہ مارتے تو وہ دونوں ہمیں قتل کر دیتے اور اگر ہم دونوں قتل کر دیے جاتے تو ذرا تم سوچ کر بتاؤ کہ اس وقت میرا خون بہا کون لیتا، ہماری طرف سے یہ مقدمہ کون لڑتا؟''

اسد نے خاموشی اختیار کر لی تو منگول سپاہی نے کہا۔ ''میں ان دونوں ناشکروں کو اپنے آقا، ہلاکو خان کے پاس لے جا رہا ہوں، جس کو ان دونوں سے ہمدردی ہو وہاں پہنچ جائے۔''

وہ ان دونوں کو لے کر ہلاکو خان کے پاس پہنچ گیا۔ ہلاکو خان بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ جب ان دونوں کو اس کے سامنے پہنچایا گیا تو ہلاکو خان غصے سے دانت پیسنے لگا، پوچھا۔ ''ناہنجارو! تم کس امید پر دوبارہ یہاں چلے آئے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''محترم ایل خان! ہم آپ کے پاس ایک خوشخبری لے کر آئے ہیں۔ آپ اگر ہمیں قتل کرا دینا چاہتے ہیں تو بشوق اسی وقت قتل کرا دیں اور اگر وہ خوشخبری جس کا میں نے ذکر کیا، سننا چاہتے ہیں تو ہمیں زندہ رکھیں اور اسے ہماری زبان سے سن لیں۔''

ہلاکو خان نے جبار کی طرف دیکھا، جبار نے کہا۔ ''خانِ محترم! ہم نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے، خلوص سے کیا ہے۔ پہلے ہم دو بار یہاں آ چکے ہیں۔ اس وقت ہم شیخ الجبال کے نمائندے ہوتے تھے اور آپ کے پاس آنے کی غرض و غایت یہ ہوا کرتی تھی کہ آپ کو قتل کر دیں کیونکہ شیخ الجبال ہم سے یہی کام لینا چاہتا تھا۔ جب ہم آپ کو قتل نہیں کر سکے، تو کھسیا کر آپ کے ایک سردار ہی کو قتل کر دیا۔ جب ہم قتل کا جرم کر کے چھپتے پھر رہے تھے تو ہماری ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہو گئی جو شیخ الجبال کے چکر میں نیا نیا آیا تھا۔ ان نے شیخ الجبال کی بہشت ارضی میں چند دن گزارے تھے اور جب اسے واپس لایا گیا تھا تو اس نے جنت ارضی کا راستہ یاد کر لیا تھا۔ اس نے ہنس کر ہمیں یہ بتایا کہ شیخ الجبال حشیش پلوا کر اپنے ماننے والوں کو جس بہشت کی سیر کراتا ہے، وہ کہیں اوپر آسمانوں میں نہیں، اسی زمین پر ہماری دسترس میں موجود ہے۔''

ہلاکو خان نے یہ سب بڑی دلچسپی سے سنا، پوچھا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر تم دونوں کو بہشت زار کا راستہ معلوم ہو گیا ہے، تو ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''آپ کو اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ آپ چشم زدن میں اس بہشت میں داخل ہو جائیں گے جہاں پہنچنے کی بڑے بڑے حکمراں خواہش کیا کرتے ہیں۔ آپ انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ بہشت میں سے اپنی پسند اور خواہش کی لڑکیاں حاصل کر سکیں گے۔ آپ اس اہم اور پیچیدہ معاملے کو سرسری نہ سمجھیں، نہایت اہم اور خاص معاملہ ہے یہ۔''

ہلاکو خان کے سخت پتھر جیسے دل پر اثر ہو چکا تھا۔ وہ پسیج چکا تھا، پوچھا۔ ''پھر میں اس جنت میں کب اور کتنے آدمیوں کے ساتھ داخل ہو سکوں گا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''اگر خانِ محترم کو میری بات گراں نہ گزرے تو میں ایک حقیر سا مشورہ دینا چاہوں گا۔''

ہلاکو خان نے منہ بنایا۔ ''دے مشورہ، میں سنوں گا۔''

جبار نے عرض کیا۔ ''خانِ محترم! آپ کا دبدبہ چہار دانگ عالم میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ شیخ الجبال کو ایک سخت خط لکھیں۔ اس میں شیخ الجبال کو صاف صاف لکھ دیجیے کہ وہ اپنے تمام قلعے برباد کرا دے، گرا دے اور آپ کو اپنی بہشتِ ارضی تک پہنچا دے۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''اس کا فائدہ؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''خانِ محترم تو جانتے ہی ہیں کہ ہمیں شیخ الجبال نے آپ کو قتل کرا دینے کی غرض سے بھیجا تھا۔ اب آپ ہم دونوں کو اپنا قاصد بنا کے شیخ الجبال کے پاس بھیج دیجیے۔ اس طرح آپ شیخ الجبال کو خود اس کی نظر میں ذلیل و خوار کر دیں گے۔''

ہلاکو خان مسکرایا۔ ''جاودانی نیلے آسمان کی قسم! تم

دونوں بہت چالاک معلوم ہوتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس طرح تم دونوں میرے چنگل سے نکل جانے کی تدبیر کر رہے ہو؟''

اسد نے کہا۔'' محترم خان! آپ یہ تو جانتے ہیں کہ ہم دونوں آپ کے لشکر میں اپنی مرضی سے آئے ہیں۔ ہم اگر یہاں نہ آنا چاہتے تو ہمیں یہاں کون لاسکتا تھا۔''

ہلاکو خان کے دل پر یہ دلیل اثر کرگئی، پوچھا۔''تم دونوں بہشتِ ارضی کی سیر کر آئے؟''

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔''جی محترم خان!''

''تمہیں اس کا راستہ معلوم ہے؟''

''معلوم ہے۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔''اور وہ نوجوان کہاں ہے جس نے تم دونوں کو اس بہشت تک پہنچایا تھا؟''

جبار نے جواب دیا۔''حضورِ والا! ہم اسے بہشت زار سے اپنے ساتھ واپس نہیں لاسکے۔''

ہلاکو خان سوچتا رہا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد ان دونوں سے مخاطب ہوا۔''بہر حال میں تم دونوں پر اعتبار کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو میں تمہارا جہنم تک پیچھا کروں گا۔''

جبار نے عرض کیا۔''میں آپ کو کس طرح دھوکا دوں گا۔ ذرا آپ اس نازک پہلو پر غور تو فرمائیں۔ جب ہم دونوں آپ کے ایلچی بن کر شیخ الجبال کے روبرو حاضری دیں گے، اس کے دل پر کیا اثر ہوگا...... وہ پاگل ہوجائے گا۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔''شیخ الجبال کی کوئی کمزوری؟''

اسد نے جواب دیا۔''عورت ہی اس کی کمزوری ہوگی۔''

ہلاکو خان نے کافی دیر تک غور وخوض کرنے کے بعد حکم دیا۔''ان دونوں کو آزاد کر دیا جائے۔''

جب ان دونوں کو آزاد کر دیا گیا تو اس نے ان دونوں کو اپنے دربار میں دائیں جانب بٹھا دیا۔ ان دونوں کی شراب اور گھوڑی کے دودھ سے تواضع کی گئی۔ کھانے کے لیے خشک میوہ دیا گیا۔ ان دونوں نے ہلاکو خان سے کہا۔''کیا ہمیں کھانا بھی مل سکتا ہے؟''

ہلاکو خان نے پوچھا۔''تواضع کے بعد کھانا؟ یہ تو بڑی بے تکی بات ہے۔''

جبار نے عرض کیا۔''حضورِ والا! ہمیں نمکین چیز درکار ہے۔''

ہلاکو خان نے حکم دیا۔''ان بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے۔''

کچھ دیر بعد وہیں کھانا پیش کر دیا گیا۔ ان دونوں کی بھوک نے جیسے معدے میں دراڑیں پیدا کردی تھیں۔ دونوں نے ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر خوب چبا چبا کر کھانا کھاتے رہے۔ اس کے بعد کھڑے ہوتے ہوئے ہلاکو خان سے کہا۔''خانِ محترم! ہم دونوں نے آپ کا نمک کھالیا ہے اس لیے اب کبھی بھی ہم نمک حرامی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔''

ہلاکو خان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ کوئی شخص کسی کا کھانا کھا کر کس طرح غلام بن سکتا ہے۔

☆☆☆

ہلاکو خان نے شیخ الجبال کو فرمان جاری کیا۔

''میں ہلاکو خان، تولی خان کا بیٹا اور خانِ اعظم چنگیز خان کا پوتا تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے تمام قلعے مسمار کرادے کیونکہ ان قلعوں سے قاتلوں کو بھیج کر تو اپنے مخالفین کو قتل کرادیتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تو سادہ لوح دہقانوں کو حشیش پلا کر اپنی بہشتِ ارضی میں پہنچادیتا ہے جہاں حسین ترین لڑکیوں کو حوریں اور نوجوان لڑکوں کو غلمان کہا جاتا ہے۔ تو سادہ لوح نوجوانوں کو بہشت کی چاٹ لگا دیتا ہے اور وہ اسی کے خمار میں بڑے بڑے کام کر گزرتے ہیں۔ میں اس بہشت کو دیکھنا چاہتا ہوں جو تیری ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تو اپنے قلعوں پر بہت نازاں ہے۔ اس لیے میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے تمام قلعوں کو مسمار کرادے اور بھاگ کر میری خدمت میں آجا تا کہ تو میری قدم بوسی کی عزت حاصل کر سکے۔

''دیکھنا خبردار، جو میری حکم عدولی کی کیونکہ جس نے بھی میرا حکم نہیں مانا، پریشان اور خوار ہوا۔ اسی طرح جس نے خود کو بڑا عظیم اور طاقتور سمجھا ذلیل ہوا۔ اگر تو نے اپنے آپ کو طاقتور اور ناقابلِ تسخیر سمجھا تو پھر پتا نہیں کیا ہوگا۔ اس کا علم نہ تو ہمیں ہے نہ تمہیں۔ بس جاودانی نیلے آسمان کو ہے۔''

جبار اور اسد۔۔۔ ہلاکو خان کا فرمان لے کر الموت کے قلعے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں شیخ الجبال رہتا تھا۔ یہ ایک دشوار گزار قلعہ تھا۔ ان دونوں کو یہ سوچ سوچ کر بڑا مزہ آرہا تھا کہ جب شیخ الجبال ان دونوں کو ہلاکو خان کے ایلچی کے حلیے میں دیکھے گا تو کیا کہے گا اور کیسا جز بز ہوگا۔ دونوں ہی شیخ الجبال کو ستانا اور ذہنی اذیت پہنچانا چاہتے تھے۔

جب وہ دونوں شیخ الجبال کی حدود میں داخل ہو گئے تو پہچاننے والوں نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے بعض نے انہیں بہت برا بھلا کہا اور یہ گری بات بتائی کہ وفاداری شریفوں کا وصف ہے اور جو وفادار نہیں، وہ ذلیل د

خوار ہے۔ شیخ الجبال کے پرستاروں نے ان دونوں کو شرم دلائی اور انہیں خوب برا بھلا کہا انہوں نے ان دونوں کو منع کیا کہ وہ اپنا ارادہ بدل دیں اور شیخ الجبال کی خدمت میں ہلاکو خان کے قاصد بن کر نہ جائیں لیکن یہ دونوں کسی کی پروا کیے بغیر شیخ الجبال کی خدمت میں پہنچ گئے۔ شیخ الجبال کے آدمیوں نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ تم دونوں ہلاکو خان کے قاصد بن کر آئے ہو؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں ہم ہلاکو خان کے قاصد بن کر آئے ہیں۔''

شیخ الجبال کے معتمد نے پوچھا۔ ''کیا تو اپنے شیخ کے حلقۂ اطاعت سے نکل گیا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، اطاعت اس کی کی جاتی ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔''

معتمد نے اسد سے پوچھا۔ ''پچھلے دنوں بہشت زار میں چند مفسدوں نے بڑی افراتفری پھیلائی۔ سننے میں آیا ہے ان میں تم دونوں بھی شامل تھے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''ہاں، ان میں ہم دونوں بھی شامل تھے اور ہمیں اس وقت بہت افسوس ہوا جب ہمیں شیخ کی بہشت کی حقیقت معلوم ہوئی۔ ہمیں ایک ایسی بہشت میں بھیجا گیا تھا جہاں حوریں مردوں کے لیے شاہراہ بنی ہوئی ہیں۔ جہاں نوجوان حوروں کی گزرگاہ عبور کر کے واپس آجاتے ہیں۔''

معتمد نے پوچھا۔ ''اب تم دونوں یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''دنیا کے فاتح اور خان اعظم کے پوتے ہلاکو خان کا یہ پیغام لے کر کہ اپنے قلعے مسمار کر دو اور ہلاکو خان کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرو۔''

معتمد نے کہا۔ ''جہاں تک قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کا تعلق ہے، شیخ الجبال کے سامنے ایسی بات نہیں کہی جاسکتی۔ دنیا شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرتی ہے۔ میں یا یہاں کا کوئی شخص شیخ الجبال سے ایسی رکیک اور ہتک آمیز بات نہیں کر سکتا۔''

اسد نے کہا۔ ''تب پھر ہمیں شیخ الجبال کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ہم یہ خط خود پیش کر دیں گے اور جو بات شیخ الجبال سے کہی نہیں جاسکتی، وہ خود پڑھ لیں گے۔''

معتمد نے جبار کی طرف دیکھا، بولا۔ ''میرا خیال ہے تو زیادہ سمجھ دار ہے کیوں نہ تجھ کو شیخ الجبال کی خدمت میں پیش کر دیا جائے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''شیخ الجبال کی خدمت میں مجھ کو پیش کر دیا جائے یا میرے ساتھی اسد کو...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں بھی وہی کہوں گا جو میرا ساتھی اسد کہتا۔''

معتمد پہلے خود شیخ الجبال کے پاس گیا اور اس کو سفارت کی پوری تفصیل بتادی، بعد میں کہا۔ ''پہلے اس سفارت پر منہاج سراج کو مقرر کیا گیا تھا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا اور جب ایک بار پھر منہاج سراج سے یہ کہا گیا کہ وہ ہلاکو خان کے پاس جائے اور اس کو شیخ الجبال کی خواہش اور شرائط صلح سے مطلع کر دے تو منہاج سراج نے ہلاکو خان کے دربار میں دوبارہ جانے سے انکار کر دیا اور ہم نے منہاج سراج کو قید خانے میں ڈال دینے کا فرمان جاری کر دیا۔ آج کل منہاج سراج قید خانے کی ہوا کھا رہا ہے۔''

شیخ الجبال نے نہایت دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ ہلاکو خان کے بھیجے ہوئے قاصد بھی ہمارے فدائی رہ چکے ہیں؟''

معتمد نے جواب دیا۔ ''جی جناب والا! دونوں ہماری وفاداری اور جاں نثاری سے منحرف ہو چکے ہیں۔ یکسر منحرف ہو چکے ہیں۔''

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ''وہ کیا کہتے ہیں؟''

معتمد نے جواب دیا۔ ''وہ منگولوں کے بادشاہ ہلاکو خان کی طرف سے یہ فرمان لے کر آئے ہیں کہ آپ اپنے جملہ قلعہ جات میں بوس کر دیں اور...... اور......''

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ''اور...... اور کیا؟''

معتمد نے عرض کیا۔ ''آگے جو کچھ ہے، غلام اپنی زبان سے نہیں ادا کر سکتا۔''

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ''پھر وہ بات کون بتائے گا؟''

معتمد نے جواب دیا۔ ''سورج کی سرزمین کا بادشاہ ہلاکو خان سیدنا سے وہی خواہش کر رہا ہے جو سیدنا کو اپنے مریدوں سے ہو سکتی ہے، یعنی قدم بوسی کی سعادت۔'' پھر دریافت کیا۔ ''اگر اجازت دی جائے تو میں ان دونوں کو یہیں بلوالوں؟''

شیخ الجبال کی اجازت سے دونوں کو بلوالیا گیا۔ ان دونوں نے اندر داخل ہوتے وقت سلام کیا اور سامنے کھڑے ہو گئے۔

شیخ الجبال نے ان دونوں کو پہچان لیا، پوچھا۔ ''کیا تم دونوں نے اپنی وفاداریاں بدل دیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہاں، صرف اس لیے کہ ہم کو ایسے حالات سے گزرنا پڑا جن سے ہمارے اعتماد اور

تصورات کو نقصان پہنچا۔ ہمیں یہ جان کر بڑا دکھ پہنچا کہ ہم سے سچ نہیں بولا گیا۔''

شیخ الجبال نے اسد کی طرف دیکھا، گویا اپنا سوال دہرا رہا ہو۔

اسد نے کہا۔ ''میں بھی انہی میں سے ہوں جن کا اعتماد مجروح ہوا اور تصورات ٹوٹ پھوٹ گئے۔''

شیخ الجبال نے پوچھا۔ ''ہلاکو خان کیا چاہتا ہے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''آپ اپنے قلعوں کو زمین بوس کرا دیں اور خود منگول فاتح کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کریں۔''

شیخ الجبال نے اپنے معتمد سے پوچھا۔ ''کیا تو یہی قدم بوسی والا حصہ ادا کرنے سے شرمار ہا تھا؟''

معتمد نے اثبات میں سر ہلا دیا کیونکہ وہ اس کا اپنی زبان سے اقرار کرنا اپنے سیدنا کی تذلیل سمجھتا تھا۔

شیخ الجبال نے کہا۔ ''کبھی کبھی آفتاب کو بھی گہن لگ جاتا ہے کیونکہ خدا کی شان، برتری، بڑائی اور عظمت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب دوسری فانی بڑی چیزیں حالات وقت اور اپنی بدقسمتی سے کمتر یا کم شان ہو جاتی ہیں۔ خدا لافانی اور لازوال ہے۔ ہم سب فانی اور زوال پذیر ہیں۔''

اس کے بعد شیخ الجبال نے اپنے معتمد سے ہلاکو خان کے نام جواب لکھوا دیا۔

''منجانب بندۂ خدا رکن الدین خورشاہ بنام ہلاکو خان بن تولی خان بن چنگیز خان فاتح شرق و غرب۔ میں آپ کی خوشنودی کے لیے ایک قلعے کے سوا سبھی کو مسمار کرا دوں گا اور یہ ایک قلعہ، قلعہ الموت ہے، میرا اپنا قلعہ، جہاں میں رہتا ہوں۔ آپ کی قدم بوسی کے لیے میں نے پہلے اپنے بیٹے کو آپ کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ مزید اصرار پر میں نے اپنا بھائی بھی آپ کے پاس روانہ کر دیا اور جب یہ محسوس کیا گیا کہ آپ اس سے بھی مطمئن نہیں ہیں تو میں نے اپنا دوسرا بیٹا بھی آپ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اب آپ اصرار فرما رہے ہیں کہ میں خود حاضر ہو جاؤں لیکن میری خواہش یہ ہے کہ مجھ کو اس حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔ ورنہ بصورت دیگر میں خود حاضر ہو جاؤں گا لیکن اس صورت میں جبکہ مجھے یہ یقین دلا دیا جائے کہ مجھے وہاں زیادہ دنوں تک نہیں روکا جائے گا اور یہ کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ میں محفوظ و مامون رہوں گا۔''

اسد نے پوچھا۔ ''کیا آپ حاضری دینے کے لیے تیار ہیں؟''

معتمد نے جواب دیا۔ ''مکتوب بنام ہلاکو خان میں یہ سب لکھ دیا گیا ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''میں مکتوب کی بابت نہیں پوچھ رہا کہ اس میں کیا کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا شیخ الجبال خود بنفسِ نفیس قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے پر آمادہ ہو چکے ہیں؟''

معتمد نے کہا۔ ''تم دونوں اپنی حیثیت کو نہ بھولو۔ ایک حکمراں نے دوسرے حکمراں کو جو لکھنا چاہا، لکھ دیا اور پھر یہ کہ ہمارے سیدنا ہلاکو خان کو شرفِ میزبانی ضرور بخشیں گے۔''

جبار نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ شرفِ میزبانی کسے کہتے ہیں لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہلاکو خان کے دربار میں جو بھی جاتا ہے، اسے شرفِ قدم بوسی خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔''

معتمد نے ان دونوں کو ڈانٹا۔ ''تم دونوں کو سیدنا کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دو حکمراں چکی کے دو پاٹ کی طرح ہوتے ہیں، ان کے بیچ میں جو آئے گا پس جائے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم دونوں کا شاید یہی حشر ہوگا۔''

جبار نے جواب دیا۔ ''ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا سیدنا کیا ہے اور ہلاکو خان کیا ہے۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا شیخ الجبال ہلاکو خان کی خدمت میں حاضری دے کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے پر آمادہ ہے یا نہیں؟''

شیخ الجبال نے کہا۔ ''مجھے جو کچھ کہنا تھا، ہلاکو خان کے جوابی مکتوب میں لکھوا دیا ہے۔''

اسد نے جبار کو سمجھایا۔ ''ہمارا کام ختم ہوا۔ اس کے بعد کا کام منگول فاتح کا ہے۔''

شیخ الجبال خاصا سہما ہوا تھا، وہ جبار اور اسد کی خوشامد پر اتر آیا، بولا۔ ''تم دونوں کو مذہبی اور وطنی عصبیت سے کام لینا چاہیے۔ یہ وحشی، جو ہزاروں میل دور سے یہاں آئے ہیں ہمارے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ آج جو لوگ ان وحشیوں کا ساتھ دے رہے ہیں، کل پچھتائیں گے کیونکہ ان کے ہاں غداروں کو معاف نہیں کیا جاتا۔ تم دونوں معلوم نہیں کیوں اس وحشی کی اطاعت اور وفاداری میں سرگرمِ عمل ہو..... خدا تمہیں معاف کرے۔''

معتمد نے شیخ الجبال کو مشورہ دیا۔ ''سیدنا کا رحم اور مروت قابلِ ستائش ہیں، اگر یہ معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں نتائج کی پروا کیے بغیر ان دونوں کو قتل کرا دیتا۔ جو کام کل ہلاکو خان انجام دے گا، میں اسے آج ہی کر گزرتا۔''

جبار کو غصہ آ گیا، معتمد کو برا بھلا کہنے لگا۔ ''میں تیرا یہ

پیغام ہلاکو خان کو زبانی پہنچا دوں گا۔ شیخ الجبال! جب کسی پر برا وقت آتا ہے تو اس کے اعضا تک ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ معتمد جو آپ کا ایک بازو ہے، آپ کا ساتھ چھوڑ چکا ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا اثر آپ پر پڑے گا۔''

اسد نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''ہمارا کام ختم ہوا، ہم یہاں جتنی دیر رکیں گے، تلخیاں بڑھتی جائیں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب واپس چلیں۔''

دونوں اسی وقت شیخ الجبال کے قلعے سے نکل کر نیہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کے جاتے ہی شیخ الجبال اپنے معتمد پر برس پڑا۔ ''میں بات بنانے کی کوشش کر رہا تھا، تم نے اپنے ایک جملے سے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔ معلوم نہیں کب تمہیں عقل آئے گی۔ اگر ہماری ساری باتیں ہلاکو خان کے علم میں آگئیں تو ہمیں اس سے رحم اور مروت کی شمہ بھر توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ تو نے ہماری موت کے محضر نامے پر کتنی آسانی سے دستخط کر دیے۔''

معتمد نے کہا۔ ''سیدنا اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری خوشامد درآمد سے بات بن جائے گی تو یہ ہماری بھول ہے۔ ہماری خوش فہمی یا غلط فہمی ہے۔ ہماری قسمتوں کا فیصلہ کب کا لکھا جا چکا ہے۔ ہلاکو خان وہ فیصلہ جب چاہے گا، سنا دے گا۔''

شیخ الجبال کو اچانک اپنے وزیر نصیر الملک طوسی کا خیال آگیا۔ معتمد سے پوچھا۔ ''یہ نصیر الملک طوسی کہاں چلا گیا؟ میں اس سے چند مشورے کرنا چاہتا ہوں۔''

معتمد مسکرایا، بولا۔ ''جیسا کہ ابھی ذرا دیر قبل سیدنا نے فرمایا تھا کہ جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو اس کے اعضا تک اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ نصیر الملک بھی آپ کا ایک بازو تھا۔ اس نے بساطِ شطرنج پر بچھائے گئے مہروں کا جائزہ لیا تو پتا چلا شہ کمزور پڑ چکی ہے اور مات کے سوا کسی بات کا امکان ہی نہیں رہ گیا تو اس نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور ہلاکو خان کے سایۂ عاطفت میں چلا گیا۔''

☆☆☆

جبار اور اسد، شیخ الجبال کا جواب لے کر ہلاکو خان کی خدمت میں پہنچ چکے تھے۔ ہلاکو خان کو شیخ الجبال کا جواب بالکل ناپسند ہوا۔ ''اس سے بہتر تو یہ تھا کہ خط کا جواب ہی نہ دیا جاتا۔''

جبار اور اسد نے ہلاکو خان کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے مگر ہلاکو خان کو ان دونوں کی کسی بات سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بس یہی پوچھا۔ ''مجھ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خورشاہ یہاں میرے پاس آئے گا یا نہیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''شاید نہیں کیونکہ وہ آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہتا ہے۔''

ہلاکو خان نے اسد کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''تو کیا کہتا ہے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ وہ زبان کو اینٹھا اینٹھا کر باتیں کر رہا تھا جبکہ اس کے معتمد نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم دونوں آپ کی بے جا طرف داری سے باز نہ آئے تو وہ ہم دونوں کو قتل کرا دے گا۔''

ہلاکو خان کو غصہ آگیا۔ اس نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کے نامی گرامی فوجی سردار قط بوغا کو بلوایا جائے۔ ذرا دیر بعد قط بوغا حاضر ہوگیا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''قط بوغا! تو نے اب تک کتنی جنگوں کی سرداری کی ہے؟''

قط بوغا نے جواب دیا۔ ''تقریباً اڑتیس جنگوں کی اور مجھے فخر ہے کہ میں نے آج تک شکست نہیں کھائی۔''

ہلاکو خان نے اسے حکم دیا۔ ''خورشاہ سر اطاعت خم کرنے میں پس وپیش سے کام لے رہا ہے۔ میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو میمون وژ کا محاصرہ کر لے کیونکہ خورشاہ اسی قلعے میں مقیم ہے۔''

قط بوغا نے جھک کر ہلاکو خان کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلایا اور اسی وقت میمون وژ کے محاصرے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

خط کتابت کے ایک ہفتے کے اندر اندر خورشاہ شیخ الجبال نے اپنے قلعے کے برج سے منگول لشکر کو اپنے قلعے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یاک کی نو دموں کا پرچم ان کے آگے آگے تھا اور ان کے گھڑ سوار اپنے ہتھیاروں کو دھوپ میں چمچماتے نشیب و فراز کو عبور کرتے میمون وژ کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

شیخ الجبال کو یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اردو اس کے قلعے کا محاصرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہلاکو خان نے اس کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور شیخ الجبال کا مہمان بن کر بڑھا چلا آ رہا ہے۔

اس نے اپنے معتمد سے پوچھا۔ ''کیوں تیرا کیا خیال ہے؟ شاید ہلاکو خان میری مہمان نوازی کو اپنی خوش قسمتی تصور کرے گا کیونکہ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ہلاکو خان کا پرچم کشور کشائی آگے آگے ہے اور اس کا حفاظتی دستہ فتح مندی کے نشے میں چور نشیب و فراز کو عبور کرتا اور منزلوں کو روندتا کچلتا ہمارے قلعے کے سائے کی تلاش میں بڑھتا چلا آ رہا ہے۔''

معتمد نے بھی منگولوں کے اس لشکر کو اچھی طرح دیکھا

اور عرض کیا۔ ''سیدنا! میں نے اس لشکر کے عزائم میں سرکشی و تباہ کاری کے آثار دیکھے ہیں۔ مجھ کو تو ان کے ارادوں میں نیکی اور خیر سگالی کی جھلک تک نہیں نظر آرہی۔''

قط بوغا نے اپنی فوج میمون دژ کے چاروں طرف لگا دی اور اس کے بعد چند آدمیوں کو ہلاکو خان کے خط کے ساتھ قلعے کی طرف روانہ کر دیا۔ اس خط میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا تھا۔ اس خط کے ذریعے ہلاکو خان نے پوچھا تھا۔

''شیخ الجبال کو آخری موقع دیا جارہا ہے۔ کیا وہ ہماری قدم بوسی کے لیے نہیں حاضر ہوگا؟''

شیخ الجبال اتنا گھبرایا کہ اس نے فوراً ہی قط بوغا کو لکھ دیا۔

''تو اپنے بادشاہ ہلاکو خان کو مطلع کردے کہ میں اس کی ملاقات کو عنقریب اس کے پاس پہنچنے والا ہوں اور جیسا کہ اس نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ مجھے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچائے گا اور یہ کہ وہاں میری حیثیت ایک مہمان، معزز مہمان کی ہوگی۔''

چھ سو چون (654ھ) کے ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کو (20 نومبر 1256ء) خورشاہ اپنے قلعے سے باہر نکلا۔ حشم و خدم ساتھ تھا، قط بوغا کے ایک مخصوص دستے نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا اور یہ لوگ ہلاکو خان کے پاس روانہ کر دیے گئے۔ خورشاہ اور اس کے آبا و اجداد نے اپنے چھری بند فدائیوں کی وجہ سے جو شہرت حاصل کی تھی، اس نے ہلاکو کی سپاہ میں شوقِ دید اور تجسس پیدا کر دیا تھا۔ یہ لوگ خورشاہ کی گزرگاہ کے دونوں طرف کھڑے اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ رہے تھے جس نے اپنے آبا و اجداد کی سنت پر عمل کر کے مشرق کو لرزہ براندام کر رکھا تھا اور جس کے چھری بند فدائیوں کی ضرب سے کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی کہیں محفوظ نہ تھا۔ خورشاہ بھی منگولوں سے بہت متاثر تھا۔ اس نے کئی بار درپردہ یہ کوشش کی تھی کہ اپنے فدائیوں کے ذریعے ہلاکو خان کا کام تمام کرادے مگر ناکام رہا تھا۔ خورشاہ اپنی ناکامی کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس کھڑے ہوئے منگولوں کو دیکھ کر یہ اثر لیا کہ شاید ہلاکو خان نے اس کے استقبال اور پیشوائی کی خاطر انہیں خورشاہ کی گزرگاہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ منگول عورتیں اور لڑکیاں نوجوان خورشاہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ انہی میں جبار اور اسد بھی موجود تھے۔ جب خورشاہ ان دونوں کے پاس سے گزرا تو یہ دونوں باطنی بادشاہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جبار نے کہا۔ ''کیا ہم نے آپ کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ ہلاکو خان آپ کو بلائے بغیر نہیں رہے گا اور آپ کو ایک نہ ایک دن منگول فاتح کی قدم بوسی کی سعادت ضرور حاصل کرنا ہوگی۔''

خورشاہ نے اپنی سواری رکوا دی اور جبار کو اپنے قریب بلوا کر پوچھا۔ ''ابھی ابھی تو کچھ کہہ رہا تھا؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں یہ کہہ رہا تھا کہ منگول فاتح ہلاکو خان ذرا ٹیڑھے مزاج واقع ہوا ہے اور وہ جو کچھ اپنے دل میں طے کر لیتا ہے، کر کے رہتا ہے چنانچہ آپ کو اس کی قدم بوسی کے لیے آنا ہی پڑ گیا۔''

خورشاہ نے پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جبار......''

خورشاہ نے پوچھا۔ ''جبار! خدا تجھے خوش رکھے، ذرا یہ تو بتا کہ میری گزرگاہ کے آس پاس یہ لوگ کیوں کھڑے کیے گئے ہیں؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''شاید آپ کے استقبال کی خاطر اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ آپ کو دیکھنے کے لیے اپنی مرضی سے کھڑے ہو گئے ہوں۔''

خورشاہ منگول عورتوں اور لڑکیوں کو نہایت شوق اور انہماک سے دیکھ رہا تھا، جبار سے پوچھا۔ ''ان عورتوں اور لڑکیوں کا دین کون سا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''شاید یہ لوگ نیلے آسمان کو جاودانی مانتے ہیں۔''

خورشاہ نے ایک خوب صورت منگول عورت کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ جب وہ پاس آگئی تو اس سے پوچھا۔ ''کیا تجھے فارسی زبان آتی ہے؟''

منگول عورت کے چہرے پر لاعلمی کی وحشت اور پریشانی کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے اپنے آس پاس موجود مردوں کی طرف دیکھا۔ گویا پوچھ رہی ہو کہ یہ عجیب و غریب شخص کیا پوچھ رہا ہے؟

ایک مسلمان نے اس عورت کو بتایا کہ چھری بندوں کا بادشاہ پوچھ رہا ہے کہ کیا تجھ کو فارسی زبان آتی ہے؟

منگول عورت نے نفی میں گردن ہلا دی۔

خورشاہ نے پوچھا۔ ''کیا تو شادی شدہ ہے؟''

منگول عورت نے ایک بار پھر مسلمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مسلمان نے جواب دیا۔ ''یہ شخص پوچھ رہا ہے کہ کیا تو شادی شدہ ہے؟''

منگول عورت کو ہنسی آگئی، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جبار نے خورشاہ کو سمجھایا۔ ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس لشکر میں آپ کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں ہے۔ پتا نہیں منگول فاتح آپ سے کیا سلوک کرے۔ آپ منگول عورتوں اور دوشیزاؤں پر اپنی حریص نظریں ڈال کر اپنے گناہوں اور خطاؤں میں اضافہ نہ کیجیے۔''

خورشاہ کو جبار پر غصہ آ گیا۔ تیوریوں پر بل ڈال کر جواب دیا۔ ''میں یہاں معزز مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ شاید منگول فاتح نے تیری عزت افزائی ضرورت سے زیادہ ہی کر دی ہے اسی لیے تو بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگا ہے۔ میں ہلاکو خان سے تیری شکایت کروں گا اور تجھے تیری گستاخیوں کی سزا دلواؤں گا۔''

جبار نے خورشاہ کی باتیں صبر و تحمل سے سنیں اور مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ لوگ چونکہ ایک سو اکہتر سال تک قلعوں سے باہر نہیں نکلے اس لیے آپ کو کچھ نہیں معلوم کہ رزم و بزم میں دوست اور دشمن کس طرح پیش آتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ منگول فاتح آپ سے کس طرح پیش آئے گا لیکن آپ کے اپنے اور آبائی اعمال نامے کی روشنی میں یہ اندازہ ضرور لگا سکتا ہوں کہ وہ چونکہ بہت برا ہے اس لیے اس کا عوض بھی اچھا نہیں ہوگا۔''

خورشاہ اس کم حیثیت شخص کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا، اس نے جبار کی طرف سے منہ پھیر لیا اور شاہراہوں کے دونوں طرف کھڑی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کو ہوس انگیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ چوڑے جبڑوں اور چھوٹی چھوٹی بھویں کھنچی ہوئی منگول دوشیزاؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے خورشاہ نے کہا۔ ''یہ بھی دنیا کا عجیب حسن ہے۔ اپنی دنیا سے یکسر مختلف، لیکن حسن ان میں بھی ہے، وہی دلکشی وہی رعنائی۔'' خورشاہ کی نظریں ایک منگول دوشیزہ پر جم گئیں، یہ پندرہ سولہ سالہ لڑکی خورشاہ کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اشارے سے اس کو اپنے قریب بلایا۔ لڑکی اس کے پاس چلی گئی۔

خورشاہ نے پوچھا۔ ''لڑکی! کیا تو شادی شدہ ہے؟''

لڑکی دوسروں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ خورشاہ کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ کسی نے ہجوم میں سے لڑکی کو خورشاہ کا مطلب سمجھا دیا۔ لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

خورشاہ اس جواب سے خوش ہو گیا، پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟''

لڑکی کو خورشاہ کے سوال کا مطلب سمجھا دیا گیا۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ''یاکی۔''

خورشاہ نے کہا۔ ''صورت شکل کی طرح تیرا نام بھی عجیب اور خوب صورت ہے۔''

لڑکی کو جب اس کا مطلب سمجھایا گیا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

خورشاہ نے پوچھا۔ ''تیرا باپ کیا کرتا ہے؟''

لڑکی نے ترجمان کے ذریعے جواب دیا۔ ''میرا باپ ہلاکو خان کے ذاتی اصطبل کا نگراں ہے۔''

خورشاہ نے لڑکی سے درخواست کی۔ ''یاکی! میں تیرے خان، ہلاکو کا معزز مہمان ہوں۔ کیا تو میرے ساتھ ہلاکو خان کے دربار تک چلے گی؟''

خورشاہ کے معتمد نے اسے سمجھایا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اتنی چھوٹی حرکت پر ہلاکو خان آپ کی بابت کیا سوچے گا؟''

خورشاہ نے معتمد کو ڈانٹ دیا۔ ''تو چپ رہ۔ بادشاہ بادشاہوں کو تحائف دیا کرتے ہیں، میں ہلاکو خان سے اس تحفے کو مانگ لوں گا۔''

جبار نے اپنے آپ پر لعنت کی کہ وہ کتنا احمق تھا، جس نے اس شیخ الجبال کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔

معتمد نے خورشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''سیدنا، ابھی ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم ہلاکو خان کے معزز مہمان ہیں یا قیدی۔ اس لیے آپ محتاط رہیے اور ایسی چھوٹی حرکتیں نہ کیجیے۔''

لیکن خورشاہ کو یاکی بہت زیادہ پسند آ گئی تھی۔ اس نے یاکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو اپنے پاس بٹھا لیا، بولا۔ ''تو بھی میرے ساتھ چل کیونکہ اگر تو اس وقت مجھ سے بچھڑ گئی تو میں تجھ کو کہاں تلاش کروں گا؟''

خورشاہ کی اس حرکت سے ایک ہلچل سی مچ گئی اور چند منگولوں نے اس لڑکی کو خورشاہ سے چھین لیا۔ خورشاہ بے بس ہو گیا۔ وہ منگولوں سے لڑ تو نہیں سکتا تھا۔ مجبوراً اپنی قسمت پر قانع ہو گیا۔ اس نے اپنے معتمد سے کہا۔ ''میں ان گستاخوں کی ہلاکو خان سے شکایت کروں گا۔ انہیں اپنے مہمان کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

معتمد نے رکے ہوئے قافلے کو چلنے کا حکم دیا۔ سفر جاری ہو گیا۔ ہلاکو خان کے خیمے کی طرف۔ ہلاکو خان استقبال کے لیے اپنے خیمے سے باہر نہیں نکلا۔ اس کے منگول سرداروں نے خورشاہ کو آگ کے دو طرفہ الاؤ کے بیچ سے گزارنا شروع کر دیا۔ انہوں نے خورشاہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ ان کی گرفت اتنی مضبوط اور سنگدلانہ تھی کہ خورشاہ تڑپ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ گرفت ڈھیلی کر دی

جائے لیکن اس کا یہ حکم نہیں مانا گیا۔

ہلاکو خان کے خیمے میں سرداروں کا ہجوم تھا۔ ہلاکو خان کے بیٹے اور دوسرے کئی قریبی رشتے دار بھی ہلاکو خان کے دائیں بائیں موجود تھے۔ یہ لوگ اس عجیب و غریب شخص کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے جو لوگوں میں شیخ الجبال کہلاتا تھا اور جس کے آباؤ اجداد نے تقریباً پونے دو سو سال سے اپنے چھری بند فدائیوں کے ذریعے بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور عالموں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔

ہلاکو خان نے اس کے لیے سب سے آگے اپنے تخت کے سامنے ایک چوکی بچھوا دی تھی۔ اس چوکی پر بھوری پوستین بچھی ہوئی تھی۔ ہلاکو خان نے حکم دیا کہ شیخ الجبال اس چوکی پر اس طرح بیٹھ جائے کہ اس کی پشت ہلاکو خان کی طرف نہ ہو۔

چوکی پر ابھی تک گاؤ تکیے نہیں رکھے گئے تھے لیکن شیخ الجبال جیسے ہی چوکی پر بیٹھا، اس کے دائیں اور سرہانے چھوٹے بڑے چار گاؤ تکیے بھی رکھ دیے گئے۔

شیخ الجبال اپنے آس پاس جیسی شکلیں دیکھ رہا تھا، وہ اس کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھیں۔ وہ ہلاکو خان کو نظر بھر کے نہیں دیکھ رہا تھا۔

ہلاکو خان نے شیخ الجبال سے شکایتاً کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تو نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا اور جب بھی میں نے تجھ کو طلب کیا تو نے خود آنے کے بجائے اپنے بیٹے یا بھائی کو بھیج دیا۔''

شیخ الجبال نے جواب دیا۔ ''میں خود بھی آسکتا تھا مگر ایک حکمراں کی ذمے داریاں دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں.... یہی ذمے داریاں میرے پاؤں پکڑے رہیں اور میں یہاں آنے میں تاخیر سے کام لیتا رہا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''تجھ کو طلب کرنے میں میرا مقصد بھی یہی تھا کہ میں تجھ کو تیری ذمے داریوں سے بری الذمہ کردوں کیونکہ تم لوگ بہت تھک چکے ہو۔ تقریباً پونے دو سو سال سے تیرے آباؤ اجداد نے یہ ذمے داریاں سنبھال رکھی تھیں۔ مجھ کو تم لوگوں پر رحم آیا اور یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں آرام کرنے کا موقع دوں۔''

شیخ الجبال پریشان ہو رہا تھا، اس نے پوچھا۔ ''میں یہاں کتنے دنوں تک مہمان رہوں گا؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''جب تک تو مہمان رہنا پسند کرے۔ میرا بڑا بھائی منگو خان قراقرم میں تیرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ بھی تجھ کو مہمان بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ میں عنقریب تجھ کو قراقرم روانہ کر دوں گا۔''

شیخ الجبال نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''میں میمون وژ کب واپس جاؤں گا؟''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''تو وہاں جا کے کیا کرے گا؟''

شیخ الجبال نے جواب دیا۔ ''وہاں میرے آدمی میرا انتظار کریں گے۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ تیری ذمے داریاں میرے آدمیوں نے سنبھال لی ہیں۔ اب تجھ کو کسی کی بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

شیخ الجبال ہلاکو خان کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ مایوسی سے کہا۔ ''حالانکہ مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھ کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچایا جائے گا۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ تجھ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ تجھ کو مطمئن رہنا چاہیے۔''

شیخ الجبال نے سوچا، اگر ہلاکو خان کے روبرو کوئی ایسی ویسی بات اس کے منہ سے نکل گئی تو یہ وحشی معلوم نہیں اس سے کیسا سلوک کر گزرے۔ شیخ الجبال دیر تک ان سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور خود شیخ الجبال منگول دوشیزہ یا کی کے تصور میں کھویا رہا۔

یہاں اسد اور جبار بھی موجود تھے لیکن ہلاکو خان نے ان دونوں کو شیخ الجبال کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ ہلاکو خان نے ان دونوں کو شیخ الجبال کے سامنے کھڑا کر دیا۔ شیخ الجبال سے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تو اپنے ان پرستاروں کو پہچانتا ہے؟''

شیخ الجبال نے ان دونوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا، بولا۔ ''انہیں میں نہیں جانتا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''لیکن یہ دونوں تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔''

شیخ الجبال ان دونوں سے پریشان ہو رہا تھا، اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ''میرا معتمد کہاں رہ گیا۔ میں اس کے بغیر خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''تیرا کوئی معتمد نہیں، تجھ کو تنہا رہنے کی عادت ڈالنا پڑے گی۔'' ہلاکو نے ایک بار پھر اسد اور جبار کو شیخ الجبال کے روبرو کھڑا کر دیا۔ ''انہیں پہچان۔ میں چاہتا ہوں تو ان دونوں کو پہچان لے کیونکہ ان کو پہچانے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اگر تو پسند کرے تو میں ان دونوں کو حکم دوں کہ تجھ سے اپنا تعارف کرا دیں۔''

شیخ الجبال نے کہا۔ ''میں انہیں پہچان کر کیا کروں گا۔ ہو سکتا ہے میں نے ان دونوں کو کہیں دیکھا ہو مگر پہچان اس لیے نہیں پا رہا ہوں کہ انہیں میں نے ہزاروں کے ہجوم

میں دیکھا ہوگا اس لیے یہ تو مجھے پہچان سکتے ہیں مگر میں انہیں نہیں پہچان سکتا۔''

ہلاکو خان نے اسد کو اشارہ کیا، پوچھا۔ ''کیا تو اس شخص کو پہچانتا ہے؟''

اسد نے جواب دیا۔ ''خوب پہچانتا ہوں، یہ شیخ الجبال ہیں، اپنے پرستاروں کے سیدنا۔ کبھی میں بھی ان کا پرستار تھا۔''

ہلاکو نے جبار سے پوچھا۔ ''اور تو..... تو بھی اس شخص کو پہچانتا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔ ''میں شیخ الجبال سے اچھی طرح واقف ہوں، میں اس کا پرستار رہ چکا ہوں۔ شیخ الجبال نے مجھے بہشت کی سیر کرائی تھی اور پھر وہاں سے نکال کر شیخ الجبال نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب میں منگولوں کے فاتح ہلاکو خان کو قتل کردوں گا تو مجھے مستقل بہشت میں بھیج دیا جائے گا۔''

شیخ الجبال نے سختی سے تردید کی۔ ''یہ جھوٹا ہے، میں اسے نہیں جانتا۔ میں اسے نہیں پہچانتا۔''

جبار نے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ یہاں آپ مجھے نہیں پہچانیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اور میرے جیسے بہت سے لوگ انہیں نہیں بھول سکتے۔'' جبار نے اپنے عہدِ فدائی کا چھرا اور لباس شیخ الجبال کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ''کیا آپ ان چیزوں کو بھی نہیں پہچانتے؟''

شیخ الجبال نے پھر سختی سے تردید کی۔ ''تو جھوٹا ہے، میں نے تجھ کو کبھی دیکھا تک نہیں۔ تو میرے اور منگول فاتح کے درمیان اختلاف اور منافرت کی خلیج نہ حائل کر۔'' پھر ہلاکو خان سے کہا۔ ''منگول فاتح! یہ شخص جھوٹا ہے اور پتا نہیں یہ ایسا کیوں کررہا ہے۔''

ہلاکو خان نے اپنے چہرے یا کسی بات سے یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ وہ شیخ الجبال کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے غیر متوقع طور پر دربار برخاست کردیا۔ شیخ الجبال کے لیے ایک نیا خیمہ نصب کردیا گیا تھا۔ اس کو اس نئے خیمے میں پہنچادیا گیا۔

☆☆☆

قطبوغا نے میمون دژ کا قلعہ زمین بوس کردیا اور شیخ الجبال کے محل کو لوٹ لیا۔ بہشت تک پہنچنے کے لیے جبار اور اسد کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ دونوں منگولوں کی فوج کے ساتھ بہشت میں داخل ہوگئے اور ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ حوروں اور غلمانوں کو پناہ کے لیے ادھر ادھر بھاگنا پڑا مگر ان سب کو حراست میں لے لیا گیا۔ جبار کو ذنوبیہ کی تلاش تھی۔ وہ منگولوں کو بہشتِ اعلیٰ میں لے گیا اور وہاں طاہرہ کو پالیا۔ اس نے طاہرہ سے ذنوبیہ کی بابت دریافت کیا۔ طاہرہ نے جواب دیا۔ ''ذنوبیہ ان عورتوں اور لڑکیوں میں شامل ہوگی جنہیں منگولوں نے حوروں کی حیثیت سے گرفتار کیا ہے۔''

حوروں کے گھروں سے سرکہ، شہد اور دودھ کے ذخائر برآمد ہوئے۔ ان میں کوئی چیز خراب نہیں ہوئی تھی۔ قطبوغا نے یہ ساری چیزیں، حوریں اور غلمان ہلاکو خان کی خدمت میں روانہ کردیے۔ دودھ کے خراب ہوجانے کا اندیشہ تھا اس لیے اسے فوج نے پی ڈالا۔

جب یہ چیزیں ہلاکو خان کے معائنے سے گزاری گئیں تو وہ انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے اس موقع پر شیخ الجبال کو اپنے ساتھ لیا۔ بہشت زار کی لڑکیاں، عورتیں اور غلمان قطاروں میں کھڑے کردیے گئے۔ ہلاکو خان، شیخ الجبال، جبار، اسد اور کئی دوسرے منگول سردار اس بہشتی مخلوق کا معائنہ کررہے تھے۔

ہلاکو خان نے شیخ الجبال سے کہا۔ ''تیرے آباؤاجداد کی بہشت اجاڑی جاچکی ہے اور وہاں کی مخلوق اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ کیا تو نے بھی کبھی اپنی جنت کی سیر کی ہے؟''

شیخ الجبال نفسیاتی طور پر پاگل ہوا جارہا تھا۔ اس نے کمال ڈھٹائی سے کام لیا اور اپنے آباؤاجداد کی قائم کردہ جنت اور اس کی مخلوق کو جاننے سے انکار کردیا، بولا۔ ''مجھے اس جنت کا کوئی علم نہیں، کیونکہ اگر ایسی کوئی جنت ہوگی تو مجھے اس کا علم نہیں۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''تجھ کو اس کا علم کیوں نہیں؟ کیا تو باطنیوں کا بادشاہ نہیں تھا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''بے شک میں ان کا بادشاہ تھا لیکن بادشاہ کو اپنے ملک اور رعایا کی بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوتا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''تو درست کہتا ہے، میں تیرے عذر کو قبول کرلوں گا مگر تجھ کو یہ ضرور بتانا پڑے گا کہ اتنا بڑا نظام اور اتنی شاندار تنظیم چلاتا کون تھا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''منگول فاتح! ہمارے بادشاہ نام کے بادشاہ ہوتے ہیں، ان کا سارا نظم ونسق وزراء کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے میرا وزیر اس تنظیم کا پورا علم رکھتا ہوگا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ”اگر تُو کہے تو تیرے وزیر نصیر الملک کو بھی یہیں بلوالوں؟“

خورشاہ نے جواب دیا۔ ”نصیر الملک کچھ عرصے کے لیے میرا وزیر رہا ہے پتا نہیں وہ آپ کے سوالوں کے جواب دے بھی سکے گا یا نہیں۔ ویسے آپ کی جیسی مرضی۔“

ہلاکو خان نے ایک حور سے پوچھا۔ ”کیا تو اس شخص سے واقف ہے؟“ اس نے خورشاہ کی طرف اشارہ کیا۔

حور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

حور نے جواب دیا۔ ”ہمارا سیدنا۔ دوسروں کا شیخ الجبال۔“

ہلاکو خان مسکرایا۔ خورشاہ سے پوچھا۔ ”اب تو کیا کہے گا؟“

شیخ الجبال نے جواب دیا۔ ”میں کیا کہوں گا۔ میرے برگشتہ مقدر نے جہاں تک مجھے پہنچا دیا ہے، وہاں میرا سایہ تک میری مخالفت ہی کرے گا۔“

ہلاکو نے خورشاہ کو اس بہشتی مخلوق کے سامنے دیر تک گھمایا پھرایا۔ محل کے آرام و آسائش کا پروردہ شیخ الجبال تھک کر چُور چُور ہو گیا۔ اس نے ہلاکو سے درخواست کی کہ اسے اور نہ گھمایا جائے، وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔

ہلاکو نے اس کی درخواست قبول کرلی اور خورشاہ کو اس کے خیمے میں بھیج دیا گیا۔ جبار کو بہشتی ہجوم میں ذنوبیہ مل گئی۔ اس نے ہلاکو خان سے درخواست کی۔ ”ذنوبیہ کو مجھے بخش دیا جائے۔“

ہلاکو نے اسے تسلی دی۔ ”ان ساری عورتوں اور لڑکیوں کی تقسیم جب عمل میں آئے تو ذنوبیہ تیرے حوالے کردی جائے گی۔“

خورشاہ کو پہلے تو امید تھی کہ اسے مہمان نوازی کے بعد واپسی کی اجازت دے دی جائے گی لیکن ہلاکو خان نے اسے روکے رکھا۔ اس قیدِ تنہائی میں بھی منگول دوشیزہ یا کی اسے برابر یاد آتی رہی۔ کئی بار اس نے یہ ارادہ کیا کہ ہلاکو خان سے یا کی کو مانگ لے مگر ہمت نہیں پڑی۔ وہ سارا سارا دن اپنے خیمے میں تنہا پڑا رہتا۔ ہلاکو کی طرف سے چند خدمت گار متعین کردیے گئے تھے مگر وہ ہر وقت اس کے پاس نہیں رہتے تھے۔ صبح اور شام حاضری دے کر وہ خورشاہ سے یہ پوچھ لیتے تھے کہ ان کے لائق کوئی خدمت ہو تو بتادی جائے چونکہ یہاں خورشاہ حشم و خدم سے محروم تھا اس لیے ان خدمت گاروں کے لیے کوئی کام بھی نہیں تھا۔

آخر کار ایک دن ان خدمت گاروں کا مصرف بھی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ جب ایک خدمت گار نے اس سے پوچھا۔ ”میرے لائق کوئی خدمت؟“

خورشاہ نے اسے روک لیا، بولا۔ ”تم رکو، ابھی جانا مت۔ تم مجھ سے باتیں کرو تاکہ میرا جی بہلے۔“

خدمت گار رک گیا، بولا۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔“

خورشاہ نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تو بتا سکتا ہے کہ میں ہلاکو خان کا کب تک مہمان رہوں گا؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں سے آپ کو قراقرم بھیج دیا جائے گا۔ کیونکہ وہاں خان کا بڑا بھائی منگو خان آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔“

خورشاہ نے پوچھا۔ ”قراقرم یہاں سے کتنی دور ہے؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”ہزاروں میل دور۔“

خورشاہ نے پوچھا۔ ”راستہ کیسا ہے؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”بہت ہی دشوار اور پُرخطر۔“

خورشاہ کچھ سوچنے لگا، پوچھا۔ ”کیا تجھے منگول زبان آتی ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں آتی تو ہے مگر کیوں؟“

خورشاہ نے رک رک کر تذبذب سے پوچھا۔ ”ایک بات اور بتا۔“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”پوچھیے، ضرور بتاؤں گا۔“

خورشاہ کچھ دیر خدمت گار کی شکل دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”ہلاکو خان کے ذاتی اصطبل کے نگراں کا نام کیا ہے؟“

خدمت گار نے پوچھا۔ ”کیا آپ یا کی کے باپ کو تو نہیں پوچھ رہے ہیں؟“

خورشاہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بے تابی سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یا کی کے باپ ہی کو پوچھ رہا ہوں۔“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”اس کا نام ہے یسار۔ مگر آپ اس کو کیسے جانتے ہیں؟“

خورشاہ اپنے دل کی بات کہہ نہیں سکا، بولا۔ ”اب تو ہلاکو خان نہ تو مجھ سے خود ملتا ہے اور نہ ہی مجھے اپنے پاس بلاتا ہے۔“

خدمت گار کو شبہ گزرا کہ شاید قیدی بادشاہ کا دماغی توازن جاتا رہا ہے جبھی یہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

خورشاہ نے اپنے خدمت گار کو خاموش دیکھا تو پوچھا۔ ”تو چپ کیوں ہو گیا؟“

خدمت گار نے کہا۔ ''معزز مہمان! میں یا کی کے باپ یسار کو اچھی طرح جانتا ہوں، اس کو آپ سے ایک شکایت ہے۔''

خورشاہ کا دل ایک بار پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پوچھا۔ ''اس کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''وہ کہتا ہے آپ نے اس کی بیٹی یا کی کو زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔''

خورشاہ نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ''ہاں! مجھے وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ میں اب بھی اس کو یاد کرتا رہتا ہوں، وہ بڑی حسین اور جاذبِ نظر لڑکی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر سرد آہ بھری۔ ''خدمت گار! کل جب میں بادشاہ تھا تو لڑکیاں میری نظرِ التفات کی بھوکی رہتی تھیں لیکن آج...... آج جبکہ میں اس چھوٹے سے خیمے میں قیدی کی زندگی گزار رہا ہوں تو کم حیثیت یسار یہ کہتا پھر رہا ہے کہ میں نے اس کی بیٹی کو زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔''

خدمت گار نے کہا۔ ''صرف یسار ہی نہیں، دوسرے لوگ بھی کچھ اس قسم کی باتیں کرتے پھر رہے ہیں۔''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''میں لوگوں کی پروا نہیں کرتا۔ میں یسار سے بھی نہیں ڈرتا۔ اگر تو میرا ایک کام کر دے تو میں تیرا شکریہ ادا کروں گا۔''

خدمت گار نے کہا۔ ''کون سا کام؟ بتائیے شاید میں کر سکوں۔''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''تو یا کی کے پاس چلا جا اور میری جانب سے یہ کہہ دے کہ خورشاہ تیرے فراق میں نحیف و نزار ہوا جا رہا ہے۔ میں اس منگول دوشیزہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

خدمت گار نے معذوری ظاہر کی۔ ''لیکن یہ باتیں یا کی سے میں کس طرح کہہ سکتا ہوں؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تو میرا یہ پیغام یا کی تک کس طرح پہنچائے گا لیکن تجھے پہنچانا ضرور ہے میرا یہ پیغام۔ اگر ہلاکو خان مجھ کو اپنے پاس بلاتا تو میں اس سے یا کی کو مانگ لیتا۔''

خدمت گار نے ایک بار پھر معذرت کی، بولا۔ ''خدا کے لیے یہاں اس قسم کی باتیں نہ کیجیے۔ ان باتوں کا میرے دل پر بڑا گہرا اور شدید اثر ہوتا ہے۔''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''مت گھبرا میرے دوست! تیرا کچھ بھی نہ ہوگا۔''

خدمت گار نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے مجھے اپنا دوست کہا ہے؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے تجھ کو اپنا دوست کہا ہے۔''

خدمت گار نے کہا۔ ''تب پھر میرا بھی یہ وعدہ ہے کہ میں یا کی سے مل کر اس سے آپ کی بات کروں گا اور کوشش کروں گا کہ وہ کم از کم ایک ہی بار سہی، آپ سے ملنے ضرور آ جائے۔''

خورشاہ نے فرطِ خوشی میں خدمت گار کو اپنے سینے سے لگا لیا، بولا۔ ''اگر تو نے میرا یہ کام کر دیا تو میں زندگی بھر تیرا احسان مند رہوں گا۔''

خدمت گار پھولا نہ سمایا۔ شیخ الجبال، باطنیوں کے سیدنا نے اس کو اپنے گلے لگا لیا تھا۔ اس کے لیے یہ بڑا اعزاز تھا۔ خدمت گار گیا تو دوسرے نے اس کی جگہ لے لی اور خورشاہ نے اس سے بھی بڑی باتیں کیں اور اس دوسرے خدمت گار نے بھی کسی کے مشورے اور ایما پر ایسا کیا تھا۔ اس دوسرے خدمت گار نے پوچھا۔ ''سیدنا! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

خورشاہ نے کہا۔ ''باتیں، صرف باتیں۔ تم لوگ مجھ سے باتیں کیا کرو۔ میں بولنا چاہتا ہوں، میں بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں گونگا نہیں ہوں۔'' دوسرا منگول شاید شیخ الجبال کا زرخرید غلام تھا کیونکہ وہ شیخ کی بڑی خوشامد کرتا رہتا تھا لیکن خورشاہ نے اس سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کیا۔ جب اس کا وقت ختم ہو گیا تو تیسرے خدمت گار نے اس کی جگہ لے لی۔

☆☆☆

پہلے خدمت گار نے اپنا وعدہ پورا کیا اور یا کی کو خورشاہ کی خدمت میں لے آیا۔ یا کی اس قیمتی اور معزز قیدی کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی پھر منگول زبان میں کچھ کہا جسے خدمت گار نے بتایا۔ ''یا کی پوچھ رہی ہے کہ تم یہاں اس خیمے میں کیا کرتے رہتے ہو؟''

خورشاہ نے یا کی سے کہا۔ ''میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں کیا تو میرے پاس رہنا گوارا کرے گی؟''

جب اس لڑکی کو شیخ کے دل کی بات بتائی گئی تو وہ کسی قدر مغموم ہو گئی، بولی۔ ''یہ کام نہ تو میرا ہے اور نہ ہی اس قیدی کا۔ کیا یہاں کا کوئی شخص اتنی ہمت کر سکتا ہے کہ ہلاکو خان کی پروا کیے بغیر خاموشی سے اپنا کام کرتا رہے۔''

خدمت گار نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔''

یاکی نے کہا۔ ''تب پھر اس قیدی کو بتا دے کہ ہلاکو خان کو بتائے بغیر مجھ سے نہ ملے۔''

خورشاہ نے یاکی سے کہا۔ ''معلوم نہیں کیوں، ہلاکو خان نہ تو مجھے بلاتا ہے اور نہ ہی میرے پاس آتا ہے اور ان حالات میں، میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر رکھا تھا کہ میں ہلاکو خان سے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ جو چاہے کرے، میں اب اس کا کوئی احسان نہیں لوں گا لیکن میں سوچتا ہوں کہ شاید تیری خاطر...... یاکی تیری خاطر مجھے اپنا عہد توڑنا پڑے گا اور میں ہلاکو خان سے تجھ کو مانگ لوں گا۔''

یاکی رونے لگی۔ خورشاہ نے خدمت گار سے کہا۔ ''یاکی سے پوچھو، یہ کیوں رو رہی ہے؟''

خدمت گار نے یاکی سے پوچھ کر بتایا۔ ''یاکی خورشاہ سے محبت کرنے لگی ہے اس لیے اگر ہلاکو خان نے قیدی بادشاہ کی درخواست قبول کرلی تو وہ خورشاہ کے پاس خوش و خرم رہے گی۔''

قیدی بادشاہ یاکی کا جواب سن کر بہت خوش ہوا اور خدمت گار سے کہا۔ ''اگر تو ہلاکو خان تک رسائی حاصل کر سکے تو اس سے کہہ دے کہ یا تو مجھے اپنے پاس بلالے یا وہ میرے پاس آنے کی زحمت کرے۔ میں اس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

خدمت گار وعدہ کر کے چلا گیا، اس کے ساتھ یاکی بھی چلی گئی۔ کئی دن بعد ہلاکو خان قیدی بادشاہ کے خیمے میں داخل ہوا۔ خورشاہ احترا ماً کھڑا ہو گیا۔ ہلاکو خان نے طنزاً پوچھا۔ ''کل مجھے بتایا گیا تھا کہ ماضی کے بادشاہ نے مجھے یاد فرمایا ہے؟''

خورشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آواز بھرا گئی۔ ''خوش قسمت اور اقبال مند فاتح! مجھے مزید ذلیل نہ کیجیے۔ میں دنیا کی نظروں سے تو کب کا گر چکا، آج میں اپنی نظر سے بھی گر گیا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تجھ کو میرے داروغۂ اصطبل بیسار کی بیٹی یاکی پسند آ گئی ہے؟''

خورشاہ نے نظریں جھکالیں اور اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تو یاکی کو خوش رکھ سکے گا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''اس وقت تو میں خود کو بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ یاکی کو کیا خوش رکھوں گا؟''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''آج کئی دن سے میں تیری بابت ایک تجویز پر غور کر رہا ہوں۔''

خورشاہ نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے پوچھا۔ ''کس تجویز پر؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''جس طرح میں نے تجھ کو تیرے خاندان سے جدا کر دیا تھا، اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ تجھے ایک خاندان فراہم کر دیا جائے۔''

خورشاہ کو امید پیدا ہو چلی کہ شاید اب اس کو معاف کر دیا جائے گا اور اس کو اس کے کنبے سے ملا دیا جائے گا۔ خورشاہ نے کہا۔ ''میرا دل بار بار یہی کہتا تھا کہ اتنا بڑا فاتح کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا۔''

ہلاکو خان نے کہا۔ ''دنیا میں تخریب اور تعمیر کا عمل جاری ہے۔ ایک حکمران جاتا ہے، دوسرا آتا ہے، ایک شہر برباد ہو جاتا ہے، دوسرا نیا آباد ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک خاندان مٹ جاتا ہے، دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ میں تیرے برباد خاندان کو دوبارہ آباد نہیں کر سکتا لیکن اس کی جگہ ایک نیا خاندان ضرور پیدا کر سکتا ہوں۔''

خورشاہ محوِ دیدہ دم بخو، ہلاکو خان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہلاکو خان نے مزید کہا۔ ''یاکی تجھے بخش دی گئی۔ تو نے اپنے دو پرستاروں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مجھے اپنی چھریوں سے ہلاک کر دیں گے تو تو انہیں بہشت زار میں داخل کر کے حوروں کا مالک بنا دے گا۔ جبار کو ذنوبیہ پسند تھی، میں نے اسے بخش دی۔ اسد نے طاہرہ کو مانگ لیا۔ ایک بادشاہ کا وعدہ دوسرے بادشاہ نے پورا کر دیا۔ میں ان دونوں خاندانوں کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ اب تم تینوں مل جل کر رہو گے اور تینوں کے مرتبے برابر ہوں گے۔ ان میں نہ کوئی بڑا ہوگا، نہ چھوٹا۔''

خورشاہ کے احساسِ برتری کو چوٹ لگ رہی تھی، بولا۔ ''کیا میرے خدمت گاران دونوں کے مقابلے میں مجھ کو نمایاں اور بڑا ثابت نہیں کریں گے؟''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''تو نے اپنے لیے ایک معمولی داروغۂ اصطبل کی بیٹی کا انتخاب کیا ہے اس لیے خدمت گاروں کو واپس بلا لیا جائے گا۔''

خورشاہ نے عاجزی سے درخواست کی۔ ''منگول فاتح! مجھ کو یاکی کے ساتھ تنہا رہنے دیا جائے۔ جبار اور اسد کو مجھ سے دور ہی رکھا جائے تو کرم ہوگا کیونکہ میں اپنے غلاموں کو اپنے کنبے کا ایک حصہ نہیں بنا سکتا۔''

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ''ان دونوں کو تیرے خاندان کا ایک جزو میں بنا رہا ہوں، تو کب بنا رہا ہے؟''

خورشاہ نے کہا۔ ”یہ میری موت ہو گی۔“
ہلاکو خان نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔“
ہلاکو خان نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ کئی دن بعد یاکی کو خورشاہ کے حوالے کر دیا گیا اور اس کا خیمہ وہاں سے اکھاڑ کر عام لشکریوں میں نصب کر دیا گیا۔ یہیں پر اسد اور جبار کے خیمے بھی نصب کر دیے گئے۔ اب ذنوبیہ اور طاہرہ ان کی بیویاں بن چکی تھیں۔ جبار اور اسد کو ہلاکو خان نے یہ حکم دیا کہ وہ اپنے سابق بادشاہ اور نئے خاندانی سربراہ سے ہر روز ملاقاتیں کیا کریں اور خورشاہ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ بھی دونوں کے خیموں میں حاضریاں دیتا رہا کرے۔
تینوں نے اس حکم کی پابندی کی لیکن خورشاہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا اس کو قراقرم روانہ کرا دے تاکہ وہ قراقرم کے شہنشاہ منگو خان کے دل کو اپنی چرب زبانی سے جیت سکے۔
ہلاکو خان نے اپنے فرستادے چین کی طرف بھی دوڑا دیے جہاں اس کا ایک اور بھائی قبلائی خان حکومت کر رہا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہلاکو خان نے اپنے بھائی منگو خان کے نام ایک خط بھیجا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔
”شاہوں کے شاہ، خان اعظم کے جانشین منگو خان کی خدمت میں اس کا چھوٹا بھائی ہلاکو خان سلام عرض کرتا ہے۔ شہبازوں کے مسکن میں رہنے والا خورشاہ اب میری قید میں ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی بہشت برباد کر دی گئی ہے۔ اس کے چھری بند فدائی جانوروں کی طرح ذبح کر دیے گئے اور اس کے پرستار منتشر کر دیے گئے۔ اب یہ مرقع عبرت انسان آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد نے جو کچھ کیا ہے، وہ ایسا نہیں ہے کہ بہ آسانی بھلا دیا جائے اور معاف کر دیا جائے مگر خورشاہ کو قتل کر دینے کا یہ مطلب ہوگا کہ اس کو معاف کر دیا گیا۔ میں نے اس کو زندہ رکھا ہے اور اس کے اردگرد، آس پاس ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ ان میں یہ ہر روز پیدا ہوگا اور ہر روز مرے گا۔“

☆☆☆

خورشاہ کا خیمہ اور خود خورشاہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے کا شوق رکھنے والے آزادی سے اس کے پاس آنے جانے لگے۔ وہ کسی کو آنے سے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسد اور جبار اپنا زیادہ وقت خورشاہ کے پاس ہی گزارتے۔ اسی طرح خورشاہ بھی ان دونوں کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو سمجھایا۔ ”تم دونوں ہلاکو خان کے پاس جاؤ اور اس سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں قراقرم بھیج دے۔“
جبار نے کہا۔ ”لیکن قراقرم جا کے ہم کیا کریں گے؟“
خورشاہ نے کہا۔ ”وہاں ہمیں اتنی بہت ساری نگراں آنکھیں گھوریں گی نہیں۔“
اس نے کہا۔ ”ہمیں ان نگراں آنکھوں سے کیا لینا دینا۔ ہم یہیں خوش ہیں اور قراقرم جانا ضروری نہیں سمجھتے۔“
خورشاہ نے بگڑ کر کہا۔ ”یہ میں کہہ رہا ہوں، یہ میرا حکم ہے۔ آخر میں بادشاہ رہ چکا ہوں۔ تمہیں میرا حکم ماننا چاہیے۔“
اسد نے جواب دیا۔ ”حکم کا زمانہ لد گیا، اگر میں تمہارا کہنا مانوں گا تو کسی دوسرے وقت تم کو میرا کہنا ماننا ہوگا۔“
خورشاہ خاموش ہو گیا۔ اس کو اپنی بدقسمتی کا اندازہ اور زیادہ ہو گیا۔ جبار کہیں سے گھوم پھر کر واپس آیا تو اپنے خیمے میں خورشاہ کو دیکھا۔ خیمے میں جبار کی بیوی ذنوبیہ بھی تھی۔ جبار ان دونوں کو یکجا اور تنہا دیکھ کر برہم ہو گیا، بولا۔
”تو یہاں کیوں آیا تھا؟“
خورشاہ اس طرز تخاطب کی چوٹ کو برداشت نہ کر سکا۔ بگڑ کر بولا۔ ”جبار! یہ تو بات کس طرح کر رہا ہے؟ کیا تجھ کو میری حیثیت اور مقام کا علم نہیں ہے؟“
جبار نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ ”تو یہاں کیوں آیا تھا؟“
یہ لہجہ اور یہ انداز گفتگو اس کے دل و دماغ پر ضربیں لگا رہا تھا۔ پھر کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں کہتا ہوں تو اپنا لہجہ درست کر۔ میں یہ سب نہیں برداشت کر سکتا۔“
جبار نے ذنوبیہ کو گدی سے پکڑ لیا، بولا۔ ”تو ہی بتا کہ یہ شخص تیرے پاس کیوں آیا تھا؟“
ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”یہ میرے پاس نہیں آپ کے پاس آیا تھا لیکن آپ خیمے میں موجود نہیں تھے اور یہ واپس جانے ہی والا تھا کہ آپ آ گئے۔“
خورشاہ نے ذنوبیہ سے کہا۔ ”تو بھی جبار کی طرح تحقیر آمیز لہجے میں بات کر رہی ہے، آخر کیوں؟“
ذنوبیہ نے جواب دیا۔ ”میں اسی لہجے میں تجھ سے مخاطب ہوں جس کا تو مستحق ہے اور جس کا تو اہل ہے۔“
خورشاہ نے کہا۔ ”لوگو! خدا کے قہر سے ڈرو اور ایک شریف اور عزت دار انسان کو اتنا ذلیل نہ کرو۔“
جبار نے جواب دیا۔ ”شریف اور عزت دار انسان سے تیری کیا مراد ہے؟ کیا ہم لوگ ذلیل ہیں؟ بتا...... جواب دے، اب خاموش کیوں ہو گیا؟“
خورشاہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر دم بخود کھڑا سوچتا رہا پھر جبار کی طرف بڑھا اور عاجزی سے کہا۔ ”جبار!

میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں تیرے خیمے میں تیری عدم موجودگی میں کسی بری نیت سے نہیں آیا تھا۔''

جبار نے جواب دیا۔''میں تیری بات پر اس لیے یقین کرلوں گا کہ ڈوتو بیہ اس کی تصدیق کر رہی ہے کہ اگر اس کی گواہی شامل نہ ہوتی تو میں تیری کسی بات پر یقین نہ کرتا۔''

خورشاہ نے کہا۔''کیا میں قابل اعتبار نہیں ہوں؟ کیا تجھ کو میری بات پر یقین نہیں رہا؟''

جبار نے جواب دیا۔''ہاں' بات کچھ یہی ہے۔''

خورشاہ نے پوچھا۔''تو سچ کہہ رہا ہے؟''

جبار نے جواب دیا۔''ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

خورشاہ نے نہایت عاجزی سے درخواست کی۔''کیا میں اپنے خیمے میں واپس جاؤں؟''

جبار نے جواب دیا۔''ہاں! تو اپنے خیمے میں واپس جاسکتا ہے مگر خبردار جو آئندہ ایسی حرکت کی۔''

خورشاہ نے نظریں جھکالیں اور چپ چاپ اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔ خورشاہ اپنے ماحول کی یکسانیت سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے ہلاکو خان سے درخواست کی کہ یا تو اسے اپنے محل میں واپس جانے کی اجازت دی جائے یا اسے قراقرم بھیج دیا جائے۔ ہلاکو خان بھی اس سے بیزار ہوچکا تھا۔ اس نے خورشاہ کو قراقرم جانے کی اجازت دے دی۔ جبار اور اسد کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی خورشاہ کے ساتھ قراقرم جائیں گے۔

تین سو جنگجو، منگولوں کا ایک دستہ خورشاہ، جبار اور اسد کو لے کر قراقرم روانہ ہوگیا۔ یا کی کا باپ بیمار ا اپنی بیٹی سے ملنے آیا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ قراقرم نہ جائے۔ یا کی متذبذب ہوگئی۔ خورشاہ نے جب دیکھا کہ یا کی ڈانواں ڈول ہورہی ہے تو وہ ڈر گیا۔ اس نے یا کی کی خوشامد شروع کردی۔''یا کی! میری آخری آرام جان، اگر تو نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گا۔''

یا کی نے کہا۔''تو قراقرم جانے کے بجائے یہیں رہ جا، کیونکہ میں اپنے باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔''

خورشاہ کا سر چکرانے لگا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے بولا۔''یا کی! زمین گھوم رہی ہے، خیمے کپکپا رہے ہیں۔ اگر مجھے تنہا قراقرم جانا پڑا تو میں راستے ہی میں مرجاؤں گا۔''

یا کی نے خورشاہ کو سمجھایا۔''اگر تو قراقرم چلا گیا تو وہاں تجھے زیادہ دن زندہ رہنا نصیب نہیں ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ منگو خان تجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہ لے اور قتل کرادے۔''

خورشاہ نے اپنا سر پیٹ ڈالا، بولا۔''میں کیا کروں یا کی! میں کیا کروں؟''

یا کی نے جواب دیا۔''تو قراقرم نہ جا، یہیں رہ جا۔''

خورشاہ نے جبار اور اسد کا سہارا پکڑا۔ ان دونوں کو اپنے قریب بلایا اور ان سے درخواست کی۔''اسد، جبار! اگر تم دونوں چاہو تو ہلاکو خان ہمیں یہیں روک سکتا ہے۔''

جبار نے جواب دیا۔''لیکن میں ہلاکو خان سے یہ درخواست کیوں کروں؟''

خورشاہ نے یا کی کی طرف اشارہ کیا۔''یہ قراقرم نہیں جانا چاہتی۔''

جبار نے جواب دیا۔''نہیں جاتی تو نہ جائے۔ اس پر جبر کیوں کیا جائے۔''

خورشاہ نے بڑی حسرت سے جبار کی طرف دیکھا، بولا۔''جبار! میرے پاس چلنے کا یہی ایک سہارا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میں اس سے بھی محروم ہوجاؤں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔''

اسد نے جبار کی طرف سے جواب دیا۔''ہم خود بھی قراقرم نہیں جانا چاہتے مگر تیری وجہ سے ہمیں بھی جانا پڑ رہا ہے۔ اگر یا کی قراقرم نہیں جانا چاہتی تو اس کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ دے۔''

خورشاہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔''اب میں کیا کروں؟ کوئی بھی میری بات تک سننے کو تیار نہیں۔'' اس کے بعد یا کی کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔''یا کی! مجھے بے سہارا نہ کر۔'' وہ پیچھے ہٹا اور کہیں سے ایک خنجر نکال لیا اور اس کو یا کی کے ہاتھ میں تھما دیا، بولا۔''تو اس خنجر سے میرا کام تمام کردے کیونکہ تیری مفارقت اور جدائی پر میں موت کو ترجیح دوں گا۔''

یا کی نے خنجر لے کر اسد کی طرف پھینک دیا، بولی۔''یہ کیسا مرد ہے جو عورت کے لیے روتا ہے۔ ہماری قوم کے مرد تو عورتوں کے لیے بالکل نہیں روتے۔'' پھر بطور خاص خورشاہ کو مخاطب کیا۔''میں کہتی ہوں تو یہ عورتوں کی طرح آنسو کیوں بہانے لگتا ہے۔''

خورشاہ نے روتے ہوئے کہا۔''میرا ساتھ نہ چھوڑنا یا کی! اگر چھوڑ دیا تو میں مرجاؤں گا۔''

اسد نے خنجر ایک بار پھر پھینک دیا۔''یہ خنجر مردوں کے لیے نہیں عورتوں کے لیے ہوتا ہے۔''

خورشاہ بری طرح سہم کر ایک ایک کو پرامید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ طاہرہ نے آگے بڑھ کر خورشاہ کی ہمدردی کی، بولی۔''اب انہیں زیادہ نہ ستاؤ۔ انہیں دیکھو اور عبرت

پکڑو۔'' پھر یاکی سے کہا۔''یاکی! تو انہیں مایوس نہ کر اور ان کے ساتھ قراقرم چلی چل۔''

یاکی نے جواب دیا۔''میں نے اس خوف زدہ عاشق کا ساتھ دینے کا عہد کرلیا ہے، میں اس کے لیے قراقرم جاؤں گی۔''

خورشاہ فرطِ خوشی میں آگے بڑھا اور طاہرہ کے روبرو دوزانو ہوگیا۔''معزز خاتون! میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

سامانِ سفر تیار تھا۔ ہلاکو خان نے سفر شروع کرنے کا حکم دیا اور یہ لوگ شاہراہِ ریشم پر رواں دواں ہوگئے۔ خورشاہ کو طاہرہ کی عادت بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اس سے ربط ضبط رکھنا چاہتا تھا مگر اسد سے ڈرتا تھا۔ اس کی نظریں ذنوبیہ پر بھی پڑنے لگی تھیں اور اسے ذنوبیہ میں بھی دلکشی نظر آنے لگی تھی۔ اس چالاک انسان نے اسد اور جبار کو رام کرنے کے لیے ایک چال چلی۔ سو میل سفر طے کرنے کے بعد اس قافلے نے ایک پہاڑی کے دامن پر پڑاؤ کیا۔ خورشاہ بہت خوش خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے اسد، طاہرہ، جبار اور ذنوبیہ کی اپنے خیمے میں دعوت کردی اور ان کے لیے کئی قسم کے کھانے تیار کرائے۔

سورج اوپر اٹھتا چلا جارہا تھا اور دھوپ میں تیزی آتی جارہی تھی۔ خورشاہ اپنے خیمے سے نکل کر اسد کے خیمے میں گھس گیا۔ اس وقت اسد اپنے خیمے میں نہیں تھا۔ خورشاہ نے تنہا طاہرہ کو بیٹھے جو دیکھا تو الٹے قدموں واپس آجانا چاہا لیکن طاہرہ نے آواز دے کر خورشاہ کو روک لیا۔ جب خورشاہ ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا تو طاہرہ نے پوچھا۔''اب تو یاکی نے کسی قسم کا شوروغل نہیں کیا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔''نہیں، اب وہ نہیں ستاتی۔'' پھر ڈرتے ڈرتے کہا۔''تیرا کیا نام ہے؟''

اس نے جواب دیا۔''طاہرہ!''

خورشاہ نے جواب دیا۔''اسد کے پاس آنے سے پہلے تو کیا میری بہشت میں تھی؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔''ہاں! مگر یہ آپ نے کیوں پوچھا؟''

خورشاہ نے سرد آہ بھری۔''افسوس کہ میں نے تجھ کو وہاں نہیں دیکھا تھا۔'' پھر ذنوبیہ کی بابت پوچھا۔''کیا ذنوبیہ بھی وہیں تھی؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔''ہاں! وہ بھی آپ ہی کی بہشت سے لائی گئی ہے۔''

خورشاہ نے ایک بار پھر سرد آہ بھری، بولا۔''آہ...... میں نے اپنا سب کچھ کھودیا۔ اے کاش! میں نے ہلاکو خان کی بات نہ مانی ہوتی اور میں اس کا مقابلہ کرتا تو شاید اتنا بے بس نہ ہوتا۔''

طاہرہ نے جواب دیا۔''بجا فرمایا آپ نے۔ مردوں کو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر شکست نہیں قبول کرنی چاہیے۔''

خورشاہ نے طاہرہ کی یہ بات شاید نہیں سنی تھی کیونکہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا، بولا۔''طاہرہ! تیرا شوہر اسد شکی کیوں ہے؟''

طاہرہ خورشاہ کی باتوں کا مطلب سمجھ رہی تھی، بولی۔''آپ یہ سوال اسد ہی سے کیجیے۔ میں اس کا کیا جواب دوں؟''

خورشاہ نے پوچھا۔''طاہرہ! میرے تجھ پر کچھ احسان بھی ہیں یا نہیں؟''

طاہرہ نے جواب دیا۔''میں نے آپ کی بہشت میں بہت آرام پایا ہے۔ اس آرام اور لذت کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔''

خورشاہ نے کہا۔''اور بھولنا بھی نہیں چاہیے۔ شاید تو نہیں جانتی کہ میں قراقرم کیوں جارہا ہوں؟ منگولوں کے شہنشاہ منگو خان نے مجھ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جب میں ہزاروں میل کا سفر کر کے اس سے ملوں گا تو وہ میرے جذبے اور سابقہ حیثیت کے پیشِ نظر میری حکومت مجھ کو واپس کردے گا۔ اگر تو میرا ساتھ دے گی تو میں ایک بار پھر ویسی ہی بہشت تعمیر کروں گا اور تجھ کو اس بہشت میں واپس بھیج دیا جائے گا۔''

طاہرہ نے پوچھا۔''میں آپ کا کس طرح ساتھ دوں گی؟''

خورشاہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔''اسد کا کام تمام کردے، رات کو سوتے میں۔''

طاہرہ نے کہا۔''پھر میں کہاں جاؤں گی؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔''میرے خیمے میں، میں تجھ کو اتنی شان اور اتنی آن بان سے رکھوں گا کہ لوگ تجھ پر رشک کرنے لگیں گے۔''

طاہرہ متذبذب ہوگئی۔ بولی۔''میں اس پر سوچوں گی۔''

خورشاہ نے کہا۔''تو بھی سوچ اور ذنوبیہ کو بھی اس اندازِ فکر پر آمادہ کرلے لیکن خبردار! جو اس کا کسی اور کو علم ہوا۔''

خورشاہ اسد سے خوف زدہ بھی تھا۔ اسد کی آمد کا دھڑکا اس کو برابر پریشان کرتا رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو ایک منگول نے خورشاہ کو مطلع کیا کہ اسد کافی دیر سے اس کے خیمے میں

سوجود جانے کیا کررہا ہے؟ یہ خبر تلوار کے گھاؤ کی طرح دل میں اترتی چلی گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے خیمے کے در پر پہنچ گیا اور باندازِ جارحانہ اس نے سوال کیا۔ ''یا کی! اندر کون ہے؟''

یا کی نے ذرا تامل سے جواب دیا۔ ''اندر میں ہوں اور تیرا دوست اسد۔ یہ بڑی دیر سے تیرا انتظار کررہا ہے۔''

خورشاہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور اسد کی گویا بو سونگھتا ہوا یا کی کے پاس چلا گیا۔ یہاں اسد خورشاہ کے قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ خورشاہ کو دیکھتے ہی اسد مسکرایا، بولا۔ ''میں بڑی دیر سے تیرا انتظار کررہا ہوں۔ تو کہاں چلا گیا تھا؟''

خورشاہ نے اسد اور یا کی کو نہایت غور سے دیکھا اور وہ جو کچھ جاننا چاہتا تھا، جان گیا۔ اس کو غصہ تو بہت آیا مگر برداشت کر گیا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ وہ طاقت میں اسد کی برابری نہیں کرسکتا۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ ''اسد! جب میں خیمے میں نہیں ملا تھا تو تجھے بھی یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ یا کی کے پاس بیٹھ کر میرا انتظار کرے۔''

اسد نے جواب دیا۔ ''پھر میں تیرا کہاں انتظار کرتا؟''

خورشاہ نے پوچھا۔ ''کیا مجھ سے تیرا کوئی کام اٹک گیا تھا؟''

اسد نے کہا۔ ''ہاں! میں اور جبار، دونوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک وقت کا کھانا ہم تینوں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھائیں۔''

خورشاہ ہنسنے لگا۔ ''خوب! یہی دعوت دینے تو میں نکلا تھا۔''

اسد نے پوچھا۔ ''کیا تو میرے خیمے میں گیا تھا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''ہاں گیا تھا، وہاں صرف تیری بیوی تھی بس اس سے مل کر چلا آیا۔''

اس کو خورشاہ کی بات گراں تو گزری مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ ان تینوں نے تین وقت کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ ایک وقت کا کھانا خورشاہ کے ساتھ، دوسرے وقت کا اسد کے ساتھ اور تیسرے وقت کا جبار کے ساتھ۔ تینوں دسترخوانوں پر ان تینوں کی بڑی پُرلطف باتیں ہوئیں۔

یہاں سے کوچ کیا تو ہفتہ بھر بعد وہ تھیان شیان کے کوہستانی سلسلوں میں داخل ہوگئے۔ یہاں بھی خیموں کا ایک قصبہ آباد ہوگیا۔ تھیان شیان کے مناظر بہت پیارے تھے۔ اسد اور جبار ان مناظر سے لطف اندوز ہونے چلے گئے۔ خورشاہ سیدھا طاہرہ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''تو نے کچھ کیا نہیں؟ میں نے بہشت کی دوبارہ تعمیر کی منصوبہ بندی شروع کردی ہے۔ کیا تجھ کو اور ذنوبیہ کو اس میں نہ داخل کیا جائے؟ مجھے صاف صاف بتادو۔''

طاہرہ نے جواب دیا۔ ''اگر بہشت میں ہم دونوں کا داخلہ یقینی ہوجائے تو ہم دونوں وہ کام فوراً ہی کرگزریں گے۔''

خورشاہ نے کہا۔ ''میں جو تم دونوں کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ بہشتِ ارضی دوبارہ وجود میں آنے والی ہے۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''ہمارے پاس زہر موجود ہے۔ وہ کام اسی منزل میں ہوجائے گا لیکن مجھے اور ذنوبیہ کو یہ یقین دلایا جائے کہ ہمیں بے سہارا تو نہیں چھوڑ دیا جائے گا؟''

خورشاہ نے جواب دیا۔ ''تم دونوں کو بے سہارا نہیں چھوڑا جائے گا۔ تم دونوں میرے پاس یا کی کے ساتھ رہوگی۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''تب پھر یہ کام کل صبح تک ضرور ہوجائے گا۔''

خورشاہ اپنے دل میں اسد کو خوب برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا کہ بالآخر وہ ان دونوں سے انتقام لے لے گا۔ دوسرے دن خورشاہ، اسد اور جبار نے ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ یہ کھانا طاہرہ نے تیار کیا تھا۔ خورشاہ روکھی روٹی کا ایک آدھ نوالا لے کر رہ گیا جبکہ بقیہ دونوں دیر تک کھاتے رہے۔

سہ پہر کو مشرق کی طرف سے دس بارہ گھڑسوار نمودار ہوئے اور یہ خورشاہ کے منگول ساتھیوں سے انہی کی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں قراقرم کے خاقان منگو خان نے بطورِ خاص اس وفد کے پاس بھیجا ہے جو خورشاہ کو لے کر قراقرم کی طرف جارہا تھا۔

ہلاکو خان کا مقرر کردہ سردارِ قافلہ ینگ چی نئے آنے والوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ پوچھا۔ ''ہمارے لیے کوئی خاص پیغام۔''

خاقانی نمائندے نے اعلان کیا۔ ''خاقان منگو خان نے کہا ہے کہ انہیں باطنیوں کے بادشاہ خورشاہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ خاقان خورشاہ سے نہیں ملنا چاہتا اس لیے وہ جہاں تک پہنچ چکا ہے، وہیں پر روک دیا جائے۔''

ینگ چی نے اسی وقت خورشاہ، اسد اور جبار کو اپنے خیمے میں طلب کرلیا۔ اسد اور جبار اپنے اپنے خیموں میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے، خورشاہ تنہا ینگ چی کے سامنے پیش ہوگیا۔

ینگ چی نے پوچھا۔ ''وہ دونوں کہاں ہیں، اسد اور جبار؟''

منگول ہرکارے نے جواب دیا۔ ''ابھی ابھی جب میں انہیں بلانے گیا تھا، وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔''

ینگ چی نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ''چلو، کوئی بات نہیں۔''

پھر خورشاہ کو خاقان کے فیصلے سے مطلع کر دیا گیا۔ خورشاہ کے چہرے پر خوشی کی لہریں نمودار ہوئیں۔ اس نے کہا۔ ''معزز منگول سردار! اسد اور جبار کی بیوائیں میرے حوالے کی جائیں کیونکہ ان دونوں کے بعد میں ہی ان کا اصل وارث ہوں۔''

ینگ چی نے جواب دیا۔ ''نہیں، ان دونوں کا اصل وارث میں ہوں کیونکہ جب میں شہر سے چلا تھا تو منگول فاتح نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب خورشاہ، اسد اور جبار زندہ نہ رہیں تو ان کی خواتین پر میرا حق ہوگا، ان کا وارث میں ٹھہروں گا۔''

خورشاہ نے مردہ سی زبان میں کہا۔ ''لیکن میں تو ابھی زندہ ہوں۔''

ینگ چی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''بے شک تُو تو ابھی زندہ ہے۔''

اس کے بعد اس منگول سردار نے دو طاقتور منگولوں کو اپنے ساتھ لیا، ان دونوں کے ہاتھوں میں گڑھا کھودنے کے آلات تھے۔ از قسم کدال، ایک کدال ینگ چی نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ ان تینوں کے ساتھ چوتھا ایک شمشیر بردار تھا۔

ینگ چی انہیں ایک ایسی زمین پر لے گیا جو نسبتاً کچی تھی..... ینگ چی نے دونوں منگولوں کو حکم دیا ''دو قبریں کھودی جائیں۔''

پھر اس نے اپنے ہاتھ کی کدال خورشاہ کے ہاتھ میں تھما دی اور حکم دیا۔ ''ایک قبر تو بھی کھود لے!''

خورشاہ نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیسی قبر؟ کس کی قبر؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

ینگ چی نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ کی اپنی قبر کیونکہ جس کو قبر میں دفن ہونا ہے، وہی اپنی قبر بھی کھودے۔''

خورشاہ نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تو زندہ ہوں۔''

ینگ چی نے جواب دیا۔ ''ہو، فی الحال زندہ ہو۔''

خورشاہ کو قبر کھودنے میں تامل تھا لیکن ینگ چی اور اس کے دونوں ساتھیوں نے خورشاہ سے قبر کھدوالی۔

ینگ چی نے خورشاہ کو حکم دیا۔ ''خورشاہ! قبر میں کھڑا ہو جا تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ تیرے ناپ کی ہے یا نہیں۔''

خورشاہ قبر میں کھڑا ہوا تو اوپر اس کا سر نظر آرہا تھا۔ ینگ چی نے خاقان کا فرمان پڑھ کر سنا دیا۔

''خورشاہ کو لانے والوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب خاقان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور جب خاقان کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ زمانے کے لیے بیکار ہو چکی ہے۔ خورشاہ کسی کام کا بھی نہیں اس لیے اس کی مشکل آسان کر دی جائے۔''

ینگ چی نے خورشاہ کو حکم دیا۔ ''بس تو اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہ تاکہ ہمیں اپنے کام میں دشواری پیش نہ آئے۔''

ینگ چی نے شمشیر بردار منگول کو گردن کے اشارے سے حکم دیا کہ خورشاہ کا کام تمام کر دیا جائے۔

شمشیر بردار آگے بڑھا اور خورشاہ کے رونے دھونے اور چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر کے فارغ ہو گیا۔ خورشاہ کا سر اور دھڑ دونوں ہی قبر کے اندر خود بخود گر گئے۔

ینگ چی نے شمشیر بردار سے کہا۔ ''چلو، یہ اچھا ہوا کہ ہمیں اس کی لاش ٹھکانے نہیں لگانا پڑی۔''

بقیہ دونوں قبروں میں جبار اور اسد کو دفن کر دیا گیا۔ یاکی، طاہرہ اور ذنوبیہ کو بس ایک ہی شخص کا انتظار تھا، خورشاہ کا۔ یہ قافلہ جب راستے ہی سے واپس ہو گیا تو ان تینوں خواتین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے مردوں کی عدم موجودگی میں یہ قافلہ واپس کیوں جارہا ہے؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا انہیں کبھی بھی جواب نہیں مل سکا کیونکہ جن کے پاس اس سوال کا جواب تھا، وہ ہمیشہ خاموش رہے اور خورشاہ اپنے دونوں ساتھیوں سمیت دیارِ غیر میں، وطن سے دور آسودۂ خاک ہو گیا..... بے نام و نشان!

ماخذ

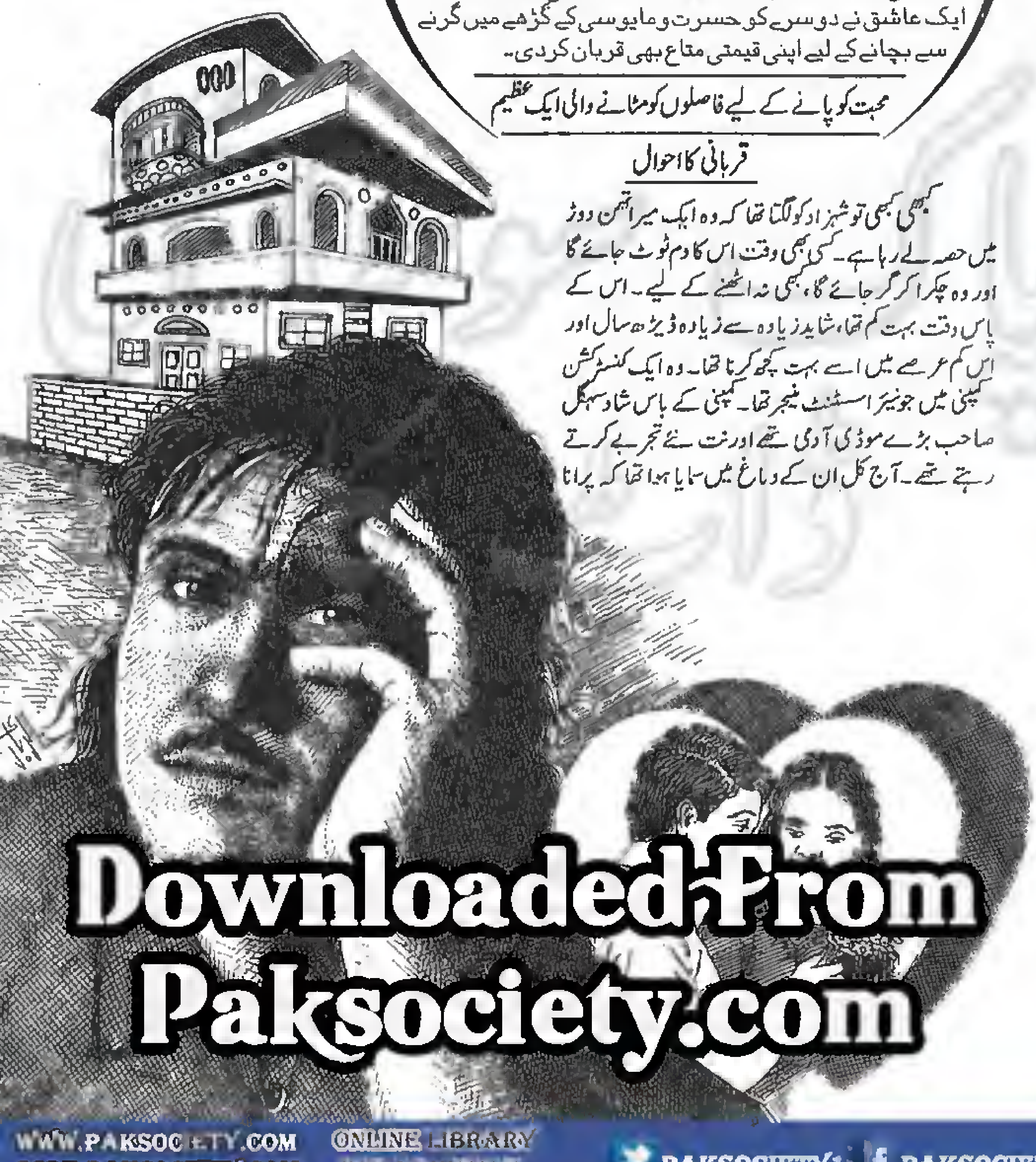
تاریخ دولت فاطمیہ، رئیس احمد جعفری۔ تاریخ فاطمین مصر، ڈاکٹر زاہد علی۔ طبقات ناصری، منہاج سراج۔ الفخری، محمد علی ابن علی۔ نظام الملک طوسی، مولوی عبدالرزاق کانپوری۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان

محبت اور فاصلے

طاہر جاوید مغل

عشقیہ داستان... کسی کی بھی ہو، اگر سچ پر مبنی ہو تو دل پر اثر کرتی ہے۔ اس نے بھی ایک ایسی ہی داستان سنا کر ناممکن کو ممکن کر دکھایا... فقط اس مماثلت پر کہ ایک محبوب کے حصول کی خاطر دونوں کی جدوجہد اور ٹارگٹ ایک مگر... نتائج مختلف... لہٰذا ایک عاشق نے دوسرے کو حسرت و مایوسی کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لیے اپنی قیمتی متاع بھی قربان کر دی۔

محبت کو پانے کے لیے فاصلوں کو مٹانے والی ایک عظیم قربانی کا احوال



کبھی کبھی تو شہزاد کو لگتا تھا کہ وہ ایک میراتھن دوڑ میں حصہ لے رہا ہے۔ کسی بھی وقت اس کا دم ٹوٹ جائے گا اور وہ چکرا کر گر جائے گا، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا، شاید زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال اور اس کم عرصے میں اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں جونیئر اسسٹنٹ منیجر تھا۔ کمپنی کے باس شاد سہگل صاحب بڑے موڈی آدمی تھے اور نت نئے تجربے کرتے رہتے تھے۔ آج کل ان کے دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ پرانا

لاہور اپنی تمام تر قدیمی خوب صورتی کے ساتھ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اندرونِ شہر کی کلاسیکل عمارتیں گرائی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ نئی عمارتیں اور پلازے تعمیر ہو رہے ہیں۔ آج کل سہگل صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا کہ اندرونِ شہر کی ایک قدیم گلی کو مسمار ہونے سے بچایا جائے اور آنے والے زمانے کے لیے محفوظ کرلیا جائے۔ اس گلی کے دس بارہ مکان تو وہ خرید چکے تھے۔ گلی کے آخری سرے پر ایک سہ منزلہ مکان ایسا تھا جس کا خبطی مالک اسے بیچنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ کمپنی کے دو تین نمائندے تو کوشش کر چکے تھے لیکن وہ مالک کو رضامند نہیں کر سکے تھے۔ اب شہزاد کا امتحان تھا۔ باس نے اسے بلا کر سرزنش کی تھی اور کہا تھا کہ ایسے اٹکے ہوئے کاموں کو وہ بخوبی کرلیا کرتا تھا لیکن پچھلے آٹھ دس ماہ سے اس کی کارکردگی بالکل صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ لہٰذا اب وہ جائے اور مالک کو اس ڈیل کے لیے رضامند کرے۔

باس نے مزید تو کچھ نہیں کہا مگر ان کی چپ بھی بے معنی نہیں تھی۔ انہوں نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر وہ ناکام ہوا تو اس کی نوکری پر بھی سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔

اپنے اس مشن پر روانہ ہونے سے پہلے شہزاد نے اپنے ان دو ساتھیوں سے معلومات حاصل کیں جو اس سے پہلے مالکِ مکان کو قائل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بہزاد نامی یہ چالیس پینتالیس سالہ شخص اس گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اسے ستار بجانے کا شوق ہے، کہیں کسی گاؤں میں تھوڑی سی زمین بھی ہے۔ اس کی آمدن سے اس کی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ جیتے جی یہ گھر فروخت نہیں کرے گا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت شہزاد ایک تنگ گلی میں مطلوبہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ لمبے بالوں، اونچی ناک اور چھریرے جسم والا مالکِ مکان اس کے سامنے آیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی۔

شہزاد نے پہلے سے سوچے ہوئے پلان کے مطابق کہا۔ ”سوری جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا...... دراصل...... میں روز ہی یہاں سے گزرتا ہوں۔ گھر کے اندر سے ستار بجنے کی آواز آتی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ستار آپ بجاتے ہیں۔“

”ہاں، میں ہی بجاتا ہوں۔“ سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

”مجھے...... یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ یقین کریں میں کئی دفعہ رک کر سنتا ہوں۔ ایک دن آپ ایک پرانا ہندوستانی گیت بجا رہے تھے۔ اک پیار کا نغمہ ہے، موجوں کی روانی ہے......“

”ہاں، شاید یہ غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہوگی۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں......؟“ خشک لہجے میں پوچھا گیا۔

”کچھ بھی نہیں جی، بس تعریف کرنے اور آپ کو دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔“

”چلو، اب یہ دونوں کام ہو چکے۔ اب جائیے یہاں سے۔“

”دراصل میں چاہتا تھا......“

اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”دراصل آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پچھواڑے پر اتنی زور سے لات ماروں کہ آپ اس سامنے والی دیوار پر جا کر لگیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے جھوٹ بولتے ہوئے۔ میں اتنا بدھو نہیں ہوں، جان گیا ہوں کہ تم اس فرم سے آئے ہو جس کے دو تین مشٹنڈے پہلے بھی میرا دماغ چاٹتے رہے ہیں۔“

شہزاد سناٹے میں رہ گیا۔ ہکلا کر بولا۔ ”سس...... سوری سر۔ میں تو بس......“

”جاتے ہو، یا دوں ایک۔“ وہ شخص چنگھاڑا اور شہزاد کو دھکا دیا۔ وہ ڈھلوان پر کھڑا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش میں بجلی کے پول سے ٹکرایا۔ مالک مکان نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

جانے کیوں، شہزاد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ دروازے سے تو ہٹ گیا لیکن کچھ دور جا کر ایک نو تعمیر شدہ بلڈنگ میں واقع چائے خانے میں بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اس شخص سے مزید بات کر کے دیکھے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جو لوگ میوزک میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے دل میں کہیں نہ کہیں نرم گوشے ضرور موجود ہوتے ہیں اور یہ ادھیڑ عمر شخص تو شکل صورت سے بھی رومان پسند لگ رہا تھا۔

سہ پہر ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ سردیوں کی مختصر شام جلد ہی رات کی تاریکی میں بدلنے والی تھی اور اندرونِ شہر کے اس علاقے میں سہ منزلہ اور چار منزلہ عمارتوں میں جلد ہی روشنیاں جگمگانے والی تھیں۔ شہزاد نے قریبی دکان سے فل اسکیپ کے چار کاغذ لیے۔ ایک اور چائے کا آرڈر دیا، سگریٹ سلگایا اور وہیں بیٹھ کر اس تندمزاج مالکِ مکان

کے نام ایک تحریر لکھنے لگا۔ اس نے لکھا۔
''محترم! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ کبھی آپ نے بھی کسی سے پیار کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنی روداد بیان کرنے کا حوصلہ مل رہا ہے۔ میں ایک بڑی مشکل میں ہوں محترم! میں لاہور کے نواح میں ایک چھوٹے قصبے کامونکی کا رہنے والا ہوں۔ میں نے گریجویشن کیا ہوا ہے اور کچھ ڈپلومے بھی لے رکھے ہیں لیکن یہ سب کچھ میری اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے جس کو پورا کرنے کے لیے میرے پاس ایک محدود وقت ہے..... میری دن رات کی کوشش بھی مجھے اپنی منزل کے قریب نہیں پہنچا پا رہی۔ دراصل میں نے ایک لڑکی سے پیار کیا اور اتنی شدت سے کیا کہ اس کے سوا میرے لیے اس دنیا میں کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں، والدین بہن بھائی کوئی نہیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ لڑکی ہی میری کل کائنات ہے اور اگر اسے حاصل نہ کرسکا تو پھر میرے لیے زندہ رہنا یا مرنا ایک برابر ہوجائے گا۔ وہ بھی مجھے بے انتہا چاہتی ہے۔ ہمارے راستے کی اصل رکاوٹ لڑکی کے والد محترم ہیں۔ وہ ایک دنیادار شخص ہیں۔ ان کی مالی حیثیت مجھ سے بہت بہتر ہے۔ انہوں نے شرط رکھی ہے کہ اگر میں ان کی بیٹی شاہینہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں تو میرے پاس کم ازکم دس مرلے کا ایک گھر اچھے علاقے میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ذاتی کار اور پچاس لاکھ کے لگ بھگ حق مہر کے لیے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے تین سال کا وقت دیا تھا۔ میں پچھلے ڈیڑھ برس سے لاہور میں ہوں اور ہر طرح سے جان مار رہا ہوں۔ دو جگہوں پر جاب کر رہا ہوں اور رات ایک بجے تک جاگتا ہوں۔ مجھے کم وبیش ڈیڑھ کروڑ روپیا اکٹھا کرنا ہے مگر آدھا وقت گزر چکا ہے اور میں 20 فیصد بھی جمع نہیں کرسکا...... اور آج کل تو یوں لگ رہا ہے محترم کہ میں پوری طرح لڑے بغیر ہی یہ لڑائی ہارنے والا ہوں۔ مجھے سہگل صاحب والی نوکری کے لالے پڑ رہے ہیں، میں ان کے لیے پرچیزنگ کا کام کرتا ہوں۔ باس مجھ سے بہت خفا ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں آپ کو مکان کی فروخت پر قائل نہ کرسکا تو شاید میری چھٹی ہو جائے اور میرے پاس صرف پارٹ ٹائم جاب ہی رہ جائے گی۔ یہ میرے لیے ایک ایسا ''سیٹ بیک'' ہوگا جس کے بعد میں شاید سنبھل ہی نہ سکوں۔

''میرے سپنے مجھ سے چھن رہے ہیں جناب! میری ...گی مجھ سے دور جا رہی ہے۔ مجھے سہارے کی ضرورت ہے جناب...... میں آپ سے التجا کرتا ہوں اگر آپ تھوڑا سا بھی دردمند دل رکھتے ہیں تو میری حالت پر رحم فرمایئے۔''

آخر میں شہزاد نے اس ڈیل کا ذکر کیا تھا جو وہ مالک مکان سے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وہ تمام نکتے بیان کیے جو مالک مکان کے فائدے کو ظاہر کرتے تھے۔ کمپنی مارکیٹ ریٹ سے قریباً 20 فیصد زیادہ دے رہی تھی۔ یہ تین مرلے کا گھر تھا۔ موقع کے لحاظ سے اس کی قیمت تقریباً تیس لاکھ بنتی تھی، مالک مکان کو چھتیس لاکھ تک کی آفر کی جاچکی تھی۔

یہ مفصل خط شہزاد نے عجیب جذباتی کیفیت میں لکھا تھا۔ خط مکمل کرکے اس نے لفافے میں ڈالا اور اس لیٹر باکس میں ڈال دیا جو مطلوبہ گھر کے مین دروازے پر موجود تھا۔

☆☆☆

تین دن تک شہزاد نے بڑی شدت سے جواب کا انتظار کیا۔ اس نے اپنا ایڈریس اور سیل فون نمبر، دونوں خط میں لکھ دیے تھے۔ چوتھے دن وہ مایوس ہوگیا لیکن جب وہ مایوس ہوا اسی روز شام کو اس کے سیل فون پر وہ کال آگئی جس کا اسے انتظار تھا۔ مالک مکان بہزاد قدسی صاحب نے اسے اپنے گھر پر بلایا تھا۔

اس نے نہادھوکر بہترین کپڑے پہنے اور موٹر سائیکل پر سوار ہوکر اندرون شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا بہزاد صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا کیونکہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس سنکی شخص کا رویہ کیا ہوگا تاہم اس کے خدشات غلط نکلے۔ اسے مسٹر بہزاد نسبتاً اچھے موڈ میں ہی دکھائی دیے۔ اپنے حال میں مگن رہنے والے آرٹسٹوں کی طرح ان کے بال چہرے پر بکھرے تھے اور وہ مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے، ان کے بیڈروم کا منظر خستگی اور بے سروسامانی کا عجیب نمونہ پیش کرتا تھا۔ فرش پر گدا بچھا ہوا تھا جس کے اسپرنگ فوم کے اندر سے جھانک رہے تھے۔ ایک دقیانوسی ٹیپ ریکارڈر کے قریب درجنوں آڈیو کیسٹ رکھے تھے۔ ایک طرف بے کواڑ کی الماری میں گردآلود کتابیں اور رسالے وغیرہ تھے۔ اگر کوئی چیز قدرے صاف ستھری نظر آتی تھی تو وہ ہی ان کا محبوب ستار تھا۔ اس کی پالش چمکیلی اور تار تنے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک مخملی گدی رکھی تھی جس پر بیٹھ کر وہ ستار نوازی کرتے تھے۔ ستار کے قریب ہی وہ ''جذباتی خط'' کھلا پڑا تھا جو چار روز پہلے شہزاد نے اس گھر کے مالک کے نام یعنی بہزاد صاحب کے نام لکھا تھا۔

بہزاد قدسی صاحب کی آنکھیں سوجی سوجی اور سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پچھلی ایک دو راتوں سے نیند پوری نہیں کر پائے اور شدید قسم کی کشمکش کا شکار رہے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر دھیمی آواز میں میوزک چلے ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ خود بہزاد صاحب کا بجایا ہوا ستار ہی تھا۔ ایک پرانا گیت گونج رہا تھا۔ تیری الفت میں صنم، ہم نے بہت درد سہے...... پر ہم چپ ہی رہے۔

بہزاد صاحب نے میوزک کا والیم کچھ اور کم کر دیا اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولے۔ ''میں نے تمہارا خط دو تین بار پڑھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے، تمہاری بات میں بھی اثر ہے۔''

جانے کیوں شہزاد کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ وہ بولا۔ ''مجھے ایسی ہی امید تھی، بہت شکریہ......''

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ سگریٹ کا دھواں ان کے اردگرد چکراتا رہا۔ ستار کی آواز گونجتی رہی۔ عجیب افسانوی سا ماحول بنا ہوا تھا۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔ ''اب وہ لڑکی شاہینہ کہاں ہے؟''

''اپنے والدین کے گھر...... اس کی سگائی کی بات چل رہی ہے مگر اس کے والد نے چونکہ مجھ سے مہلت کا وعدہ کیا ہوا ہے اور والدہ بھی اس مہلت کے حق میں ہیں، اس لیے ابھی یہ بات کسی نتیجے پر نہیں پہنچی۔''

''یہ سلسلہ...... میرا مطلب ہے تمہارا اور شاہینہ والا معاملہ کب شروع ہوا؟''

شہزاد نے خط میں کافی کچھ لکھ دیا تھا۔ پھر بھی اس نے ساری تفصیل سے بہزاد صاحب کو آگاہ کیا۔ اس میں کوئی بات بھی جھوٹ نہیں تھی۔ اس نے جیسے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

ان کے سامنے چائے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ یہ چائے پڑوس سے آئی تھی۔ پڑوس کے لوگوں سے بہزاد صاحب کے تعلقات اچھے تھے۔ ان کا کھانا وہیں سے آتا تھا...... کپڑے وغیرہ بھی وہیں سے دھلتے تھے، البتہ اس کے لیے وہ ماہانہ معقول رقم دیتے تھے۔

بات کرتے کرتے بہزاد صاحب گہری سوچ میں چلے جاتے تھے۔ جیسے اردگرد کو بالکل بھول ہی جاتے ہوں۔ ایک ایسے ہی طویل وقفے کے بعد انہوں نے شہزاد کی آنکھوں میں دیکھا اور بولے۔ ''میں تمہیں یہ مکان بیچنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کی ایک شرط ہے۔''

''جی فرمائیے۔'' شہزاد نے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو بہ مشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

''بلکہ یہ دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں یہ مکان کسی فلانی ڈھمکانی کمپنی کو نہیں، تمہیں بیچوں گا۔ دوسری شرط یہ کہ تم اس مکان کو سنبھال کر رکھنے کے لیے نہیں خریدو گے بلکہ گرانے کے لیے خریدو گے۔''

''م...... میں سمجھا نہیں جناب۔ میرا مطلب ہے آپ کی دوسری شرط......''

''پہلی شرط تمہارے فائدے کی ہے اور دوسری بھی تمہارے ہی فائدے کی ہے۔ اس مکان کو اس حالت میں سنبھال کر رکھنے سے تمہیں وہ فائدہ نہیں مل سکتا جو اس کو گرانے سے مل سکتا ہے۔''

''میں معذرت چاہتا ہوں جناب! مگر میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔ گرانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''وہی مراد جو سب کی ہے۔ لوگ ان پرانے گھروں کو گرا کر نئے گھر بنا رہے ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کر سکتے ہو۔''

''میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ضروری ہے جناب؟''

''زیادہ سوچ بچار کرو گے تو پھر یہ سودا تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس کے ساتھ ہی شاید......''

انہوں نے فقرہ مکمل نہیں کیا لیکن ان کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ یقیناً وہ افسردہ انداز میں یہی کہہ رہے تھے کہ اس مکان کے ساتھ شاید شاہینہ بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔

شہزاد کو اندازہ ہوا کہ سنکی مزاج کے بہزاد صاحب سے زیادہ بحث کرنا درست نہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر اچانک اپنا ارادہ بدل دیتے اور وہی لب و لہجہ اختیار کر لیتے جو انہوں نے پچھلی ملاقات میں کیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں خود یہ مکان خریدتا ہوں تو اس کے لیے مجھے آپ کو کیا ادا کرنا ہوگا؟''

''وہی مارکیٹ ریٹ۔ 30 لاکھ کے لگ بھگ...... اور جو کچھ میں سمجھا ہوں، تم اتنی رقم تو آسانی سے دے ہی سکتے ہو۔''

وہ واقعی سنکی تھے۔ 36 کی آفر ٹھکرا کر 30 پر آمادہ ہو رہے تھے۔ شہزاد نے کہا۔ ''آپ یقیناً میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ آپ کی آفر قبول کر کے مجھے خوشی ہوگی لیکن درمیان میں کمپنی کا مسئلہ ضرور آئے گا۔ وہ لوگ کہیں گے کہ میں ان کے لیے پر چیزنگ کرنے گیا اور اپنے لیے سودا کر کے آگیا۔''

''تو پھر؟'' بہزاد صاحب نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''نن...... نہیں...... کوئی ایسی بات تو نہیں۔ میں اس کا

حل نکال لوں گا۔ میرے ایک دو بہت با اعتماد دوست ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کے نام پر رجسٹری کرا لوں گا اور ساتھ ہی مختار نامہ یا دستبرداری وغیرہ لکھوا لوں گا۔''

انہوں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہے، یہ تمہارے مسائل ہیں۔ ہاں، میں اتنا یقین تمہیں ضرور دلاتا ہوں، یہ مکان تمہیں تمہاری توقع سے کہیں زیادہ فائدہ دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ پانچ چھ گنا تک۔''

شہزاد، بہزاد صاحب سے کئی سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کسی بھی سوال پر بھتّے سے اکھڑ سکتے ہیں اور بنی بنائی بات بگڑ سکتی ہے۔ اسی لیے اس نے کہا۔ ''آپ میرے بزرگوں کی طرح ہیں، آپ جو کہہ رہے ہیں مجھے منظور ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم کاغذ تیار کروالو، پیمنٹ کا انتظام بھی کرلو۔ ہم اگلے جمعے کو ملیں گے۔ اس وقت میں تمہیں ایک دو اور ضروری باتیں بھی بتاؤں گا۔''

رات نو بجے کے قریب شہزاد اس ناقابلِ فہم شخص سے رخصت ہو کر اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

تقریباً سب کچھ بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔ جمعے کے روز کاغذات پر بہزاد صاحب کے سائن انگوٹھے ہوگئے اور شہزاد نے 30 لاکھ روپے کا پے آرڈر ان کے حوالے کردیا۔ بہزاد صاحب نے اداس لہجے میں کہا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر مکان خالی کردیں گے۔ شہزاد کو معلوم تھا کہ انہوں نے کوئٹہ شفٹ ہونے کا پروگرام بنایا ہے اور وہاں کسی فلیٹ کا بیعانہ بھی دے دیا ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے اپنی مرضی ومنشا سے کر رہے تھے اور اپنے معاملے میں وہ کسی کا مشورہ قبول کرنے والے شخص ہرگز نہیں تھے۔

پانچ دن بعد جب وہ لاہور سے رخصت ہو رہے تھے، ان کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ در و دیوار کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا انداز دیکھ کر شہزاد کا دل کٹ سا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بہزاد صاحب اور اس مکان کے پیچھے کوئی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے بارے میں کوئی سوال کرنے کی جرأت شہزاد کو ہرگز نہیں تھی۔ شاید کسی کو بھی نہیں تھی۔ بہزاد صاحب کا حلقۂ احباب بہت محدود تھا۔ اکثر پرانے لوگ تو یہ محلہ چھوڑ کر ہی جا چکے تھے، جو چند ایک موجود تھے وہ بھی ان کے بارے میں کسی اچھی یا بری رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

جاتے وقت بہزاد صاحب نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تم اس گھر کو گرانا شروع کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ ایک بندہ تمہارے پاس آئے۔ وہ تمہیں تمہارے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔ بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ تم سے یہ گھر خریدنا چاہے لیکن تم نے صاف انکار کرنا ہے۔ وہ قیمت بڑھائے گا۔ ممکن ہے کہ تمہاری خرید سے دگنی یا تگنی قیمت بھی دے لیکن تم نے لالچ میں نہیں آنا۔ وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہر قیمت پر یہ مکان خریدنا چاہے گا۔ اس بندے سے ایک ڈیڑھ کروڑ تک وصول کرلینا تمہارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ ایسا ہی ہو جیسا میں نے سوچا

ہے...... اور تم اپنی مراد پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔" آخری الفاظ کہتے کہتے بہزاد صاحب کی آواز غم ناک اور بوجھل سی ہو گئی تھی، ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی اور آنکھوں میں گہری اداسی کی دھند نظر آتی تھی۔ شہزاد حیران تھا۔

کمپنی والوں کو پتا نہیں چل سکا کہ یہ مکان شہزاد نے خریدا ہے۔ باس کو یہی معلوم ہوا کہ شہزاد اس "پرچیزنگ" میں ناکام رہا ہے۔ وہ اس سے ناراض تھے۔ اس کی ترقی کا امکان ختم ہو گیا تھا اور خدشہ تھا کہ تنخواہ میں بھی بے قاعدگی آنے والی ہے۔ بہرحال پتا نہیں کیوں وہ زیادہ پریشان نہیں تھا۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ بہزاد صاحب کے کہنے پر اس نے جو کچھ کیا، اس کا کچھ نہ کچھ پھل اس کو ضرور ملے گا۔

مالک مکان بننے کے بعد اس نے اڑوس پڑوس والوں سے بہزاد صاحب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ فقط اتنا پتا چل سکا کہ بہزاد صاحب کے والدین کوئی پندرہ سال پہلے وفات پا چکے تھے۔ بہزاد صاحب سے بڑا ایک بھائی انگلینڈ میں مقیم تھا اور اپنے بال بچوں سمیت وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ بہزاد صاحب کے حصے میں اندرونِ شہر کا یہ مکان آیا تھا اور وہ اس پر مطمئن تھے۔ بہزاد صاحب کو کالج کے زمانے سے ستار کا شوق پیدا ہوا۔ اس فن میں انہوں نے کافی نام کمایا اور ایوارڈ وغیرہ بھی حاصل کیے۔ جوانی میں ہی انہوں نے کافی شہرت انجوائے کی۔ اسی دوران میں انہیں کسی سے پیار بھی ہوا جو ناکامی پر ختم ہو گیا۔ اس وقت تک والدین زندہ تھے۔ انہوں نے مجبور کر کے ان کی شادی کر دی۔ بہزاد آرٹسٹک مزاج رکھتے تھے۔ بیوی بالکل اور طرح کی تھی۔ نباہ نہ ہو سکا۔ شادی کے صرف دو سال بعد ہی طلاق ہو گئی۔ بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ بہزاد صاحب تنہائی کی زد میں آئے۔ والدین یکے بعد دیگرے دنیا سے گئے تو اس گھر میں صرف بہزاد اور ان کا ستار ہی رہ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے سوشل لائف سے بالکل کٹ گئے۔ لوگ ان کے پرستار تھے۔ محفلوں میں ان سے سننا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی ریڈیو اور ٹی وی سے بھی آفر آتی تھی لیکن وہ صرف اپنے لیے بجاتے اور خود ہی سنتے تھے۔

شہزاد اپنی جمع پونجی اس کھنڈر مکان کی خرید پر صرف کر چکا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اس کا کیا کرے گا۔ یہ بات تو کچھ افسانوی سی ہی لگتی تھی کہ جب وہ اس مکان کو گرانا شروع کرے گا تو کوئی بندہ یہاں پہنچے گا اور اسے روکنے کے لیے اور مکان خریدنے کے لیے منہ مانگے دام دے گا۔ اگر کوئی ایسی بات تھی تو پھر بہزاد صاحب نے خود یہ کام کیوں نہ کر لیا؟ ایک دن فقط تجربے کے طور پر اس نے دو مزدور لگائے اور اس سہ منزلہ مکان کی چھت پر واقع ممٹی کو گرانا شروع کیا۔ ممٹی دو دن میں گر گئی۔ چھت پر چاروں طرف ملبا بکھر گیا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا جیسا بہزاد قدسی نے بتایا تھا۔ شہزاد نے ایک ہفتے تک سوچ بچار کی پھر اس کے دماغ نے مشورہ دیا کہ وہ اس ایڈونچر میں پڑ کر کہیں خود کو خوار ہی نہ کر لے۔ یہ جگہ اس لائق ہرگز نہیں تھی کہ اسے مسمار کر کے یہاں کوئی پلازا وغیرہ بنایا جاتا۔ تین ساڑھے تین مرلے میں اور اس تنگ گلی میں بھلا کیا بن سکتا تھا۔ بہت ہوتا تو سات آٹھ لاکھ کا فائدہ ہو جاتا اور وہ بھی سخت بھاگ دوڑ اور انویسٹمنٹ کے بعد۔ یہ انویسٹمنٹ کہاں سے آتی؟ اور تعمیر کون کرواتا؟ اس طرح کے کئی سوالات تھے۔ آخر اس نے سوچا کہ خود پس پردہ رہتے ہوئے یہ گھر باس کو ہی فروخت کر دیا جائے مگر جب اس نے ٹوہ لگائی تو اسے پتا چلا کہ باس نے اس سلسلے میں جو بجٹ بنایا تھا، وہ ختم ہو چکا ہے اور اس نے جو آٹھ دس مکان خرید رکھے ہیں وہ ابھی پر اکتفا کرنا چاہ رہا ہے۔ ویسے بھی وہ انگلینڈ روانہ ہو رہا تھا اور اپنے سیریس کام یعنی کنسٹرکشن کے سلسلے میں اسے چار پانچ ماہ وہیں پر قیام کرنا تھا۔

ایک بار پھر شہزاد کا ذہن بہزاد صاحب والی بات کی طرف منتقل ہونے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک اور بات بھی آئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کبھی کبھی پرانے مکانوں کے گرانے والوں کو کوئی غیر متوقع فائدہ بھی ہو جایا کرتا ہے۔ چھت میں سے کوئی نہایت قیمتی لکڑی نکل آتی ہے۔ کہیں دبایا ہوا روپیا یا زیور وغیرہ مل جاتا ہے...... کہیں بہزاد صاحب کی مراد کوئی ایسا ہی فائدہ تو نہیں تھا؟

آخر ایک روز اس نے پھر مزدور لگا کے اور تیسری منزل کے ایک ایسے جھروکے کو گرانے کا ارادہ کیا جس کے گرانے سے باقی عمارت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ مکان میں سامنے کی طرف ایسے ہی تین جھروکے اور تھے۔ قدیم طرز تعمیر کے مطابق ان میں سامنے کی طرف لکڑی کی منقش محرابیں تھیں۔ جھروکے کے زیریں حصے میں سرخ پتھر کی حفاظتی جالی تھی۔ ایسے ہی جھروکے اور بالکونیاں نیچے والی دو منزلوں میں بھی تھیں۔ مکان کی دیواریں موٹی اور لکڑی کی چھتیں قریباً سولہ فٹ بلند تھیں۔ بل کھاتی ہوئی تاریک سیڑھیاں نیچے سے اوپر تک آتی تھیں۔ ان سیڑھیوں میں روشنی اور ہوا کے لیے چھوٹے روزن تھے۔ کبھی کبھی شہزاد کو محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کی ہر شے میں

ایک طرح کی اداسی اور موسیقیت رچی ہوئی ہے۔ وہ اداسی اور موسیقیت جس کا تعلق بہزاد صاحب سے تھا، جنہوں نے پہلے اپنے خاندان کے ساتھ اور پھر تن تنہا قریباً چالیس پینتالیس برس اس گھر میں گزارے تھے۔

شہزاد نے جھروکا گرانے کا کام بڑی احتیاط سے شروع کروایا۔ گنجان علاقوں میں تعمیر اور مسماری کا کام کافی مشکل اور احتیاط طلب ہوتا ہے۔ یہ دوسرے روز دوپہر کی بات ہے۔ شہزاد دفتر میں تھا۔ اسے سیل فون پر ایک کال آئی۔ یہ کال اسی مستری کی طرف سے تھی جو ایک مزدور کے ساتھ گھر میں جھروکا گرانے کا کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر جی! ایک صاحب آئے ہیں۔ انہوں نے کام رکوا دیا ہے۔ کہا ہے کہ مالک کو بلاؤ.....''

ایک دم شہزاد کے سینے میں جیسے نقارہ سا بج اٹھا۔ شہزاد نے پوچھا۔ ''کون ہے؟ کسی محکمے کا بندہ ہے؟''

''نہیں جی۔ محکمے کا تو نہیں لگتا۔ بڑی عمر کا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی ہے۔ ساتھ میں ایک دوسرا بندہ بھی ہے، شاید گاڑی کا ڈرائیور ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم ان کو روکو بلکہ کمرے میں بٹھاؤ۔ میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

شہزاد نے موٹر سائیکل پکڑی اور دھڑکتے دل کے ساتھ حتی الامکان تیزی سے موقع پر پہنچ گیا۔

نیم سفید ڈاڑھی والے شخص کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے کلف لگی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی مگر وہ کچھ زیادہ رعب داب والا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا، ہاں آنکھوں میں ذہانت کی گہری چمک تھی۔ ساتھ ہی ڈرائیور ٹائپ شخص تھا۔ سلام دعا کے بعد نیم سفید ڈاڑھی والے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام فضل احمد ہے۔ تین گلیاں چھوڑ کر چوک میں جو پیلے رنگ کی حویلی ہے، میں وہاں رہتا ہوں۔''

''جسے چٹی حویلی کہتے ہیں؟'' شہزاد نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، پہلے وہ چٹی حویلی ہی کہلاتی تھی۔ اب رنگ بدل چکا ہے مگر نام وہی ہے۔'' فضل احمد نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''مجھے ابھی پتا چلا ہے کہ بہزاد یہ مکان آپ کو بیچ کر چلا گیا ہے اور آپ اسے گرا کر یہاں نئی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔'' شہزاد نے جواب دیا۔

فضل احمد نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ مستری بھی باہر ہی کھڑا اس گفتگو کو دلچسپی سے سن رہا تھا۔ شہزاد کے اشارے پر وہ بھی باہر نکل گیا۔

سفید ڈاڑھی والے فضل احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد صاحب! اب تم اس جگہ کے مالک ہو، جو چاہو کر سکتے ہو لیکن میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اس مکان کو جیسے کا تیسا رہنے دو۔ میرا نہیں خیال کہ آپ اسے گرا کر اور نئی تعمیر کر کے کچھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ یہ جگہ پلازے والی تو ہے نہیں۔ ایک بے ڈھنگی سی رہائشی عمارت ہی بنے گی۔''

''آپ کے مشورے کا شکریہ۔'' شہزاد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟''

فضل احمد نے پھر تھوڑا سا توقف کیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''دراصل...... اس گھر سے کسی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور وہ یہی چاہتا ہے کہ یہ مکان ایسے ہی رہے۔''

''کون ہے وہ شخص؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''سمجھیں کہ میرا مالک ہے۔ میں اس کی ملازمت کرتا ہوں۔ اسی کے کہنے پر میں یہاں آیا ہوں۔''

''آپ کی باتیں کچھ الجھی ہوئی ہیں...... میں سمجھ نہیں پا رہا...... ویسے آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ مکان گرایا جا رہا ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں جس چٹی حویلی میں رہتا ہوں اس حویلی کی دوسری منزل سے مجھے تمہارا یہ گھر نظر آتا ہے۔ چند دن پہلے بھی شاید تم نے تھوڑی بہت توڑ پھوڑ کی تھی...... لیکن اس وقت مجھے پتا نہیں چلا۔ اب جب تم نے دوبارہ کام شروع کرایا تو میں نے دیکھ لیا۔''

''تو آپ کے مالک نے آپ کو بھیجا کہ آپ یہ کام رکوائیں؟'' شہزاد نے قدرے روکھے انداز میں کہا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''آپ کی منطق کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔ آپ کے مالک کو اس مکان میں اتنی دلچسپی کیوں ہے اور کیا اس دلچسپی کی وجہ سے میں آپ کی مرضی کے مطابق چلنا شروع کر دوں؟''

''نہیں...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ اس میں کسی طرح کی زبردستی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر بندے کو اپنا مالی فائدہ سوچنے کا حق ہوتا ہے لیکن اس سلسلے میں، میں ایک چھوٹی سی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔'' شہزاد کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''تم یہ مکان فروخت کر دو۔ تم بغیر تعمیر کے ہی اپنی

توقع سے زیادہ فائدہ حاصل کرلو گے۔"
وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا ذکر بہزاد صاحب نے کیا تھا۔ بہزاد صاحب کی کہی ہوئی ساری باتیں شہزاد کو یاد آنے لگیں۔ اس نے فضل احمد کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "چلیں، آپ بتائیں...... آپ کیا دے سکتے ہیں اس گھر کا؟"

فضل احمد نے ایک طائرانہ سی نگاہ در و دیوار پر ڈال کر کہا۔ "مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت تیس بتیس سے اوپر ہرگز نہیں لیکن اگر تم اپنا ذہن بنالو، تو میں تمہیں اس کا چالیس لاکھ تک دلوا سکتا ہوں۔"

شہزاد کی دھڑکن بڑھ گئی۔ اس نے یہ تیس لاکھ میں خریدا تھا۔ قریباً ایک لاکھ کاغذات وغیرہ پر لگا تھا۔ دو تین ہفتوں بعد نو دس لاکھ کا منافع بہت بڑی بات تھی مگر پھر اسے فوراً بہزاد صاحب کی گفتگو یاد آگئی۔ اس نے روکھے لہجے میں کہا۔ "فضل صاحب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں یہاں کچھ بنانا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے چار چھ سال میں یہ جگہ کمرشل بن جائے گی۔"

"اس گلی میں کیسی کمرشل؟" فضل احمد نے استہزائیہ انداز میں سر ہلایا۔ "تمہاری کم از کم یہ بات تو ماننے والی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ جو بھی سمجھیں لیکن میں ابھی اس جگہ کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ آئی ایم سوری۔" شہزاد کا لہجہ خشک ہو گیا۔

چائے آگئی تھی۔ دونوں نے بوجھل سے ماحول میں چائے کے کپ ختم کیے اور پھر یہ ملاقات ٹیلی فون نمبرز کے تبادلے کے ساتھ ختم ہو گئی۔

شہزاد نے یہ پرکشش آفر ٹھکرا دی تھی لیکن اسے امید تھی کہ جلد ہی دوبارہ آفر آئے گی اور واقعی یہی ہوا۔ اگلے ہی روز شام کو شہزاد اور فضل احمد میں پھر گفتگو ہوئی۔ فضل احمد نے کال کر کے شہزاد کو بتایا کہ وہ لوگ اس گھر کے لیے اسے پورے پچاس لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔ شہزاد نے دل پر جبر کر کے یہ آفر بھی بے رخی سے ٹھکرا دی۔ بہرحال بارش اور خراب موسم کی آڑ لے کر اس نے جھروکے کو مسمار کرنے کا کام وقتی طور پر روک دیا تھا۔

اب اس سلسلے میں اس کی دلچسپی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ فضل احمد کون تھا؟ وہ اپنے کس مالک کے لیے یہ گھر خریدنا چاہ رہا تھا اور اس مالک کو اس گھر سے ایسی کیا گہری دلچسپی تھی؟ اس نے اپنے طور پر کھوج لگایا۔ ایک ہیئر ڈریسر آفتاب عرف آفتابی سے اسے "چٹی حویلی" کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ اسے پتا چلا کہ یہ حویلی انگریزوں کے دور سے کسی سیٹھی فیملی کے استعمال میں ہے۔

آفتابی نے کہا۔ "شاید آپ نے ٹی وی کی مشہور اداکارہ سلیمہ سیٹھی کا نام سنا ہو۔ وہ آج کل بھی ڈراموں میں درمیانی عمر کے پارٹ کرتی ہیں۔"

شہزاد کی آنکھوں کے سامنے نہایت دلکش نقوش والی پُروقار خاتون کا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے کہا۔ "ہاں...... سلیمہ سیٹھی کو دیکھا ہوا ہے۔ کیا وہ بھی اس حویلی میں رہتی ہیں؟"

"اب نہیں رہتیں جی، دس پندرہ سال پہلے رہا کرتی تھیں۔ آج کل تو ڈیفنس میں ان کی بڑی شاندار کوٹھی ہے۔"

"اب حویلی میں کون رہتا ہے؟"

"خستہ حال حویلی ہے جی۔ سلیمہ صاحبہ کا ایک پرانا ملازم ہی اپنی فیملی کے ساتھ وہاں رہ رہا ہے۔ فضل احمد نام ہے۔ اچھا بندہ ہے ویسے۔ میل جول والا ہے۔"

شہزاد کو اب اس معاملے کی کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔ فضل احمد کی مالکن ایک نہایت دلکش اور امیر خاتون تھی...... اور شاید یہی خاتون تھی جو اس مکان کو بکنے سے روکنا چاہتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ماضی میں اس حسین ٹی وی آرٹسٹ اور ستار نواز بہزاد صاحب میں کوئی گہرا تعلق رہا ہے۔ اس تعلق نے کچھ ایسی یادوں کو جنم دیا ہے، جو ایک مدت گزرنے کے باوجود بکھری نہیں تھیں، اپنا وجود رکھتی تھیں۔

شہزاد نے باتوں باتوں میں ہیئر ڈریسر آفتابی سے بہزاد صاحب کے بارے میں بھی پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا تھا جو شہزاد کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا۔ اب شہزاد بے چینی سے فضل احمد سے اگلی ملاقات...... اور اگلی آفر کا انتظار کرنے لگا۔ حسبِ توقع اس ملاقات میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی۔ قریب کی کشادہ گلی میں گاڑی رکنے کی آواز آئی اور پھر فضل احمد نمودار ہوا۔ شہزاد نے اسے اس مختصر گھر کی بیٹھک میں بٹھایا اور رسمی انداز میں چائے کا پوچھا۔

"ہاں چائے کا موڈ تو ہے۔" فضل احمد نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

چائے کے دوران میں ہی فضل احمد اصل موضوع پر آگیا۔ وہی مکان کی خرید والا موضوع۔ شہزاد نے اپنے چہرے پر سخت بیزاری پیدا کر رکھی تھی اور یہ جتا رہا تھا کہ

جیسے وہ اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔
آخر فضل نے کہا۔ ''دیکھو شہزاد! میں نے تمہیں تین چار آفرز دی ہیں۔ اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم یہ مکان بیچنے کے لیے کیا لینا چاہو گے تو پھر؟''
شہزاد کے سینے میں جیسے ایک شادیانہ سا بج اٹھا لیکن وہ ایک ماہر سودے باز تھا۔ اپنے تاثرات چھپانا بخوبی جانتا تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لے کر فضل کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ''ڈیڑھ کروڑ دے سکو گے؟''
فضل سناٹے کی سی کیفیت میں اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر چند سیکنڈ کے اندر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر اس نے بغیر کچھ کہے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک چیک بک نکالی۔ ایک چیک علیحدہ کر کے شہزاد کے سامنے رکھا۔ چیک پر سائن موجود تھے۔ فضل ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''تم نے میری توقع سے بھی زیادہ بتایا ہے۔ ایک بار اس پر نظر ثانی کر لو پھر جو بھی دل چاہے اس میں بھر لینا۔''
''نظر ثانی کوئی نہیں جی۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''ایک روپیا کم نہ زیادہ۔''
فضل ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''او کے..... شناختی کارڈ کی کاپی دے دو۔ میں کل تک کاغذات تیار کروا لوں گا۔''
شہزاد کو اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا لیکن جو وہ سن رہا تھا وہ حقیقت تھی اور حقیقت یہی تھی کہ ایک انہونی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہزاد نے اچھے علاقے میں دس مرلے کا ایک سنگل اسٹوری گھر خرید لیا۔ مہران کار لے لی۔ اس کے کئی سپنے پورے ہو گئے۔ مگر اپنے محسن یعنی بہزاد صاحب سے دوبارہ ملنے والا سپنا پورا نہیں ہوا۔ ان کا فون نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے سیکڑوں مرتبہ ٹرائی کی مگر وہ شاید ''نمبر'' ختم کر چکے تھے۔
شہزاد نے اب چھوٹے پیمانے پر کنسٹرکشن کا اپنا کام شروع کر دیا تھا..... قریباً ڈیڑھ سال بعد کی بات ہے، ایک کام کے سلسلے میں شہزاد کا ''ستی'' جانا ہوا۔ ایک روز ایک سڑک سے گزرتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹک گیا۔ اسے ایک دروازے سے بہزاد صاحب نکلتے نظر آئے۔ ان کا حلیہ اور لباس کافی بدل چکا تھا۔ بال تو اسی طرح لمبے تھے مگر اب چہرے پر کھچڑی ڈاڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔ ماتھے پر ہلکا سا محراب تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھے۔ شہزاد نے گاڑی کو

ھنی مون

ایک شادی شدہ جوڑا ہنی مون ختم ہوتے ہی اپنے گھر پہنچ گیا اور دوسرے دن ہی دلہن نے خرچ کی تنگی کا گلہ شروع کر دیا۔ ''تم تو کہا کرتے تھے، میں بڑا کھاتا پیتا اور مالدار شخص ہوں۔''
''درست ہے۔ مگر یہ میں ہنی مون منانے سے پہلے کہا کرتا تھا۔''

عاشق

ایک عاشق نے ماہر نفسیات کو خط لکھا۔
محترم جناب.......
مجھے ایک ایسی بدصورت لڑکی سے، جسے دیکھ کر بچے ڈر جاتے ہیں۔ سچی محبت ہو گئی ہے جبکہ ایک خوب صورت لڑکی جسے دیکھ کر بیویاں ڈر جاتی ہیں، مجھ سے سچی محبت کرتی ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دونوں میں سے کس کا انتخاب کروں۔
فقط...... پریشان حال
ماہر نفسیات نے جواباً لکھا۔
جناب پریشان حال۔
اپنی سچی محبت کا گلا نہ گھونٹیے اور پہلی والی سے شادی کر لیجیے اور دوسری لڑکی کا نام و پتا مجھے ارسال کر دیں۔
فقط...... جواب کا منتظر

دعوت نامہ

امریکی مزاحیہ اداکار باب ہوپ نے اپنے دوستوں کو ایک شاندار پارٹی دی جس میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ ایک ایسا نوجوان بھی خوب بن ٹھن کر پارٹی میں پہنچ گیا جسے دعوت نامہ نہیں دیا گیا تھا۔ جب پارٹی ختم ہوئی اور لوگ رخصت ہونے لگے تو باب ہوپ نے اس سے آ کر پوچھا۔
''کہیے جناب پارٹی کیسی رہی......؟''
''بے حد شاندار.....'' نوجوان نے اپنی چالاکی پر پھولے نہ سماتے ہوئے کہا۔
باب ہوپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بڑی مہربانی، آپ اپنا پتا دے جائیں تاکہ آئندہ آپ کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا جائے۔''
مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

بریک لگائے اور پھر اتر کر ان کی طرف بھاگا۔ وہ ان سے لپٹ گیا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے...... اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ پریشان بھی۔

شہزاد نے انہیں بتایا کہ وہ کس کس طرح انہیں تلاش کرتا رہا ہے۔ شہزاد نے نیم پلیٹ پڑھی تو اسے پتا چلا کہ یہ بہزاد صاحب کا ہی گھر ہے۔ بہزاد صاحب نے اسے بتایا کہ وہ کوئٹہ سے یہاں آگئے ہیں۔ وہاں کا موسم انہیں بالکل راس نہیں آرہا تھا۔

اگر کہیں سرِراہ ان سے ملاقات ہوئی ہوتی تو شاید وہ کنی کترا جاتے مگر وہ اب گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ انہیں شہزاد کو اندر لے جانا پڑا۔

لاہور کی طرح وہ یہاں بھی تنہا تھے بلکہ اب تو ستار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ شہزاد کا خیال تھا کہ وہ سب سے پہلے اس سے گھر کی فروخت کے بارے میں سوال کریں گے۔ پھر شاہینہ کے بارے میں اور اس سے شادی کے بارے میں پوچھیں گے...... لیکن وہ تو اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے، ان کی سوچ اپنی اور گفتگو کا انداز منفرد تھا۔ شہزاد کے منع کرنے کے باوجود وہ خود ہی چائے بنا کر لائے اور سامنے لکڑی کی میز پر رکھ دی۔ وہ ایک بارشی شام تھی۔ کھڑکی سے باہر بوندیں تواتر سے گر رہی تھیں۔ دسمبر کا آغاز تھا۔ دسمبر ہو، بارش ہو تو پھر آتش دان بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں آتش دان تو نہیں تھا لیکن لوہے کی چھوٹی سی انگیٹھی ضرور سلگ رہی تھی۔ بہزاد صاحب چائے کی پیالی کو گھور رہے تھے۔ اچانک ہی انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں بولنا شروع کیا۔ ''اس کا نام تو سلیمہ تھا لیکن گھر میں اسے پیار سے سیلی کہا جاتا تھا۔ کھاتا پیتا امیر گھرانا تھا۔ اسے ریڈیو ٹی وی پر کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف شوق تھا، یہی شوق اسے پہلے ریڈیو اور پھر ٹی وی پر لے گیا۔ ان دنوں آج کل کی طرح چینلز کی بھرمار تو نہیں تھی۔ بڑا اعلیٰ کام ہوتا تھا......''

بہزاد صاحب بولنا شروع ہوئے تو پھر سحر انگیز انداز میں بولتے چلے گئے۔ وہ اپنی اور سلیمہ سیٹھی کی کہانی سنا رہے تھے۔ شہزاد کا خیال تھا کہ ان سے ان کے ماضی کے بارے میں جاننے کے لیے اسے شاید بہت تگ و دو کرنا پڑے مگر اس کے دیگر خیالوں کی طرح یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا تھا۔ اس بوندا باندی والی یخ بستہ شام میں بہزاد صاحب نے اسے اپنے ماضی کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ مختصر الفاظ میں یوں تھا۔

سلیمہ اپنے کیریئر کے جوبن پر تھی۔ اسے ایک ڈراما سیریل میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ملا جو بہت اچھا ستار بجاتی تھی۔ اپنے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے سلیمہ نے باقاعدہ ستار سیکھنا چاہا۔ ان دنوں بہزاد صاحب کا بھی ستار نوازی میں نام تھا۔ ان کی عمر چھبیس سال اور سلیمہ کی تئیس چوبیس سال ہوگی۔ بہزاد صاحب کی اپنی ایک فنکارانہ آن بان تھی۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ چٹی حویلی میں جا کر سیٹھی فیملی کی لڑکی کو ستار بجانا سکھائیں تو انہوں نے کہا، پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے......

نتیجہ یہ نکلا کہ معروف اداکارہ سلیمہ برقع اوڑھ کر اور تقریباً نصف فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کر کے ستار سیکھنے، چٹی حویلی سے بہزاد صاحب کے گھر آنے لگی۔ بہزاد صاحب کی خودی اور بے نیازی سلیمہ کے دل میں گھر کر گئی اور اس سے بھی زیادہ ان کی شرافت۔ پتا نہیں وہ کون سا جادوئی لمحہ تھا جب وہ ان کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ دوسری طرف بہزاد صاحب بھی خود کو اس کی سحر انگیز شخصیت کی کشش سے نہ بچا سکے۔ جلد ہی دونوں کو یوں لگنے لگا جیسے ایک دوسرے کے بغیر جینا اب ''ناممکن'' ہے لیکن یہ معاشرہ ایسے ہی ناممکنات کو ممکن بنانے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ سلیمہ کو اس کے دادا فرمان سیٹھی نے پالا تھا۔ وہ پوتی سے بہت محبت کرتے تھے اور اتنے ہی سخت مزاج بھی تھے۔ وہ سلیمہ اور بہزاد کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار بن گئے جس کی دونوں جانب دو پیار کرنے والے تڑپ تڑپ کر رہ گئے لیکن دیوار کو توڑ نہ سکے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا جب خوبرو سلیمہ نے سب کچھ چھوڑ کر بہزاد صاحب کے ساتھ کہیں بھی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بالکل تیار ہو چکی تھی مگر بہزاد صاحب اپنی محبت کو اس طرح حاصل کرنے کے حق میں نہیں تھے...... اور پھر وہی کچھ ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ان دونوں کی جدائی پر مہر لگ گئی تھی۔ سلیمہ سیٹھی کی شادی اس کی فیملی میں ریحان سیٹھی سے کر دی گئی اور غریب مگر خوددار اور باکردار ستار نواز بہزاد نقوی اپنے تین مرلے کے گھر میں مہینوں کے لیے بند ہو کر رہ گیا۔ ہاں، یہ وہی گھر تھا جہاں چپے چپے پر ان دونوں کی محبت کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہاں کی دیواریں، جھروکے، بالکونیاں...... سیڑھیاں...... کون سی جگہ ایسی تھی جہاں سے ان کی محبت کی خوشبو نہیں پھوٹتی تھی۔ ان دونوں کا ساتھ صرف ایک سال تک رہا تھا مگر اتنی یادیں دے گیا تھا جو سنبھالے نہیں سنبھلتی تھیں۔ اس ناکام محبت کی روداد علاقے کے کئی پرانے لوگ جانتے تھے۔

بانی کی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں تھی۔ سلیمہ جب کبھی کبھار اپنے میکے یعنی چچی حویلی آتی تھی تو دور سے بہزاد صاحب کے گھر کو دیکھتی تھی۔ کبھی کبھار اسے اپنے نامراد محبوب کی کوئی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہوگی۔ وہ ایک ٹی وی آرٹسٹ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک باکردار مشرقی لڑکی بھی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے بعد اس نے کوئی معاشرتی حد پھلانگنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف...... اور صرف اتنی سی رعایت اپنے لیے حاصل کی کہ کبھی کبھی جب چچی حویلی آتی تو آنسوؤں کی اوٹ سے بہزاد صاحب کے گھر کو دیکھا کرتی۔ دھیرے دھیرے اس کا یہ معمول پختہ ہوگیا۔ مہینے میں کم از کم ایک بار ضرور وہ چچی حویلی آتی تھی۔ ہاں محبت سے وابستہ چیزیں بھی محبوب ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ خاص مکانوں اور گلی کوچوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اس کا شوہر سات آٹھ سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے قریباً سترہ اور پندرہ سال کے تھے۔ ترکے میں اس کو ایک چلتی چلاتی شاندار گارمنٹ فیکٹری بھی ملی تھی۔ اب وہ ہر طرح خودمختار تھی۔ اگر کبھی کبھی کسی ڈرامے یا شو میں دکھائی دیتی تھی تو وہ صرف ایک شوق ہی تھا جو ماضی سے اس کے ساتھ چلا آرہا تھا۔

بہزاد صاحب کی کہانی نے ایک عجیب سے درد میں مبتلا کر دیا تھا۔ خود ان کا اپنا چہرہ بھی اندوہ کی تصویر تھا۔ کھڑکی سے باہر تاریکی پھیل گئی تھی لیکن بارش کی صدا آرہی تھی۔

ایک اداس وقفے کے بعد شہزاد نے کہا۔ ''بہزاد صاحب! گستاخی معاف۔ آپ نے سب کچھ بتایا لیکن اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جس نے آکر مجھ سے مکان کا سودا کیا اور آپ کی پیش گوئی کے عین مطابق ایک بھاری رقم ادا کی۔ اسے یقیناً آپ کے اور سلیمہ صاحبہ کے بارے میں سب معلوم ہوگا۔''

''شاید تم فضل احمد کی بات کر رہے ہو؟'' شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولے۔ ''ہاں...... وہ سلیمہ کا رازدار ملازم تھا۔ دراصل وہ سیٹھی فیملی کے جدی پشتی ملازموں میں سے تھا۔ بچپن میں اس نے سلیمہ کو گود کھلایا اور جب وہ قدرے بڑی ہوئی تو اس کے دوستوں کی طرح ہوگیا۔ جو بات وہ اپنے دادا یا ماں کے ساتھ نہیں کرسکتی تھی، وہ فضل کے ساتھ کرسکتی تھی اور وہ بھی وفاداری اور پُرخلوص محبت میں اپنی مثال آپ تھا...... اور اب بھی ہے۔ خیر اس طرح کی تو اتنی باتیں ہیں کہ شروع کریں تو رات بیت جائے۔ تم بتاؤ، تم کس حال میں ہو۔ شاہینہ کو حاصل کر چکے یا نہیں......؟''

شہزاد نے تھوڑا توقف کیا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں جناب! باقی تو سب کچھ آپ کی عنایت سے حاصل ہو گیا مگر شاہینہ ابھی تک نہیں مل سکی۔''

''یہ کیا بات کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت زدہ اور دکھی نظر آئے۔

''شاہینہ کے والد محترم کی تقریباً ساری شرطیں پوری ہوگئی ہیں لیکن وہ ابھی تک پس و پیش کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی بہانہ کبھی کوئی۔ اب یہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے شاہینہ ماسٹرز مکمل کرے گی۔ بہرحال شاہینہ کی والدہ امید کی کرن کی طرح ہیں۔ وہ پوری طرح ہماری طرف داری کر رہی ہیں...... آپ نے دوا تو کر دی ہے جناب، اب دعا بھی کریں......'' شہزاد نے عجیب لہجے میں کہا۔

بہزاد صاحب یک ٹک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''اچھا فقرہ کہا تم نے۔ دوا تو کر دی اب دعا بھی کریں۔ اچھا کہا۔ ویل سیڈ۔''

''کریں گے دعا؟'' شہزاد نے ان کے ہاتھوں کو عقیدت سے چھوتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور دو سچے موتی محبت کا حسین اشارہ بن کر ان کی آنکھوں سے ٹپک گئے۔

اب پتا نہیں کہ یہ اتفاق تھا، حسنِ اتفاق تھا یا دعا کا اثر تھا (کئی دعائیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جو ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی خدا کی بارگاہ میں قبول ہو جاتی ہیں اور ایسی دعائیں بہزاد صاحب جیسے لوگوں کی ہی ہوتی ہیں) بہزاد صاحب کی آنکھوں سے آنسو گرے ہوئے بہ مشکل دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک شہزاد کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف شاہینہ ہی تھی۔ اس کی آواز جیسے خوشی سے کانپ رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

''ہمارے لیے ایک اچھی خبر ہے شہزاد!''

''کیا؟'' شہزاد نے اپنے سرپٹ دل کو بہ مشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تمہیں سن کر خوشی ہوگی...... لیکن...... لیکن...... مجھے بتاتے ہوئے شرم آئے گی...... میں تمہاری بات امی سے کروا رہی ہوں۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

پھر اس کے بھاگتے چنچل قدموں کی آواز آئی۔ وہ امی کی طرف جا رہی تھی۔ گویا سپنے پورے ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔ ایک گمشدہ محبت کے طفیل ایک روتی سسکتی محبت کو نئی زندگی مل رہی تھی۔



قسط: 11

شیش محل

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رب جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوؤں اور ناآسودہ تمناؤں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی ثنا بھی وہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں ولدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولدار آغا جیسے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ ثنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رین دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی تھیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ وہاں ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ رین دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی ہملا سے ہوتی ہے جو بیوہ ہے۔ ہملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، وہ شوٹنگ کی غرض سے شملہ جاتی ہے اور فاروق سے ملنے بھابیہ کی رہائش گاہ پہنچتی ہے۔ تاہم ہملا اسے فاروق سے ملنے نہیں دیتی اور دل میں رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے مگر فاروق کی چاند بانو سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ادھر رین دادا جولیٹ کی بربادی کے ذمے دار شخص کی کھوج میں رہتا ہے۔ تاہم جولیٹ اسے کچھ نہیں بتاتی۔ رین دادا محلے کی ایک بیوہ ثریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ ثریا بانو کے پیچھے مجو دادا نامی غنڈا لگا ہوتا ہے جسے رین دادا پہلے ہی سبق سکھا چکا ہوتا ہے۔ مجو دادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو غنڈوں کو برات کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ برات بمبئی سے بذریعہ ٹرین دوسرے شہر جا رہی ہوتی ہے۔ اس کے آدمی بھی برات کی حفاظت کے لیے موجود ہوتے ہیں تاہم لڑائی کے دوران رین کا ایک آدمی مارا جاتا ہے۔ رین کے آدمی بدلہ لینے کے لیے ایک مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ تاہم اس جگہ پر پہلے سے ہی مجو کے آدمی ہوتے ہیں اور وہ سب اس مکان میں ...

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

آنے والے کچھ ایسی تیزی سے اندر آئے تھے کہ راسو اور اس کے ساتھی فوری طور پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر سکے اور آنے والوں نے انہیں زد پر لینا شروع کر دیا۔ ان کے تیز دھار چاقو بلا تخصیص ہر طرف گھوم رہے تھے، نتیجے میں کئی چیخیں اور آہیں بلند ہوئیں۔ کسی کے شانے پر زخم آیا تو کسی کے بازو پر چرکا لگا، کسی کے پہلو سے خون کا فوارہ چھوٹا تو کوئی اپنی کلائی پکڑ کر رہ گیا۔ وہ جو جوشِ انتقام سے بھرے حملہ کرنے آئے تھے، خود ہی شکار ہونے لگے۔

بالکل غیر متوقع صورت حال نے کچھ لمحوں کے لیے ان کے حواس ہی مختل کر دیے تھے اور حملہ آوروں کو گمان ہونے لگا تھا کہ انہوں نے بازی مار لی ہے لیکن پھر راسو اور اس کے ساتھیوں نے ابتدائی جھٹکے سے نکل کر سنبھلنا شروع کر دیا۔ وہ عام لوگ نہیں تھے کہ اپنے جسموں پر چاقو کا ایک آدھ وار کھا کر ہی لیٹ جاتے۔ انہیں ایسے حال میں بھی لڑنے کی تربیت دی گئی تھی، چنانچہ لمحوں میں اپنے زخموں سے بے نیاز ہو کر آنے والوں کو ان کی جرأت کا جواب دینے لگے۔ اس

سارے ہنگامے نے رات کے سکوت وسکون کو یکسر توڑ ڈالا۔ جوشیلی آوازیں، بلند چیخیں، گندی گالیاں اور بڑی بڑی بھڑکیں مل کر اچھے خاصے شور شرابے میں تبدیل ہوگئیں۔ اس شور کو سن کر اپنے بستروں پر محو استراحت اہل محلہ جاگ گئے، اندھیرے گھروں میں روشنیاں جلنے لگیں، کچھ جی دار حالات کا اندازہ کرنے دروازے کھول کر باہر بھی نکلے لیکن کس میں جرأت تھی کہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا چاقو برداروں سے کوئی سوال کر پاتے یا انہیں اس وحشیانہ لڑائی سے روک پاتے۔ لڑنے والوں میں سے کچھ مکان کے اندر تھے اور کچھ باہر تک آگئے تھے۔ دو ڈھائی منٹ میں ہی وہاں گویا قیامت آگئی تھی۔ لڑنے والوں کو تو کوئی ہوش نہیں تھا لیکن دیکھنے والے خون اور خاک میں لتھڑے انسانی جسموں کو دیکھ کر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان کانپتے لوگوں ہی نے سب سے پہلے یہ منظر دیکھا کہ ایک تانگا قریب آکر رکا ہے اور اس میں سے کچھ لوگ کھلے چاقوؤں کو لہراتے ہوئے بھاگ کر لڑنے والوں میں شامل ہوئے ہیں۔ نئے آنے والے یہ لوگ ربن دادا اور اس کے آدمی تھے۔ ان کے آتے ہی لڑائی کا نقشہ تیزی سے بدلنے لگا۔ راموا اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہونے والوں کا زور ٹوٹتے ٹوٹتے بالکل ختم ہوگیا اور وہ خاک میں لوٹتے دکھائی دینے لگے۔

''ایک دو مشٹنڈوں کو باندھ کر ساتھ لو اور سارے ادھر سے نکل چلو۔'' صورت حال قابو میں آتے ہی ربن کی پاٹ دار آواز وہاں گونجی تو تیزی سے اس حکم پر عمل ہونے لگا۔ راموا اور وجے نے مزید دو افراد کے ساتھ مل کر نسبتاً کم زخمی ہونے والے دو افراد کو ان ہی کی قمیصوں کے ٹکڑے پھاڑ کر باندھا اور تانگوں میں لاد لیا۔ باندھے گئے ان دو افراد کے منہ بھی کپڑا ٹھونس کر بند کر دیے گئے تھے۔ ان افراد کو پائیدان پر ڈال کر وہ لوگ خود بھی تانگوں پر چڑھنے لگے۔ زیادہ تر کی حالت بہتر تھی بس ایک دو افراد ذرا زیادہ زخمی ہوئے تھے جنہیں ان کے ساتھیوں نے سہارا دے کر سوار کروایا۔ زیادہ زخمی افراد میں سے ایک کے پہلو میں زخم آیا تھا جس سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا جبکہ دوسرے کا شاید بازو ٹوٹ گیا تھا۔ فوری طور پر اس کے بازو کو ایک لکڑی کے ٹکڑے کے ساتھ باندھ دیا گیا جبکہ دوسرے کے پہلو پر کپڑے کی گدی سی بنا کر رکھنے کے بعد سختی سے پٹی باندھ دی گئی کہ خون کے بہاؤ کی رفتار کم ہوسکے۔ یہ سب کام چلتے تانگے میں ہی انجام دیے گئے کیونکہ رکنے میں خطرہ تھا۔ وہاں جتنا ہنگامہ ہوا تھا پولیس کو اطلاع ہونا لازمی تھا۔ اطلاع پا کر پولیس پہنچتی اور انہیں گھیرنے میں کامیاب ہوجاتی تو بہت مشکل ہوجاتی۔ وہ اپنے علاقے سے دور تھے اور ان کی حیثیت حملہ آوروں کی سی تھی، اس لیے پولیس کے ہاتھ آجانا ہر اعتبار سے سخت نقصان دہ ہوتا اور اشوک بجن جیسے ماہر وکیل کی قابلیت بھی کام نہ آتی۔ واپسی کا سفر بے حد تیزی سے طے کیا گیا۔ وہ لوگ واپس اڈے پہنچے تو وہاں ڈاکٹر اپنے ایک مددگار کے ساتھ پہلے ہی موجود تھا۔ سب سے پہلے پہلو میں زخم کھائے اشفے عرف اکو کو ڈاکٹر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے زخم کا معائنہ کیا اور اس کی آنکھوں میں تشویش دکھائی دینے لگی۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے دادا۔ خون زیادہ بہہ گیا ہے۔ زخم بھی گہرا ہے، اس کو اسپتال بھیجنا پڑے گا۔'' آخر کار اس نے اعلان کر دیا۔

''ٹھیک ہے، بھجوا دیتے ہیں۔'' ربن نے پل بھر کے لیے سوچا اور فیصلے پر پہنچ گیا۔ بازو ٹوٹنے والے کے بارے میں بھی ڈاکٹر کی یہی رائے تھی کہ اگرچہ اس کا زخم جان لیوا نہیں ہے لیکن مناسب علاج اسپتال میں ہی ہوسکتا ہے۔ ربن نے فوری طور پر ان دونوں کو دو آدمیوں کے ساتھ اسپتال کے لیے روانہ کر دیا۔ اس نے ہدایت کر دی تھی کہ پولیس کے تفتیش کرنے کی صورت میں انہیں کیا بیان دینا ہے۔ وہ پولیس والوں کو یہی بتاتے کہ دونوں افراد فلم کا لیٹ نائٹ شو دیکھ کر واپس آرہے تھے کہ ایک تاریک گلی میں کچھ افراد نے انہیں گھیر لیا اور لوٹ مار کی کوشش کی۔ وہ چونکہ اڈے کے لوگ تھے اس لیے آسانی سے لٹیروں کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے چنانچہ ان سے بھڑ گئے۔ نتیجے میں دونوں طرف کے افراد کا نقصان ہوا لیکن چونکہ لٹیروں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وہ غالب رہے اور ان دونوں کو شدید زک اٹھانی پڑی۔ وہ زخمی حالت میں گرتے پڑتے اڈے پر پہنچے اور وہاں سے ان کے ساتھی علاج کے لیے انہیں اسپتال لے آئے۔ پولیس اس کہانی پر یقین کرتی یا نہ کرتی لیکن انہیں جھٹلانے کے لیے بھی ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہوتا۔

ان دو افراد کو اسپتال روانہ کرنے کے بعد ڈاکٹر اپنے مددگار کے ساتھ باقی زخمیوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ کے زخموں کو ٹانکے لگا کر بند کرنا پڑا اور کچھ کا صرف مرہم پٹی سے ہی

گزارا ہوگیا۔ جنہیں ضرورت تھی، انہیں انجکشن بھی لگائے گئے۔ ڈاکٹر کا مددگار اپنے ساتھ لائے گئے ڈبے میں سے گولیاں نکال نکال کر حسب ضرورت ایک ایک کو تھما تا رہا۔ اس دوران یرغمالی کی حیثیت سے ساتھ لائے گئے دونوں افراد بندھی ہوئی حالت میں ایک طرف پڑے رہے۔ ربن بے نیازی سے ساری کارروائی دیکھتا ایک طرف بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اس سے مخاطب ہوتا۔ گھاؤ کھا کر آنے والے اس کے سامنے نظر اٹھاتے ہوئے شرمندہ ہو رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ربن... بہ زبانِ خاموشی ان سے کہہ رہا ہے کہ انہوں نے اس کی ساری محنت اور تربیت خاک میں ملا دی۔ شرمندگی کا شکار ان افراد میں رامو بھی شامل تھا۔ اس کے بازو پر گہرا زخم آیا تھا اور ڈاکٹر کو چار ٹانکے لگانے پڑے تھے۔ دوسرے پر بھی دو تین زخم تھے لیکن وہ معمولی نوعیت کے تھے۔ حملہ آوروں کی اچانک آمد نے اسے بھی پہلے لمحے پر بوکھلا دیا تھا لیکن پھر وہ بہت جی داری سے لڑا تھا۔ حملہ آوروں میں سے کس کس نے اور کتنا اس کے چاقو کی دھار کا مزہ چکھا تھا، اس کا شمار وہ خود بھی نہیں کرسکا تھا لیکن اس ساری کارکردگی کے باوجود اس کی نظریں شرمساری کے احساس سے ربن کے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔ حالات نے اسے ربن کے ہر عمل اور ردِعمل کی وضاحت خود پیش کردی تھی۔ بجو کے ایک ٹھکانے کا علم ہونے پر اس نے ان لوگوں کی طرح اندھا دھند وہاں چڑھ دوڑنے کی تجویز نہیں دی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو جوش میں حملہ کرنے جا پہنچے تھے اور بغیر کوئی منصوبہ بندی کیے سید ھے اس مکان کے اندر جا کودے تھے۔ وہ مکان جو ان کے لیے اصل میں چوہے دان تھا۔ اگر ربن پیچھے سے کمک لے کر نہ پہنچتا تو انہیں موجودہ صورتِ حال کے مقابلے میں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا۔ ربن کی زیرک نگاہوں نے پہلے ہی گڑبڑ کو بھانپ لیا تھا لیکن ان لوگوں کو اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جوشِ انتقام سے بھرے اس کے ساتھی اس کے کہنے پر رک تو بے شک جائیں گے لیکن ان کے دل غیر مطمئن رہیں گے۔ نہ روکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ انہیں ان کی کمزوریوں اور خامیوں کا احساس دلانے کے لیے عملی سبق دینا چاہتا ہو۔ زبانی سمجھانے بجھانے کا شاید ان پر اتنا اثر نہ ہوتا جتنا چوٹ کھا کر انہوں نے سیکھا تھا۔

''اپنے کو شما کردو دادا! اپن کے پاس تمہارے جیسی نظر نہیں ہے۔ اپن کو تمہاری خاموشی سے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تمہاری کیا مرضی ہے۔ اپن سمجھا نہیں اور دوسری غلطی یہ کیا کہ سارا کیہنہ لوگ ایک ساتھ مکان میں کود گیا۔ اپنے کو دو چار آدمی باہر نگرانی کے لیے چھوڑنے کا تھا پر پتا نہیں کیسے بدھی ماری گئی۔ اگر تم نہ آتے تو آج سب سالا مارا جاتا۔ مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔ ایسے تمہارے کو یہ پھٹکار برستی شکل تو نہیں دکھانا پڑتا۔'' رامو میں ربن سے نظر ملانے کا یارانہ تھا لیکن وہ اس سے اپنی شکل چھپا کر جاتا بھی تو کہاں۔ دیر سویر اسے ربن کا سامنا تو کرنا ہی تھا، اس لیے ڈاکٹر کے روانہ ہوتے ہی اپنی ہمت مجتمع کرکے اس کے قریب جا پہنچا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پیروں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔

''کاہے کو اپنا بھیجہ (مغز) کھاتا ہے۔ جا، جا کر آرام کر اور یہ جو ہیں جن کا منہ متھا پھوٹا ہوا ہے، ان کو ادھر سے اپنا شکل گم کرنے کا بول۔ وہ سالے پولیس والے کتوں کی طرح بو سونگھتے ہوئے پوچھ تاچھ کے لیے ادھر ہی ضرور آئیں گے۔ کوئی ایسا بندہ پولیس کی نظر میں نہ آنے پائے جس کا زخم دکھائی پڑتا ہو۔'' ربن نے ڈپٹنے والے انداز میں اس سے کہتے ہوئے ایک اور کام کا نکتہ سمجھایا تو رامو تیزی سے حرکت میں آگیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ افراد جن کے زخم کپڑوں میں پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے، اڈے سے روانہ کردیے گئے۔ اب پولیس والے اڈے پر آبھی جاتے تو ان کا ایسے کسی بندے سے سامنا نہ ہوتا جس کی موجودگی شکوک وشبہات پیدا کرپاتی۔ اس کام سے فارغ ہوکر رامو ایک بار پھر ربن کے قدموں میں آبیٹھا۔ وہ ربن کا نائب تھا اور ربن کے بعد اڈے پر اسے خاص اہمیت حاصل تھی لیکن اپنی ایک غلطی کا ادراک ہوجانے پر وہ سب کے سامنے ربن کے آگے جھکنے اور معافی طلب کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کررہا تھا۔

''اپن تیرے کو بولا تھا کہ جا کر آرام کر پھر کیوں ادھر آکر بیٹھ گیا ہے۔'' ہونٹوں سے حقے کی نے جدا کرتے ہوئے ربن نے بیزاری کا اظہار کیا۔

''تم اپنے کو شما نہیں کریں گا تو اپنے کو چین کدھر سے آئے گا۔ ماں کی سوگند اپن تو تمہیں ناراج (ناراض) چھوڑ کر آرام کرنا تو دور کی بات، سکھ سے مر بھی نہیں سکے گا۔'' رامو بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

''اپن کسی سے ناراض نہیں ہے۔ تم لوگوں کو ایک سبق سکھانے کا تھا، سکھا دیا۔ اب کاہے کی ناراضگی.....؟'' سختی سے بولتے بولتے آخر میں ربن کا لہجہ نرم ہوگیا تو رامو کو

قدرے تسلی ہوئی اور اس کے پاؤں دباتے ہوئے لجاجت سے بولا۔

''سبق تو ایسا سیکھا ہے دادا کہ اب مرتے دم تک نہیں بھولنے کا ہے۔''

''یاد رکھنا ہی اچھا ہے رے۔ اپنی دنیا میں جو بھولتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ ادھر جنگل کا قانون چلتا ہے اور جناوروں (جانوروں) جیسی ہی ہوشیاری چاہیے ہوتی ہے ورنہ جو ذرا سا ڈھیلا پڑا، دوسرے اسے چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔'' اب ربن کا انداز پُرشفقت ہو گیا تھا۔

''ایک دم ٹھیک بولے دادا۔'' رامو نے اس سے اتفاق کیا پھر ساتھ لائے دونوں افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ان کا کیا کرنا ہے؟ پولیس آ گئی تو یہ لفڑا ڈال دیں گے۔''

''پولیس کے آنے پر ان کا بندوبست بھی کر دینا۔ ابھی تو ان سے تھوڑی جانکاری لینے کی ہے۔ یہی تو اپنے سے مجو اور فیکے کا آگا پیچھا بھونکیں گے۔ کھلوان کے منہ۔'' ربن کا لہجہ ایک بار پھر جلالی ہو گیا۔ اس کا حکم پاتے ہی دو تین افراد بندھے ہوئے آدمیوں کی طرف لپکے اور ان کے منہ میں ٹھونسے گئے کپڑے نکال کر ربن کے مقابل زمین پر لا پٹخا۔ ان میں سے ایک فوراً ہی فریادیں کرنے لگا۔

''اپنے کو شما کر دو دادا۔ اپن کو کچھ کھبر نہیں ہے۔ اپن تو بس دِہاڑی لگایا تھا۔'' اس نے بغیر کسی سوال کے خود ہی بولنا شروع کر دیا اور ذرا دیر میں اپنی ساری کہانی سنا ڈالی کہ وہ گلیوں میں بھٹکنے والا ایک عام سا غنڈا ہے جسے رقم دے کر حملہ آوروں میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کی اس داستان گوئی کے درمیان دوسرا آدمی بالکل خاموش اور لاتعلق رہا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد ربن نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی اور دوسرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تیرا کیا نام ہے رے؟''

''پنچو۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تو اپنا کچا چٹھا بول۔'' ربن نے اسے حکم دیا۔

''اپنی کہانی بھی اس کے جیسی ہی ہے۔'' اپنا نام پنچو بتانے والے نے پہلے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پر تیرے منہ پر تو کچھ اور لکھا ہے۔ خود سے بک دے ورنہ اگر اپن نے یہ کہانی پڑھنے کی کوشش کی تو تیرا بڑا نقصان ہوگا۔''

''جو تھا اپن نے بول دیا۔'' اس نے ربن کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں لیا اور اسی بے نیازی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جیسی تیری مرضی۔'' ربن نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور پھر سجو کو پکارنے لگا۔ سجو فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

''تیری رسوئی میں مرچی نمک کی کمی تو نہیں ہے نا رے؟'' ربن نے اس سے دریافت کیا۔

''نہیں دادا! ساری برنیاں ایک دم فل بھری ہوئی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لا پھر تھوڑی ادھر لا کر دے۔ سالے ڈاکٹر نے ان بے چاروں کی مرہم پٹی نہیں کی۔ اپن ان کے زخموں پر تھوڑا دوا لگا دے گا۔'' سجو کو دیے جانے والے اس حکم پر پنچو کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا تاہم اس نے زبان بند ہی رکھی۔ سجو جا کر فٹافٹ نمک اور مرچ کی برنیاں لے آیا۔

''لگا رے دجے، ذرا مہمان کو تھوڑی دوا تو لگا۔'' ربن نے دجے کو پکارا تو وہ فوراً حرکت میں آ گیا اور نمک کی برنی میں سے نمک نکال کر پنچو کی پنڈلی کے زخم پر مل دیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اور خون جم کر خود ہی رک گیا تھا لیکن نمک لگنے سے وہ تڑپ اٹھا۔

''جلدی جلدی ہاتھ چلا رے۔ دیکھ تو بے چارے کے جسم پر کتنے گھاؤ ہیں، سب پر دوا لگا۔'' ربن نے سرد لہجے میں ہدایت جاری کی۔ اس بار وجے نے سرخ مرچ نکال کر اس کے بازو پر لگے چھوٹے سے کٹ میں بھر دی۔ وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کے تڑپنے کو خاطر میں نہ لا کر وجے نے اس کے جسم پر ایک اور زخم دریافت کیا اور اس میں نمک اور مرچ دونوں ملا کر بھرنے لگا۔ اس تکلیف پر بلبلا کر پنچو چیخیں مارنے لگا۔

''زخموں کو تلاش کیوں کرتا ہے رے..... تیرے پاس چاقو ہے نا' چار چھ چرکے تو خود کیوں نہیں لگا دیتا۔'' ربن کا انداز قطعی بے رحم تھا اور وجے بھی ہر حکم پر فوری عمل کے لیے کمربستہ نظر آ رہا تھا۔ لمحے بھر کی بھی تاخیر کیے بغیر اس نے پنچو کے رخسار پر بڑی نفاست سے دو انچ کا ایک کٹ لگا دیا۔ اس سے قبل کہ وہ اس زخم کے ساتھ کوئی کارروائی کرتا، پنچو کی مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ ہاتھ پیر جوڑنے لگا۔ اس کی زبان کھلنے پر یہ باتیں سامنے آئیں کہ ربن کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہو کر اپنی گدی گنوا دینے والا مجو اور من مانی پر بیچ چورا ہے پہ جوتے کھانے والا فیکا، ربن

اور اس کے آدمیوں کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ انہوں نے ادھر اُدھر سے بچے لوگ جمع کر کے اپنا ایک گروہ سا بنا لیا تھا جس کا خرچہ پانی فی الحال اس مال پر چل رہا تھا جو بجو نے اپنے اڈے پر راج کے زمانے میں خوب جی بھر کر جمع کیا تھا۔ ربن نے اس کو اس لائق تو چھوڑا ہی نہیں تھا کہ اب وہ کبھی ہاتھ میں بیا تو پکڑ سکتا اور کسی اڈے کی گدی پر بیٹھ سکتا، چنانچہ وہ دن رات انتقام کی آگ میں جلتا سازشوں کے جال بُنتا رہتا تھا۔ ثریا بانو کو کلکتہ جاتے ہوئے اغوا کرنے کی کوشش بھی اس کی انتقامی کارروائی کی ایک کڑی تھی لیکن اسے اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور کمو نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر ثریا بانو کو اغوا ہونے سے بچا لیا۔ اس کام میں فیکے کے ساتھ شامل کرائے کے دونوں بندوں کو اصل میں چارے کے طور پر آزاد چھوڑا گیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ربن کے آدمی ہریا اور سلو تک لازمی پہنچ جائیں گے اور ہریا اور سلو اس ٹھکانے کی نشان دہی کر دیں گے جہاں ان کی بجو سے ملاقات ہوئی تھی۔ دور دور سے ان دونوں کی نگرانی کرتے بجو اور فیکے کے آدمیوں نے اس ٹھکانے کو ربن اور اس کے آدمیوں کے لیے چوہے دان بنانے کی سازش کر رکھی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے اگر ربن بیدار مغزی سے کام نہ لیتا اور عین وقت پر اپنے آدمیوں کی مدد کے لیے نہ پہنچ جاتا۔

''اب کس بل میں چھپ کر بیٹھا ہے وہ کمینہ'' پنٹو سے ساری داستان سننے کے بعد ربن نے دریافت کیا۔

''ماتا جی کی سوگند اپنے کو نہیں معلوم۔ فیکا استاد اپن سے اپنے ٹھکانے پر آ کر ڈیل کیا تھا۔ اپن آج کل اس کے لیے کام جرور کر رہا ہے، پر وہ اپن کو اپنے ٹھکانے پر کبھی نہیں لے گیا۔ خود آ کر ملتا اور حکم دیتا ہے۔ اپن کو بھی مال پانی سے مطلب ہے اس لیے کبھی اس سے اس کا ٹھکانا نہیں پوچھا۔'' پنٹو کی ساری طراری ختم ہو گئی تھی اور وہ ہولے ہولے کراہتے ہوئے بول رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تو اپنے ساتھی کے ساتھ ادھر سے نکل جا۔ زبان ایک دم بند رکھنا اور پولیس کے پاس جانے کی غلطی مت کرنا ورنہ اپنا تو کچھ نہیں جائے گا پر تیری جان مصیبت میں آ جائے گی۔'' ربن کی زیرک نگاہوں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی سچائی کو بھانپ لیا تھا اس لیے اسے دھمکا کر جانے کی اجازت دے دی۔ خواہ مخواہ کا خون خرابا نہ اس کے مزاج میں تھا اور نہ ہی مفاد میں۔ کرائے کے ان ٹٹوؤں کو نقصان پہنچا کر انتقام کی آگ نہیں بجھائی جا سکتی تھی۔ اصل مجرم فیکا اور بجو تھے اور ان کا ہاتھ آنا ضروری تھا اور یہ آسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ وہ دونوں چھپ کر وار کرنے کی حکمت عملی پر کاربند ہیں اور جب جب موقع ملے گا، انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش تو ضرور کریں گے لیکن خود سامنے آنے کے بجائے پنٹو اور اس جیسے دوسرے کرائے کے آدمیوں سے کام لیتے رہیں گے۔ منظم گروہ کے نہ ہونے کے باعث یہ ان کی مجبوری بھی تھی اور حکمت عملی بھی۔

''دھنیو اد داوا۔ بہت بہت دھنیو اد۔ اپن تمہاری بات یاد رکھے گا اور کدھر بھی اپنا منہ نہیں کھولے گا۔'' آزادی کی خوش خبری سن کر پنٹو اس کے قدموں میں بچھنے لگا لیکن اب ربن اس سے بے نیاز ہو چکا تھا اور لاتعلقی سے اپنے حقے کو گڑگڑاتے ہوئے کسی بہت گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆

''ٹھیک ہے سروری..... تم جاؤ، میں یہاں کچھ دیر گزاروں گی۔ تم اتنی دیر میں اپنے دوسرے کام نمٹا لو۔'' جوزفین کی خواہش پر سروری اسے اپنی راہنمائی میں نواب صاحب کی لائبریری تک لے کر آئی تو اس نے دروازے سے ہی سروری کو واپس بھجوا دیا اور خود دروازہ کھول کر دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ کمرے کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور چاروں طرف بڑی بڑی دیوار گیر الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ درمیان میں لکڑی کی ایک منقش میز تھی جس کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے قریب خوب صورت و بیش قیمت راکنگ چیئر رکھی ہوئی تھی جو یقیناً نواب سلیم اللہ کے زیر استعمال رہتی تھی۔ درمیان میں رکھی میز پر رائٹنگ پیڈ اور قلم دان بھی موجود تھے اور خوب صورت شیڈ والا ٹیبل لیمپ بھی۔ جوزفین کو اس کمرے کی ترتیب اور سکون آمیز خاموشی بہت اچھی لگی۔ یہاں آرائشی اشیا کی بھرمار نہیں تھی لیکن جتنا بھی سامان تھا، اس سے امارت اور خوش ذوقی دونوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ پاؤں دھنسنے والے دبیز قالین پر چلتی ہوئی وہ الماریوں میں سجی کتب کا جائزہ لینے لگی۔ یہ کتب بھی بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھی گئی تھیں۔ مذہب سے متعلق کتب ایک جگہ تھیں، اسی طرح انگریزی اور اردو ادب کے فن پاروں کو بھی بڑی ترتیب سے جمع کر کے رکھا گیا تھا۔ اس نے انگریزی ادب والے حصے سے شیکسپیئر کا ''ہیملٹ'' نکالا اور درمیان میں رکھی میز کے گرد موجود کرسیوں میں سے ایک پر آ بیٹھی۔ یہ وہ پیپر کے

کھانے کے بعد ملنے والا آرام کا وقفہ تھا اور وہ اطمینان سے مطالعہ کر سکتی تھی۔ اس نے ناول پڑھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ اس میں گم ہوتی چلی گئی۔ اپنے اس انہماک میں اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہے اور اسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا ہے۔ گلابی رنگ کے کرتے پاجامے میں ملبوس، رخسار پر سرخی مائل براؤن بالوں کی جھولتی لٹ اور کتاب پر جھکی نظروں کے ساتھ وہ کچھ ایسی ہی دلکش لگ رہی تھی کہ آنے والے کا ٹھٹکنا بالکل جائز تھا۔ کچھ دیر تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے تکتا ہی رہ گیا لیکن پھر اسے خود ہی احساس ہوا کہ اگر جوزفین نے نظر اٹھا کر دیکھ لیا تو اس کے اس انداز پر وہ برا بھی مان سکتی ہے۔ ایک لڑکی کو اس کی لاعلمی میں یوں گھورتے ہوئے کھڑے رہنا کافی معیوب سی حرکت تھی۔ اس نے ہولے سے گلا کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جوزفین کا انہماک ٹوٹا اور اس نے چونک کر کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔

''ارے نواب زادہ صاحب آپ!'' وہ کچھ گڑبڑا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''پلیز تشریف رکھیے۔ ہم یہاں ایک کتاب کی تلاش میں آئے تھے۔'' نواب زادہ اسد اللہ اپنی ابتدائی کیفیت سے سنبھل چکا تھا چنانچہ بڑے وقار سے ٹہلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے بھی انگریزی ادب کے ذخیرے والی الماری کا رخ کیا تھا۔ جوزفین کا انہماک اس کی موجودگی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ مطالعے پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پا رہی تھی لیکن اٹھ کر باہر نکل جانا بھی کچھ معیوب سا لگ رہا تھا کہ مبادہ نواب زادہ گمان کرے کہ اس کی یہاں موجودگی اسے شاق گزر رہی ہے۔ وہ بہ ظاہر مطالعے میں مصروف اپنی جگہ پر بیٹھی رہی لیکن کن انکھیوں سے نواب زادہ کی طرف بھی دیکھتی رہی۔ اس نے حسب معمول سفید کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ جوزفین نے نوٹ کیا تھا کہ یہاں مرد حضرات حویلی میں موجودگی کے دوران عموماً کرتہ پاجامہ ہی پہنتے تھے جس کا رنگ بھی زیادہ تر سفید ہوتا تھا جبکہ حویلی سے باہر جاتے ہوئے شیروانی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ نواب زادہ اسد اللہ نے اس وقت جو سفید رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا، اس کے گلے پر سفید رنگ کے ہی دھاگے سے نہایت نفیس کڑھائی کی گئی تھی اور اس کرتے میں اس کی شخصیت کی وجاہت بے حد نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ الماری کھولے بہت توجہ سے کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ جوزفین نے محسوس کیا کہ اسے جس کتاب کی تلاش ہے، وہ مل نہیں رہی ہے اور اس ناکامی پر اس کے ماتھے پر دھیرے دھیرے ایک بل ابھرنے لگا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے قدرے جھنجلاہٹ کے عالم میں الماری بند کی اور رخ موڑا۔ جوزفین نے بھی فوری طور پر اس کا جائزہ لینا بند کر کے نظریں پوری طرح کتاب پر مرکوز کر دیں۔

''ایکسکیوزمی مس جوزفین! کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کس کتاب کا مطالعہ کر رہی ہیں؟'' وہ جو سمجھ رہی تھی کہ اب اسد اللہ وہاں سے باہر نکل جائے گا، انگریزی زبان میں اپنی سماعت سے ٹکرانے والے اس جملے کو سن کر چونکی پھر زبان سے کوئی جواب دینے کے بجائے کتاب کا سرورق اس کے سامنے کر دیا۔

''اوہ...... یہ آپ کے پاس ہے۔ ہم اتنی دیر سے اسی کتاب کو تلاش کر رہے تھے۔'' اسد اللہ نے گویا اطمینان کا سانس لیا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا ورنہ پہلے ہی بتا کر آپ کو زحمت سے بچا لیتی۔'' جوزفین نے کہتے ہوئے کتاب اس کی طرف بڑھائی۔

''پلیز نہیں۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ اسے اپنے ہی پاس رکھیے۔ ہم کسی اور وقت اس کا مطالعہ کر لیں گے۔ اس وقت تو فقط یہ الجھن تھی کہ کتاب غائب کہاں ہو گئی ہے۔ ہمیں ڈر تھا کہ صفائی کرنے والی ملازمہ نے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہیں اِدھر اُدھر نہ کر دی ہو۔'' اسد اللہ نے کتاب تھامنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا اور وضاحت کرنے لگا۔

''اصل میں دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے فرصت ہوتی ہے اس لیے میں نے نواب صاحب سے ان اوقات میں یہاں آ کر مطالعہ کرنے کی خصوصی اجازت حاصل کر لی ہے۔ میری معلومات کے مطابق ان اوقات میں حویلی کے زیادہ تر افراد قیلولہ فرماتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں آتا۔'' جوزفین نے بھی اپنی یہاں موجودگی کی وضاحت پیش کرنا مناسب سمجھا۔

''آپ کی معلومات درست ہیں، بس آج اچانک ہمیں اس وقت شیکسپیئر کی اس کتاب کا خیال آ گیا تو ہم اسے لینے یہاں چلے آئے۔ اصل میں ہم شیکسپیئر کے شیدائی ہیں اور اس کی ہر کتاب کو کئی بار پڑھ چکے ہیں۔ لندن میں قیام کے عرصے میں تو ہم ہر ویک اینڈ پر خاص طور پر تھیٹر جا کر شیکسپیئر کا ڈراما دیکھا کرتے تھے۔ ہم مزاج دوستوں سے بھی اس پر کافی گفتگو رہتی تھی لیکن یہاں ہم سے اس موضوع پر

گفتگو کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں یہ کتاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ایک ہم ذوق میسر آگیا ہے۔ کیا آپ کو بھی شیکسپیئر پسند ہے؟'' اس کے سوال نے جوزفین کو گڑبڑا دیا کہ وہ جو اپنے سامنے شیکسپیئر کے دوسرے مداح کو پا کر اتنا خوش ہے، اس کے جواب سے مایوس نہ ہو جائے لیکن پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''معاف کیجیے گا، مجھے پہلے کبھی شیکسپیئر کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا ہے اس لیے پسند یا ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نصاب میں شامل کچھ چیزوں سے ہٹ کر میں پہلی بار شیکسپیئر کی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں اور ابھی آغاز ہی کیا ہے اس لیے کوئی رائے نہیں دے سکتی۔''

''آپ پوری کتاب پڑھ لیں پھر رائے دیجیے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ جیسی خوش ذوق اور نفیس خاتون شیکسپیئر کو پسند کیے بغیر رہ ہی نہیں سکیں گی۔'' نواب زادہ کو اس کے جواب نے مایوس نہیں کیا اور اس نے بڑے تیقن سے اپنی رائے دی جسے سن کر جوزفین کے رخسار سرخ ہو گئے۔

''اپنے بارے میں آپ کی رائے میرے لیے حیران کن ہے۔ آپ بھلا مجھ سے واقف ہی کتنے ہیں۔'' اس نے اپنی بکھرتی دھڑکنوں کو قابو میں کرتے ہوئے نواب زادہ سے کہا۔

''بعض اوقات انسان کو جاننے کے لیے زیادہ طویل عرصے کی ضرورت نہیں پڑتی اور مختصر آشنائی میں بھی وہ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ آپ نے اس حویلی میں جتنی تیزی سے اپنی جگہ بنائی اور جیسی آسانی سے یہاں کے ماحول کو اپنایا، یہ کام ہر کوئی نہیں کرسکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ پھوپی بیگم نے آپ کو بڑے اصول و قواعد میں جکڑ رکھا ہے اور وہ آپ کے کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے تک پر اپنی مرضی مسلط کر رہی ہیں لیکن آپ نے جبین پر شکن لائے بغیر ان کی ہر بات مانی ہے حالانکہ اس سے قبل جو محترمہ یہاں ملازمت کرتی تھیں، انہوں نے پھوپی بیگم کی پابندیوں کی وجہ سے ہی یہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔'' اسد اللہ نے اس پر انکشاف کیا۔

''پابندیوں کو قبول کرنے سے میری خوش ذوقی اور نفاست کا کیسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے؟ مجھ جیسی لڑکی کو تو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے بھی یہ سب اپنانا پڑا ہے۔'' جوزفین کا لہجہ یاس زدہ ہو گیا۔

''ہمیں معلوم ہے کہ آپ اپنے مسائل کے ہاتھوں مجبور ہیں لیکن مجبوری کو سلیقے سے نبھانا بھی ایک فن ہوتا ہے جو کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ آپ نے بے شک پھوپی بیگم کے حکم پر اپنا پہناوا تبدیل کیا ہے لیکن جتنے قرینے سے اسے زیب تن کرتی ہیں اس سے آپ کی نفاست پسندی صاف ظاہر ہوتی ہے اور اس نفاست پسندی کی وجہ سے ہی یہ لباس آپ پر خوب جچتا بھی ہے۔'' نواب زادہ اسد اللہ کی اس تعریف پر جوزفین کے رخسار مزید دہک اٹھے اور وہ کچھ محجوب سے لہجے میں بولی۔

''یہ سارا تو سروری کا کمال ہے۔ اس نے ہی اس لباس کو قرینے سے پہننے میں میری مدد کی ہے۔''

''بہت خوب، آپ کی انکساری بھی کمال کی ہے۔ آپ کسی بات کے لیے خود کریڈٹ لینے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں حالانکہ ہمارے ہاں تو خواتین تعریف کی شدید تمنائی ہوتی ہیں لیکن آپ کا تو یہ حال لگتا ہے کہ کوئی آپ کے حسن کی تعریف کرے گا تو آپ کہیں گی، تعریف اس خدا کی جس نے مجھے بنایا۔'' نواب زادہ کی بے ساختگی سے کہی اس بات پر جوزفین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی آواز نے نواب زادہ کو مسحور کر دیا۔ ممکن تھا کہ وہ جوزفین سے اس کی ہنسی کی تعریف کر ڈالتا لیکن عین وقت پر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اسے خیال آگیا تھا کہ اس کے بار بار تعریف کرنے سے کہیں جوزفین کو یہ گمان نہ ہو کہ وہ کوئی عیاش طبع شخص ہے جو اپنی لچھے دار باتوں کے جال میں اسے الجھانا چاہتا ہے۔ وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ شیکسپیئر کو پڑھیے۔ جب پڑھ چکیں گی تو ہم آپس میں اس پر تبادلہ خیال کریں گے۔''

''جی بہت بہتر۔'' جوزفین اسے اتنا ہی جواب دے سکی۔

''تو اب اجازت۔ ہم نے آپ کا بہت وقت ضائع کر دیا۔ اب آپ آرام سے بیٹھ کر مطالعہ کیجیے۔'' وہ جو اب تک کھڑے کھڑے ہی اس سے گفتگو کر رہا تھا، سنجیدگی سے بولا اور مضبوطی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے رہ جانے والی جوزفین دوبارہ کتاب کی طرف اپنی توجہ مبذول نہ کر سکی۔ نواب زادہ نے تو بے شک اپنی زبان روک لی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''اللہ بس کیجیے۔ آپ کے یہ آنسو ہمارے دل پر گر رہے ہیں۔ آپ یوں دکھی رہے تو ہمارا دل پھٹ جائے گا۔''

چاند بانو نے اپنی مخروطی انگلیوں سے فاروق کا ہاتھ تھاما اور نہایت درد بھرے لہجے میں بولی۔ آج وہ ربن کی خواہش پر بھابیہ ہاؤس آئی تھی۔ ربن نے کیتھرائن سے معلوم کرلیا تھا کہ فاروق کی طبیعت اب بہتر ہے۔ اس کے چیک اَپ کے لیے چندی گڑھ سے آنے والے ڈاکٹر نے بھی اس کی طرف سے تسلی دی تھی چنانچہ ربن نے اسے کمو کی موت کی اطلاع دیگر تفصیلات کے ساتھ پہنچا دی تھی۔ البتہ اس اطلاع کو دینے سے پہلے اس بات کا اہتمام کرلیا تھا کہ چاند بانو اس کا غم بانٹنے کے لیے وہاں موجود ہو۔ یوں تو گولو اور کیتھرائن بھی تھے لیکن اپنی تمام تر محبت کے باوجود گولو میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ فاروق کو سنبھال پاتا بلکہ وہ تو خود ہی کمو کے مرنے کا سن کر اتنا دکھی ہوجاتا کہ اسے سنبھالنے کے لیے کسی کی ضرورت تھی۔ کیتھرائن سے اس کی گہری وابستگی کی ربن کو خبر تھی اس لیے اسے تسلی تھی کہ وہ گولو کو سنبھال لے گی۔ فاروق کے لیے البتہ اس نے چاند بانو کو ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس کی زیرک نگاہوں نے چاند بانو کے دل میں بھڑکتی فاروق کی محبت کی آگ دیکھی ہوئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ مرد کو ٹوٹ کر چاہنے والی عورت اسے سمیٹنے کے ہنر سے واقف ہوتی ہے۔ اس کی خواہش پر چاند بانو نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی تھی لیکن کمو کی موت کی خبر سن کر فاروق جس طرح ٹوٹ کر رو دیا تھا خود اس کا اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہورہا تھا۔

''دل تو میرا پھٹ رہا ہے چاند بانو! میں بدبخت یہاں اس پُرفضا مقام پر بیٹھا دنیا جہان کے مزے اڑا رہا ہوں اور وہاں میرے ساتھیوں پر قیامت گزر گئی۔ تم نہیں جانتیں کہ جب اڈے سے کمو کا جنازہ اٹھا ہوگا تو وہاں کیا عالم ہوگا۔ دلوں پر قیامت ہی تو ٹوٹ پڑی ہوگی لیکن وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا غم بانٹا ہوگا۔ کمو کا آخری دیدار کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے ہوں گے تو انہوں نے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے بھی ہوں گے۔ اس کے جنازے کو کندھا دینے والوں نے ایک دوسرے کے شانوں پر آنسو بہا کر غم ہلکا کرلیا ہوگا لیکن میں...... میں کیسا بدنصیب ہوں کہ نہ تو اس کا آخری دیدار کرسکا اور نہ جنازے کو کندھا ہی دے سکا اور اب یہاں تنہا بیٹھا رو رہا ہوں تو کون ہے ان آنسوؤں کو سمیٹنے والا؟''

وہ کرب و اذیت کا شکار تھا۔ ایک طرف کمو کے مرنے کا غم تھا تو دوسری طرف سب سے دوری کا احساس مار رہا تھا۔ شدید غم میں اپنوں کی قربت میسر نہ آئے تو اچھے بھلے انسان کے حواس غائب ہونے لگتے ہیں۔ اس کے حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ تھانے میں سر پر لگائی جانے والی چوٹ نے اس کا اڈے سے عملی رابطہ ختم کردیا تھا اور وہاں کے حالات سے بس اسی حد تک واقفیت ہو پاتی تھی جتنی ربن مناسب سمجھتا تھا۔ اڈے کے ساتھ ساتھ وہ جولیٹ سے بھی دور تھا اور یہ دوری مسلسل اس کے اعصاب پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ کمو کی موت کی اطلاع نے جیسے اس کے ضبط کے بندھن توڑ ڈالے تھے اور وہ آنسوؤں کی صورت اپنے سارے بوجھ بہا رہا تھا۔

''ہم شاید آپ کو بہت زیادہ اپنے نہ لگتے ہوں لیکن یقین کیجیے ہم آپ کے دکھ کو بہت اچھی طرح محسوس کرسکتے ہیں اور کسی لائق نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کو آنسو بہانے کے لیے اپنا شانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' نہایت دل سوزی سے کہتے ہوئے چاند بانو نے اچانک ہی اس کا ہاتھ چھوڑا اور اس کے مضبوط جسم کو اپنی نرم و نازک بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ فاروق کو تو شاید ایسے ہی کسی سہارے کی تلاش تھی۔ چاند بانو کی بانہوں کے حصار میں وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا رہا اور وہ بڑی ہنرمندی سے اسے سمیٹتی اور تھپکتی رہی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن عورت کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ساری صفات اس میں موجود تھیں۔ باوصف عورت جانتی ہے کہ کب اسے مرد کے لیے محبوبہ بننا ہے، کب دوست بن کر اسے بہلانا ہے اور کب ماں کی طرح اس کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے۔ وہ اس وقت فاروق کو کسی ماں کی طرح ہی سمیٹ اور سنبھال رہی تھی۔ اس کے انداز میں بڑی شفقت، بڑا گداز تھا۔ وہ اپنی جادوئی انگلیوں کو کبھی فاروق کے بکھرے بالوں پر چلا کر انہیں سنوارتی تو کبھی اس کی پشت کو سہلا کر تسلی دینے کی کوشش کرتی۔ فاروق کے اشکوں کو چنتے ہوئے خود اس کی جھیل سی آنکھوں سے کتنے اشک خاموشی سے بہہ رہے ہیں، اسے اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اس کا محبت میں قناعت پسند دل تو بس صرف یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ فاروق کسی طور سنبھل جائے اور یہ کام بہرحال ہو رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سنبھل رہا تھا۔ اس کی ہچکیاں قابو میں آنے لگی تھیں۔ آنکھوں سے برستی برسات بھی کم ہوگئی تھی اور دل سے یہ غم نکلتا جارہا تھا کہ اتنے بڑے غم کو سہارنے کے لیے اسے کوئی سہارا میسر نہیں ہے۔ چاند بانو کی گداز بانہوں سے بڑھ کر بھلا اور کون سا سہارا ہوسکتا تھا اور اس کے بے لوث جذبوں سے تو کسی طور

بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آخر کار اسے احساس ہو گیا کہ وہ چاند بانو کی نازک جان پر بہت بوجھ ڈالے ہوئے ہے اور وہ جو اس سے بالکل غیر مشروط محبت کرتی ہے، اس بات کی حق دار نہیں کہ اس کو اتنا دکھ دیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دکھ چاند بانو کا دکھ ہے کہ جسے چاہا جائے اس کے ہر جذبے، ہر کیفیت کو بھی اسی کی طرح محسوس کیا جاتا ہے۔

''کیوں میرے لیے خود کو دکھ دیتی ہو چاند بانو! کیوں اس راہ پر چلتی ہو جس پر چلنے میں بربادی کے سوا تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا۔ کیوں ایسے شخص پر اپنا خلوص نچھاور کرتی ہو جو تمہارے انمول جذبے کی پذیرائی نہیں کرسکتا۔ تمہاری یہ عنایتیں اور نوازشیں مجھے شرمسار کردیتی ہیں۔ مجھ تہی داماں کے پاس کچھ ہوتا تو میں بھی جواب میں تمہیں کچھ دے پاتا۔ اب تو بس اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہوں اور تمہارے لیے کڑھتا رہتا ہوں۔'' چاند بانو کے شانے پر سر ٹکائے وہ جو کچھ بول رہا تھا، وہ اس کے اندر کی سچائی تھی۔ اس نے خود کو چاہنے والے بہت دیکھے تھے لیکن چاند بانو کی بات سب سے جدا تھی۔ وہ ان خاص لوگوں میں سے تھی جنہیں محبت کرنے اور اس کے اطوار نبھانے کا ہنر دولیعت کیا جاتا ہے۔ جو جانتے ہیں کہ محبت پانے کا نہیں بلکہ دیے جانے کا نام ہے۔

''ہم نے کب بھی آپ سے کچھ طلب کیا ہے۔ ہم تو اس پر بھی خوش رہتے ہیں کہ آپ بے شک ہمارے جذبے کی پذیرائی نہیں کرسکتے لیکن اس کے قدر دان تو ہیں۔ اگر آپ اتنا بھی نہ کرتے تو یقین جانیے ہم تب بھی آپ سے شکوہ نہیں کرتے کہ ہم سمجھتے ہیں ہمارے دل کا معاملہ بس ہمارا ہی معاملہ ہے اور ہمیں خود اس معاملے کو نبھانا ہے۔ اپنے اس معاملے کو نبھاتے اب چاہے ہم برباد ہوں یا آباد، ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ ہم بس اسی میں خوش ہیں کہ ہمارے خانۂ دل میں جو شخص آباد ہے، وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ آپ گھٹ کر اور کڑھ کر ہماری اس خوشی کے زیاں کا سامان کیوں کرتے ہیں، جب ہم طلب گار ہی نہیں تو آپ نہ دینے پر شرمسار کیوں ہیں۔ آپ کی یہ شرمساری ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔ اگر آپ کو اس شرمندگی سے بچانے کے لیے آپ کی محبت سے دست بردار ہوجانا ہمارے بس میں ہوتا تو ہم یہ بھی کر گزرتے مگر واللہ ہم بالکل مجبور ہیں۔'' وہ اپنی رس گھولتی آواز میں دھیرے دھیرے اپنی قلبی کیفیات کو فاروق کے گوش گزار کررہی تھی۔ ان لمحات میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ فاروق کا سر اس کے شانے پر ٹکا ہوا تھا اور وہ اب بھی اس کے وجود کو اپنی نازک بانہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ ان کی نکھری ہوئی روحیں بڑے خالص پن کے ساتھ ایک دوسرے کو محسوس کررہی تھیں لیکن روحوں کا یہ خالص پن دیکھنے والی نظروں کو نہیں دکھائی دیتا۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بالکل اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور کھلے دروازے کے فریم میں ہملا کی تصویر جڑی نظر آئی۔ وہ دونوں ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف متوجہ ہوگئے تھے اور بے ساختہ ہی ایک دوسرے سے الگ بھی ہوئے تھے۔

''سوری۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں آپ دونوں کو ڈسٹرب کررہی ہوں۔ مجھے تو کرشن نے بتایا تھا کہ مسٹر فاروق کے کسی عزیز کی ڈیتھ کی اطلاع آئی ہے اور وہ ڈسٹرب ہیں تو میں حال معلوم کرنے آئی تھی۔ اس رنگین اور سنگین سچویشن کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔'' سوری کا لفظ ادا کرکے وہ طنز کے زہر میں ڈوبے تیر ان دونوں پر برسانے کے بعد اونچی ایڑھی کی سینڈل پر ٹھک ٹھک کرتی وہاں سے واپس چلی گئی۔ آج اسے کسی پرانی شناسا نے اپنے گھر انوائٹ کر رکھا تھا۔ اس نے فاروق سے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا تھا لیکن فاروق خود پر طاری اداسی اور پژمردگی کی وجہ سے راضی نہیں ہوا تھا۔ وہ جاتے وقت فاروق کے انکار کی وجہ سے خاصی مایوس ہوئی تھی اور اب واپس آکر اس نے چاند بانو کو جس طرح اس کے قریب پایا تھا، وہ اس کے لیے اشتعال کا باعث بنا تھا۔

اس کے اس رویے پر فاروق اور چاند بانو دونوں ہی کچھ دیر کے لیے اپنی اپنی جگہ دم بخود رہ گئے تھے۔ پھر فاروق نے ہی سنبھالا لیا اور دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اسے دیکھا نا چاند بانو۔ اس بے چاری کو معلوم ہی نہیں کہ اپنے اندر کی آگ میں دھیمے دھیمے سلگنے میں کیسی راحت ہوتی ہے۔ یہ آگ کا ایک تند بگولا ہے جو ایک دم سے بھڑک اٹھنے اور دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر ڈالنے کے سوا کوئی ہنر نہیں جانتا۔''

''اسے ایسا ہی ہونا چاہیے فاروق صاحب۔ وہ ہملا بھابیہ ہے۔ ایک امیر و کبیر صاحب اختیار باپ کی اکلوتی بیٹی جو دنیا کی ہر شے کو اپنی رسائی میں تصور کرتی ہے۔'' چاند بانو نے بڑی فراست سے حقیقت کا اظہار کیا۔

''جو اپنی حیثیت کو یاد رکھتے ہیں، وہ محبت نہیں کرسکتے۔ محبت کرنے والوں کو اپنی نہیں، اپنے محبوب کی

حیثیت یاد رکھنی پڑتی ہے اور محبوب کو ہمیشہ سب سے اونچے سنگھاسن پر بٹھایا جاتا ہے۔ جس کو بلند مقام نہ دیا جائے وہ محبوب ہی کیا۔'' فاروق نے اس کے جواب پر تبصرہ کیا۔

''یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ ہم تو خود اس بات کے قائل ہیں۔'' اس کی ہاں میں ہاں ملاتی چاند بانو کی آنکھوں میں تحریر جذبے اس کی سچائی کی تصدیق کر رہے تھے۔

☆☆☆

''باہر پولیس والے آئے ہیں دادا۔'' سجو نے ربن کو اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے، اندر بلالے۔'' اس نے اجازت دی۔ پولیس کا آنا اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ ان کی آمد کا انتظار ہی کر رہا تھا۔

''آیئے آیئے انسپکٹر وکرم۔ اپن خود بھی آپ کی طرف کا چکر لگانے کا سوچ رہا تھا۔ کمو کے قاتلوں کا کچھ پتا چلا کہ نہیں۔'' تھانے اور اڈے کا چولی دامن کا ساتھ تھا چنانچہ دونوں ہی طرف کے لوگ ایک دوسرے سے آشنا تھے۔ اسی آشنائی نے کچھ بے تکلفی بھی قائم کر دی تھی اس لیے ربن نے ایک سنتری کے ساتھ اندر داخل ہونے والے انسپکٹر کو اس کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

''وہ کارروائی چالو ہے لیکن ابھی میں تیرے پاس کسی اور کام سے آیا ہوں۔'' انسپکٹر وکرم نے بیٹھنے کے لیے پیش کیے گئے موڑھوں میں سے ایک پر ٹکتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''کام تھا تو اپن کو بلوالیا ہوتا۔ کیا اپنے آدمیوں سے کوئی شکایت ہے؟ تھانے میں خرچہ پانی ٹھیک سے نہیں پہنچا رہے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو بولو، اپن ابھی آپ کے سامنے سالوں کی چمڑی گرا دے گا۔'' ربن جان بوجھ کر تجاہل سے کام لے رہا تھا ورنہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ تھانے اور اڈے کے درمیان حساب کتاب کیسا چل رہا ہے۔ وہ خود ان معاملات پر نظر رکھتا تھا۔

''اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے دادا! اپن کسی دوسرے چکر میں ادھر آیا ہے۔ ادھر پارسی محلے کے قریب رات بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔ محلے والوں کا کہنا ہے کہ رات کی تاریکی میں کچھ غنڈوں کا آپس میں جھگڑا ہوا تھا اور اس میں خوب مارم ماری ہوئی۔ ایک خالی مکان کے سامنے اور اندر بہت خون پڑا ملا ہے لیکن ان افراد کا کوئی پتا نہیں جن کا خون ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سارے زخمی فرار ہو گئے یا انہیں ان کے ساتھی اپنے سنگ اٹھا لے گئے۔ پولیس کو ان خون بہانے والوں کی تلاش ہے۔ خیال ہے کہ ایسی مارم ماری اڈے کے لوگ ہی کر سکتے ہیں اس لیے سارے شہر کے اڈوں کو چیک کیا جا رہا ہے۔ تیرا اڈا یہاں اپن کے علاقے میں ہے اس لیے تیرے سے پوچھنے اپن کو آنا پڑا۔'' ربن کو اندازہ تھا کہ اسے کچھ سن گن ہے اس لیے یہاں آیا ہے لیکن جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔ اس نے بھی یہی انداز اختیار کیا اور بولا۔

''پارسی محلہ تو ادھر سے بہت دور ہے۔ ادھر سے اپنا کوئی حساب کتاب بھی نہیں بنتا تو اپنا آدمی لوگ ادھر کیا کرنے جائیں گا اور جب کوئی گیا ہی نہیں تو جھگڑے لفڑے کا بھی کوئی گنجائش نہیں۔''

''کل رات اڈے کے دو آدمی زخمی حالت میں اسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ پولیس کو شک ہے کہ کہیں انہیں اسی جھگڑے میں تو زخم نہیں آئے ہیں؟'' وکرم نے معنی خیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

''پولیس کو انہوں نے اپنا بیان دے دیا ہوگا انسپکٹر۔ وہ رات فلم کا آخری شو دیکھ کر آ رہے تھے کہ کسی نے لوٹنے کے لیے ان پر حملہ کیا۔ حملہ کرنے والے تعداد میں زیادہ تھے اس لیے سالا اپن کا آدمی لوگ زخمی ہو گیا ورنہ تم دیکھتے......''

''اس بیان کی مجھے بھی خبر ہے لیکن کیا ثبوت ہے کہ اپنے آدمیوں کو وہ بیان تم نے نہیں رٹوایا اور اصل میں وہ رات پارسی محلے کے قریب ہونے والے جھگڑے میں زخمی ہوئے ہیں۔'' انسپکٹر نے ربن کی بات کاٹ دی اور تیز لہجے میں بولا۔

''آپ ایسا بولتے ہو تو آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟'' ربن کے لہجے میں بھی تیزی آ گئی۔

''حالات و واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ تم پولیس کو ایسا بھی بے خبر نہ سمجھو۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ تمہارا مجو دادا سے کیا پھڈا چل رہا تھا اور تم نے کیسے اس کی من پسند لڑکی کو کھڑے گھاٹ بیاہ کر بمبئی سے نکال دیا۔ اسی لڑکی کو رخصت کروا کر برات کلکتہ جا رہی تھی نا جب ان کو لٹیروں نے لوٹنے کی کوشش کی اور اتفاقاً تمہارے دو آدمی موقع پر وہاں پہنچ گئے۔ تمہارا ساتھی کمو اسی جھگڑے میں مارا گیا تھا نا؟ کل رات کا سارا ہنگامہ کمو کے خون کا بدلہ لینے کی کوشش بھی تو ہو سکتی ہے۔'' حسب توقع پولیس والوں نے کڑی سے کڑی جوڑلی تھی لیکن ربن یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس

کے پاس کوئی ثبوت اور گواہ موجود نہیں ہے اور محض واقعات کے تال میل سے ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا اسی لیے اس پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''آپ بادشاہ لوگ ہو۔ جو چاہو وہ سوچ سکتے ہو پر آپ کا سوچا سارا درست ہو یہ ضروری تو نہیں ہے نا۔ اپن کو اپنے اور مجو دادا کے جھگڑے سے انکار نہیں ہے لیکن اپن اس جھگڑے کو اپنی دنیا کے اصولوں کے مطابق نمٹا لیتے۔ آپ اتنی خبریں رکھنے والے ہو تو کیا آپ کو خبر نہیں ہوگی کہ مجو کے اڈے کی گدی اپنے پاس کیسے آئی؟'' آخر میں اس کا لہجہ قدرے طنزیہ ہوگیا تھا۔

''خبر ہے اسی لیے تو سوچتے ہیں کہ مجو اپنی رسوائی کا بدلہ لینے کی کوشش کررہا ہے اور تم اسے منہ توڑ جواب دیتے جارہے ہو۔'' انسپکٹر وکرم اپنی جگہ پُریقین تھا۔

''تو پھر تو آپ پہلے جا کر مجو کو پکڑو۔ وہ آپ کی تفتیش کو آگے بڑھانے میں مدد کردے گا۔'' ربن کا مشورہ بڑا بے ساختہ تھا جسے سن کر انسپکٹر وکرم بل کھا گیا اور خشک لہجے میں بولا۔

''مشورے دینے کی ضرورت نہیں دادا۔ پولیس اپنا کام کرنا جانتی ہے۔''

''تو پھر آپ ہی حکم کرو کہ اپن آپ کی کیا سیوا کرسکتا ہے۔ آپ کے الزام پر اپنے آدمیوں کو بے قصور ہی پٹکا باندھ کر آپ کے ہاتھ میں تو تھما نہیں سکتا۔'' ربن نے بھی ردِعمل میں بے زاری کا مظاہرہ کیا۔

''میں تمہاری چالوں کو اچھی طرح جانتا ہوں دادا۔ تم ایسی آسانی سے ہاتھ آنے والوں میں سے نہیں ہو۔ پولیس بھی اس وجہ سے زیادہ سخت ایکشن نہیں لے رہی کہ ابھی تک کسی نے تمہارا نام لے کر پرچہ نہیں کٹوایا ہے اور نقصان میں بھی تم ہی زیادہ رہے ہو لیکن یہ سلسلہ چالو رہا تو ہمیں سختی سے ایکشن لینا پڑے گا۔ سرکار شہر کا امن خراب کرنے کی پرمیشن بالکل نہیں دینے والی۔'' انسپکٹر وکرم اسے دھمکانے لگا۔

''وہ جو آئے دن جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہورہا ہے، وہ کیا سرکار کی اجازت سے ہورہا ہے۔ جاؤ اپنی سرکار سے بولو پہلے اس ہنگامے کو تو روکے پھر اڈے والوں کی فکر کرے۔'' ربن نے بھی خراب موڈ کے ساتھ اسے دوبدو جواب دیا۔

''ذرا ہلکا ہاتھ رکھو دادا۔ تم سرکار سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ تمہارا اور سرکار کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔''

''اپنے کو خبر ہے کہ اپن چھوٹا غنڈا ہے۔'' اس نے اس انداز میں جواب دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس کی نظر میں سرکاری لوگ زیادہ بڑے غنڈے ہوں۔ انسپکٹر وکرم نے بھی اس کے جملے کی معنویت کو پالیا اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگیا تاہم اس بار وہ زبان سے کچھ نہیں بولا اور جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایسے کیسے انسپکٹر...... اپنے بجو نے کبھی آپ کو ایسے یہاں سے لوٹنے دیا ہے کیا۔ وہ دیکھیں وہ آپ کی خاطر کا سامان لے کر آیا ہے۔'' ربن نے یکدم ہی اپنا لہجہ بدل لیا اور دوستانہ انداز میں بولا۔

''جانے دو دادا۔ تم نے اپنی باتوں سے زبان ہی کڑوی کردی ہے۔'' پھیلی ہوئی توند والے انسپکٹر وکرم نے یہ بات کہتے ہوئے چور نظروں سے بجو کی طرف دیکھا جو بڑے سے خوان میں نہ جانے کیا کیا سجائے لیے چلا آرہا تھا۔ خوان میں سجے ذائقہ دار پکوانوں کی خوشبو ہر سو پھیل رہی تھی اور انسپکٹر کے بڑے بڑے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

''اپنے بجو کے ہاتھوں میں ایسا سواد ہے کہ آپ اپنی ساری کڑواہٹ بھول جائیں گے، بس ذرا آزما کر دیکھیں۔'' ربن کا لہجہ ایک بار پھر دوستی تھا لیکن وکرم محسوس نہیں کرسکا۔ فی الحال اس کی ساری توجہ خوان کی طرف مبذول ہوگئی تھی اور وہ لبوں پر زبان پھیرتے خود پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔ ربن نے ایک بار پھر اسے بیٹھنے اور کھانے پینے کی دعوت دی تو وہ اپنے انکار پر قائم نہیں رہ سکا۔

''اڈے والوں کے طور طریقوں کا پولیس کو بھی پتا ہے دادا۔ پولیس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ اڈے کے معاملات سے الگ رہے لیکن ایسا تب تک ہی ہوسکتا ہے جب تک بات اڈے کے اندر تک رہے۔ مارا ماری اور خون خرابے پر ہمیں حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ ہمارے اوپر بھی سرکار کا زور ہوتا ہے۔ ہمیں بھی جواب دہی کرنا پڑتی ہے۔ ایسے میں ہم تمہارے سے پڑتال کرنے نہیں آئیں گے تو کدھر جائیں گے۔'' گو وکرم ذرا اکڑا اکڑا سا ہی دسترخوان پر بیٹھا تھا لیکن بجو کے ہاتھ کے ذائقے نے آہستہ آہستہ اسے نرم کرنا شروع کردیا اور آخر وہ آلو کی ترکاری اور پودینے کی چٹنی میں کچوری ڈبو کر کھاتے ہوئے ربن سے دوستانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ اس کی اس تبدیلی پر ربن دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اسے وکرم کی کمزوریوں کا علم تھا۔ تھانے میں پابندی سے پہنچنے والے نذرانے کے علاوہ جو

دوسری چیز اس کا موڈ خوش گوار رکھنے میں مددگار ثابت ہوئی تھی، وہ تھی لذیذ پکوان...... اور تجو جیسے ماہر باورچی کی موجودگی میں وکرم کی یہ ضرورت آسانی سے پوری کر دیتا تھا۔

''اپن کو سب خبر ہے انسپکٹر صاحب! ادھر اوپر والا اپنے نیچے والے پر ڈنڈا تان کر گزارا کرتا ہے پر نیچے والوں کو بھی تو اوپر والوں کو شانت رکھنے کا ہنر آتا ہے نا۔ آپ بھی چاہو تو سرکار کی توجہ سب پر سے ہٹا سکتے ہو۔ آپ کے پاس دماغ ہے بھی تو سرکاری نوکری کر رہے ہو اور ہماری طرح جھک مارتے نہیں پھرتے۔ آپ چاہو تو سرکار سب بھول بھال جائے گی۔ سرکار کے پاس ویسے بھی اتنی فرصت نہیں کہ ایک بات کو پکڑ کر بیٹھی رہے۔ ادھر تو بیسیوں قصے چلتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے حساب کتاب دیکھنے ہوتے ہیں سرکار کو۔ اڈے پاڑوں کی دنیا پر تو ذرا کی ذرا نظر پڑتی ہے اور آپ چاہو تو یہ نظر ٹھہرے بغیر یوں چٹکی بجا کر گزر بھی جائے۔ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' ربن نے بھی اپنا لہجہ بدلا اور وہ انداز اختیار کیا جو دنیا کے تقریباً ہر فرد کو بھاتا ہے۔ تھوڑی تعریف، تھوڑی خوشامد بڑے بڑے کام بنوا دیتی ہے۔ اب بھی یہی ہوا اور انسپکٹر وکرم بزرگانہ تفہیمی انداز میں اپنے سر کو ہلاتا رہا، منہ سے کچھ بولنے کی اسے فرصت تھی نہ مہلت۔ تجو بڑی پھرتی سے اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھتا جا رہا تھا اور انسپکٹر اسی پھرتی سے اسے اپنے منہ میں رکھ کر معدے میں منتقل کرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ آیا سنتری بھی پوری تندہی سے اپنے افسر کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کی آمد تو یوں بھی بس افسر کی افسرانہ شان کے اظہار کے لیے تھی۔ باقی معاملات کیسے طے پاتے ہیں، یہ نہ اس کا مسئلہ تھا نہ اسے اس سے کوئی غرض تھی۔ انسپکٹر مع سنتری جب ربن کے اڈے سے رخصت ہوا تو ایک مکمل طور پر بدلا ہوا انسان تھا۔ اس تبدیلی میں ریشمی کپڑوں کے ان سلے سوٹوں نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا جو وقتِ رخصت ربن نے بطور تحفہ اس کے سامنے کر دیے تھے اور جنہیں وہ اپنی بیوی کو پیش کر کے اپنی افسری سے مزید مرعوب کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''گڈ۔ آپ نے سارے جملے بالکل ٹھیک بنائے ہیں۔ آپ ذہین ہیں اور بڑی محنت سے سیکھ رہی ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلدی انگریزی زبان کو سمجھنے لگ جائیں گی۔'' جوزفین نے عالیہ کی نوٹ بک چیک کرنے کے بعد اسے واپس لوٹاتے ہوئے تبصرہ کیا تو وہ خوش ہوگئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''اس میں زیادہ کمال آپ کا ہے مس جوزفین۔ آپ ایک اچھی استاد ہیں اسی لیے آپ سے پڑھنے والے زیادہ تیزی سے سیکھ جاتے ہیں۔ بچے بھی آپ کی تعریف کرتے تھے۔ وہ اپنی سابقہ ٹیچر کے مقابلے میں آپ سے زیادہ خوش ہیں۔''

''یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے لیکن میں اس کے لیے صرف خود کو کریڈٹ نہیں دے سکتی۔ استاد کا ہنر بھی تب ہی کام آتا ہے جب اسٹوڈنٹ شوقین اور محنتی ہو۔'' اس نے عالیہ کے ساتھ بیٹھی عشرت جہاں کی نوٹ بک اس کی طرف بڑھائی۔ جس صفحے پر اس نے کام کیا تھا، وہ سرخ روشنائی سے بھر گیا تھا۔ سرخ روشنائی والا قلم جوزفین نے اس کے کام کی جانچ کے لیے استعمال کیا تھا اور کام میں اتنی غلطیاں تھیں کہ سرخ روشنائی نیلی روشنائی پر سبقت لے گئی تھی۔ عشرت جہاں اول روز سے عالیہ کی ہم سبق ضرور رہی ہوئی تھی لیکن سیکھنے کی طرف اس کی توجہ بالکل نہیں تھی۔ جوزفین کو تدریجی طور پر بھی وہ کچھ کم ذہانت کی مالک لگی تھی لیکن اس نے کبھی اس چیز کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ پڑھانے کے دوران عشرت جہاں کو بہت نرمی سے اس کی اغلاط سے آگاہ کرتی رہتی تھی لیکن عشرت جہاں نے کبھی دلچسپی سے اپنی کمزوریوں کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بس مارے باندھے ہی عالیہ کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ جوزفین نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی اصل شاگرد عالیہ ہی ہے لیکن ظاہر ہے وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ عشرت کو کھرا کھرا سنا کر نوابی خون کو چھیڑنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ نوابی خون بھی کوئی ایسا ویسا نہیں۔ ندرت جہاں کی کوکھ سے جنم لینے والا تھا اور اتنی صاحب اختیار ماں کی بیٹی کی شان میں گستاخی کر کے وہ اپنی اچھی بھلی ملازمت سے بالکل بھی ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھی لیکن احتیاط کے باوجود اس وقت اس سے چوک ہوگئی ہے...... اس بات کا علم اسے عشرت کے ایک دم تنتنا کر کھڑے ہونے پر ہوا۔

''ہمیں معلوم ہے کہ آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے۔ آپ ہمارا تمسخر اڑا رہی ہیں لیکن ہم آپ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم کوئی کند ذہن اور نکمی لڑکی نہیں ہیں۔ ہم آپ سے انگریزی سیکھنے میں اس لیے دلچسپی نہیں لے رہے کہ ہم اسے سیکھنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ بھلا ہم کیوں فرنگیوں کی زبان سیکھیں۔ ہم کوئی ان کے غلام ہیں جو ان کی راہ پر چلیں۔ ہم ایک آزاد ریاست میں جنم لینے والی ایک آزاد نواب زادی ہیں۔

اور ہمارے ایک اشارے پر بڑے بڑے انگریزی دان ہمارے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔'' اس نے ہکا بکا بیٹھی جوزفین کے سامنے تقریر جھاڑی اور پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے اس انداز پر جوزفین کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ ہکا بکا سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

''تشریف لے آیئے۔'' عالیہ نے جو خود بھی اس صورتِ حال پر بھونچکی رہ گئی تھی، سنبھل کر دستک کا جواب دیا۔ فوراً ہی کھلے دروازے سے نواب زادہ اسد اللہ اندر داخل ہوا۔

''خیریت......؟ یہ آنسہ عشرت جہاں کیوں آگ کے تند بگولے کی طرح آپ کے کمرے سے برآمد ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں بڑے غضب ناک تیوروں کے ساتھ برآمدہ پار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' وہ جوزفین کی وہاں موجودگی سے انجان نہیں تھا لیکن اس کی طرف توجہ دیے بغیر بہن سے مخاطب ہوا۔

''ان کا تو مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر یونہی بھڑک اٹھتی ہیں۔'' عالیہ کے لہجے میں بیک وقت بے چارگی اور کوفت موجود تھی۔

''یہ تو ان کا موروثی مسئلہ ہے۔ اپنی والدہ کی بالکل صحیح جانشین ہیں وہ۔'' اسد اللہ نے بے ساختگی سے تبصرہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے دریافت کرنے لگا کہ عشرت جہاں کے مزاج کی برہمی کی موجودہ وجہ کیا ہے۔ جواب میں عالیہ نے پورا قصہ کہہ سنایا۔

''بلیوی...... میرا مقصد ان کی انسلٹ کرنا نہیں تھا۔ میں تو بس ایسے ہی ایک جنرل بات کر رہی تھی۔'' جوزفین نے پہلی بار اس گفتگو میں مداخلت کی اور اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

''لیکن افسوس کہ آپ ایک سچ بولنے کی غلطی کر بیٹھیں اور سچ ہمارے ہاں کے لوگوں سے برداشت نہیں ہوتا۔''

''تو اب میں کیا کروں؟ کیا مجھے نواب زادی عشرت جہاں سے ایکسکیوز کرنا چاہیے؟'' وہ حقیقتاً پریشان تھی۔ اب جبکہ اس کی ملازمت کا عبوری دور ختم ہو رہا تھا اور وہ مستقل ملازمت کے حصول کے لیے بڑی پُرامید تھی کہ یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا تھا۔

''بالکل بھی نہیں۔ اول تو آپ نے کوئی غلطی کی ہی نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا تب بھی استاد کی حیثیت سے آپ کا رتبہ بلند ہے۔ عشرت جہاں کو اس رتبے کا خیال رکھنا ہوگا اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتیں تو بہتر ہے کہ وہ آپ سے پڑھنا چھوڑ دیں۔ بغیر شوق کے پڑھ کر وہ اپنا اور آپ کا وقت ہی ضائع کریں گی۔ کیوں عالی...... ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے بہن سے تائید چاہی۔

''آپ کی بات درست ہے بھائی جان لیکن پھوپی بیگم کا مزاج برہم نہ ہو جائے۔'' عالیہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

''پھوپی بیگم کے قہر سے نمٹنا ہمیں خوب آتا ہے۔ وہ ابا جان کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنی من مانی کرتی ہیں لیکن ہم ان کے کچھ کرنے سے قبل ابا جان کو اپنا حامی بنا لیں گے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں اپنے ارادے کا اظہار کیا تو جوزفین کی پریشانی میں کمی واقع ہوگئی اور وہ محسوس کرنے لگی کہ اسے پردیس میں جیسے کوئی مضبوط سہارا میسر آگیا ہے۔ ''آپ بے فکر ہو کر اپنا کام جاری رکھیں مس جوزفین۔ آپ کی کارکردگی اطمینان بخش ہے اس لیے کوئی آپ کو آپ کی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔'' اس بار اسد اللہ کی مخاطب جوزفین تھی جس نے اس کی بات سن کر سر کو تفہیمی جنبش دی اور دھیمے سُروں میں بولی۔

''تھینکس آلاٹ نواب زادہ صاحب! آپ نے میری ساری ٹینشن دور کر دی۔''

''شکریہ تو ہمیں آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ یہاں کے سخت ماحول کے باوجود یہاں رکی ہوئی ہیں۔ اگر آپ نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تو اصل نقصان ہمارا ہوگا۔'' اسد اللہ کے اس جواب پر اس کے گندمی چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے بالکل ایسا لگا جیسے اسد اللہ نے حویلی کے دیگر افراد کا نہیں بلکہ اپنے ذاتی نقصان کا ذکر کیا ہو۔

☆☆☆

''طبیعت کیسی ہے آپ کی؟'' معمول کے مطابق وہ صبح سویرے ورزش سے فارغ ہو کر کچھ دیر تازہ ہوا میں بیٹھا تھا کہ بملا چلی آئی اور اس کے مقابل بیٹھ کر اس سے دریافت کرنے لگی۔ اتنی صبح کے وقت بھی وہ بالکل نک سک سے تیار تھی۔ تنگ مہری کے پاجامے پر اونچے دامن کی جسم پر کسی ہوئی قمیص جس کا گریبان بے حد کشادہ تھا اسے چھپانے سے زیادہ دکھانے کا کام کر رہی تھی۔ لباس کا ہم رنگ چنا ہوا دوپٹا رسی کی طرح گردن میں پڑا ہوا تھا اور وہ مہارت کے ساتھ کیے گئے میک اپ میں دعوتِ نظارہ دیتی سی لگ رہی تھی۔ فاروق کوئی زاہد خشک نہیں تھا لیکن اسے کبھی بھی خود کو اس طرح پیش کرنے والی عورت متاثر نہیں کرتی تھی پھر یہاں معاملہ بھی الگ

تھا۔ اس کی نظروں میں بسی جولیٹ کی تصویر اسے کچھ اور دیکھنے بھی کہاں دیتی تھی، ورنہ چاند بانو کے بے تحاشا حسن نے اسے اپنا اسیر نہ بنالیا ہوتا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے قدرے توقف سے بے رخی کے ساتھ بملا کے سوال کا جواب دیا۔

''آپ کو چندی گڑھ کے اسپتال میں چیک اپ کے لیے کب جانا ہے؟'' اس کی بے رخی کو محسوس کرنے کے باوجود بملا نے اپنا دوستانہ انداز برقرار رکھا۔

''دو چار دن میں اسپتال والے خود ہی فون کر کے بتادیں گے۔ میں نے دادا کو انفارم کردیا ہے کہ اب میں زیادہ دن یہاں ٹکنے والا نہیں ہوں۔ مجھے جلد بمبئی واپس لوٹنا ہے۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟'' اس کا جواب سن کر بملا بے قراری سے بولی۔

''جلدی کہاں..... اتنے بہت سارے دن گزر گئے ہیں۔ مجھے اپنوں کے درمیان پہنچنے کی بے قراری ہے۔ اپنے پیاروں کی قربت میں رہوں گا تو زیادہ تیزی سے صحت یاب ہوجاؤں گا۔'' وہ جواب ضرور دے رہا تھا لیکن لہجے میں اب بھی محسوس کی جانے والی بے رخی تھی۔

''یہاں بھی آپ بالکل تنہا کب ہیں؟ آپ کے کچھ اپنے تو یہاں بھی کمپنی دینے آپ کے پیچھے پیچھے چلے آئے ہیں۔'' بملا اس کی بے رخی کو زیادہ دیر کہاں برداشت کرپاتی، چنانچہ تلملا کر بولی۔

''آپ کا اشارہ یقیناً چاند بانو کی طرف ہے۔ وہ واقعی بہت ہمدرد اور مسیحا صفت لڑکی ہے لیکن میرے زخموں پر مرہم رکھتے خود اس کی انگلیاں فگار ہوجائیں، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ وہ میری خاطر یہاں آتی ہے اور بے عزتی اٹھا کر واپس جاتی ہے تو میں اپنے آپ میں کٹ کر رہ جاتا ہوں۔ بہتر ہے کہ میں ایسی جگہ پر ہی نہ رہوں جہاں مجھ سے محبت کرنے والوں کو مجھ سے محبت نباہنے کے لیے زخم زخم ہونا پڑے۔'' اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے بملا کے طنز کا کھل کر جواب دیا۔

''آپ میرے ساتھ زیادتی کررہے ہیں فاروق! میرے جس ری ایکشن کو آپ چاند بانو کی انسلٹ سمجھ رہے ہیں، وہ بالکل نیچرل تھا۔ بند کمرے میں آپ کو ایک طوائف کی بانہوں میں دیکھ کر میں اسی طرح کا ری ایکشن دے سکتی تھی۔''

''پلیز شٹ اپ۔ میں نے آپ کو پہلے بھی چاند بانو کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔ رہی آپ کے ری ایکشن کی بات تو آپ کو اس طرح ری ایکٹ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں آپ کا شوہر نہیں ہوں جو آپ مجھ سے میرے کسی عمل کے لیے باز پرس کرسکیں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر بملا کو مزید بولنے سے روکا اور کھل کر بولتا چلا گیا۔ اس کی بات سن کر بملا کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ پڑ گیا لیکن اس نے خود پر قابو پالیا اور مفاہمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا پلیز جانے دیں۔ میں مان لیتی ہوں کہ میں اوور ری ایکٹ کرگئی تھی لیکن وہ میری بھی مجبوری تھی۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ ہم عورتوں میں جیلسی کچھ زیادہ ہوتی ہے، ہم کسی کو خود سے زیادہ اہمیت پاتا نہیں دیکھ سکتیں۔''

''آپ جیسی تعلیم یافتہ خاتون سے ایسے رویے کی کم از کم میں امید نہیں رکھتا تھا۔ ہر باشعور انسان یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اس سے وابستہ لوگ صرف اسی سے وابستہ نہیں ہوتے۔ ان کے دوسرے بھی رشتے ناتے اور تعلقات ہوتے ہیں اور ہر تعلق کو نبھانا پڑتا ہے۔ ہر تعلق کی اپنی اہمیت اور وقعت ہوتی ہے۔ آپ یہاں میرے ساتھ تعلق رکھنے والے صرف تین افراد کو برداشت نہیں کر پارہی ہیں جبکہ مجھ سے تو اور بھی بہت سے لوگ وابستہ ہیں۔ آپ کس کس سے جیلس ہوں گی اور کس کس کو مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کریں گی۔ اس مشکل سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ خود میری دوستی سے کنارہ کشی اختیار کرلیں کیونکہ میں تو آپ کی خاطر سب سے ناتا توڑنے سے رہا۔'' فاروق کی صاف گوئی عروج پر تھی۔ وہ اس فطرت کا انسان نہیں تھا لیکن بملا کے رویے نے اسے مجبور کردیا تھا کہ وہ اس حد پر جا کر اس سے بات کرے۔ اس امیرزادی کا دماغ ٹھکانے پر رکھا جائے، یہ بہت ضروری ہوگیا تھا۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا کیا گل کھلاتی اور فاروق کو اپنے پیاروں کی بے عزتی گوارا نہیں تھی۔ بملا پر اس کے اس رویے کا واضح اثر ہوا اور وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز لہجے میں بولی۔

''آپ میری انسلٹ کررہے ہیں۔''

''اگر آپ دوسروں کی انسلٹ کرنے کی عادت ترک کردیں تو خود بھی اس چیز سے محفوظ رہیں گی۔'' فاروق نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔

''جو جس لائق ہو اس کے ساتھ میرا ایسا ہی بیہیور ہوتا ہے۔ آپ ایک طوائف کو میرے مدمقابل لاکر اس کی

خاطر میری انسلٹ نہیں کرسکتے۔ میں اسے اچھی طرح دیکھ لوں گی۔'' وہ غصے سے بولی اور ننتناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ پیچھے فاروق ماتھے پر بل لیے اس صورتِ حال پر غور کرتا رہ گیا۔

☆☆☆

''گورا افسر ولیم واپس لوٹ آیا ہے دادا۔'' زامو نے اطلاع دی تو ربن فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کب......؟ کب لوٹا وہ حرام کا جنا؟''

''پرسوں ہی واپس آیا ہے۔ اپنے کو آج خبر ملی ہے۔'' زامو نے اسے بتایا۔

''بس تو پھر موقع دیکھ کر بجا ڈال اسے۔ ادھر وہ شہزادہ واپسی لوٹنے کے لیے اتاولا ہو رہا ہے۔ اس کے لوٹنے سے پہلے یہ حساب برابر ہوجائے تو اچھا ہے۔ لونڈیا والا معاملہ تو اپن نمٹا نہیں سکے۔ وہ منہ سے کچھ نکالتی تو اپن کچھ کر پاتے اور شہزادے کو دلاسا بھی دے پاتے کہ اس کی معشوقہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کا کتنا برا انجام کیا ہے اپن نے۔'' ربن نے اضطراری لہجے میں کہا۔ اصل میں اس نے محسوس کرلیا تھا کہ فاروق کو اب مزید شملہ میں روکے رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی طبیعت بہت بہتر تھی اور معائنے کے لیے شملہ جانے والے ڈاکٹر نے بھی اس کی طرف سے خاصا اطمینان دلایا تھا اس لیے اصولی طور پر اس کا اب شملہ میں رکے رہنا غیر ضروری تھا۔ کمو کے انتقال کے بعد سے تو فاروق نے ضد ہی باندھ لی تھی کہ وہ بمبئی واپس آنا چاہتا ہے اور ربن بھی اب اس کی واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس کے واپس آنے سے قبل کچھ معاملات نمٹ جاتے تو اچھا تھا۔ ان میں سے ایک کام انگریز افسر ولیم سے بدلہ لینے کا بھی تھا۔ زمرد بائی کے کوٹھے پر چاند بانو کے سلسلے میں ہونے والے تنازعے میں مجو دادا کے ساتھ ولیم بھی ایک فریق تھا۔ فاروق نے تنہا اس سارے معاملے کو بخوبی نمٹا دیا تھا لیکن بعد میں ولیم نے اپنے اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف فاروق کو تھانے میں بند کروا دیا بلکہ وہاں اس پر وحشیانہ تشدد کیا گیا جس کے نتیجے میں اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی اور سر پر مہلک چوٹ آئی جو ابھی تک فاروق کے لیے تکلیف کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ولیم کا یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔ اگر وہ اس واقعے کے فوراً بعد اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ انگلستان نہ چلا گیا ہوتا تو اس کا حساب فوری طور پر برابر کردیا جاتا لیکن تاک میں تو وہ لوگ بہرحال اب بھی تھے اور ولیم کے واپس پہنچنے کی خبر پر جوشِ انتقام پھر

تازہ ہو گیا تھا۔

''اپن کا آدمی لوگ گورے کا نگرانی کر رہا ہے۔ تمہاری طرف سے حکم ملتے ہی کام ہو جائے گا۔'' رامو نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پھر مشورہ دینے کے انداز میں بولا۔

''میری مانو تو دادا، فاروق کو واپس بلانے سے پہلے ایک بار پھر جولی سے مل کر اس...... کا نام معلوم کرنے کی کوشش کرو جو اس کا مجرم ہے۔ اس...... کو ٹھکانے لگائے بغیر اپن فاروق استاد کا سامنا کرنے میں بڑی شرم محسوس کرے گا۔ اپن کو معلوم ہے وہ اس خبر کو سن کر بہت بری طرح تڑپے گا۔ اس کی تسلی کے لیے اس...... کو انجام تک پہنچانا ضروری ہے۔'' وہ ہر بار جولی کے مجرم کا ذکر کرتے ہوئے اپنے جملے میں ایک بڑی سی گالی ٹانک دیتا تھا۔

''تو ٹھیک کہتا ہے۔ چل آج ہی ایک کوشش اور کر ڈالتے ہیں۔'' ربن نے فوراً ہی اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ موضوعِ گفتگو بدل کر اڈے کے دیگر معاملات پر بات کرنے لگے۔ اس وقت ربن جو دادا والے اڈے پر تھا۔ یہاں کا انتظام وانصرام دیکھنے کے لیے وہ چکر لگاتا رہتا تھا جبکہ رامو تو زیادہ تر رہتا ہی وہیں تھا۔ پرانے اڈے پر اس کا آنا جانا حسبِ موقع وضرورت ہوتا تھا۔ جیسے کمو کی موت کے موقع پر وہ وہاں زیادہ رہا تھا اور بعد میں اس کے خون کا انتقام لینے کے لیے بھی اس نے دیگر ساتھیوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ فی الحال کمو کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے والا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ فیکا اور مجو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے اور انہیں اصل بدلہ ان دونوں سے ہی چکانا تھا۔

ربن نے تقریباً آدھا گھنٹا مزید وہاں گزارا اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ گیا۔ رامو نے باہر تک آ کر اسے رخصت کیا۔ داداؤں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے دو چار چیلوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں لیکن ربن عموماً اپنے اردگرد بھیڑ بھاڑ لگانے سے گریز کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ تنہا ہی تھا۔ پرانے اڈے کے علاقے میں داخل ہوتے ہی اس کی عقابی نظروں نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے آدمی اڈے کے اطراف کے علاقے میں پھیل کر اپنی ڈیوٹی دیتے رہتے تھے تاکہ کسی بھی غیر معمولی واقعے کی خبر رہے۔ باخبر رہنا علاقے پر اپنے کنٹرول کے لیے ازحد ضروری تھا۔ بظاہر بے نیازی سے چلتے ہوئے اس نے دیکھ لیا کہ جانی ایک دکان کے قریب بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ جانی نے بھی قدرے تاخیر سے اسے دیکھ لیا اور جلدی سے ہاتھ میں موجود بیڑی ایک طرف پھینک دی۔ ربن نے گردن کے خفیف سے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا تو وہ تیزی سے اس تک پہنچ گیا۔

''سب ٹھیک ہے رے؟'' ربن نے یونہی اس سے رپورٹ لی۔

''ہاں دادا! سب ایک دم پرفیکٹ ہے۔'' جانی نے اسے جواب دیا۔

''جولی دفتر سے آجائے تو اپنے کو خبر کرنا۔'' ربن نے اسے حکم دیا۔

''مسز تو آج دفتر گیا ہی نہیں۔ گھر پر ہی ہے۔'' جانی نے اسے اطلاع دی۔

''چل تو پھر اپن ابھی اس سے مل لیتے ہیں۔'' ربن نے کہا اور جانی کو ساتھ لے کر جولیٹ کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ انہیں دروازے پر دوبار دستک دینی پڑی تب جولیٹ کی طرف سے ردعمل ظاہر ہوا اور کون ہے پوچھتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے حلیے سے لگ رہا تھا کہ وہ بستر سے اٹھ کر آرہی ہے۔ اس کا لباس شکن آلود اور بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی بغیر دھلا لگ رہا تھا لیکن ہاتھ میں موجود مخملیں جلد والی ڈائری کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ وہ سو نہیں رہی تھی لیکن وہ تازہ دم بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں تھکن سی تھی۔ اصل میں وہ جوزفین کی ڈائری پڑھ رہی تھی اور اس ڈائری میں درج واقعات پڑھتے ہوئے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو آج تک یہ سمجھتی رہی تھی کہ اس کے ماں باپ ایک دوسرے سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور انہوں نے لو میرج کی تھی تو یہ کوئی ایسی درست بات نہیں تھی۔ کم از کم جوزفین نے جوزف سے محبت نہیں کی تھی۔ وہ تو کسی نواب زادہ اسد اللہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی لیکن اس محبت کا کیا انجام ہوا اور جوزفین کی جوزف سے شادی کیسے ہوئی، اسے یہ جاننے کے لیے ابھی ڈائری کے بہت سے ابواب پڑھنے تھے۔ ربن اور جانی کی آمد نے اس کام میں خلل ڈال دیا تھا۔

''آپ لوگ......'' ان لوگوں کو دروازے پر پا کر اس نے قدرے حیرت سے کہا۔

''ہم تیرا حال پوچھنے آئے تھے بٹیا! ہمیں اندر نہیں بلائے گی؟'' ربن نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ فاروق کے حوالے سے وہ اسے عزیز تھی۔ فاروق اس کی محبت حاصل کر پاتا یا نہیں، اس سے قطع نظر اس کی اہمیت کے لیے یہی کافی

تھا کہ وہ فاروق کی محبت تھی۔

''آجایئے۔'' جولیٹ اس وقت تنہائی کی خواہاں تھی لیکن ربن کو انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اڈے والوں کے لیے اس کے دل میں لاکھ ناپسندیدگی ہو، وہ یہ بات فراموش نہیں کرسکتی تھی کہ انہوں نے ہر مشکل گھڑی میں اس کی اور اس کے گھر والوں کی مدد کی تھی۔

''آج دفتر نہیں گئی تو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' وہ برآمدے میں رکھی میز کے گرد موجود کرسیوں پر آبیٹھے تب ربن نے اس سے دریافت کیا۔

''جی بس ذرا سر میں درد تھا اس لیے چھٹی کرلی تھی۔ آپ لوگ بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' جولیٹ نے کہا اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے ہوئے تھے۔

''اپن تیرے کو چائے بنانے سے منع کرنے کا سوچ رہا تھا پھر اس لیے نہیں روکا کہ بٹیا کے ہاتھ کا سواد ہی چکھ لیں گے۔'' وہ ان لوگوں کے ساتھ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تو ربن نے اس سے کہا۔

''مجھے اچھی ککنگ نہیں آتی۔ ممی نے خود ہی کچن سنبھالا ہوا تھا۔ میں تو بس کبھی کبھی ہی کچھ بنا لیتی تھی۔'' جولیٹ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ جوزف اور جوزفین کی زندگی میں اس میز پر کیسی رونق ہوتی تھی۔ جوزفین کے ہاتھ کا ذائقہ ان دونوں باپ بیٹی کو بے حد بھاتا تھا اور وہ فرمائشیں کر کر کے اس سے خاص کھانے بنواتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے جوزفین نے اس کا پسندیدہ لوکی کا حلوا بنایا تھا۔ اب کون تھا جو اس کا ایسا خیال کرتا اور اسے اس کی من پسند چیزیں بنا کر کھلاتا۔ اب تو بس جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ زہر مار کرلیتی تھی۔ زبان نے ذائقوں کو محسوس کرنا کب سے چھوڑ دیا تھا۔

''تو پڑھنے لکھنے والی، نوکری کرنے والی لڑکی ہے۔ تیرے پاس چولہا چوکی سنبھالنے کا ٹائم ہی کدھر تھا۔ تو جو کررہی ہے تیرے لیے وہ ہی اچھا ہے۔ چولہا چوکی تو دنیا کی بہت عورتیں سنبھالتی ہیں۔ تیری جیسی ذہین اور پڑھی لکھی لڑکیاں کم ہوتی ہیں۔'' ربن نے جیسے اس کی دل جوئی کی۔

''مجھ جیسی ان لکی لڑکیاں بھی تو کم ہوتی ہیں۔ کیا بچا ہے میرے پاس۔ ماں باپ، عزت سب چلے گئے۔ میں پتا نہیں کیوں جی رہی ہوں......'' وہ یاسیت کا شکار تھی۔

''کس کو رہنا ہے اور کس کو جانا ہے، اس کا فیصلہ تو وہی کرنے والا ہے جس نے یہ سنسار بنایا ہے۔ یہ تو سوچتی ہے کہ تیرا سب کچھ ختم ہوگیا پر اصل میں جاننے والا تو وہ ہے کہ اس نے تیرے لیے کیا کیا رکھا ہوا ہے۔ اچھا برا وقت تو آدمی پر آتا ہی رہتا ہے۔ تو ہر وقت یہی سب سوچ کر اپنی جان مت گھلاتی رہا کر۔ لوگوں سے مل جل کر کہیں آجا تو تیرا من بہلے گا۔ یہ سارے محلے والے تیرے اپنے ہیں۔ دوست رشتے دار بھی ہوں گے۔ ان کے پاس آیا جایا کر۔'' ربن نے اسے مشورہ دیا اور چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ ساتھ آیا جانی بھی خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ فی الحال اسے اس گفتگو میں حصہ لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ربن صرف احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لایا ہے کہ جوان اور تنہا لڑکی سے ملاقات کے لیے اکیلے جانا لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دے سکتا تھا۔

''جو مجھ پر بیتی، اس کے بعد سب تعلق ختم ہوگئے ہیں۔ محلے والوں کو میری تنہائی بانٹنے سے زیادہ اس بات کی کھوج رہتی ہے کہ میں اپنے ساتھ بیتی کو کھل کر بتاؤں۔ دوستیاں کوئی ایسی خاص تھی نہیں۔ بس ایک دوست بنایا تھا اور ساری زندگی اس کے ساتھ رہنے کا خواب دیکھا تھا لیکن وہ بولا کہ اب میں اس کے قابل نہیں رہی۔ رشتے دار کبھی دیکھے ہی نہیں۔ دونوں طرف کے گرینڈ فادرز اور گرینڈ مدرز کی مام ڈیڈ کی میرج سے پہلے ڈیتھ ہوگئی تھی اور مام ڈیڈ دونوں ہی اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد تھے تو رشتے دار کہاں سے آتے۔ اب آپ بولو کہ میں کہاں اور کس سے ملنے جایا کروں؟'' وہ آج ذرا مختلف موڈ میں تھی جو ربن سے اتنی تفصیل سے بات کررہی تھی۔ ربن نے محسوس کرلیا کہ وہ بہت دکھی اور مایوس ہے لیکن وہ کوئی سرا ہاتھ میں دیتی، تب ہی تو وہ اس کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر جولیٹ کا مجرم کیفرکردار کو پہنچ گیا تو وہ اپنی اس کیفیت سے باہر آسکتی ہے۔

''کچھ دن پیچھے ادھر موٹر میں ایک آدمی تیرے لیے پھول اور تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ آدمی تو اپنے حلیے سے ڈریور (ڈرائیور) لگتا تھا اور معلوم پڑتا تھا کہ کسی اور کی طرف سے آتا ہے۔ ایک بار تو موٹر میں بیٹھ کر گھر بھی آوئی تھی...... تو وہ موٹر والا کون ہے تیری پہچان میں؟ کیا اس نے بھی تجھ سے ناتا توڑ لیا؟'' ربن نے اتنا اچانک یہ ذکر چھیڑا کہ جولیٹ ٹھٹھک کر رہ گئی اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ربن نے اس کی اس تبدیلی کو فوراً محسوس کرلیا اور سمجھ گیا کہ بالکل

صحیح نشانے پر تیر مارا ہے۔ اڈے کے اطراف میں بکھرے اپنے آدمیوں کے ذریعے اسے محلے میں ہونے والی ہر سرگرمی کی خبر رہتی تھی لیکن چونکہ وہ محلے داروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا اس لیے کبھی جولیٹ کے اس معاملے پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اب بالکل اچانک خیال آ گیا تھا کہ اس سلسلے کی کڑی کے ساتھ ہی کہیں جولیٹ کے اغوا کی کڑی بھی نہ جڑی ہوئی ہو۔ اغوا کے واقعے کے بعد ایک بار بھی اس موٹر اور ڈرائیور کو محلے میں نہیں دیکھا گیا تھا۔

''تو نے جواب نہیں دیا اپن کو......؟'' جولیٹ کو خاموش پا کر ربن نے اسے ٹوکا۔

''وہ...... میں سوچ رہی تھی کہ آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔'' جولیٹ سنبھلی اور وضاحت پیش کرنے کے انداز میں بولی۔ ''وہ موٹر تو میری ایک فرینڈ کی تھی۔ وہ میرج کے بعد پنجاب چلی گئی تھی۔ کچھ دن پہلے اس کا بمبئی آنا ہوا تھا تو اس نے مجھے ملنے کے لیے بلا لیا اور بعد میں اپنے ڈرائیور سے واپس گھر بھی بھجوا دیا۔ وہ امیر لڑکی ہے اس لیے مجھے گفٹس بھیجتی رہتی تھی لیکن میں اس لیے واپس کروا دیتی تھی کہ میں بدلے میں اسے کوئی قیمتی گفٹ نہیں دے سکتی تھی۔'' وہ سمجھ گئی تھی کہ جہاں اتنا سب کچھ ربن کے علم میں ہے تو یہ بات بھی وہ جانتا ہوگا کہ وہ ان تحائف کو شرفِ قبولیت نہیں بخشتی تھی اس لیے اس کی بھی وضاحت دے دی۔

''کیا نام ہے تیری اس سہیلی کا؟''

''ثنا......'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا اور ثنا کا مکمل نام بتانے سے گریز کیا۔ ''تو نے بتایا کہ بڑی امیر لڑکی ہے تو اس کا سسرال بھی کچھ کم نہیں ہوگا۔ اس کے گھر والوں نے اتنی دور بمبئی یوں ہی تو اٹھا کر دے نہیں دی ہوگی۔ داماد بھی کوئی بڑا آدمی ہوگا، تجھے کچھ نام پتا معلوم ہے اپنی سہیلی کے شوہر اور اس کے خاندان کا؟'' ربن بالکل ٹھیک لائن پر چل رہا تھا جس کی وجہ سے جولیٹ کی گھبراہٹ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے ایک بار پھر خود پر قابو پایا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ سب تو مجھے یاد نہیں۔ ثنا نے نام بتایا تو ہوگا لیکن میرے ذہن میں نہیں رہا اور پتا میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ میں اس سے ملنے کے لیے پنجاب تو جانے سے رہی۔''

''ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔ اتنی دور کون کسی سے ملنے جاتا ہے۔ اپن تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اگر کہیں قریب رہتی ہے تیری سہیلی تو تو اسی سے ملنے چلی جایا کر۔'' ربن نے جیسے اس کی بات کو تسلیم کر لیا جس پر جولیٹ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے بولی۔

''آپ میری اتنی فکر مت کریں۔ میں ٹھیک ہوں۔ کچھ دن اور گزریں گے تو اور بھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بری یادوں کو بھلانے میں کچھ ٹائم تو لگ ہی جاتا ہے نا۔''

''یہ بھی آدمی کے اپنے اوپر ہوتا ہے کہ وہ کتنا ٹائم لیتا ہے۔ اپنے زخموں کو بیٹھ کر ادھیڑتے رہنے والے کو کبھی کچھ نہیں بھولتا اور زخم تازہ ہی رہتا ہے۔'' ربن کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔

''کبھی کبھی آدمی کو نہ بھرنے والا زخم بھی لگ جاتا ہے۔'' جولیٹ کے اس جملے نے واضح کر دیا کہ کچھ دن بعد ٹھیک ہو جانے کی بات اس نے محض ربن کو ٹالنے کے لیے کہی تھی ورنہ وہ کچھ بھی بھلانے پر راضی نہیں تھی۔

''آدمی کسی کو اپنے زخم پر مرہم رکھنے ہی نہ دے اور بولے کہ میرا زخم نہ بھرنے والا ہے تو یہ بڑی جیازتی...... (زیادتی) کی بات ہے۔ پر ٹھیک ہے جیسا تو صحیح سمجھے۔ اپن کو اب اجازت دے۔ اپن بس تیرا حال معلوم کرنے آئے تھے۔ کوئی بھی کام یا ضرورت ہو تو اپنے پاس پیغام بھیج دینا۔ اپن اب چلتا ہے۔'' ربن نے بالکل اچانک ہی بات ختم کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جانی اور جولیٹ نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیرونی دروازے تک پہنچے۔ دروازے پر پہنچ کر ربن نے جولیٹ کے سر پر ہاتھ رکھا اور جانی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ان کے پیچھے دروازہ بند کر کے جولیٹ نے بے ساختہ ہی ایک گہرا سانس لیا۔ اسے پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ ربن کس قدر بیدار مغز آدمی ہے۔ اپنے طور پر اس نے اسے ٹال تو دیا تھا لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اپنی اس کوشش میں کتنے فیصد کامیاب رہی ہے۔ ادھر ربن بھی سوچ رہا تھا کہ جو ایک معمولی سا سرا ہاتھ آیا ہے، اسے تھام کر کس طرح حقیقت تک پہنچے۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے میں لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

''شیکسپیئر کی تحریر زندگی سے بہت قریب ہے۔ اس کا لکھا ایک ایسے شخص کا لکھا ہے جو زندگی کو سمجھتا تھا۔ آپ اس کی اس مشہورِ زمانہ بات کو ہی لے لیجیے کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر شخص اس اسٹیج پر اپنا کردار ادا کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ یہ بات حقیقت سے کتنی قریب ہے۔ آپ دیکھیے کہ

ہماری زندگی اس منتولے سے کتنی زیادہ قریب ہے۔ میں، آپ اور ہم سب یہاں اپنے مخصوص کردار ادا کر رہے ہیں اور دیکھنے والے ہمیں بس ہماری اس دنیا کے اسٹیج پر موجودگی کی حد تک ہی جانتے ہیں۔ ہماری اس پرفارمنس سے پہلے اور بعد میں کیا ہے، کسی کو نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ اسٹیج پر موجود فنکار کے بارے میں نہیں معلوم ہوتا کہ وہ پردے کے پیچھے سے نمودار ہونے سے پہلے کیا تھا اور پردے کے پیچھے واپس چلے جانے کے بعد کیا ہوگا۔ ہم سب اپنے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں آنے سے قبل کیا تھے اور کن حالات سے گزر رہے تھے اور جب یہاں سے جائیں گے تو کس حال میں ہوں گے اور ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا۔''

جوزفین اور نواب زادہ اسداللہ لائبریری میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے اور اسداللہ شیکسپیئر کے بارے میں اپنی رائے سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ لائبریری میں پہلی بار ہونے والے ٹکراؤ کے بعد کبھی کبھی اسداللہ اس کی موجودگی کے اوقات میں بھی وہاں آنے لگا تھا۔ وہ مطالعے کے سلسلے میں جوزفین کو مشورے دیتا تھا کہ کون سی کتاب پڑھنا زیادہ بہتر رہے گا اور پھر ان کتابوں پر اس کے ساتھ ڈسکشن کرتا تھا۔ اتنے دنوں میں جوزفین کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ شیکسپیئر کا زبردست مداح ہے اور اس موضوع پر بلا تکان بول سکتا ہے۔ جوزفین خود یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے شیکسپیئر نے کس حد تک متاثر کیا تھا۔ وہ تو بس نواب زادہ اسداللہ کی وجہ سے ہی اسے پسند کرنے لگی تھی اور اس کی خاطر شیکسپیئر کو توجہ سے پڑھنے لگی تھی۔ وہ دیکھتی تھی کہ شیکسپیئر پر بات کرنے سے اسداللہ خوش ہوتا ہے اور اسے اسداللہ کو خوش دیکھ کر اچھا لگتا تھا۔ حویلی کے گھٹے بند ھے ماحول میں نواب زادہ اسداللہ سے لائبریری میں ہونے والی یہ ملاقات تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے کے مانند تھی۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر رہا کرتی تھی کہ کس دن اسداللہ لائبریری میں وارد ہوتا ہے اور اس کے سامنے بیٹھ کر اس سے گفتگو کرتا ہے۔ اسداللہ کے علاوہ اسے اس حویلی میں عالیہ کے ساتھ وقت گزارنا بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ سادہ طبیعت کی خوش مزاج لڑکی تھی اور جوزفین کو اپنی ذاتی ملازمہ سمجھنے کے بجائے اس کے ساتھ عزت سے پیش آتی تھی البتہ عشرت جہاں انا کا مسئلہ بنا کر اس سے انگریزی سیکھنے کا سلسلہ ختم کر چکی تھی اور کہیں بھی سامنا ہو جانے پر اسے معاندانہ نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ جوزفین کو اس سے ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں وہ اپنی بااختیار ماں کو اس کے خلاف بھڑکا کر حویلی سے اس کا بوریا بستر ہی گول نہ کروا دے لیکن فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

''آپ بھی تو کچھ بولیے۔'' بولتے بولتے اسداللہ کو احساس ہوا کہ وہ خود ہی بولے جا رہا ہے اور جوزفین اپنی کوئی رائے نہیں دے رہی تو چونک کر اسے ٹوکا۔ جوزفین جو سننے سے زیادہ اس کے دل آویز نقوش کو دیکھنے میں مصروف تھی، اس کے ٹوکنے پر گڑبڑائی اور اٹکتے ہوئے بولی۔

''آپ بولتے رہیں نا۔ مجھے آپ کو سننا اچھا لگ رہا ہے۔''

''ہمیں تو لگ رہا ہے کہ آپ کو سننے سے زیادہ ہمیں دیکھنا اچھا لگ رہا ہے۔'' نواب زادہ اسداللہ اس کی کیفیت سے ایسا بے خبر نہیں تھا چنانچہ موقع پاتے ہی اسے جتا بھی دیا۔ اس کے جتانے پر جوزفین مزید گڑبڑا گئی اور شرم سے اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔

''جب کوئی اچھا لگے تو اسے بتا دینے میں کوئی ایسا حرج نہیں ہوتا جیسا کہ ہم آپ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ زرد رنگ آپ پر بہت خوب لگ رہا ہے اور اس رنگ کو زیادہ پسند نہ کرنے کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ کو زرد رنگ کا لباس پہنے دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ رنگ بنا ہی آپ کے لیے ہو..... بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں سارے رنگ ہی آپ کے لیے تخلیق کردہ لگتے ہیں۔ آپ کو جب جب جس جس رنگ میں دیکھا خوب ہی پایا۔ رنگوں سے ایسی دوستی پہلے کبھی ہم نے کسی کی نہیں دیکھی۔'' نواب اسداللہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا اور جوزفین کی آنکھوں میں بیک وقت حیا اور حیرت کے رنگ دوڑنے لگے۔ اتنی واضح تعریف سے تو ظاہر تھا کہ نواب زادہ اسداللہ کی اس پر خصوصی نظر رہتی ہے اور یہ امر اس کے لیے خوشی کا باعث تھا۔ وہ خود تو پہلی نظر میں ہی اس سے متاثر ہوگئی تھی لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسداللہ بھی اس کے لیے ایسے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہوگا۔

''اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ کو تو پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ ہم یہاں ڈسکشن کرنے سے زیادہ آپ کو دیکھنے کی خاطر آتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہم آپ سے متاثر ہیں حالانکہ ہم نے بہت ہی ذہین اور خوب صورت لڑکیوں کی سنگت میں وقت گزارا ہے۔ لندن میں دوستوں کی فہرست میں کئی لڑکیوں کے نام بھی شامل تھے لیکن ان میں سے کسی نے ہمارے دل کو یوں اپنی طرف نہیں کھینچا جیسے آپ کھینچتی ہیں۔ آپ میں کچھ خاص

بات ہے جوزفین۔'' نواب زادہ اسد اللہ نے وہی بات کہی جو ہر چاہنے والا اپنے محبوب کے بارے میں سوچتا اور کہتا ہے۔ حقیقت میں دنیا میں حسن، ذہانت اور دیگر خوبیوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن ان گنت لوگوں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے جسے دل اپنے لیے چن لیتا ہے اور بغیر کسی منطق کے خاص الخاص قرار دے دیتا ہے۔

''یہ سب آپ کی نظر کا کمال ہے نواب زادہ صاحب ورنہ میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں۔ خاص تو آپ ہیں۔ گاڈ نے ہر طرح سے آپ کو بے حد نوازا ہے۔ اونچا نسب، اعلیٰ تعلیم، اچھی شکل اور بے حد وحساب دولت...... سب ہی کچھ تو ہے آپ کے پاس۔ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے آپ کو اپنے مقام سے اتنے نیچے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ دنیا آپ کو اور مجھے دونوں کو معاف نہیں کرے گی۔ خاص طور پر میں مجرم قرار دی جاؤں گی کیونکہ یہاں کمزور کو ہی سب سے پہلے نشانہ بنایا جاتا ہے۔'' جو آپ کو اچھا لگے وہ بھی آپ کی طرف ملتفت ہو، دنیا میں اس سے بڑھ کر خوشی کیا ہو سکتی ہے۔ جوزفین کو بھی پہلے لمحے پر یہی خوشی محسوس ہوئی تھی لیکن پھر وہ اپنے اور نواب زادہ کے درمیان موجود فرق کو دیکھ کر سہم گئی اور شکستہ لہجے میں اس سے بولی۔

''ہم بھی اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں، کوئی آپ کو نشانہ بنائے گا تو ہم ڈھال بن کر آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔'' اسد اللہ نے اسے تسلی دی اسی پل دروازہ کھلا اور کوئی لائبریری میں داخل ہوا۔ ان دونوں نے رخ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ صفیہ جہاں عرف نواب بیگم چلی آرہی تھیں۔ اسد اللہ ماں کو سامنے پا کر تیزی سے کھڑا ہوا۔ جوزفین نے بھی اس کی تقلید کی۔

''امی جان..... آپ اور یہاں۔ کوئی کام تھا تو ہمیں حکم دیا ہوتا۔'' اسد اللہ نے احترام سے کہا لیکن ساتھ ہی وہ حیرت میں بھی مبتلا تھا کہ صفیہ جہاں کا لائبریری میں کیا کام، پہلے کبھی اس نے انہیں یہاں کا رخ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

''ہمیں آپ سے گفتگو کے لیے یہی مقام اور موقع مناسب لگا۔'' صفیہ جہاں نے بے حد سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔

''آپ تشریف رکھیے۔'' اسد اللہ نے خود کرسی کھینچ کر انہیں بیٹھنے کے لیے پیش کی۔ جوزفین کو اس جگہ اپنی موجودگی غیر ضروری محسوس ہوئی، نواب بیگم نے اس کی یہاں موجودگی کو مکمل نظر انداز کر دیا تھا اور صرف اپنے بیٹے سے مخاطب تھیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ صرف بیٹے سے ہی بات کرنا چاہتی ہیں۔ جوزفین نے اجازت طلب کی تو اسے فوراً جانے کی اجازت دے دی گئی۔

''جی امی جان! فرمایئے۔'' اسد اللہ، صفیہ جہاں کی طرف رخ کر کے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''ہمیں آپ کے معمولات پر تشویش ہے اسد اللہ۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کی کوئی حرکت آپ کے ابا جان کے غیظ کا سبب بنے اور آپ ان کی نظروں میں معتوب ٹھہریں۔'' صفیہ جہاں نے بات کا آغاز کیا تو اسد اللہ نے دیکھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات میں پریشانی درج ہے۔

''ہم آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھے امی جان! ہم تو بڑی پابندی سے ابا جان کی عائد کردہ ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ ہمیں نہیں یاد پڑتا کہ ہم سے اس سلسلے میں بھی کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔''

''ہم اس سلسلے میں بات نہیں کر رہے۔ ہمارا اشارہ آپ کے معمول میں آنے والی نئی تبدیلی کی طرف ہے۔ آپ کی جوزفین کے ساتھ طویل نشستیں شکوک وشبہات کو جنم دے رہی ہیں اور اس سلسلے میں چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں۔'' آخر انہوں نے کھل کر اپنی تشویش کا اظہار کر ہی دیا۔

''ان شکوک وشبہات کا اظہار یقیناً پھوپی بیگم نے کیا ہوگا۔'' اسد اللہ کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی اور اس نے قدرے تند لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے بیٹا کہ کون کہہ رہا ہے۔ باتیں تو بہرحال بن رہی ہیں نا۔'' صفیہ جہاں کے لہجے میں بے بسی تھی۔ نواب سلیم اللہ کی بیوی کی حیثیت سے انہیں نواب بیگم کا اعلیٰ خطاب تو ضرور مل گیا تھا لیکن وہ کبھی اس حویلی پر حکمرانی نہیں کر سکی تھیں۔ شادی کے ابتدائی دور میں ان کی ساس حیات تھیں اور تمام معاملات ان ہی کے ہاتھ میں تھے۔ ساس کے انتقال کے بعد آپا بیگم بیوگی کی چادر اوڑھ کر اسی حویلی میں وارد ہوئیں کہ ہر طرف چھا گئیں۔ نواب سلیم اللہ نے بیوہ بہن کی دل جوئی کی خاطر انہیں اس قدر اہمیت دی کہ بیوی کی حیثیت بالکل ختم ہو کر رہ گئی اور آپا بیگم حاوی ہوتی چلی گئیں۔ صفیہ جہاں کچھ اس وجہ سے بھی مقابل کھڑی نہ ہو سکیں کہ ندرت جہاں سسرالی رشتے کے اعتبار سے ضرور ان سے چھوٹی تھیں لیکن عمر میں بڑی تھیں اور وہ بچپن سے انہیں آپا بیگم کہہ کر ان کا احترام کرنے کی

عادی تھیں۔'' آپ ان باتوں کا اثر کیوں لیتی ہیں امی جان! ہم کوئی مس جوزفین سے خفیہ ملاقاتیں تو نہیں کرتے ہیں کہ کسی کو اعتراض ہو۔ ہم یہاں لائبریری میں ان کے ساتھ علمی مباحث کیا کرتے ہیں۔ حویلی میں کوئی اور فرد تو ایسا ہے نہیں کہ ہم سے ان موضوعات پر گفتگو کر سکے۔ بھائی کو اپنی لاء کی کتابوں سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع پر کتب بینی کا شوق نہیں۔ ابا جان کی دوسری بے شمار مصروفیات ہیں۔ اختر کو ولایت سے واپس آنے میں ابھی خاصا وقت درکار ہے اور ان تین افراد کے علاوہ حویلی میں کوئی انگریزی زبان سے واقف نہیں۔ ایسے میں اگر ہمیں مس جوزفین کی صورت میں ایک ہم ذوق میسر آ گیا ہے تو ہمیں اس خوشی سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟'' نواب زادہ اسد اللہ کو بھی اپنی ماں کی حویلی میں حیثیت سے آگاہی تھی چنانچہ لہجے کو نرم کر کے وضاحت پیش کرنے لگا۔

''ہم آپ کی ہر بات کو درست تسلیم کر لیتے ہیں لیکن آپ یہ بھی تو سمجھیے کہ ہم دوسروں سے اسے تسلیم کروا لینے پر قادر نہیں ہیں۔'' صفیہ جہاں کے لہجے میں وہی بے بسی کی کیفیت تھی۔

''تو آپ ایسی کوشش ہی کیوں فرمائیں؟ آپ اس معاملے کو ایسے ہی چھوڑ دیجیے۔ ابا جان ہم سے اس سلسلے میں باز پرس کریں گے تو ہم خود انہیں جواب دے لیں گے۔'' اسد اللہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''آپ بے شک تعلیمی قابلیت کے اعتبار سے ہم سے بہت آگے ہیں اسد اللہ لیکن آپ یہاں کے معاملات کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے جیسے ہم سمجھتے ہیں۔ ایک ماں کی حیثیت سے ہم آپ کو کسی بڑے نقصان سے بچانا چاہتے ہیں لیکن ہم اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ ہر طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ ہماری نظریں اس طوفان کو دیکھ سکتی ہیں جو آپ کی طرف بڑھ رہا ہے اور پیش بندی کے طور پر ہی آپ سے احتیاط کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''

''ہم آپ کے اشاروں کو سمجھ نہیں پا رہے امی جان۔ برائے مہربانی ذرا وضاحت فرمائیں۔'' اسد اللہ ان کے اس قدر خوف زدہ ہونے پر حیرت اور الجھن کا شکار ہو گیا۔

''ہم آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جوزفین کے ساتھ آپ کے زیادہ میل ملاپ کو بے راہ روی کی طرف پیش قدمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں فیصلہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو فوری طور پر شادی کے بندھن میں باندھ کر پابند کر دیا جائے۔ اس وقت اگر آپ کی شادی کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے تو لامحالہ آپ کی دلہن کے طور پر عشرت جہاں کا نام لیا جائے گا اور ہم آپ کو اس بے جوڑ رشتے سے بچانا چاہتے ہیں۔ بات صرف شکل وصورت کی ہوتی تو تب بھی ہمیں زیادہ اعتراض نہیں ہوتا لیکن عشرت جہاں کی دیگر صفات بھی ایسی نہیں ہیں کہ ہم انہیں آپ کی دلہن بنا کر زندگی بھر کے لیے آپ کے سر پر ایک عذاب مسلط ہوتا دیکھ سکیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کی شادی کا ذکر اس وقت چھڑے جب عشرت جہاں اپنے گھر کی ہو چکی ہوں یا کم از کم ان کی کہیں نسبت طے پا جائے۔ آپ خود سوچیے کہ آپ کو ولایت سے واپس آئے اتنے دن ہو گئے لیکن ہم نے ایک بار بھی آپ کی شادی کی خواہش ظاہر نہیں کی جبکہ آپ کے بھائی جان صفی اللہ کو ہم نے تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم جیسے ہی آپ کی شادی کا ذکر چھیڑیں گے فوراً عشرت جہاں کا نام تجویز کر دیا جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم یہ تذکرہ ہی اس وقت چھیڑیں جب عشرت جہاں کسی ٹھکانے لگ چکی ہوں۔ ہم چپکے چپکے ان کی کہیں نسبت طے کروانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں کچھ وقت درکار ہے۔ آپ کی ذرا سی بھی بے احتیاطی ہماری ہر تدبیر پر پانی پھیر دے گی اور ہم آپ کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر پائیں گے۔'' صفیہ جہاں نے پوری وضاحت سے اسے اپنے خدشات، احساسات اور خواہشات سے آگاہ کیا تو وہ بھی متفکر ہو گیا۔ اسے حویلی میں اپنی پھوپھی ندرت جہاں کی حیثیت کا علم تھا۔ فی الحال تو انہوں نے بیٹی کی ماں ہونے کی حیثیت سے وضع داری نبھاتے ہوئے اپنی زبان سے یہ خواہش ظاہر نہیں کی تھی لیکن اگر اس کی شادی کا قصہ چھڑتا تو وہ کسی نہ کسی ترکیب سے نواب سلیم اللہ کے ذہن میں عشرت جہاں کا نام ڈال سکتی تھیں اور ایک بار عشرت جہاں کا نام نواب صاحب کے ذہن میں آ جاتا تو وہ اپنی بھانجی ہونے کی خصوصیت کے آگے اس کی ہر خامی اور کجی کو نظر انداز کر دیتے۔

''امید ہے آپ نے ہماری بات اچھی طرح سمجھ لی ہو گی اور اس پر غور فرمائیں گے۔ اب ہم چلتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر طرف ہلچل مچ جائے کہ آخر اتنی دیر سے ہم یہاں آپ سے کس گفتگو میں مصروف ہیں۔'' صفیہ جہاں نے اسے سوچ میں ڈوبا پایا تو آہستہ سے بولیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نواب زادہ اسد اللہ بھی فوراً کھڑا ہو گیا اور پورے احترام سے انہیں دروازے تک جا کر رخصت کیا۔

ان کے جانے کے بعد وہ اپنی جگہ پر آن بیٹھا اور کھوئی کھوئی سی کیفیت میں اپنے سامنے رکھی خالی کرسیوں کو دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ان کرسیوں پر اب بھی جوزفین اور صفیہ جہاں براجمان ہوں۔ ان دونوں کی وہاں موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ باری باری دونوں سے ہونے والی گفتگو کو یاد کرنے لگا۔ جوزفین سے اس کی گفتگو کتنی پُرلطف تھی۔ آج پہلی بار بڑی بے ساختگی میں وہ اظہار کے مراحل سے گزرے تھے لیکن اس مرحلے کے بعد حاصل ہونے والے کیف ونشاط کے لمحات کو محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا اور صفیہ جہاں اپنے بدترین خدشات کے اظہار کے ساتھ انہیں متنبہ کرنے آن پہنچی تھیں ان کا بیان کردہ خطرہ حقیقی تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اظہار کے مرحلے سے گزرنے کے بعد کیا وہ جوزفین سے فاصلہ قائم رکھ پائے گا......؟ محبت کے پودے کو تو یوں بھی قربت کے پانی کی بڑی پیاس ہوتی ہے۔ اس پانی کو پا کر یہ پودا خوب پھلتا پھولتا اور لہلہاتا ہے اور دیکھنے والوں کی نظریں فوراً اس کی موجودگی کو بھانپ لیتی ہیں۔

☆☆☆

حدِنظر تک پھیلا نیلا آسمان اور اس پر اٹکھیلیاں کرتی بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں، ہر طرف موجود سبزہ، فضا کی تازگی اور مہک، پرندوں کی سریلی آوازیں..... کیا تھا جو شملہ میں نہیں تھا۔ یہ وادی ان سارے لوازمات سے آراستہ تھی جو انسانی دل کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ فاروق کو بھی شملہ کی سحر انگیز خوب صورتی نے متاثر کیا تھا لیکن جو دیکھنے میں پیارا لگے، وہ دل کو بھی پیارا ہو یہ ضروری تو نہیں ہوتا۔ اسے بھی شملہ دیکھنے میں بہت پیارا لگتا تھا لیکن دل کو تو بمبئی پیارا تھا جس میں تنگ وتاریک گلیاں تھیں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں تھیں، بے ہنگم ٹریفک تھا اور دھواں دھواں فضا تھی کیونکہ بمبئی وہ شہر تھا جس نے خانماں بربادی کے دور میں اسے اپنی بانہوں میں سمیٹا تھا۔ جہاں اس نے ربن کی شفقت پائی تھی اور گولو سمیت دوسرے تمام ساتھیوں کی بے تحاشا محبتیں سمیٹی تھیں۔ اسی بمبئی میں جولیٹ بستی تھی جو اپنی تمام تر بے رخی سمیت اس کے دل میں آباد تھی اور اسے زندگی برباد کرنے کے عوض بھی اپنے دل کی یہ آبادی پیاری تھی۔ اپنے اس بے حد پیارے بمبئی کی یاد میں تڑپتے اس کے لیے شملہ کی خوب صورتی بے معنی ہو گئی تھی اور وہ شدت سے اس بات کا منتظر تھا کہ کب ربن کی طرف سے اسے واپس آنے کی اجازت ملتی ہے۔ ربن نے بھی نیم رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن واپسی کو اس بات سے مشروط رکھا تھا کہ وہ چندی گڑھ کے اسپتال میں اپنا تفصیلی چیک اپ کروائے اور وہاں سے تشفی بخش جواب ملنے کے بعد ہی بمبئی کا رخ کرے۔

چندی گڑھ اسپتال میں اس کے چیک اپ کے لیے اپائنٹمنٹ لی جا چکی تھی اور وہ شدت سے منتظر تھا کہ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد بمبئی کے لیے روانہ ہو سکے۔ اب اس کے لیے شملہ میں وقت کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ بملا بھابیہ کی شملہ آمد کے نتیجے میں اسے جو ایک اچھی رفاقت میسر آئی تھی، اس سے بھی وہ بملا کے بدلتے ہوئے رویوں کی وجہ سے بیزار ہو گیا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور ذہین عورت تھی اور فاروق کو اس سے گفتگو کر کے اچھا لگتا تھا لیکن پھر بملا نے اسے اپنی جاگیر سمجھنا شروع کر دیا اور ایسے رویوں کا مظاہرہ کرنے لگی جو اس کے لیے ناگوار تھے چنانچہ اس کی رفاقت کا لطف بھی ختم ہو گیا۔ آدھا گھنٹا قبل کی بات تھی کہ وہ بملا سے جان چھڑانے کے لیے آرام کا کہہ کر اپنے لیے مخصوص کمرے میں بند ہو گیا تھا لیکن پھر کمرے کے درودیوار اسے کاٹنے کو دوڑنے لگے تو وہ وحشت زدہ ہو کر باہر نکل آیا اور چہل قدمی کرتا ہوا بھابیہ ہاؤس سے کافی دور نکل گیا۔ احساس ہونے پر پلٹا اور واپسی کی راہ اختیار کی۔ واپسی میں اس نے اس عام گزرگاہ کو استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا جس پر سے گاڑیاں وغیرہ گزرتی تھیں اور بھابیہ ہاؤس کی بالکونی میں کھڑا ہو کر اس گزرگاہ اور اس پر چلنے والی گاڑیوں سمیت انسانوں کو بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ اپنے تئیں وہ ایک شارٹ کٹ کو استعمال کرتا ہوا اونچے نیچے ناہموار راستے پر چل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ اس راستے سے وہ کم وقت میں بھابیہ ہاؤس واپس پہنچ جائے گا لیکن آہستہ آہستہ اسے اپنے اندازے کی غیر درستگی کا احساس ہوتا چلا گیا۔ عام گزرگاہ سے بھابیہ ہاؤس پہنچنے میں جتنا وقت لگتا تھا، اس سے اوپر وقت گزر جانے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی اور وہ اب گھنے درختوں کے بیچ بھٹکتا پھر رہا تھا۔ موسم اگرچہ گرم نہیں تھا لیکن اونچائی کی سمت کافی دیر چلنے کی وجہ سے اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا اور اب اس کا موقع بھی نہیں رہا تھا کہ وہ پلٹ کر نیچے چلا جائے۔ وہ بس اندازے سے ہی اس طرف آیا تھا اور اب اسے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں کہاں سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ دن کا وقت ہونے کی وجہ سے فی الحال اسے کوئی خطرہ تو محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن اس بات کا بھی احساس تھا کہ اگر

وہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تو بڑی پریشانی میں پڑ سکتا ہے۔ یہاں رہتے ہوئے اسے اس بات کا تجربہ ہوچکا تھا کہ پہاڑی علاقوں میں شام ہوتے ہی اتنی تیزی سے رات میں ڈھلتی ہے کہ انسان اندازہ ہی نہیں لگا پاتا اور اندھیرا ہوجانے کی صورت میں راستہ تلاش کرنے کا کام اور بھی دشوار ہوجاتا لیکن فی الحال اس کے لیے کچھ دیر رک کر اپنی سانس بحال کرنا بھی ضروری تھا۔ سانس بحال ہوتی تو شاید پیاس کی شدت میں بھی کچھ کمی آجاتی۔

وہ ایک بڑے سے پتھر پر آرام کی غرض سے بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی طبیعت بحال ہونے لگی اور کچھ دیر سستا کر وہ ایک بار پھر چل پڑا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے لگا کہ اس کے کانوں میں کوئی انسانی آواز پڑی ہو۔ وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور سماعت پر کچھ اور زور دیا۔ کچھ توقف کے بعد اسے آواز پھر سنائی دی۔ الفاظ کا اندازہ نہ ہونے کے باوجود اس کو احساس ہوگیا کہ یہ نسوانی آواز ہے۔ اس نے سمت کا بھی تعین کرلیا اور دل میں خوشی محسوس کی کہ یہاں اس کے سوا بھی کوئی موجود ہے۔ اس نے جو آواز سنی تھی، اس سے لگتا تھا کہ بولنے والی عورت کسی سے گفتگو کررہی ہے۔ یعنی وہاں دو یا دو سے زائد افراد موجود تھے جو منزل پر پہنچنے میں اس کی مدد کرسکتے تھے۔ وہ فوراً آواز کی سمت چل پڑا لیکن اس کا انداز محتاط تھا اور اس نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے قدموں کی آواز نہ پیدا ہونے پائے۔ ربن کی تربیت نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا اور ان حالات میں بھی اس نے جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ آگے موجود افراد کے سامنے پہنچنے سے پہلے اس بات کا تعین کرلے کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں کیونکہ ممکن تھا کہ مدد کی آس میں وہ ایسے لوگوں سے جا ٹکراتا جو ڈاکو اور لٹیرے ہوتے اور وہ الٹا مشکل میں پڑ جاتا۔

درختوں کی آڑ لیتا ہوا وہ ان کے نزدیک پہنچا تو ایک عورت اور مرد دکھائی دیے۔ مرد صورت سے شریف نہیں لگتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک زخم کا نشان تھا اور چہرے پر سختی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بدرنگ سی پتلون کے ساتھ آدھی آستینوں کی قمیص پہن رکھی تھی اور قمیص کے اوپر بغیر آستین کی چمڑے کی جیکٹ تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کے مقابل کھڑی عورت نے سیاہ پتلون کے ساتھ تنگ سی جرسی پہن رکھی تھی۔ عورت کی پشت ہی نظر آرہی تھی لیکن فاروق کو وہ شناسا لگی اور پھر اس نے اسے پہچان لیا۔

وہ بملا تھی، بملا بھابیہ..... اگر پہلے وہ مرد کے جائزے میں نہ الجھا ہوتا تو پہلے ہی بملا کو پہچان لیتا۔ فوری طور پر اسے نہ پہچان سکنے کی ایک وجہ اس کی یہاں اس غنڈے قسم کے آدمی کے ساتھ موجودگی بھی تھی۔ بملا آخر اس جگہ اس آدمی سے کیوں مل رہی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس نے فاروق کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور اس نے اپنے کان پوری طرح ان کی گفتگو کی طرف مرکوز کردیے۔

''غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے گنیش! میں نے تمہیں جس طرح سمجھایا ہے، کام بالکل ویسے ہی ہونا چاہیے۔'' بملا کا لہجہ سخت اور تحکمانہ تھا۔

''آپ کو پتا ہے میڈم اپن کتنا پرفیکٹ کام کرتا ہے۔ آپ اپن کو اتنا دور بمبئی سے ایسے ہی تو نہیں بلوایا ہے نا؟ آپ کو یاد ہے نا کہ اپن نے آپ کے حکم پر آپ کے پتی کو بھی کتنی صفائی سے ٹھکانے لگایا تھا۔ کسی نے شک نہیں کیا تھا کہ یہ ایکسیڈنٹ کے بجائے مرڈر ہے۔ اگر کسی کو شک ہوا بھی ہو تو آپ کے پتاجی یا کزن منوہر پر ہوا ہوگا۔ آپ کا تو کہیں نام تک نہیں آیا تھا۔'' بے ڈھنگے پن سے ہنس کر فخر سے بولتے گنیش نامی اس غنڈے کے انکشاف نے فاروق کو انگشت بدنداں کردیا۔ بملا کے حالاتِ زندگی اس کے علم میں تھے۔ اسے معلوم تھا کہ بملا نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف محبت کی شادی کی تھی اور اس کا شوہر ایک حادثے میں مرگیا تھا۔ بظاہر یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا لیکن فاروق کو تھوڑا تھوڑا شک ہوا تھا کہ اس حادثے کے پیچھے بھابیہ سینہہ یا اس کے بھتیجے منوہر کا ہاتھ ہوسکتا ہے لیکن یہاں تو بالکل ہی غیر متوقع بات سامنے آئی تھی۔ باپ کی مخالفت مول لے کر بملا نے جس شخص کو اپنایا، خود ہی اس کو قتل بھی کروا ڈالا تھا۔ کیوں.....؟ اس بات کا جواب تو یقیناً اسی کے پاس تھا۔

''بے کار باتیں مت کرو۔ تم نے کام صفائی سے کیا تھا تو تمہیں منہ مانگا پیسا بھی ملا تھا اور یاد رکھو اب کبھی دوبارہ یہ بات تمہاری زبان پر نہیں آنی چاہیے۔'' بملا نے بے حد سختی سے ٹوکا تو وہ صورت سے اچھا خاصا غنڈا نظر آنے والا فوراً بھیگی بلی بن گیا اور گھگیاتے ہوئے بولا۔

''سوری میڈم۔ بھول ہوگئی۔ آئندہ ایسا مسٹیک نہیں ہوئے گا۔''

''اوکے۔ اب تم جاؤ۔ کام کرتے ہی یہاں سے نکل جانا اور ہاں، یاد رکھنا کہ تمہیں بھولے سے بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرنی ہے۔ تم کسی کی نظر میں نہ آؤ اسی لیے

میں نے تمہیں ملاقات کے لیے یہاں بلایا تھا۔'' تحکمانہ لہجے میں بولتی بملا نے اپنے پرس سے ایک خاصا پھولا ہوا لفافہ برآمد کیا اور گنیش کو تھما دیا۔ لفافہ پا کر گنیش کی باچھیں پھیل گئیں۔

''تھینک یو میڈم۔'' جواب میں بملا کچھ نہیں بولی اور ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ گنیش بھی چل پڑا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ دم سادھے کھڑے فاروق کو خیال آیا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا تعاقب کر کے اس جگہ سے نکل سکتا ہے۔ اس نے بملا کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا کہ یقیناً اس کا رخ بھابیہ ہاؤس کی طرف تھا اور خود اس کی اپنی منزل بھی وہی تھی۔ بملا کے تعاقب میں جانے کے لیے اس نے تھوڑا سا توقف کیا تاکہ فاصلہ رہے اور بملا کو اس کی وہاں موجودگی کا علم نہیں ہو سکے۔ آج کے اس اتفاق نے اس پر بہت بڑا انکشاف کیا تھا۔ وہ بملا جسے اس نے ابتدا میں جانا تھا، بالکل پس منظر میں چلی گئی تھی اور اس کی جگہ اس روایتی حاکمانہ مزاج رکھنے والی امیر زادی نے لے لی تھی جو جائز و ناجائز ہر طریقے سے بس اپنی مرضی چاہتی تھی۔ محبوب شوہر کو ٹھکانے لگانے کے بعد اب نہ جانے اسے کیا کام آ پڑا تھا کہ اس نے خاص طور پر بمبئی سے گنیش کو یہاں بلوایا تھا۔ فاروق نے کیونکہ ادھوری گفتگو ہی سنی تھی اس لیے گنیش کے سپرد کیے جانے والے کام کی نوعیت نہیں جان سکا تھا لیکن اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی خطرناک کام ہے جس کو انجام دیتے ہی اس نے گنیش کو شملہ سے نکل جانے کی ہدایت کی ہے۔

الجھن اور تجسس میں مبتلا وہ محتاط انداز میں بملا کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ بہت اعتماد سے آگے چلی جا رہی تھی۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی ہے جو اس کے ایک اہم راز سے واقف ہو چکا ہے۔ راستے پر اٹھتے اس کے پُراعتماد قدم بتا رہے تھے کہ وہ اس جگہ سے پوری طرح واقف ہے۔ واقف کیوں نہ ہوتی۔ شملہ اس کی پسندیدہ ترین جگہ تھی اور اس نے یہاں کا چپا چپا دیکھ رکھا تھا۔ اب بھی وہ بہت آرام سے جنگل نما درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل گئی اور آگے بڑھنے لگی۔ فاروق البتہ وہیں رکا رہا۔ درختوں کی آڑ سے نکل کر کھلے میں جانے کی صورت میں وہ بملا کی نظر میں آ سکتا تھا۔ ویسے بھی اب آگے کا راستہ اس کے لیے دشوار نہیں تھا اور وہ آرام سے بھابیہ ہاؤس تک پہنچ سکتا تھا۔ اصل میں وہ جس جگہ سے نکل رہا تھا، وہ بھابیہ ہاؤس سے زیادہ دور نہیں تھی

لیکن وہ درختوں کی وجہ سے صحیح سمت کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ درختوں کے سلسلے سے نکل کر اسے راستہ سمجھ آنے لگا تھا اور وہ کچھ اور بلندی پر سے نظر آتی بھابیہ ہاؤس کی ترچھی سرخ چھتوں کو دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

''تیرا نام عارف ہے نا؟'' دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والے مناسب قد و قامت کے قبول صورت لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے ربن نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ میں عارف ہوں لیکن آپ کون؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' عارف نے اس کے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''اندر چل کر ذرا تسلی سے بات کر لیتے ہیں پھر اپن اپنی پہچان بھی کروا دیں گے۔'' ربن نے اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں اسے جواب دیا تو عارف اسے انکار نہیں کر سکا اور ذرا سا ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کی جگہ دی۔ وہ ربن کو اپنے ساتھ بیرونی دروازے کے فوراً بعد بنے ہوئے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرا چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ فرش پر سفید چاندنی بچھا کر اس پر مخمل کے غلاف والے گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔ ربن پاؤں میں پہنی سینڈل اتار کر کمرے میں داخل ہوا اور ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''آپ کی خاطر کے لیے کیا پیش کروں...... ٹھنڈا، گرم میں سے کیا پسند کریں گے؟'' ربن کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ عارف اس کے اجنبی ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ ادب اور اخلاق سے پیش آ رہا تھا۔

''کوئی تکلیف نہیں کر رے۔ اپن تیرے پاس دو باتیں کرنے آئے ہیں۔ کر کے واپس چلے جائیں گے۔ اپن تیرا زیادہ ٹیم نہیں لینا چاہتے۔ اپن کو خبر ہے کہ تو چھٹی پر گھر آیا ہوا ہے اور شام میں تیرے کو واپس بھی لوٹنے کا ہے۔ یہ تھوڑا ٹیم ماں بہنوں کے ساتھ ہی گزرے تو اچھا ہے۔'' ربن کے ملائمت سے دیے جواب نے عارف کو ایک بار پھر تیران کر دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک اجنبی کی اپنے بارے میں اس قدر معلومات پر حیران تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بمبئی کے ایک ایسے دادا کے مقابل ہے جس کے آدمیوں نے اس کے ایک اشارے پر عارف کا سارا اتا پتا کھوج نکالا تھا۔

''ادھر بیٹھ جا۔'' ربن نے اس کی حیرانی کو محسوس کر لیا لیکن بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکم دیا تو عارف میکانکی انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''اپن کو ربن دادا کہتے ہیں۔ اپن کو تو جولی کا چاچا سمجھ لے۔ وہ اپنی بیٹی کے ماتق ہے۔ اپن اسی کے حوالے سے تجھے جانتا ہے۔'' آخر ربن نے اس سے اپنا تعارف کروایا جس پر عارف کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اس کی تیوری پر ناگواری کی شکنیں نظر آنے لگیں۔

''جولیٹ سے میری ریلیشن شپ ختم ہو گئی ہے۔ پھر آپ کی یہاں آمد کا مقصد؟'' اس نے کافی رکھائی کے ساتھ دریافت کیا۔

''تیرا اس کا تعلق تو ختم ہونا ہی تھا۔ تو اس ہیرے جیسی لڑکی کے لیول کا آدمی ہی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کو اوپر والے نے بہانہ بنا دیا ورنہ کل کو وہ خود سمجھ لیتی کہ تو اس کا غلط چناؤ تھا۔'' ربن نے لہجے کو ہموار رکھتے ہوئے اس کی بات کا اتنا کڑوا جواب دیا کہ عارف اندر سے تلملا کر رہ گیا اور تلخی سے بولا۔

''پھر آپ میرے پاس کیا لینے آئے ہیں؟''

''اپن کو پتا لگا ہے کہ تو جولیٹ کے ساتھ پڑھا ہے اور تم دونوں نوکری بھی ایک دفتر میں کرتے تھے۔ تو، تو اس کے بارے میں بہت باتیں جانتا ہوگا۔ اپن کو تجھ سے اس کی سہیلی ثنا کے بارے میں پوچھنا تھا۔'' ربن فوراً اپنے مقصد پر آ گیا۔

''ثنا موتی والا...... مگر آپ اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' عارف نے بے ساختہ ثنا کا پورا نام لیا اور حیرت سے پوچھا۔

''جو، جو تو جانتا ہے سب بتا دے۔''

''ثنا موتی والا بڑے خاندان کی لڑکی ہے اور بمبئی میں تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کتنا بڑا کاروباری خاندان ہے۔ ثنا نے امیرزادی ہونے کے باوجود دوستی کے لیے ہمارا گروپ جوائن کیا تھا۔ ایجوکیشن کمپلیٹ ہونے سے پہلے ہی اس کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ پنجاب چلی گئی۔ اس کا شوہر ایک بڑا زمیندار صنعت کار اور سیاست دان ہے۔ کچھ عرصہ پہلے دونوں میاں بیوی یہاں آئے تھے تب جولیٹ نے ثنا کی مدد سے اس کے شوہر کا انٹرویو لیا تھا۔ اتنے عرصے بعد بھی وہ جولیٹ سے بہت اچھی طرح پیش آئی تھی اور جولیٹ کی باقاعدہ دعوت کر ڈالی تھی۔'' عارف نے اس کے سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔ مشکل وقت میں جولیٹ کو چھوڑ دینے پر خود اس کے دل میں بھی ایک چور سا تھا اس لیے اس نے ربن کی تلخ بات پر آنے

والے غصے کو جلد قابو کرلیا تھا۔

''ثنا کے شوہر کا نام کیا ہے؟'' ربن نے پُرسوچ انداز میں سوال کیا۔

''دلدار آغا۔ بڑا مشہور اور جانا پہچانا آدمی ہے۔'' عارف نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا۔

''یہ دلدار آغا کیسا بندہ ہے؟ تجھے اس کے بارے میں کچھ جانکاری ہے؟''

''زیادہ نہیں، پر سنا ہے امیروں والے سارے شوق رکھتا ہے۔ شراب، کباب، شباب سب کا شوقین ہے۔'' عارف کے اس جواب نے ربن کے دماغ میں گھنٹی بجادی۔

''جولیٹ نے تجھے آغا کے بارے میں بھی کوئی بات بولی تھی؟''

''نہیں لیکن وہ اس کے انٹرویو کے بعد کچھ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ آفس میں بھی اس کے لیے کسی کی فون کالز آنے لگی تھیں۔ ان کالز کو سن کر جولیٹ کا موڈ خراب ہو جاتا تھا لیکن میرے پوچھنے پر بھی اس نے کبھی مجھے کوئی صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ بس یہی بولتی تھی کہ اس کے فادر کے کوئی رشتے دار ہیں جن سے ان کا ملنا جلنا نہیں ہے لیکن اب وہ آگے ملنا چاہتے ہیں اس لیے فون کر کے بار بار اس سے اپنے والدین کو راضی کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔'' عارف بے ساختہ بہت کچھ بولتا چلا گیا۔ جولیٹ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ ایک داغی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر سکے لیکن لاشعوری طور پر وہ اس بارے میں سوچتا رہا تھا اور اب ربن نے سوال جواب کیے تھے تو بہت کچھ خود بخود اس کے دماغ میں آتا چلا گیا تھا۔

''کیا جولیٹ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے میں دلدار آغا کا کوئی ہاتھ تھا؟'' عارف پڑھا لکھا نوجوان تھا اور تھا بھی صحافت کے شعبے سے وابستہ چنانچہ ربن کے سوال جواب کے نتیجے میں اس کے ذہن کے دریچے کھل گئے اور کڑی سے کڑی جوڑتا وہ بھی اس نتیجے پر پہنچ گیا جو شاید ربن کے ذہن میں بھی تھا اس لیے سرسراتے لہجے میں ربن سے اپنے خیال کی تائید چاہی۔

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابھی سب کچا پکا ہے۔ اپن سچائی کو خود کھوجے گا لیکن تو اس معاملے کو بھول جا۔ بالکل ویسے ہی جیسے تو جولیٹ کو بھول گیا ہے۔ کسی کے سامنے غلطی سے بھی تیری زبان پر یہ بات نہیں آنی چاہیے۔ کبھی منہ کھلنے لگے تو اس بات کا خیال کر لینا کہ تو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔'' دھیمے دھیمے بولتے ربن کے لہجے میں جو سنگین دھمکی تھی اسے عارف نے پالیا اور اندر ہی اندر جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اپنی بات کہہ کر ربن فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ عارف میں اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ اسے دروازے تک رخصت کرنے جاتا۔ ربن نے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور عارف کے گھر سے نکلنے کے بعد گلی سے بھی سیدھا نکلتا چلا گیا۔ گلی کے کونے پر دوجے اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے عارف کے گھر تک اس لیے ساتھ نہیں لے گیا تھا کہ کہیں دو افراد کو دیکھ کر عارف بدک ہی نہ جائے اور وہ اس سے گفتگو کا موقع حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ دوجے نے اس کا اشارہ پا کر ایک تانگے کو روکا اور دونوں تانگے میں سوار ہو کر مجو دادا والے اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔

اڈے پر رامو گویا ان کا منتظر ہی بیٹھا تھا۔ ربن کو سامنے پا کر وہ کھل اٹھا اور جوش سے بولا۔

''اپن تمہاری ہی راہ دیکھ رہا تھا دادا۔ ادھر اڈے پر بندہ بھجوایا تھا پر پتا چلا تم نہیں نکلے ہوئے ہو لیکن کسی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ اپن بولا شاید ادھر کے لیے ہی نکلے ہو پر راہ دیکھتے دیر ہو گئی تو سوچ رہا تھا کہ اب کدھری پتا کرداؤں۔''

''ایسی بھی کیا آفت آن پڑی جو تو اپنے لیے کنوؤں میں بانس ڈلوانے پر تل گیا تھا۔'' ربن نے بے نیازی سے کہتے ہوئے اپنی گدی سنبھالی۔

''آفت نہیں خوشی کی خبر تھی دادا۔ تمہارا مہمان پہنچ گیا ہے۔'' رامو نے باچھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا تو ربن کے چہرے کے تاثرات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور وہ ماتھے پر بل ڈال کر رامو کی طرف دیکھنے لگا۔

''اسے پورے خیال سے تو رکھا ہے نا؟ اصل کام مہمان کو خیال سے رکھنے کا ہے ابھی جو تو اسے لے آنے پر بتیسی نکال رہا ہے نا، ذرا سی گڑبڑی ہونے پر یہ بتیسی منہ سے ہتھیلی پر بھی آ سکتی ہے۔''

''فکر نہ کرو دادا۔ سب کام ایک دم فٹ ہوا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔'' رامو نے دانت اندر کرتے ہوئے اس کی تسلی کروائی۔

''چل تو پھر مل لیتے ہیں اس سے۔ مہمان کو جاستی انتظار کروانا اچھا نہیں ہے۔'' ربن نے کہا تو رامو فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار سفر کے لیے ٹیکسی کا انتخاب کیا گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے سفر خاموشی میں کٹا۔

''اب کدھر صاحب؟'' ٹیکسی ان کے مطلوبہ ٹھانے تک

میں پہنچ گئی تو ڈرائیور نے پیچھے پلٹ کر پوچھا۔

"ادھر مندر کے پاس روک دے۔" رامو نے اشارے سے اسے بتایا تو ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اس کے بتائے ہوئے مندر کے سامنے لے جا کر روک دی۔ اسے کرایہ وغیرہ دے کر فارغ کرنے کے بعد وہ دونوں پیدل ہی ایک سمت چل پڑے۔ یہ پتلی اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں والا بمبئی کا ایک قدیم علاقہ تھا جہاں راستوں پر جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ننگ دھڑنگ بچے بے فکری سے کھیلتے پھر رہے تھے۔ کئی گھروں کے دروازوں کے آگے بنے چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر ست الوجود اور صورت سے نشئی دکھائی دینے والے مرد پیر پسارے بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان مردوں کی موجودگی سے قطعی بے نیاز عورتیں گلی میں آ جا رہی تھیں۔ عورتوں کے لباس پھٹے پرانے اور میلے تھے۔ مجموعی طور پر وہ علاقہ غربت اور جہالت کی منہ بولتی تصویر نظر آ رہا تھا۔ ربن اور رامو کے لیے ان میں سے کوئی چیز نئی نہیں تھی۔ وہ اس محلے سے اچھی طرح واقف تھے اور گندی متعفن پیچ در پیچ گلیوں میں سے بڑے آرام سے گزرتے جا رہے تھے۔ اندرونی گلیوں میں سے ایک گلی میں بنے مکان کے سامنے پہنچ کر رامو نے لوہے کی کنڈی کی مدد سے دروازہ بجایا۔ فوراً ہی ردعمل ظاہر ہوا اور ایک خاصا بوڑھا آدمی دروازے پر نمودار ہوا۔

"سلام دادا۔" ربن کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ ماتھے پر پہنچ گیا۔

"کیسا ہے رے اچھو! کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟" ربن نے اس سے پوچھا۔

"اوپر والے کے بعد تمہاری ہی مہربانی ہے کہ اچھو کا بڑھاپا چین سے گزر رہا ہے۔" بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ بوڑھا ربن کو چند سال قبل بہت خستہ حالت میں ملا تھا۔ وہ بیمار بھی تھا اور کئی وقت کا بھوکا بھی۔ اس لاوارث بوڑھے کو ربن نے اس مکان میں لا بٹھایا اور ایک لڑکے کو بھی اس کے پاس چھوڑ دیا۔ لڑکا سارے کام انجام دینے کے ساتھ اچھو کا خیال بھی رکھتا تھا۔

"وہ نمکا کدھری ہے جو تمہیں دروازہ کھولنے آنا پڑا۔" رامو کے ساتھ اندر داخل ہو جانے والے ربن نے اس لڑکے کے بارے میں دریافت کیا۔

"بازار سے سودا لینے گیا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔" اچھو نے بتایا تو ربن سر ہلاتے ہوئے اس خلا تک پہنچ گیا تھا جو رامو نے فرش پر بچھی دری اٹھا کر لکڑی کا تختہ ہٹانے کے بعد دریافت کیا تھا۔ اس خلا سے ایک سیڑھی نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ ربن نے اس سیڑھی پر قدم جمائے اور نیچے اترنے لگا۔ رامو نے بھی اس کی تقلید کی۔ یہ خفیہ تہ خانہ پہلے ہی سے اس مکان میں بنا ہوا تھا۔ ربن نے اس تہ خانے کی وجہ سے ہی یہ مکان لیا تھا۔ خفیہ کاموں کے لیے اڈے سے ہٹ کر ایک محفوظ ٹھکانا بنانے کے لیے اسے یہ مکان بہت مناسب لگا تھا۔ اس ٹھکانے کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ لوگ زیادہ اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ہر ایک کو اس کے بارے میں علم تھا۔ آس پاس رہنے والوں کو بس اتنا ہی علم تھا کہ کسی سخی دل آدمی نے بوڑھے اچھو کو رہائش کے لیے یہ مکان دے رکھا ہے اور اچھو کے سارے اخراجات بھی وہی پورے کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہاں آنے والوں کو اچھو کی خبرگیری کے لیے آنے والے سمجھا جاتا تھا۔ اچھو خود بھی سب کو یہی تاثر دیتا تھا۔

ربن اور رامو تہ خانے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچے تو ربن کی نظر سب سے پہلے چھت سے الٹے لٹکے آدمی پر پڑی۔ اس آدمی کے جسم پر صرف ایک جانگیا موجود تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اس حالت میں لٹکا ہوا تھا کہ جسم کا سارا خون سمٹ کر نیچے کی طرف آ جانے سے اس کا چہرہ بے پناہ سرخ ہو رہا تھا اور چہرے کی اصل رنگت پتا نہیں چل رہی تھی۔ اس آدمی کو اس حالت میں لٹکے دیکھ کر ربن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں ٹھنڈ پڑتی جا رہی ہے اور وہ ایک آگ جو وہ بہت دنوں سے خاموشی سے اپنے اندر لیے پھر رہا تھا اس کو بجھانے کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس نے لٹکے ہوئے آدمی کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ تھپڑ کھا کر وہ شخص غنودگی سے نکلا اور آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اچھی طرح دیکھ لے مجھے اور پہچان لے کہ میں موت کا فرشتہ ہوں، وہ بھی ایسا جو جان نکالنے کے بعد نہیں بلکہ جان نکالنے سے پہلے ہی تجھ سے سارا حساب کتاب لے گا۔ تو حساب دینے کے لیے تیار ہو جا۔" اس کا لہجہ ایسا سنگین تھا کہ چھت سے لٹکا ہوا آدمی تو کیا، اس کے ساتھ آیا رامو بھی کانپ اٹھا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ایڈ روڈ اور میری کی دوستی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی اس کے زیادہ عرصے تک چلنے کا امکان تھا کیونکہ دونوں ہی اسپتال میں لیٹے اپنی اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے لیکن یہ بات شاید انہیں معلوم نہ تھی۔ ایڈ روڈ حقیقت کی دنیا میں رہنے والا شخص تھا اور خوش گمانی اس کی فطرت میں شامل نہ تھی۔ اسے ڈاکٹروں اور نرسوں کی سرگوشیوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک یا دو ہفتوں کا مہمان ہے۔ مسکن دواؤں کی بدولت اس کی تکلیف میں تو کمی واقع ہو گئی تھی لیکن بستر پر لیٹنا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا اور ویسے بھی وہ کافی باتونی اور ملنسار واقع ہوا تھا اس لیے اس کی بوریت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ ایسے میں میری کی رفاقت اسے غنیمت لگی۔ وہ کینسر کی ایک ایسی قسم میں مبتلا تھی جو کسی کسی شخص کو لاحق ہوتی ہے اور جس پر اب بھی تحقیق ہو رہی ہے۔ وہ ایک ہفتے کی نگہداشت کے لیے اسپتال آئی تھی اور نہ جانے ایڈ روڈ میں اسے کیا کشش محسوس ہوئی کہ ہر روز شام کو اپنی وہیل چیئر گھسیٹتی ہوئی اس کے بستر کے پاس چلی آتی۔

دام

تنویر ریاض

بسترِ مرگ پر لیٹے اس مریض کی نگاہ بہت گہری تھی اور جسے ہر چہرے پر لکھی کہانی پڑھنے کا ہنر آتا تھا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے ایک دن خود بھی کسی داستان کا حصہ بن جائے گا۔

دوسروں کا غم ہلکا کرنے والے ایک بیمار کی جاندار ہوشیاری



اس شام بھی وہ اس سے ملنے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ وہ اسے لہراتے ہوئے بولی۔ ''اس تصویر کو غور سے دیکھو..... ان میں سے ایک قاتل ہے۔''

ایڈرووڈ نے اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر پر ایک نظر ڈالی جس میں تین افراد ہاتھوں میں گلاس تھامے مسکرا رہے تھے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟''

''میں تمہیں ایک اشارہ دیتی ہوں۔ ان میں سے ایک میرا بھائی ہے اور وہ قاتل نہیں ہے۔''

''میں اس تصویر کو غور سے دیکھتا ہوں۔'' ایڈروڈ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی وہیل چیئر کو اس کے قریب لے آئی اور جھکتے ہوئے تصویر اس کے آگے بڑھا دی۔ اس کے لباس سے پرفیوم کی مہک آ رہی تھی اور اسے دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کینسر کی مریضہ ہے۔ وہ بہت ہی دلچسپ اور زندگی سے بھرپور عورت تھی اور اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کینیڈا میں گزارا تھا۔

''درمیان میں تو تمہارا بھائی ہے۔'' ایڈورڈ نے میری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک کورٹ آرٹسٹ تھا اور چہروں کو پہچاننے میں اسے کمال حاصل تھا۔ دونوں بہن بھائیوں کی ناک ایک جیسی تھی۔ ''بقیہ دو کون ہیں؟''

''ان میں سے ایک کو ہم ڈاکٹر ایکس اور دوسرے کو ڈاکٹر وائی کہہ سکتے ہیں۔''

ایڈورڈ نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا۔ ڈاکٹر وائی لمبا اور سانولے رنگ کا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے باوجود سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جبراً مسکرا رہا ہو جبکہ ڈاکٹر ایکس کا قد چھوٹا اور رنگ صاف تھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے۔

''کیا تم جانتی ہو کہ انہوں نے کسے قتل کیا تھا؟'' ایڈورڈ نے پوچھا۔

''ہاں۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ شاید اس واقعے کو پچیس یا تیس سال ہو گئے ہوں گے۔ ایک سرجن کو آپریشن تھیٹر میں کام کرنے والی نرس سے عشق ہو گیا تھا، جب اس کا نتیجہ سامنے آنے والا تھا تو اس ڈاکٹر نے اپنی شادی اور ساکھ کو بچانے کے لیے اس نرس کو مار ڈالا۔ اس کے ساتھیوں کو یہ بات معلوم تھی لیکن وہ بھی اس سازش میں شریک ہو گئے اور مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح اس نرس کی موت کا معما کبھی حل نہ ہو سکا۔''

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟''

''یہ بات میرے بھائی نے بتائی تھی۔ وہ بھی ان ڈاکٹروں میں سے ایک تھا جنہوں نے اپنے ساتھی کا جرم چھپالیا۔ دو ماہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا اور مرنے سے پہلے اس نے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ راز فاش کر دیا لیکن یہ پھر بھی نہیں بتایا کہ ان دونوں میں سے اصل قاتل کون ہے۔ جب لوگوں کو اپنی موت قریب نظر آنے لگتی ہے تو وہ سچ بولنے لگتے ہیں، فریڈ نے بھی ایسا ہی کیا لیکن اس کا آدھا سچ کس کام کا؟ اگر وہ قاتل کا نام بتا دیتا تو اس تک پہنچنے میں آسانی رہتی۔''

ایڈورڈ سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ زندگی کے آخری ایام میں انسان پر کیا گزر رہی ہوتی ہے تاہم اسے یہ اطمینان تھا کہ اس نے تمام ذمے داریاں بخوبی ادا کر دی تھیں اور اب اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ ''ممکن ہے یہ دونوں زندہ ہی نہ ہوں۔ اس لیے اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔''

''میں نہیں جانتی کہ فریڈ کو اس بارے میں معلومات تھیں یا نہیں۔ اس نے جو کہا وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان میں سے ایک اس نرس کا قاتل ہے۔''

''کیا اس نے بتایا تھا کہ یہ قتل کیسے ہوا؟''

''وہ اپنے بستر پر مردہ پائی گئی تھی جبکہ وہ ایک صحت مند عورت تھی اور تمام زندگی میں ایک دن بھی بیمار نہیں پڑی۔ اس لیے اس کی موت کے بارے میں کوئی بات واضح طور پر نہیں کی گئی۔ اسپتال کی ڈسپنسری میں ایسی کئی دوائیں ہوتی ہیں جن کے غلط استعمال سے کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ ویسے بھی اس زمانے میں دواؤں کے استعمال کا ریکارڈ رکھنے پر کوئی سختی نہیں تھی۔''

ایڈورڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ہاں، آج کل تو اس کا پتا چلانا بہت آسان ہو گیا ہے۔''

''اگر پولیس اس کیس کو ری اوپن کرے تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔'' میری پُرامید لہجے میں بولی۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ دروازے پر ایک موٹا سا میل نرس کھڑا تھا جسے ایڈورڈ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے انجکشن کا وقت ہو گیا ہے۔''

میری نے اپنی وہیل چیئر گھمائی اور جانے لگی۔

''یہ تصویر تو لیتی جاؤ۔'' ایڈورڈ نے کہا۔

''یہ میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ ان میں سے قاتل کون ہے، کیونکہ تم یہ کام کرتے رہے ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کیس میں تمہاری مہارت کیا رنگ دکھاتی ہے۔''

وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے تکیے سے ٹیک لگالی۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک کسی نے میری کو قتل کیوں نہیں کیا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا کیونکہ ایڈورڈ کو راہداری میں لوگوں کی آمدورفت دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ اس کی نظریں وال کلاک پر جم گئیں۔ ابھی صرف نو بجے تھے۔ اس کی بیٹی کا فون آنے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ اس نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ تینوں تقریباً ہم عمر تھے اور ان کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ کپڑوں اور شخصیت سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں سے کون قاتل ہوسکتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر ڈالی نے شادی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جسے صرف محدب عدسے کی مدد سے دیکھا جاسکتا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گیا۔ ایک گھنٹا گزرنے کا پتا ہی نہ چلا تھا۔

☆☆☆

جینیفر نے سر اٹھایا۔ اس کے کان رات کی خاموشی میں چھوٹی سے چھوٹی غیر معمولی آواز بھی سن سکتے تھے۔ وہ کبھی بھی گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوئی اور رات کی ڈیوٹی کرنے کی عادی تھی لیکن اس آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے اپنے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور راہداری میں چلی آئی جو خالی پڑی تھی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے گزرا ہے۔ اس نے ایک بار پھر کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔ اس وقت وہ کچھ دیر کے لیے ایڈورڈ کے پاس جاکر بیٹھتی تھی کیونکہ تکلیف کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا تھا اور جینیفر سے باتیں کرکے اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اس کے لیے چائے بنا کر لائی اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ گوکہ یہ اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ ایک نرس ہونے کے ناتے مریض کی دیکھ بھال اس کا فرض ہے۔ ''بچے کے بارے میں کوئی خبر؟'' اس نے ایڈورڈ کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ایڈورڈ کی اکلوتی بیٹی لورا نیوزی لینڈ میں تھی جہاں اس کی اپنی بیٹی میلانی کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ لورا اس موقع پر باپ کے پاس رہنا چاہ رہی تھی لیکن کیس پیچیدہ ہوجانے کے سبب اسے بحالتِ مجبوری بیٹی کے پاس جانا پڑ گیا لیکن وہ ہر رات دس بجے فون کرکے باپ کی خیریت ضرور معلوم کرتی تھی۔

''لورا کا فون آیا تھا۔'' ایڈورڈ نے جواب دیا۔ ''وہ بے وقوف لڑکی میرے پاس آنے کے لیے بے چین ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ میلانی کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ میری تو بس اتنی خواہش ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے پرنانا بن جاؤں۔''

''میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ تم اس کے بعد بھی کافی عرصہ زندہ رہوگے۔''

ایڈورڈ نہیں جانتا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو دیکھ بھی سکے گا یا نہیں لیکن جینیفر اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اپنی بیٹی کا کتنی شدت سے انتظار ہے لیکن دونوں میں سے کسی کی زبان پر یہ بات نہیں آئی۔ ایڈورڈ اپنے دلی جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے ملاقاتیوں کی کوئی کمی نہیں۔ کوئی نہ کوئی ملنے کے لیے آتا ہی رہتا ہے۔''

''مجھے اسٹاف سے معلوم ہوا ہے کہ آج کل میری کے ساتھ تمہاری خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔''

''میں اتنا بدذوق بھی نہیں کہ کسی خوب صورت عورت کو نہ دیکھ سکوں۔ اس سے پہلے کیتھرائن میری نظروں میں سمائی ہوئی تھی۔''

کیتھرائن اسپتال کی راہبہ تھی جو ہفتے میں چار مرتبہ آیا کرتی تھی۔ اس کا تعلق چرچ آف انگلینڈ سے تھا۔

''میں سمجھتی تھی کہ تم جیسا باتونی بھی کسی راہبہ کو متاثر نہیں کرسکتا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''مجھے ہر کسی سے باتیں کرکے خوشی ہوتی ہے۔ ویسے بھی ہم دونوں کے درمیان کبھی مذہب کے بارے میں گفتگو نہیں ہوئی۔ ہمیں جرائم کی کہانیوں سے لگاؤ ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ان کہانیوں کا نیا مجموعہ لاکر دے گی۔''

وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر جینیفر نے محسوس کیا کہ ایڈورڈ کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔ اس نے تکیے سیدھے کیے اور ہنگامی گھنٹی اس کے قریب رکھ دی اور لائٹ بجھا کر واپس چلی گئی۔ اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے وہ مریضوں کے کمروں میں جھانکتی جارہی تھی۔ میری کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے محسوس کیا

کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ واپس مڑی اور اس کے کمرے میں چلی گئی۔ میری کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ اس نے نبض ٹٹولی۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ گزشتہ دو گھنٹوں کے دوران کسی بھی وقت میری خاموشی سے رخصت ہو گئی تھی۔ جینیفر نے اس کی آنکھیں بند کیں اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کرنے لگی۔

ایڈورڈ کو اس کی موت کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے جینیفر سے کہا۔ ''کیا تمہیں امید تھی کہ وہ اتنی جلدی مر جائے گی جبکہ میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا نہیں سوچتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کافی عرصے تک زندہ رہے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی کسی ٹائم ٹیبل کے تحت ایسا ہوتا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ وہ زندگی سے بھرپور عورت تھی۔''

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور ایسا کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔''

''جانتا ہوں، ہسپتال میں کسی کی موت واقع ہو جانا کوئی بڑی خبر نہیں لیکن......''

جینیفر نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا اور بولی۔ ''ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ وہ کسی تکلیف اور شور شرابے کے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔''

ایڈورڈ نتھنے پھلاتے ہوئے بولا۔ ''شاید نہیں کیونکہ یہ اس کا اسٹائل نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس نے کبھی کوئی آسان طریقہ اپنایا ہوگا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''شاید اس کے گھر والوں کو بھی یہ امید نہ ہو گی۔'' جینیفر اعتراف کرتے ہوئے بولی۔ ''میلی سے مجھے یاد آیا کہ اس کی بھتیجی کسی بیگ کا تذکرہ کر رہی تھی جس میں اس کی خاندانی تصویریں تھیں۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن وہ بیگ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ کہیں وہ تمہارے پاس تو نہیں چھوڑ گئی؟''

''پورا بیگ تو نہیں البتہ وہ یہ تصویر ضرور میرے پاس چھوڑ گئی تھی۔'' ایڈورڈ نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز سے ایک تصویر نکالتے ہوئے کہا۔

جینیفر آگے کی طرف جھکی اور تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو ڈاکٹرز لگ رہے ہیں؟''

ایڈورڈ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''تم انہیں پہچانتی ہو؟''

''نہیں...... لیکن یہ بتا سکتی ہوں کہ یہ تصویر کس موقع پر لی گئی ہو گی۔ یہ ان کی پریکٹس کا پہلا دن ہے۔ غور سے دیکھو تو تمہیں ان کے ناموں کی پلیٹ بھی نظر آجائے گی۔''

ایڈورڈ نے سوچا کہ واقعی اس نے اس جانب دھیان نہیں دیا کیونکہ اس کی زیادہ توجہ چہروں پر تھی۔ اس نے غور سے نام پڑھنے کی کوشش کی لیکن حروف غیر واضح تھے اس لیے کامیاب نہ ہو سکا۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' جینیفر نے پوچھا۔

ایڈورڈ تھوڑا سا ہچکچایا لیکن اس نے بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ میری کی زبانی اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ اس نے جینیفر کو بتا دیا۔

''کیا تم نے وہ لطیفہ سنا ہے کہ ایک آدمی مرنے کے بعد جنت میں گیا تو اس نے ایک شخص کو سفید کوٹ پہنے گھومتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ خدا ہے جبکہ وہ اسے ڈاکٹر سمجھ رہا تھا۔ اسی طرح پرانے زمانے کے ڈاکٹر بھی اپنے آپ کو خدا سمجھتے تھے۔''

''آج بھی کچھ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔'' ایڈورڈ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''گویا تم یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہو کہ ایسا ہو سکتا ہے؟''

''ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے لیکن جب تک زبان سے کچھ نہ کہا جائے لوگ یہی ظاہر کرتے رہیں گے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔''

''اور کچھ دنوں بعد سب سمجھ جائیں گے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ اگر کوئی ثبوت ہوتا تو پولیس اس پر ضرور غور کرتی لیکن قاتل کو یہ معلوم نہیں کہ جرم کبھی نہیں چھپ سکتا۔ فن لینڈ میں جو قتل ہوئے، ان کا مقدمہ چالیس سال بعد چلا۔ میری کے پاس یقیناً کوئی راز تھا جس کی وجہ سے قاتل نے اسے خاموش کر دیا۔''

''تم ایک بات بھول رہے ہو۔'' جینیفر بولی۔ ''اگر کوئی میری کو قتل کرنا چاہتا تھا تو وہ اسپتال میں کس طرح داخل ہوا؟ تمام ملاقاتیوں کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور یہ کوئی بہت بڑا اسپتال نہیں ہے جہاں ملاقات کے دوران میں لوگوں کا جم غفیر جمع ہو جائے۔ میں یہاں کام کرنے والے سبھی لوگوں کو جانتی ہوں کہ کوئی ڈاکٹر کا بھیس بدل کر اندر آجائے۔''

''انہیں ڈاکٹر کا بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ خود ڈاکٹر ہو سکتے ہیں۔ میں نے اپنے دوست سے رنگین پنسلیں منگوائی ہیں تاکہ اپنا کام مکمل کر سکوں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اسکیچ بک نکالی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس تصویر

میں موجود تینوں افراد کی موجودہ عمر کے حساب سے خاکے بنانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر وائی کے بال پہلے ہی بہت باریک تھے جس کا اندازہ اس تصویر سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے میرے تصور کے مطابق اسے سامنے سے گنجا ہونا چاہیے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی پتلا ہوگیا ہوگا۔"

جینیفر بڑے غور سے اس کے بنائے ہوئے خاکوں کو دیکھ رہی تھی پھر ایڈورڈ نے ڈاکٹر ایکس کے خاکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا وزن تیزی سے بڑھتا ہے۔ اس کی وجہ صرف جسمانی ساخت نہیں بلکہ اس طرح کے لوگ کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ اس کے بال تھوڑے بہت جھڑ گئے ہوں گے اور ان میں سفیدی بھی جھلک رہی ہوگی۔ اس مضبوط ناک کی وجہ سے اس کا چہرہ خاصا امتیازی ہوگیا ہے۔"

"اب یہ لوگ کتنی عمر کے ہوں گے؟" جینیفر نے پوچھا۔

"میرے حساب سے یہ ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گے۔"

"ان میں سے کوئی بھی ہمارے اسٹاف میں نہیں ہے۔" وہ اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے کہ تمہیں اس کا یقین نہیں ہے؟"

"میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

قریبی کمرے سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی تو وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ تصویر اور خاکے لیتی جاؤ۔ شاید تم کسی نتیجے پر پہنچ سکو۔"

وہ تھوڑا سا ہچکچائی اور پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ دونوں چیزیں لے لیں۔ وہاں سے جانے کے بعد جینیفر کی مصروفیت میں اور اضافہ ہوگیا۔ مسز اوشیا کی حالت اچانک ہی بگڑ گئی تھی۔ اس اسپتال میں وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی لہٰذا رات بھر اس کے رشتے داروں کا آنا جانا لگا رہا۔ ایک کے بجائے دو پادری آگئے تاکہ اس کے لیے دعا کرسکیں لیکن جینیفر کی ڈیوٹی ختم ہونے تک وہ موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرایا اور ان کے جانے کے بعد خود بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کے ذہن میں ایڈورڈ کی باتیں گونج رہی تھیں۔ نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ میری کو قتل کیا گیا ہے۔ ایڈورڈ کو جاسوسی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا اس لیے وہ ان خطوط پر سوچ رہا تھا۔ ویسے بھی جن مریضوں کو مارفین کی زیادہ خوراک دی جائے ان کے دماغ میں ایسے ہی عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔

اس نے اپنا بیگ ٹٹولا اور ایڈورڈ کے بنائے ہوئے خاکے نکال کر دیکھنے لگی۔ انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ اسے ان تصویروں کا خیال آیا جو میری کی بھتیجی کے مطابق اسپتال سے گم ہوگئی تھیں پھر اس کی نگاہوں کے سامنے ڈیوٹی ڈاکٹر کا چہرہ گھوم گیا جو میری کو مردہ حالت میں دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔ اسے میری کے مرجانے کی بالکل بھی امید نہیں تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ اس نے اپنی مرضی سے موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کردیے تھے۔ اس کے لیے بھی مشکل تھا کہ وہ اسپتال میں ہونے والے کسی قتل کے بارے میں سوچ سکتا۔ ویسے بھی جس مریض کو دن میں کئی انجکشن لگتے ہوں، وہاں ایک اور انجکشن کا نشان کسے نظر آسکتا تھا۔

اچانک اس کی نظر دیوار گیر گھڑی پر گئی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا اور بچوں کو لینے کے لیے روانہ ہوگئی۔ واپس آنے کے بعد وہ رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کا ہوم ورک کرواتی اور ان کی باتیں بھی سنتی رہی۔ میٹ کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ کسی اسپتال میں کمپیوٹر پر کام کرتا تھا اور اس کی ڈیوٹی نو سے پانچ ہوا کرتی تھی۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے ساڑھے آٹھ بج ایک۔ اس نے بچوں کو بستر پر لٹایا اور خود میٹ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے یہی وقت ہوتا تھا۔ اس نے میٹ کو سارا قصہ سنایا اور ایڈورڈ کے بارے میں بتاتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو یہ سب کچھ ایک پاگل پن لگتا ہے۔"

"ان لوگوں کی شناخت ہوجائے تو یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔" میٹ تصویر پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"میں اس تصویر کو اسکین کرکے بڑا کردوں گا تاکہ نام پڑھے جاسکیں۔ کیا تم میری کے بھائی کا نام جانتی ہو؟"

"میری کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے نام کے ساتھ جانسن لگایا کرتی تھی۔ یقیناً اس کے بھائی کے نام میں بھی جانسن آتا ہوگا۔"

"ہم آن لائن ریکارڈ اور گوگل کے ذریعے بہت کچھ معلوم کرسکتے ہیں۔ لاؤ یہ تصویر مجھے دے دو۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" جینیفر منہ بناتے ہوئے بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر میں ان کے بارے میں

جاننے میں کامیاب ہو گیا اور اگر یہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں تو کم از کم تم اس بوڑھے کا شک تو دور کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔"

☆☆☆

ایڈورڈ کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ کیتھرائن اس کے لیے جاسوسی کہانیوں کا نیا شمارہ لے آئی تھی لیکن وہ بھی اس کی توجہ بٹانے میں ناکام رہیں۔ وہ ہر ایک منٹ بعد گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لورا ہر رات دس بجے اسے فون کیا کرتی تھی لیکن اب گیارہ بج چکے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو اور زچگی کا مرحلہ بخیر و خوبی گزر جائے۔ جینیفر نے دروازے سے جھانکا اور بولی کہ وہ ایک بجے کے قریب اس کے پاس آنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ وہ جانتا تھا کہ جینیفر جھوٹا وعدہ نہیں کرتی لیکن ایک بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔

فون کی گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور لورا کی آواز سن کر جان گیا کہ سب خیریت ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ڈیڈی! سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں اتنی مصروف رہی کہ وقت پر فون نہ کر سکی۔"

"میری فکر چھوڑو یہ بتاؤ کہ بچہ کیسا ہے؟"

"بچی بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے اس کا نام ایلس رکھا ہے اور میلانی بھی خیریت سے ہے۔ وہ کل آپ سے بات کرے گی۔ میں نے ابھی ایئرلائن کو فون کیا تھا۔ مجھے تین گھنٹے بعد جانے والی پرواز میں نشست مل گئی ہے۔"

"اتنی جلدی کیوں جارہی ہو؟" ایڈورڈ نے پوچھا۔

"اب میری یہاں ضرورت نہیں رہی۔ جان مجھے لینے ائیرپورٹ پر آجائے گا۔ میں پرسوں تک آپ کے پاس آسکوں گی۔"

خوشی کی خبر سن کر اس کے چہرے پر رونق آگئی اور اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس کے آنے کا سن کر ایڈورڈ کے دل میں اسے دیکھنے کی آرزو جاگ اٹھی۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب اس نے لورا کو پیدائش کے فوراً بعد اپنے بازوؤں میں لیا تھا اور یہ احساس کتنا خوشگوار تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اسے ایک بار دیکھ سکے گا۔

☆☆☆

جینیفر کی میز پر کاغذوں کا انبار جمع ہو گیا تھا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے وہ انہیں نہیں دیکھ پارہی تھی۔ کاش اسے کوئی ایسا دن مل جائے جب وہ اپنی میز صاف کر سکے۔ اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا اسے چائے پینے اور ایڈورڈ سے باتیں کرنے کے لیے مزید چالیس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ اس نے اپنا سر جھکالیا اور دوبارہ کاغذوں میں کھو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمپیوٹر پر اسے ہلکی سی آواز سنائی دی جو کسی ای میل کی آمد کا پتا دے رہی تھی لیکن وہ اپنے کام میں اتنی محو تھی کہ اس نے اس آواز کو نظرانداز کر دیا۔ دس منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت بھی وہ ایک کاغذ کو بغور پڑھ رہی تھی۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا اور میٹ کی آواز سنتے ہی گھبرا گئی۔ کہیں بچوں کو کچھ نہ ہو گیا ہو لیکن جب میٹ نے اسے بتایا کہ بچے خیریت سے ہیں تو اس نے سکون کا سانس لیا اور بولی۔

"تم اب تک کیا کر رہے ہو؟"

"میں کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہا تھا۔ کیا تم نے میری ای میل نہیں دیکھی؟ میں نے اس تصویر میں موجود دونوں آدمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ان میں سے ایک چارلس ہیلدمائن ہے۔ وہ ساؤتھمپٹن اسپتال میں تھا اور اس نے ایک شاندار کیریئر گزارا لیکن تمہیں اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ گزشتہ برس فوت ہو چکا ہے۔ دوسرا رابرٹ کلیور ہے جو آسٹریلیا چلا گیا تھا لیکن دس سال پہلے واپس آ گیا۔ وہ کینسر کے امراض کا ماہر ہے اور لندن کے ایک ٹیچنگ اسپتال سے وابستہ ہے۔"

جینیفر کو یوں لگا جیسے اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی گزرا ہے۔ اس نے کالے سوٹ کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ کوریڈور کی طرف جارہا تھا۔ جینیفر نے میٹ کی ای میل کھولی اور اسے دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک بول رہا تھا۔

"اسپتال کی ویب سائٹ پر اس کی تصویر موجود ہے اگر دیکھنا چاہو تو مطلوبہ لنک پر کلک کرو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر جو چہرہ ابھرا، اسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ ایڈورڈ نے کتنا مکمل اسکیچ بنایا تھا بس ایک کسر باقی رہ گئی تھی۔

اس کی چھٹی حس بتارہی تھی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کوریڈور کے سرے پر پہنچ کر قدموں کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ اس وقت کون ملاقاتی آسکتا ہے؟ مسز اوشیا تو گزشتہ شب انتقال کر گئی تھی اور اس کی لاش اسپتال کے مردہ خانے میں رکھ دی گئی تھی۔ جینیفر نے فون رکھ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایڈورڈ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن

وہ جاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے جینیفر کا انتظار تھا تاکہ پوچھ سکے کہ میلانی اور اس کی نومولود بچی کی تصویروں کے ساتھ کوئی ای میل آئی ہے۔ کاش وہ یہ خوش خبری میری کو بھی سنا سکتا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ ابھی تک اسے یاد کر رہا تھا۔ اس نے جو کہانی سنائی تھی، اس کا کوئی نہ کوئی تعلق اس کی موت سے بنتا تھا۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس کی موت طبعی تھی۔

جب پادریوں جیسا لباس پہنے وہ شخص دروازے پر نمودار ہوا تو ایڈورڈ یہی سمجھا کہ وہ غلطی سے اس کے کمرے میں آگیا ہے۔ جب وہ شخص اس کے قریب آیا تو اس کا دوسرا خیال یہ تھا کہ اس نے جو خاکہ بنایا تھا، اس شخص کی شکل اس سے کتنی ملتی ہے۔ ہاں اسے خاکہ بناتے وقت ڈاڑھی کا خیال نہیں آیا تھا۔ تیسری بات اس کے ذہن میں یہ آئی کہ شاید وہ اب کبھی لورا کو نہ دیکھ سکے لہٰذا اس کا ہاتھ بے اختیار سرہانے رکھی ہوئی گھنٹی تک پہنچ گیا۔ جینیفر گھنٹی کی آواز سنتے ہی تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے کمرے تک آئی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ کوئی شخص ایڈورڈ کے بستر کے قریب کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک سرنج ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے بازو پھیلائے اور پیچھے سے جا کر اسے دبوچ لیا۔ اس شخص نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن جینیفر برسوں سے اپنے گھر پر مردوں والے کام کرتی آرہی تھی اور اسپتال میں بھی اسے مریضوں کو اٹھانے کی بڑی پریکٹس تھی جس کی وجہ سے اس کے بازو کافی سخت ہوگئے تھے۔ لہٰذا اس شخص کو اس کی گرفت سے نکلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے ہاتھ سے سرنج چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ عین اسی وقت اسپتال کا سب سے تنومند اسٹاف پال دروازے پر نمودار ہوا اور اس نے اس شخص کو قابو کر لیا۔

''حیرت ہے کہ ایک اجنبی شخص سیاہ لباس پہنے کتنی آزادی سے اسپتال میں چلا آیا اور کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔'' ایڈورڈ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جینیفر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس لباس میں وہ کسی بھی اسپتال میں جا سکتا تھا۔ سب اسے پادری ہی سمجھتے اور کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔''

اگلے روز جینیفر اپنی ڈیوٹی ختم کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر ایڈورڈ کے پاس گئی۔ وہ جو کچھ دیکھ چکی تھی اس پر اسے یقین نہیں آرہا تھا اور وہ ایڈورڈ سے اس بارے میں مزید گفتگو کرنا چاہ رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ اس مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لیے شاید زندہ نہ رہوں۔'' اس نے بہ مشکل تمام اپنے سر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جو کچھ ہوا، وہ بالکل واضح ہے۔''

''وہ اس لحاظ سے بدقسمت رہا کہ میری کو بھی اسی قسم کا غیر معمولی کینسر تھا جس میں اس نے اسپیشلائزیشن کر رکھا ہے اور وہ اس کے پاس مشورے کے لیے جاتی رہتی تھی۔''

''جانسن تو ایک عام سا نام ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ میری کو اپنے دوست کی بہن کی حیثیت سے پہچان گیا ہو۔''

''لیکن میری سے یہ غلطی ہوگئی تھی۔ وہ اس شخص کی اصلیت نہ پہچان سکی اور اس کی باتوں سے وہ یقیناً یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوگا کہ اسے نرس کے قتل والی بات معلوم ہوگئی ہے۔''

''اور اسے یہ شک بھی ہوگیا ہوگا کہ میری نے یہ بات اسپتال میں کسی دوسرے شخص کو بھی بتادی ہے۔''

جینیفر کا اشارہ واضح طور پر ایڈورڈ کی جانب تھا۔ ایڈورڈ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ اس قاتل کی گرفتاری سے اسے ایک نئی زندگی ملی ہے لیکن جینیفر اس بارے میں کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھی۔ اس کی بیماری بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اسے اٹھنے بیٹھنے میں بھی بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شام کو ڈیوٹی پر واپس آنے کے بعد وہ اسے زندہ دیکھ سکے گی؟ اس کی خواہش تھی کہ آخری وقت میں وہ شاید ہی اس کے پاس ہو۔ اس کے علاوہ، وہ لورا سے بھی ملنا چاہتی تھی۔

اس نے ایڈورڈ کا ہاتھ تھام لیا اور وہاں سے اٹھنا ہی چاہ رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ ایڈورڈ نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ راہداری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک درمیانی عمر کی خوب صورت عورت اس طرف چلی آرہی تھی۔

''لورا۔'' ایڈورڈ اسے دیکھ کر بڑبڑایا۔ ''تم یہاں......''

''ہاں ڈیڈ! میں تو اس سے بھی پہلے آجاتی لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں......''

ایڈورڈ نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا اور بولا۔ ''یہ جینیفر ہے۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔''

دونوں عورتوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ لورا کی مسکراہٹ بالکل باپ جیسی تھی۔ جینیفر نے باہر آکر دروازہ بند کیا اور اس پر براہِ کرم ڈسٹرب نہ کریں، کی تختی لگا دی۔ وہ چند ساعتوں کا مہمان تھا۔ اب وہاں کسی کو آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

خبط

بابر نعیم

کبھی کبھی انسان اپنی پسند ناپسند، فطرت اور مختلف عادتوں کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھاتا ہے... وہ بھی ایک خبط میں مبتلا تھی مگر اسے احساس تک نہ تھا کہ اس معمولی سی عادت کی بنا پر کبھی اسے موت کو منہ لگانا پڑے گا...

محبت کی چاشنی میں ڈوبا ایک زیرک قاتل کا زہریلا منصوبہ

''اس عورت کی موت کی وجہ زہر خورانی ہے۔'' ہومی سائیڈ کے کیپٹن فلینیگن نے کہا۔ ''آل رائٹ!''

''زہر کون سا تھا؟''

''سائنائیڈ!''

''لیکن کیا یہ قتل ہے؟'' سراغ رساں جون میلون نے پوچھا۔ ''یہ خودکشی بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''یقیناً قتل ہی ہو سکتا ہے۔'' کیپٹن فلینیگن نے کہا۔ ''وہ عورت قدرے خبطی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ حال ہی میں



ڈاکٹر ہلٹن نامی ایک ماہر نفسیات کے پاس بھی گئی تھی۔"

"میں اس ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔" سراغ رساں جون میلون نے بتایا۔

"تم تو ہر کسی سے واقف ہو۔" کیپٹن فلینیگن نے کہا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بات ہمیں اس کے شوہر ارنی میڈیسن نے بتائی ہے لیکن اس عورت کا خبط اس ٹائپ کا نہیں تھا کہ وہ خودکشی کر لیتی...... تم سمجھ رہے ہونا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟ خودکشی کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں اور اگر وہ خودکشی کرنا چاہتی تب بھی وہ خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ تمام حقائق اس کے خلاف ہیں۔"

سراغ رساں جون میلون نے استفہامیہ نظروں سے پولیس کیپٹن کی طرف دیکھا۔

"اس پورے اپارٹمنٹ میں سائنائیڈ کا کوئی معمولی سا سراغ موجود نہیں ہے۔" کیپٹن نے ناخوشگوار لہجے میں بتایا۔ "کسی قسم کا بھی سائنائیڈ موقع پر ہی ہلاک کر دیتا ہے۔ وہاں پر کوئی گلاس یا ایسی کوئی شے موجود ہونی چاہیے تھی جس میں اس عورت نے سائنائیڈ لیا ہوگا لیکن ہمیں لاش کے پاس سے ایسی کوئی شے بھی نہیں ملی۔"

"تو تم نے اس عورت کے شوہر کو شک کی بنا پر حراست میں لیا ہوا ہے؟" سراغ رساں میلون نے ایک نئے سگار کا ریپر کھولتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے پاس تمام جواز موجود ہیں۔" پولیس کیپٹن نے کہا۔ "تمام دولت اس عورت کی تھی۔ پھر زندگی کے بیمے کی رقم بھی خاصی تگڑی بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ارنی میڈیسن نے کسی دوسری عورت کے ساتھ بھی ناجائز تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔"

یہ سن کر سراغ رساں جون میلون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن اگر ہم یہ معلوم کرنے میں ناکام رہے کہ اس نے اپنی بیوی کو زہر کس طرح دیا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم بلا کسی جواز کے اسے کب تک حراست میں رکھے رہیں گے۔"

"زیادہ دیر تک تو نہیں رکھ سکتے۔" سراغ رساں میلون نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"اس پورے اپارٹمنٹ میں ایسی کوئی شے موجود نہیں جس میں سائنائیڈ کے ایک معمولی سے ذرّے کا بھی سراغ ملا ہو۔ ہم نے تو یہاں تک بھی سوچا کہ بے ضرر گولیوں کی کسی بوتل میں زہر آلودہ ایک گولی شامل کر دی گئی ہو۔ ایسا بھی کوئی امکان نہیں۔ جب اس عورت کی موت واقع ہوئی تو اس وقت وہ اپارٹمنٹ میں تنہا تھی اور اندر سے کمرے کے دروازے کی چٹخنی بھی لگی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی اس عورت کو زہر دیا گیا ہے۔ کس طرح...... یہ ایک معما ہے۔" کیپٹن نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

سراغ رساں جون میلون اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک انگڑائی لی، اپنا سگار دوبارہ سلگایا اور بولا۔ "آؤ، ڈاکٹر ہلٹن کے پاس چلتے ہیں۔۔۔ معلوم نہیں کیوں لیکن مجھے ایک کسک سی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے یہ اچانک ہی سجھائی دیا ہے۔"

☆☆☆

سفید بالوں والے ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر ہلٹن نے پوری سنجیدگی کے ساتھ ان کی تمام بات سنی پھر آخر میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تم لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ دھیما تھا۔ "میرا مشورہ ہے کہ ہم وہاں چل کر ایک نظر اس اپارٹمنٹ کا جائزہ لے لیتے ہیں۔"

وہ اپارٹمنٹ شکاگو کے جنوبی حصے میں واقع تھا۔ اپارٹمنٹ کی آرائش نہایت سلیقے سے کی گئی تھی اور وہ صاف ستھرا اور بے داغ نظر آرہا تھا۔

کیپٹن فلینیگن اپنی راہنمائی میں انہیں اس کمرے میں لے گیا جہاں ایلما میڈیسن کی لاش پائی گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا ڈائننگ روم تھا جس میں شوخ رنگ کا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ دیوار پر بھڑکیلا وال پیپر چسپاں تھا جس پر ٹراپیکل فروٹ کی تصویریں ایک خاص ترتیب سے بنی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر ہلٹن سیدھا وال پیپر کے پاس چلا گیا اور نزدیک سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے پولیس کیپٹن اور سراغ رساں کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ان دونوں کی توجہ وال پیپر پر نمایاں ان نم دھبوں کی جانب مبذول کرائی جو انگور کے بڑے سے خوشے کی تصویر پر دکھائی دے رہے تھے۔

"ان دھبوں کو ہاتھ مت لگانا۔" ڈاکٹر ہلٹن نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "ایسے اور بھی دھبے موجود ہو سکتے ہیں۔ ان پر تمہارا سائنائیڈ موجود ہے۔"

یہ سن کر سراغ رساں اور پولیس کیپٹن چونک پڑے۔

"میرا خیال ہے کہ اگر تم لوگ مجھے اپنے ساتھ ڈاؤن ٹاؤن لے چلو اور مجھے اپنے مشتبہ مجرم سے بات کرنے کا موقع دو تو میں تمہاری خاطر اس سے جرم کا اقرار کروا سکتا ہوں۔"

☆☆☆

بعد میں وہ تینوں بیئر اور سگار پینے کے دوران آپس میں اسی معاملے پر گفتگو کررہے تھے۔

''اس نے سائنائیڈ وال پیپر پر لگا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی سائنائیڈ اپنی انگلیوں پر لگا لے گی اور اسے چاٹ لے گی۔''

کیپٹن فلیکن نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس نے ایسا کیا ہوگا؟''

یہ سن کر ڈاکٹر مسکرا دیا۔ ''وہ جب مشورے کے لیے میرے پاس آئی تھی تو اس کا شوہر اس کے ہمراہ تھا۔ وہ باہر کے کمرے میں بیٹھا رہا جہاں وہ ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ آسانی سے سن سکتا تھا۔ اس وقت خاصی دیر ہو چکی تھی اور میرے کلینک میں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ میری سیکریٹری بھی جا چکی تھی۔ صرف اس کے شوہر کے علم میں تھا کہ میرے اور اس کی بیوی کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔''

''لیکن اس کی بیوی نے تمہیں کیا بتایا تھا؟'' سراغ رساں میلون نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ ایک سادہ سے ذہنی مسئلے میں مبتلا تھی۔ اس نے مجھ سے کہا...... ڈاکٹر! میں اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ مجھے انگور کھانے کا جنون ہے۔ میں انگور کھانے کے خبط میں مبتلا ہوں۔ میں نے اس سے دیر تک مختلف قسم کے سوالات کیے۔ وہ ایک ذہین اور نوجوان عورت تھی اور بظاہر ایسی اور کوئی بات نہیں تھی کہ اس میں کسی قسم کی خرابی ہو۔''

ڈاکٹر نے اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ''میں نے اپنی سی پوری کوشش کرتے ہوئے اسے بھرپور تسلی دی کہ دنیا میں ایسے لاکھوں کروڑوں افراد ہیں جو انگور نہایت شوق سے کھاتے ہیں اور جنہیں انگور کھانے کا جنون ہے...... اور میں نے کہا کہ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے اور وہ اس بارے میں قطعی طور پر فکر مند نہ ہو۔''

''تو پھر؟''

''وہ یہ سن کر مسکرا دی تھی۔ اس نے کہا...... ڈاکٹر! میں یہ بات بخوبی جانتی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں۔ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ دنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگوں کو انگور کھانے کا جنون ہے لیکن بات یہ ہے ڈاکٹر کہ مجھے وال پیپر پر موجود انگور کھانا پسند ہیں اور میں انہیں شوق سے کھاتی ہوں۔''

ہنی مون

عمر رسیدہ قاسم بھائی کراچی میں رہتے تھے لیکن ایک روز وہ مری میں مال پر ٹہلتے پائے گئے۔ ان کے ایک شناسا نے انہیں وہاں دیکھا تو گرمجوشی سے بولے۔

''قاسم بھائی! آپ یہاں کیسے۔''

قاسم بھائی نے ذرا شرماتے ہوئے کہا۔ ''میں نے دوسری شادی کر لی ہے، یہاں ہنی مون پر آیا ہوں۔''

''بہت خوب! بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟'' شناسا نے پوچھا۔

''وہ تو کراچی میں ہیں، گھر میں کسی کو دیکھ بھال کے لیے چھوڑنا ضروری تھا۔'' قاسم بھائی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

مرسلہ۔ مرحا گل، رمنا گل، درابن کلاں

معصوم مخبر

والدہ۔ ''بیٹا انسان کی جان کہاں سے نکلتی ہے؟''

بیٹا۔ ''کھڑکی سے۔''

والدہ۔ ''وہ کیسے؟''

بیٹا۔ ''امی جب آپ نے کال بیل دی تو پاپا نے آنٹی سے کہا جان کھڑکی سے نکل جاؤ۔''

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

دعوتِ خاص

آج شام آٹھ بجے ایک چھوٹی سی محفل رکھی ہے۔ آپ سے ضرور بالضرور آنے کی استدعا ہے۔ اس محفل میں چکن بروسٹ، کولڈ ڈرنک، پیزا، شوارما، سموسے، پکوڑے، چاٹ، دہی بھلے، دالیں، آئس کریم اور برگر...... سے ہونے والے ''نقصانات'' کے بارے میں بتایا جائے گا۔

پلیز۔ آنا نہ بھولیے گا۔

مرسلہ۔ سفینہ منظور، یوحنا آباد، لاہور

پہلا پتھر

مرزا امجد بیگ

زندگی میں چاہے معصوم بچے کا پہلا قدم ہو یا انسان کی اچھائی اور برائی کی جانب پہلی نگاہ... اہمیت ہوتی ہے اس بات کی کہ پیروں میں طاقت اور ارادوں میں استقامت کس حد تک ہے اور یہی تعین انسان کی آئندہ گزرنے والی زندگی کو درست یا غلط، کوئی بھی سمت عطا کرتا ہے۔ اس کیس کی الجھی گتھیاں بھی اسی جانب اشارہ کررہی تھیں کہ جرم کسی نے کیا اور سزا کسی اور کے حصے میں... لیکن مجرم کی چھوٹی چھوٹی غفلتیں اور فرار کی عجلتیں اس کے گرد دائرہ تنگ کردیتی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا... دولت کے حصول میں وہ بھول گیا تھا کہ ببول کے پودے میں گلاب کے پھول نہیں کِھل سکتے... اور جہاں مرزا امجد بیگ جیسے گہری نظر اور وسیع تجربے کے حامل وکیل کا کھیل شروع ہوجائے وہاں دلیلوں کی بساط پر مجرموں کی بازی مات ہو ہی جاتی ہے اور یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ بھلائی اور سچائی کے عمل میں بس پہل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی پہلا پتھر پھینکنے کی ہمت کرلے تو پھر ساتھ دینے والوں کی کمی نہیں رہتی۔

رشتوں کے وبال اور سازشوں کے جال میں الجھی مجرمانہ کارروائیوں کا احوال

کیس کو عدالت میں لگے ہوئے لگ بھگ چار ماہ ہوگئے تھے لیکن آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت تھی۔ عدالت کا کمرا افراد سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ متعلقہ لوگوں کے علاوہ بھی اس کیس کی سماعت کے لیے وہاں کافی افراد موجود تھے۔ جج اپنی مخصوص کرسی پر آکر بیٹھا تو کارروائی کا آغاز ہوا۔

میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عرفان کو اس کے جرم سے آگاہ کیا گیا تو اس نے فردِ جرم کے خلاف صحتِ جرم سے صاف انکار کردیا۔

ملزم عرفان پر ایک خوب صورت عورت انیتا کے قتل کا اور ایک لاکھ روپے کی چوری کا الزام تھا اور اس امر میں کسی شک وشبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ میرا مؤکل بے گناہ تھا۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں پھنسایا گیا تھا۔ اگر مجھے عرفان کے قاتل ہونے کا ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں ہرگز ہرگز اس کیس میں ہاتھ نہ ڈالتا۔

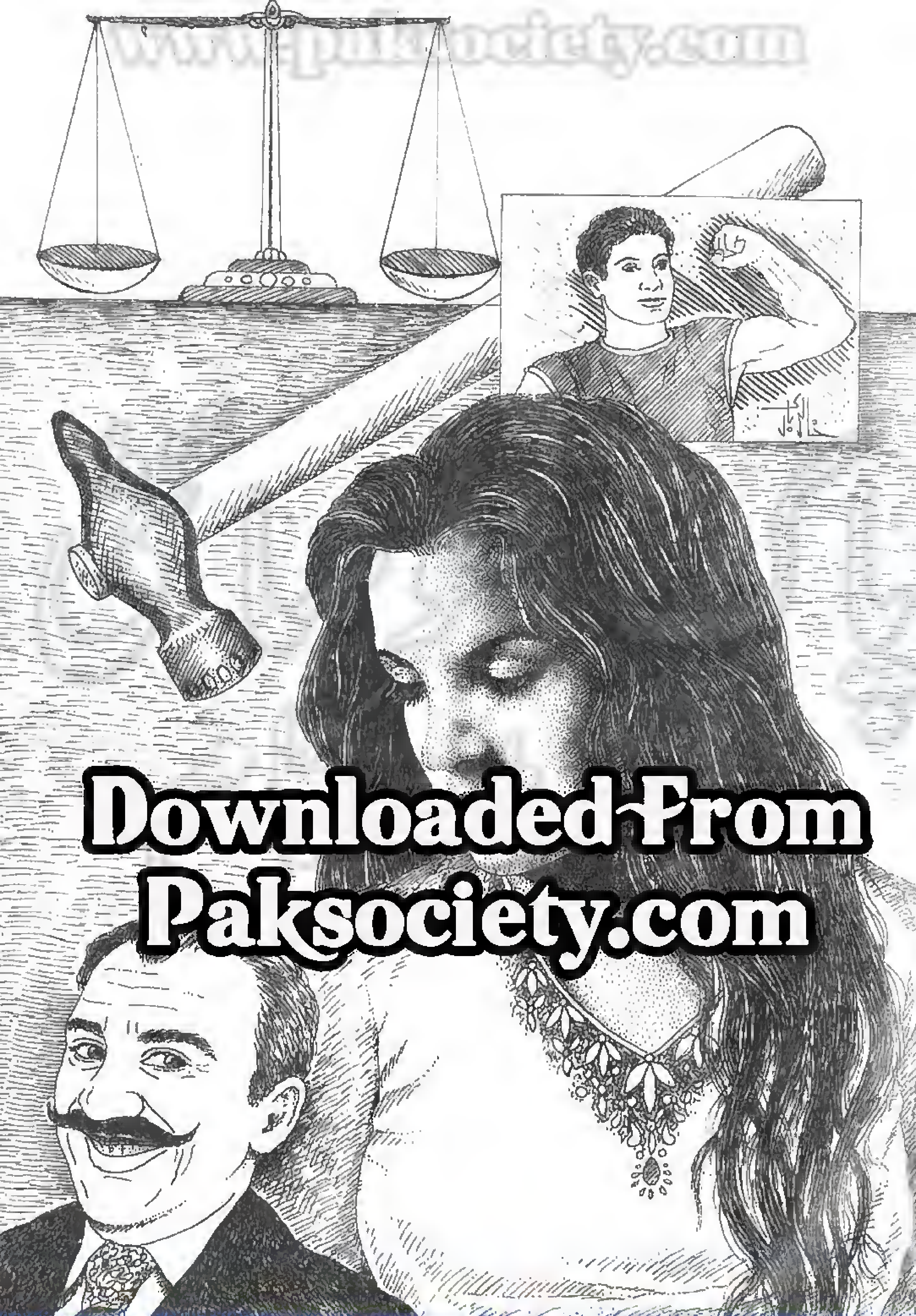
صحتِ جرم سے انکار کے بعد ملزم عرفان کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا پھر جرح کا سلسلہ شروع ہوا۔ وکیلِ استغاثہ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا اور تیز نظر سے ملزم کو گھورنے لگا۔

وکیل استغاثہ کے اس خاموش جارحانہ انداز پر ملزم چند لمحات کے لیے بے چین ہوا پھر وہ بڑے اعتماد کے ساتھ وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا جیسے وہ قتل کے کسی مقدمے میں ملوث نہ ہو بلکہ دیگر افراد کی طرح وہ بھی عدالت کی سنسنی خیز کارروائی دیکھنے اور اس سے محظوظ ہونے آیا ہو۔

وکیلِ استغاثہ نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے ملزم سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنے نام کے معنی معلوم ہیں؟“

یہ ایک غیر متعلق اور کافی حد تک بے تکا سوال تھا تاہم ملزم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”جی ہاں...... معلوم ہیں۔“

”میں بھی تمہارے نام کے معنی جاننا چاہتا ہوں۔“



وکیلِ استغاثہ بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''بتاؤ......؟''

''عرفان کے معنی ہیں...... جان کاری۔'' ملزم نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''آگاہی......''

''اوہ......'' وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''پھر تو تم اس بات سے بھی آگاہ ہو گے...... میرا مطلب ہے، تمہیں اس امر کی آگاہی ہوگی کہ اس وقت تم کس حیثیت سے اس عدالت میں موجود ہو؟''

میں اگر چاہتا تو اس مرحلے پر مداخلت کر کے وکیل استغاثہ کے ان غیر متعلقہ سوالات کے جواب میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن میں دانستہ خاموش رہا۔ ملزم نے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''مجھ پر میڈم کے قتل کا الزام ہے۔''

''کون میڈم؟'' وکیل استغاثہ نے تیکھے انداز میں استفسار کیا۔

''میڈم انیتا......!''

''صرف تم پر انیتا کے قتل کا الزام ہی نہیں بلکہ تم نے یہ قتل کیا بھی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے درشت انداز میں کہا۔ ''تم انیتا کے قاتل ہو...... ایک خطرناک اور سنگین مجرم ہو......!''

''آبجیکشن یور آنر......!'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔ ''میرے مؤکل عرفان پر عائد کردہ الزام ابھی ثابت نہیں ہوا لہٰذا اسے مجرم کہہ کر پکارنا قانوناً اور اخلاقاً غلط ہوگا...... بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر استغاثہ کا یہ اقدام انصاف کے اصولوں کے بھی سراسر منافی ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے اعتراض کو درست مانا اور اپنے مخصوص بھاری بھرکم لہجے میں وکیل استغاثہ کو ہدایت کی۔

''وکیل صاحب! آپ اپنے بیان میں سے لفظ ''مجرم'' کو خارج کر کے جرح جاری رکھیں۔''

''مسٹر عرفان! میں نے سنا ہے کہ تمہیں سردی نہیں لگتی......؟'' وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں......'' ملزم نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''آپ اس وقت ٹی شرٹ میں ملبوس ہو۔'' وکیل استغاثہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم ہمیشہ ایسی شرٹ پہنتے ہو جس میں سے تمہارے بازوؤں کی یہ صحت مند مچھلیاں نظر آتی رہیں۔ موسم چاہے کوئی بھی ہو، تمہیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ تمہیں تو بس اپنی باڈی کی نمائش کرنا ہوتی ہے...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

میرا مؤکل عرفان ایک دراز قامت اور صحت مند شخص تھا۔ اس کے جسم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے باڈی بلڈنگ وغیرہ کا بہت شوق تھا اور وہ باقاعدہ ایکسرسائز بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے بازوؤں کی حرکت کرتی ہوئی خوب صورت مچھلیاں اس امر کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

''ہاں...... آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔'' ملزم نے وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں بڑی سے کہا۔ ''مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر میں عموماً ٹی شرٹس یا ہاف سلیو شرٹس پہنتا ہوں تو اس میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

''مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وکیل استغاثہ نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس، میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کی نمائش کیوں کرتے ہو؟ تم نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم ان سے بہت محبت کرتے ہو اسی لیے انہیں خوب تندرست اور توانا رکھتے ہو......''

''یہ کیا بات ہوئی۔ میں تو اپنے پورے بدن ہی سے محبت کرتا ہوں۔'' ملزم نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ ''اور سر سے پاؤں تک خود کو تندرست رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' میں نے ملزم کے خاموش ہوتے ہی اٹھ کر کہا۔ میرا مخاطب کرسیِ انصاف پر بیٹھا ہوا سنجیدہ مزاج جج تھا۔

میں نے چونکہ ملزم کے جواب دینے کے بعد ''آبجیکشن'' کیا تھا اس لیے جج مجھ سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟''

''جناب عالی!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر اپنے اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''قدرت کی عطا کردہ نعمتوں میں صحت کو بہت زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کوئی کسی بیمار شخص سے پوچھے۔ لوگ تو خود کو صحت مند اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے سو جتن کرتے ہیں۔ یہ ایسی نعمتِ خداوندی ہے جو ہزاروں، لاکھوں روپے خرچ کر کے کسی دکان سے خریدی نہیں جا سکتی......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میرا مؤکل قابلِ رشک صحت کا مالک ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے اسے خوب صورت اور دلکش بدن عطا فرمایا ہے تو اس میں میرے فاضل دوست کو کیا اعتراض ہے۔ وہ بار بار میرے مؤکل کے بازوؤں کی مچھلیوں پر کیوں نکات اٹھا رہے ہیں۔ کیا اچھی صحت اور سڈول جسم کا مالک ہونا قانون کی نظر میں کوئی جرم ہے؟''

میں نے بڑے بھرپور انداز میں ملزم عرفان کا دفاع کیا تھا۔ جج نے تحمل سے میری وضاحت سنی پھر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وکیل صاحب! آپ ڈیفنس (وکیلِ صفائی) کے سوال کے جواب میں کیا کہیں گے......؟''

''یور آنر......!'' وکیل استغاثہ، معاندانہ نظر سے ملزم کو گھورنے کے بعد جج سے مخاطب ہوا۔ ''ملزم کی صحت اور تندرستی پر استغاثہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن......''

''لیکن کیا......'' جج نے وکیل استغاثہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی استفسار کر ڈالا۔ ''جب کوئی اعتراض نہیں ہے تو پھر اس زاویے سے جرح کا کیا جواز ہے؟''

''میں وضاحت کرتا ہوں جناب عالی۔'' وہ گردن کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔ ''یہاں پر میں چھری کی مثال دوں گا۔ چھری عام استعمال ہونے والی ایک ایسی شے ہے جس پر کسی بھی شخص کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تاہم اس کا استعمال بعض اوقات قابلِ اعتراض صورتِ حال کو جنم دے سکتا ہے مثلاً......''

وکیل استغاثہ نے دانستہ توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ڈرامائی انداز میں اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مثلاً......اگر چھری کی مدد سے سبزی اور پھل کاٹے جائیں تو یہ عمل کسی بھی طور پر قابلِ اعتراض نہیں کہلائے گا۔ اگر اسی چھری سے مرغی یا بکری وغیرہ کو ذبح بھی کر ڈالیں تب بھی کہیں سے صدائے احتجاج بلند نہیں ہوگی لیکن اگر یہ چھری کسی انسان کے پیٹ میں گھونپ دی جائے یا کسی انسان کی شہ رگ پر چلا دی جائے اور یا پھر اس کی مدد سے کسی جیتے جاگتے انسان کی آنکھیں نکال لی جائیں تو چھری کا اس نوعیت کا استعمال قابلِ دخل اندازی پولیس قرار پائے گا۔ اب میں زیر سماعت کیس کی طرف آتا ہوں......''

اس نے ایک مرتبہ پھر ذرا دیر کو توقف کیا، فاتحانہ انداز میں مجھ پر ایک نظر ڈالی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ شخص انہیں بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔''

''جناب عالیٰ!'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''وکیل استغاثہ اس قسم کی پہیلیاں ڈال کر خوامخواہ میرے مؤکل کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھلا کسی کے بازوؤں کی صحت مند مچھلیاں کیونکر ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہیں؟''

''ڈیفنس کے اعتراض کا جواب دیں وکیل صاحب۔'' جج وکیل استغاثہ کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''آپ ملزم کے صحت مند بازوؤں کی مچھلیوں کو کیوں زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ آپ کی اس کوشش میں کون سا راز چھپا ہوا ہے اور...... یہ ہتھیار سے آپ کی کیا مراد ہے......؟''

''یور آنر......!'' وکیل استغاثہ انگلی کی مدد سے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ شخص بہت ہی عیار اور چالباز ہے۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور انداز کی سادگی کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ کس طرح اپنے خطرناک منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا ہوگا۔ اس نے صنفِ مخالف کو متاثر اور اپنی جانب راغب کرنے کے لیے یہ صحت مند مچھلیاں پال رکھی ہیں اور موجودہ کیس میں بھی ملزم کے اس آزمودہ ہتھیار نے بہت کام دکھایا ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! ملزم کے حوالے سے کیے گئے اس دعوے کی وضاحت آپ کس طرح کریں گے......؟''

''جناب عالی!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میرے موقف کو سمجھنے کے لیے عورتوں کی مخصوص نفسیات کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے......''

''عورتوں کی نفسیات بیچ میں کہاں سے آگئی؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ مجھے بات مکمل کرنے دیں گے تو بتاؤں گا تاکہ کون کون سی اور کس کس کی نفسیات بیچ میں آسکتی ہے؟''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی باری پر ضرور سوال کیجیے گا۔'' پھر وہ وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''وکیل صاحب! آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد رواں ہوگیا۔ ''جیسا کہ سب جانتے ہیں اور اس امر میں کسی شک و شبے کی بھی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ عورت بنیادی طور پر کمزور واقع ہوئی ہے اور ہر

وقت یہ ایک مضبوط سہارے کی تلاش میں رہتی ہے۔ اسی حقیقت کی بنیاد پر اسے طاقتور اور صحت مند مرد اچھے لگتے ہیں جو اس کی حفاظت کر سکے۔ ملزم ان خصوصیات پر صد فیصد پورا اترتا ہے۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر احتجاجی لہجے میں کہا۔

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیسا اعتراض؟''

''جناب عالی......!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''میرے فاضل دوست اور اس کیس کے سرکاری وکیل نے عورتوں کی نفسیات کے حوالے سے ابھی معزز عدالت کے سامنے جو کچھ بیان فرمایا ہے، اسے فارمولا بنا کر ہر عورت پر فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عورت کو تحفظ کی اشد ضرورت ہوتی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ سچی محبت کی متلاشی ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں وہی مرد کوئی مقام پا سکتا ہے جو اپنے قول و فعل میں سچا اور پُرخلوص طرزِ عمل کا حامل ہو۔''

''آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں وکیل صاحب؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے سوال کیا۔

''بے شک یور آنر...... یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے عورت کی عمومی نفسیات کا ذکر کیا ہے۔''

''وکیل صاحب! اس وقت ملزم عرفان پر دو الزامات کا بوجھ لدا ہوا ہے۔'' جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''اول، اس نے ایک حسین و جمیل عورت انیتا کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ دوم، اس نے مقتولہ انیتا کے گھر سے ایک لاکھ روپے چرائے ہیں۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے عورت کی عمومی نفسیات کے ذیل میں جو کہانی سنائی ہے، اس کا ملزم اور مقتولہ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟''

''بالکل کروں گا جناب عالی۔'' وکیل استغاثہ نے اعتماد بھرے انداز میں کہا۔ ''اصل میں یہی نکتہ تو میں عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ملزم نے اپنی وجاہت اور پُرتاثر شخصیت کا تیر چلا کر پہلے تو مقتولہ انیتا کے دل میں اپنے لیے جگہ بنائی اور پھر اپنا کام کر کے چلتا بنا۔''

''دل میں جگہ بنائی...... بہت خوب۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آپ کی تھیوری سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ میرے مؤکل اور مقتولہ انیتا کے درمیان بڑا افلاطونی قسم کا کوئی عشق چل رہا تھا؟''

اس کیس میں نامزد ملزم اور میرا مؤکل عرفان پیشے کے اعتبار سے ایک الیکٹریشن تھا جبکہ مقتولہ انیتا ایک کاروباری شخص نجیب اللہ کی بیوی تھی۔ نجیب اللہ کا بزنس بولٹن مارکیٹ کے علاقے میں تھا۔ میں نے خاصے تیکھے انداز میں وکیل استغاثہ سے سوال کیا تھا لیکن اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بڑے تحمل سے جواب دیا تھا۔

''میں ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کو افلاطونی عشق نہیں سمجھتا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک طرف سے پسندیدگی اور دوسری جانب سے ایک گہری چال کا شاخسانہ تھا۔''

وکیل استغاثہ کے اس تبصرے پر جج کی دلچسپی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''یہ جو آپ نے پسندیدگی اور چال کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ذرا ان کی وضاحت کر دیں۔''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند بولنا شروع کیا۔ ''اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مقتولہ انیتا ملزم کو دل و جان سے پسند کرتی تھی اور اس پسندیدگی کا سب سے بڑا سبب ملزم کا صحت مند اور دلکش شخصیت کا مالک ہونا ہی تھا۔ وہ ملزم کے بازوؤں کی خوب صورت مچھلیوں کی اکثر تعریف کیا کرتی تھی۔ یہ تو ہے اس کیس کا ایک پہلو......'' یہاں تک بتانے کے بعد اس نے ذرا سا توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''دوسری جانب ملزم ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مقتولہ کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ملزم نے ابتدا ہی میں یہ بات بھانپ لی تھی کہ مقتولہ کو دلکش شخصیت کے مالک مرد بہت زیادہ پسند ہیں لہٰذا اسے مقتولہ کے قریب آنے اور اس کا اعتماد حاصل کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بندی کی اور موقع ملتے ہی یہ ایک لاکھ روپے چرا کر بھاگ نکلا......''

''ایک منٹ میرے فاضل دوست!'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے فرمایا کہ ملزم نے ایک خاص مقصد کی خاطر مقتولہ کا اعتماد حاصل کیا اور پھر ایک لاکھ روپے حاصل کر کے فرار ہو گیا لیکن شاید آپ بھول رہے ہیں کہ میرے مؤکل پر مقتولہ انیتا کے قتل کا الزام بھی ہے؟''

''میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں......'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''پھر آپ انیتا کے قتل کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟'' میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "مقتولہ نے ملزم کو ایک لاکھ کی رقم چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہوگا۔ اس کے بعد مقتولہ انیتا کی جانب سے مزاحمت کا مضبوط جواز بنتا تھا یقیناً اس نے ملزم کو روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس خوف سے کہ پکڑے جانے پر ملزم کا راز فاش ہوجائے گا، اس نے مقتولہ کی مزاحمت کے جواب میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔"

"بہت خوب میرے فاضل اور قابل دوست!" وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "آپ نے کہانی تو بہت دلچسپ سنائی ہے مگر آپ کی کہانی میں "ایسا ہوا ہوگا!... ویسا ہوا ہوگا!" جیسے الفاظ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کہانی مفروضات پر مبنی ہے۔ کیا آپ میرے تین سوالات کے ٹھوس جواب دے سکتے ہیں؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا تاہم جلد ہی سنبھلتے ہوئے بولا۔

"کون سے تین سوال؟"

"سوال نمبر ایک......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "کیا آپ کے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ ملزم نے مقتولہ کے گھر سے ایک لاکھ روپے چوری کیے تھے؟ سوال نمبر دو...... آپ کس بنا پر اتنے دعوے سے کہہ رہے ہیں کہ مقتولہ نے ملزم کو ایک لاکھ کی رقم چراتے ہوئے دیکھ لیا تھا......؟" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس امر کو آپ کیسے ثابت کریں گے کہ مقتولہ کی مزاحمت پر ملزم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟ یہ میرا تیسرا سوال ہے......"

"اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں ایک لاکھ روپے رکھے ہوں اور وہ اچانک غائب ہوجائیں۔" وہ چند لمحے سوچنے کے بعد گویا ہوا۔ "وہ شخص اپنے گھر کے اندر مردہ پایا جائے تو اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ چور نے چوری کی اور صاحب خانہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا۔"

"آپ کی تھیوری تو خاصی دلچسپ ہے میرے فاضل دوست۔" میں نے چوٹ کرنے والے انداز میں کہا۔ "مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مبینہ چور اور قاتل اس کیس کا ملزم اور میرا موکل عرفان الیکٹریشن ہی تھا؟"

"وہ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ......" وہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "کہ جب یہ وقوعہ پیش آیا، میرا مطلب ہے کہ جب چوری اور قتل کی واردات ہوئی تو ان اوقات میں ملزم کے سوا اور کوئی شخص مقتولہ کے گھر نہیں گیا تھا لہٰذا پہلا اور آخری شک اسی شخص پر کیا جاسکتا ہے......" اتنا کہنے کے بعد وکیل استغاثہ نے انگلی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ بھی کردیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔

"میرے فاضل دوست! اگر مقتولہ کی لاش کے نزدیک ہی آلۂ قتل بھی پڑا ہوا مل جائے اور اس آلۂ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات یعنی فنگر پرنٹس بھی موجود ہوں تو پھر ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسی شخص نے......" وہ ایک مرتبہ پھر انگلی کے اشارے سے ملزم کی نشاندہی کرتے ہوئے بولا۔ "اسی شخص نے مقتولہ انیتا کو موت کی نیند سلایا ہوگا...... دیٹس آل!"

وکیل استغاثہ نے بات مکمل کرنے کے بعد بڑے اسٹائل سے کندھے اچکائے تو میں نے بہ آواز بلند کہا۔

"دیٹس ناٹ آل مائی ڈیئر پراسیکیوٹر......!"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں......؟"

"آپ نے جو دلچسپ اور سنسنی خیز اسٹوری سنائی ہے اسے ثابت کرنا بھی ضروری ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "عدالت اس نوعیت کی بے بنیاد باتوں کو اہمیت نہیں دے سکتی۔ کیا استغاثہ کے پاس اس واردات کا کوئی عینی شاہد موجود ہے......؟"

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں!"

"کیا آپ نے ملزم کو گرفتار کرنے کے بعد اس کے پاس سے ایک لاکھ کی رقم برآمد کرلی تھی؟" میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں......!" اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا۔

"میرے فاضل دوست!" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ اس کیس کے والی ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور آلۂ قتل کئی بار آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ آپ نے فنگر پرنٹس رپورٹ کو بھی متعدد بار پڑھا ہوگا۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ مقتولہ انیتا کو کس نوعیت کے آلۂ قتل سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟"

وہ میرے اس معصوم اور سادے سے سوال پر تعجب خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ میرے سوال کا جواب دیں؟"

میرے لیے یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ نجیب اللہ کی خوب صورت اور جوان بیوی انیتا کو ایک ہتھوڑی کی مدد سے قتل کیا گیا تھا۔ آلہ قتل کی لیبارٹری رپورٹ ظاہر کرتی تھی کہ مذکورہ ہتھوڑی کی ایک طوفانی ضرب نے مقتولہ کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئی تھی۔ آلہ قتل پر پائے جانے والے خون کے دھبے مقتولہ کے خون سے میچ کر گئے تھے۔ علاوہ ازیں ہتھوڑی کے فولادی حصے پر خون کے دھبوں کے ساتھ ہی مقتولہ کے سر کے چند بال بھی چپکے ہوئے پائے گئے تھے۔ اس امر میں توکسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ اسی ہتھوڑی کے ایک کاری وار نے مقتولہ انیتا کو اس جہان سے اس جہان میں پہنچایا تھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے لیے وکیل استغاثہ چوبی میز کی جانب بڑھ گیا۔ اس قسم کی چوبی میز یا ایک سے زیادہ میزیں عدالت کے کمرے میں موجود ہوتی ہیں جن پر زیر سماعت کیس سے متعلق تمام ثبوت اور شہادتیں رکھی جاتی ہیں۔ ایسی چیزوں میں آلہ قتل بھی شامل ہوتا ہے۔ جس ہتھوڑی کی مدد سے انیتا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہ ایک سیلوفین بیگ کے اندر چوبی میز پر موجود تھی۔

وکیل استغاثہ میز پر سے مذکورہ سیلوفین بیگ اٹھالایا اور میری نگاہ کے سامنے بیگ کو لہراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ ہے وہ خطرناک ہتھوڑی جو انیتا کی جان لینے کے لیے آلہ قتل کے طور پر قتل کی اس واردات میں استعمال ہوئی تھی۔''

میں نے چونک کر سیلوفین بیگ کی طرف دیکھا۔

''ارے...... یہ تو......'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ ''یہ ہتھوڑی تو میرے موکل عرفان کی ہے...... ہیں نا؟''

''جی ہاں...... آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ چوٹ کرنے والے انداز میں بولا۔ ''اور آپ ایسا فرما کر اپنے موکل کو پھنسا رہے ہیں......''

''موکل کو پھنسا رہے ہیں...... کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب یہ کہ آپ اس ہتھوڑی کی شناخت کرکے ملزم پر کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ کرنے کا بندوبست کر رہے ہیں کیونکہ اس ہتھوڑی کے دستے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں جو اسے قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔''

''ہرگز نہیں!'' میں نے شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہتھوڑی میرے موکل کی ملکیت ہے۔ اس کا ایک ٹول ہے۔ اس ہتھوڑی کے دستے پر اس کے فنگر پرنٹس پائے جانا کوئی انہونی نہیں ہے۔''

''اور ہتھوڑی کے سر پر جو مقتولہ کا خون اور بال چپکے ہوئے پائے گئے ہیں......؟'' وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے، یہ خون اور بال مقتولہ ہی کے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور اس امر میں بھی کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ اسی ہتھوڑی کی مدد سے مقتولہ انیتا کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔''

''اس کے باوجود بھی......'' وہ تمسخرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کے باوجود بھی آپ اپنے موکل کو بے گناہ سمجھتے ہیں؟''

''جی ہاں...... بالکل......'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''آلہ قتل کے دستے پر میرے موکل کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ عین ممکن ہے، کسی سازشی شخص نے اس کی ہتھوڑی چرا کر یہ واردات کی ہو تاکہ الزام میرے موکل کے سر آئے...... اس کا کوئی دشمن، کوئی بدخواہ یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔''

''ہرگز نہیں......'' وکیل استغاثہ تیز آواز میں چلایا۔

''کیوں...... اس میں ایسی چیخنے یا چلانے والی کون سی بات ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرے موکل نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی یہ ہتھوڑی چند روز پہلے گم ہوگئی تھی اور......''

''اس نے جھوٹ بولا ہے، بکواس کی ہے......'' وکیل استغاثہ کی آواز اور بلند ہوگئی۔

''میں وقت آنے پر اپنے موکل کے بیان کو عدالت میں سچ ثابت کرسکتا ہوں۔'' میں نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔

''اگر کسی شخص نے ملزم کی ہتھوڑی چرا کر قتل کی یہ واردات کی ہے تو ہتھوڑی کے دستے پر اس شخص کے فنگر پرنٹس آنا چاہیے تھے۔'' وکیل استغاثہ دور کی کوڑی لایا۔ ''ہتھوڑی کے ہینڈل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات کیوں موجود ہیں؟''

''اس سوال کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''جو چیز جس شخص کی ملکیت ہوتی ہے اس پر اسی کے فنگر پرنٹس پائے جاتے ہیں اور جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"قاتل نے میرے مؤکل کو اس کیس میں پھنسانے کے لیے ہاتھوں پر دستانے پہن کر یہ قتل کیا ہوگا تاکہ ہتھوڑی کے دستے پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت نہ ہوسکیں اور میرے مؤکل کی انگلیوں کے فنگر پرنٹس جوں کے توں موجود رہیں اور عین ایسا ہی ہوا......"

"یور آنر......!" وکیل استغاثہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈیفنس اس کہانی کے ذریعے کیس کو کسی اور رخ پر ڈال کر اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم پر سے عدالت کی توجہ ہٹانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"یہی میرا بھی موقف ہے جناب عالی!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وکیل استغاثہ اپنی کہانی کی مدد سے اصل قاتل کی جانب سے توجہ ہٹا کر میرے مؤکل کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ میرا مؤکل بے گناہ ہے۔ اگر استغاثہ کے پاس اس واردات کا کوئی عینی شاہد ہے تو وہ اسے عدالت میں پیش کرے..... تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے۔"

"بیگ صاحب......!" جج نے گہری سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور میرے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پلیز پروسیڈ......!"

میں وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "استغاثہ کے پاس اس واردات کا کوئی آئی وٹنس نہیں ہے اور استغاثہ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ ملزم نے اپنے کسرتی بدن خصوصاً بازوؤں کی ابھری ہوئی صحت مند مچھلیوں کے ذریعے مقتولہ کو اپنی محبت کے دام میں پھنسایا تھا۔ یہ اتنی اہم بات استغاثہ کو کس نے بتائی؟"

"یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔" وہ برہمی سے بولا۔ "کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے......!"

"یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔" میں نے وکیل استغاثہ کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ "مقتولہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی اور ملزم اس قسم کی باتوں سے یکسر انکاری ہے۔ پھر آپ اس ٹھوس حقیقت کو عدالت میں کس طرح ثابت کریں گے۔ اس سلسلے میں کسی نہ کسی گواہ کو تو عدالت میں پیش کرنا ہی پڑے گا میرے فاضل دوست!"

"جب میں نے کہا کہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے تو پھر یہ ایک ٹھوس حقیقت ہی ہے۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "اور حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔"

"آنکھوں دیکھی حقیقت واقعی کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی مگر آنکھوں دیکھی حقیقت کا مطلب ہے کہ اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ ضرور ہوگا لیکن آپ عینی شاہد کے وجود سے انکاری ہیں۔ علاوہ ازیں......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"علاوہ ازیں آپ بڑے دعوے سے کہہ رہے ہیں...... میں نے جو کہہ دیا وہی حقیقت ہے...... آپ کا یہ پُرغرور دعویٰ عدالتی اور قانونی آداب وقواعد کے منافی ہے۔ عدالت میں اپنے موقف اور دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت پیش کرنا پڑتے ہیں میرے فاضل دوست میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟"

"نہیں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملزم اس وقت کٹہرے میں موجود ہے۔ اصولی طور پر یہ سوال اسی سے کیا جانا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ ملزم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔" پھر وہ روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! میں ملزم سے چند کڑے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی اجازت دی جائے۔"

"پرمیشن گرانٹیڈ!" جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

وکیل استغاثہ ملزم کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم مقتولہ انیتا کے گھر میں پہلی بار چار اکتوبر کو گئے تھے؟"

"جی...... یہ سچ ہے۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں گئے تھے...... تم مقتولہ کے گھر کس کام سے گئے تھے؟"

"ان لوگوں نے اے سی لگوانا تھا۔" ملزم نے بتایا۔ "میں اے سی کی فٹنگ وغیرہ کے سلسلے میں وہاں گیا تھا۔"

"تم وہاں گئے......" وکیل استغاثہ نے بولنا شروع کیا۔ "اس وقت مقتولہ کا شوہر نجیب اللہ گھر پر موجود تھا۔ نجیب اللہ نے تمہیں کام کے بارے میں سمجھایا۔ تم نے اسٹیمیٹ بتایا اور ضروری سامان وغیرہ لینے کے لیے مارکیٹ چلے گئے...... ایسا ہوا تھا یا نہیں؟"

"جی ہاں......" ملزم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟" وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے ملزم کی طرف دیکھا۔

"اس کے بعد......" میرے مؤکل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ "اس کے بعد میں مارکیٹ سے اے سی کی فٹنگ کے لیے ضروری سامان لے کر آیا تھا اور اپنا کام شروع کردیا تھا۔"

''جب تم مارکیٹ سے واپس آئے تو کیا اس وقت مقتولہ کا شوہر نجیب اللہ گھر میں موجود تھا؟'' وکیل استغاثہ نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''ن.....نہیں..... وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔''

''وہ کہاں چلا گیا تھا؟''

''نجیب اللہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں معمول کے مطابق گھر سے نکلا تھا۔'' ملزم نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''ہوں.....'' وکیل استغاثہ چند لمحات تک ذومعنی انداز میں ملزم کو گھورتا رہا پھر سوال کیا۔ ''جب تم اے سی کی فٹنگ کا کام کررہے تھے تو اس وقت مقتولہ کے علاوہ گھر کے اندر اور کون کون تھا؟''

''جی کوئی بھی نہیں۔'' ملزم نے بتایا۔ ''مقتولہ اکیلی ہی تھی۔ یہ دو افراد کی فیملی تھی۔ جب نجیب اللہ اپنے بزنس کو دیکھنے چلا گیا تو ظاہر ہے، اس کے بعد مقتولہ کو گھر میں اکیلا ہی ہونا تھا۔ اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے.....؟''

''پریشانی والی بات اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا پھر ملزم سے سوال کیا۔ ''تم نے اپنے کام کے سلسلے میں مقتولہ کے شوہر سے کتنی اجرت طے کی تھی؟''

''ایک سو روپے۔'' ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

یہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے کے ایک سو روپے آج کے کم از کم ڈیڑھ، دو ہزار سمجھ لیں۔

''کیا اے سی کی فٹنگ کا ضروری سامان بھی اسی سو روپے کے اندر شامل تھا؟''

''جی نہیں، اس کے پیسے الگ تھے۔'' ملزم نے بتایا۔ ''سو روپے صرف میری مزدوری کے تھے۔''

''کام کی تکمیل کے بعد تمہیں تمہاری مزدوری تو یقیناً مل گئی ہوگی؟'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جی..... جی ہاں!'' ملزم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کتنی مزدوری.....؟''

''سو روپے..... اور کتنی مزدوری!'' ملزم نے الجھن زدہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔''

''تمہارے اور مقتولہ کے شوہر نجیب اللہ کے درمیان اس کام کی اجرت ایک سو روپے طے ہوئی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میری معلومات کے مطابق اس روز مقتولہ نے کام ختم ہونے پر تمہیں دو سو روپے دیے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں وکیل صاحب۔'' ملزم نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس روز مقتولہ نے مجھے دو سو روپے ہی دیے تھے۔''

''تو پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''کون سا جھوٹ وکیل صاحب!''

''یہی کہ..... کام کی تکمیل پر مقتولہ نے تمہیں سو روپے دیے تھے!'' وکیل استغاثہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ نے میری اجرت کے حوالے سے سوال کیا تھا اور میں نے بھی اسی حوالے سے جواب دیا تھا۔ میرے کام کا معاوضہ ایک سو روپے طے ہوا تھا اور مقتولہ نے اس سلسلے میں مجھے ایک سو روپے ہی دیے تھے۔''

''اور دوسرے سو روپے.....!'' وکیل استغاثہ نے شک زدہ نظر سے ملزم عرفان کو گھورا اور سوال کیا۔ ''یہ ایکسٹرا سو روپے کس سلسلے میں تھے؟''

''انعام.....!'' ملزم نے بتایا۔ ''مقتولہ نے کہا تھا، یہ سو روپے میرا انعام ہے۔''

''انعام؟'' وکیل استغاثہ نے چونک کر غیر یقینی انداز میں ملزم کو دیکھا۔ ''کیسا انعام..... کس بات کا انعام..... تم نے کون سا کارنامہ انجام دیا تھا..... کیا تم نے ہائی جمپ کے مقابلے میں ماؤنٹ ایورسٹ کو نیچا دکھا دیا تھا؟''

''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' ملزم جلدی سے بولا۔

''پھر کیسی بات ہے؟'' وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ایکسٹرا سو روپے مقتولہ نے میرے کام سے خوش ہو کر دیے تھے۔'' ملزم نے بتایا۔ ''اسے میرا کام بہت پسند آیا تھا۔''

آپ ''سو روپے'' کے ذکر سے کسی الجھن میں نہ پڑیں کہ اے سی فٹنگ کی اجرت اتنی کم کیوں۔ واضح رہے کہ زیر نظر واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے سو روپے ایک معقول معاوضہ تھا اور جہاں تک ''انعام'' کا تعلق ہے تو اس کی رقم کا تعین کارنامے

کی نوعیت سے نہیں بلکہ دینے والے کی دلی کشادگی سے کیا جاتا ہے لیکن یہاں پر وکیل استغاثہ کا زاویۂ گراؤنڈ کچھ اور ہی تھا۔

''کام پسند آ گیا تھا یا تم پسند آ گئے تھے ؟'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا کام......!'' ملزم وکیل استغاثہ کی جارحیت کے جواب میں بوکھلا گیا۔

''جب مقتولہ کو تمہارا کام پسند آیا تھا تو پھر تعریف بھی تمہارے کام ہی کی کرنا چاہیے تھی نا؟'' وکیل استغاثہ نے... بہ دستور جارحانہ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری پرکشش صحت اور بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کی نہیں......''

''ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔'' ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''مقتولہ نے میرے کام کی تعریف کی تھی۔''

''اچھا......'' وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوا تھا...... ابھی دیکھ لیتے ہیں، کیا ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! میں استغاثہ کے گواہ فاروق کو کٹہرے میں بلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''اجازت ہے......'' جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

میرا مؤکل اور اس مقدمے کا ملزم عرفان پیشے کے اعتبار سے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ایک الیکٹریشن تھا۔ اس کی رہائش گاندھی گارڈن یعنی چڑیا گھر کے نزدیک تھی اور وہ سولجر بازار میں واقع ایک دکان سے منسلک تھا۔ اس بڑی سی دکان پر رنگ وروغن، ہارڈ ویئر کا سامان، الیکٹرک کا سامان وغیرہ سب کچھ ملتا تھا اور دکان کا مالک ضرورت مندوں کو الیکٹریشن، پلمبر، رنگ ساز وغیرہ کی سروس بھی مہیا کرتا تھا۔ عرفان اسی دکان کے توسط سے مقتولہ کے گھر اپنے ہی کی فٹنگ وغیرہ کا کام کرنے پہنچا تھا۔ استغاثہ نے فاروق نامی جس گواہ کو ابھی کٹہرے میں بلانے کی بات کی تھی، وہ عرفان کا محلے دار تھا اور یہ لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر چائے وغیرہ بھی پی لیا کرتے تھے۔

جب فاروق کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا تو عرفان کے چہرے پر مجھے الجھن بھری سلوٹیں ابھرتی نظر آئیں جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ عرفان یہاں اس کی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اگر فاروق استغاثہ کی جانب سے پیش ہوا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ عرفان کے خلاف کسی قسم کا زہر اگلنے والا تھا۔

فاروق سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد فارغ ہوا تو وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم عرفان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاروق سے سوال کیا۔ ''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں...... بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' فاروق نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''کس طرح جانتے ہو؟'' وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کس طرح کا کیا مطلب......!'' فاروق نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''عرفان میرا محلے دار ہے۔ ہماری تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی ہے۔''

وکیل استغاثہ مخصوص انداز میں جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''صرف ملاقات ہی ہوتی ہے یا بات چیت بھی ہوتی ہے؟''

''ملاقات کا مطلب، بات چیت ہی ہے جناب۔'' فاروق نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ ''ہم اکثر چائے کے ہوٹل میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔''

''گپ شپ کرتے ہیں......'' وکیل استغاثہ نے پرسوچ انداز میں دہرایا۔ ''اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہے؟''

''جی ہاں، دوستی ہے لیکن......!''

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو وکیل استغاثہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ......'' استغاثہ کا گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دوستی اپنی جگہ ہے اور سچائی بیان کرنا اپنی جگہ!''

''اس بات کا بھلا کیا مطلب ہوا؟'' وکیل استغاثہ نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

میں وکیل استغاثہ کے انداز کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ بھولے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملزم کے گرد اپنی جرح کے گھیرے کو تنگ کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ دلچسپی سے اس کی کارکردگی کا تماشا دیکھنے لگا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ وہ میرے مؤکل کو اپنے جال میں پھنسا نہیں پائے گا۔

''مطلب یہ کہ جناب......!'' گواہ نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''میں نے ابھی بھری عدالت میں سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے اس لیے آپ مجھ

سے جو بھی پوچھیں گے اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گا، یعنی میری اور عرفان کی دوستی سچائی کے راستے میں دیوار نہیں بن سکے گی۔''

''ویری گڈ!'' وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کی بات کو سراہتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گا۔ مجھے تم سے عرفان اور مقتولہ اینا کے بارے میں چند باتیں پوچھنا ہیں۔''

''جی پوچھیں...... میں حاضر ہوں۔''

''کیا کبھی ملزم نے تم سے اینا کا تذکرہ کیا تھا......؟''

''مقتولہ کی موت سے چند روز پہلے عرفان نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔'' گواہ نے بتایا۔

''کس قسم کا ذکر؟''

''یہی کہ وہ بہت اچھی عورت ہے۔ دل کی سخی اور خوب صورت ہے۔'' گواہ وضاحت کرنے لگا۔ ''بہت ہی پرکشش اور طرح دار ہے۔ اس نے میری بہت تعریف کی ہے اور ایک سو روپے مجھے زیادہ دیے ہیں۔''

''ملزم نے یہ باتیں تمہیں پرجوش انداز میں بتائی تھیں یا اس کا بیان سرسری سا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے چھیڑنے والے انداز میں پوچھا۔

''بہت جوش و خروش سے جناب۔'' گواہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ ''یہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا جیسے اسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری مزدوری کے برابر انعام سمجھ میں نہیں آرہا۔ سچ بتاؤ، یہ چکر کیا ہے......!''

''پھر ملزم نے تمہیں کیا جواب دیا تھا؟''

''اس نے کہا کہ یہ خود بھی سو روپے انعام دیکھ کر حیران ہوا تھا۔'' استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔ ''جب اس نے اپنی الجھن کو دور کرنے کے لیے اینا سے پوچھا کہ اتنا بھاری انعام کیوں...... تو پتا ہے، مقتولہ نے عرفان کو کیا جواب دیا تھا......''

''نہیں پتا......'' وکیل استغاثہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''عدالت جاننا چاہتی ہے۔ تم تفصیل سے اور پوری سچائی کے ساتھ بتاؤ۔ تمہیں اسی غرض سے یہاں بلایا گیا ہے۔''

''میں وہی بتا رہا ہوں جو عرفان نے مجھے بتایا تھا۔'' گواہ فاروق ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''عرفان کے سوال کے جواب میں مقتولہ نے اس کے بازوؤں کی مچھلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا تھا...... یہ سو روپے ان خوب صورت مچھلیوں کی پرورش کے لیے ہیں، تم ان پیسوں کے بادام خرید کر کھانا......'' لمحاتی توقف کر کے گواہ نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جب عرفان مجھے یہ قصہ سنا رہا تھا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔''

''گویا اس خوب صورت اور سنسنی خیز تجربے کی وجہ سے ملزم کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے......؟'' وکیل استغاثہ نے ذومعنی انداز میں استفسار کیا۔

''جی...... جی ہاں...... بالکل!'' گواہ نے بڑے وثوق سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وکیل استغاثہ اپنے گواہ کو چھوڑ کر دوبارہ ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''کیا تم اپنے دوست فاروق کے بیان کو جھٹلا سکتے ہو...... تم نے یہ سب اس سے کہا تھا یا نہیں......؟''

''جی، میں نے کہا تھا مگر اس کا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' میرے مؤکل نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ مقتولہ نے میرے بازوؤں کی مچھلیوں کی تعریف کی تھی لیکن اس تعریف کو منفی انداز میں نہیں لینا چاہیے۔''

''حالانکہ تھوڑی دیر پہلے تم معزز عدالت کے سامنے اس بات سے انکار کر چکے ہو۔'' وکیل استغاثہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''جب میں نے سوال اٹھایا تھا کہ مقتولہ نے انعام دیتے وقت کام کے بجائے تمہارے بازوؤں کی مچھلیوں کی تعریف کیوں کی تو تمہارا پرزور جواب تھا...... ایسا کچھ نہیں ہوا تھا...... اور گواہ فاروق کے بیان کے بعد یہ ثابت ہو چکا کہ ایسا ہوا تھا...... تم نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔ ''اگر مقتولہ نے ملزم کی قابلِ رشک صحت ہی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے وہ سو روپے انعام میں دیے تھے تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ وکیل سرکار خوامخواہ اس ایشو کو اچھال کر میرے مؤکل کی کردارکشی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں......''

''جنابِ عالی! یہ بہت ہی حساس اور اہم ایشو ہے۔'' وکیل استغاثہ نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے ملزم پر جرح کا موقع دیا جائے۔''

''آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔'' جج نے وکیل

استغاثہ کی استدعا کو درست مانتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔

''تو جب مقتولہ نے تمہاری مزدوری سے زیادہ معاوضہ دیا اور یہ کہا کہ اس سو روپے کے تم بادام خرید کر کھانا تاکہ تمہارے بازوؤں کی یہ مچھلیاں سدا تندرست و توانا رہیں تو کیا تمہارے دل میں خوشی سے لڈو نہیں پھوٹے تھے......؟'' وکیل استغاثہ نے تیز نظر سے ملزم کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں وکیل صاحب!'' میرے موکل نے پُراعتماد انداز میں وکیل استغاثہ کی جرح کا سامنا کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ خوامخواہ حقیقت کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں......''

''تو پھر حقیقت کیا ہے؟'' وکیل استغاثہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''یہ تم خود ہی عدالت کے سامنے بیان کر دو۔''

''یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ مقتولہ انیتا نے میرے کام سے خوش ہو کر مجھے انعام میں سو روپے دیے تھے۔'' ملزم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور مجھے اس انعام کو حاصل کرنے کی خوشی بھی ہوئی تھی لیکن ''لڈو پھوٹنے'' جیسے الفاظ استعمال کر کے میری نیت پر شک کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ بس، مجھے خوشگواری محسوس ہوئی تھی اور اس واقعے کا ذکر میں نے اپنے دوست فاروق سے بھی کیا تھا لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے شاکی نظر سے کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ فاروق کی جانب دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آج میرا دوست میرے ہی خلاف گواہی دینے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے......''

''تم نے ایک دوست کو تو مقتولہ کی جانب سے ملنے والے بھاری انعام کے بارے میں خوب جوش و خروش سے بتایا......'' وکیل استغاثہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن دوسرے دوست کو اس واقعے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی......ہیں نا؟''

''دوسرا دوست......!'' ملزم نے الجھن زدہ لہجے میں دہرایا اور پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ میرے کس دوست کی بات کر رہے ہیں؟''

''چونک گئے نا......'' وکیل استغاثہ فاتحانہ نظر سے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ ڈر گئے نا......؟''

''میں نہ تو چونکا ہوں اور نہ ہی مجھے کوئی ڈر یا خوف ہے۔'' ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں البتہ، آپ کی بات نے میرے ذہن کو الجھا ضرور دیا ہے۔ بتائیں، آپ میرے کس دوست کی بات کر رہے ہیں؟''

''امیر علی کی بات کر رہا ہوں......'' وکیل استغاثہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ امیر علی جو تمہارے ساتھ ہی سولجر بازار والے مدینہ الیکٹرک اسٹور سے منسلک ہے اور تمہارا ہم پیشہ بھی ہے یعنی کہ......الیکٹریشن!''

''اچھا اچھا......وہ امیر علی!'' ملزم اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''دیکھا، کتنی جلدی یاد آ گیا۔'' وکیل استغاثہ ملزم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے امیر علی کو اس سو روپے والے انعام والے واقعے سے آگاہ کیوں نہیں کیا تھا؟''

''یہ کوئی خاص بات نہیں تھی اس لیے میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ سب کو بتاتا پھروں۔'' ملزم نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

''خاص بات تو تھی۔'' وکیل استغاثہ مخصوص انداز میں اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے امیر علی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا تو اس کے پیچھے تمہارا ایک مذموم مقصد کارفرما تھا......بولو......تم نے ایک خاص وجہ سے امیر علی کو یہ بات نہیں بتائی تھی نا......؟''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......'' ملزم کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔

''سب سمجھ میں آ جائے گا۔ بس، ایک سنٹ صبر......'' یہ کہتے ہوئے وکیل استغاثہ جج کی جانب مڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جناب عالی! میں استغاثہ کے اگلے گواہ امیر علی کو کٹہرے میں بلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اجازت ہے۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد استغاثہ کا گواہ فاروق عدالت کے کمرے سے باہر چلا گیا اور اس کی جگہ امیر علی وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

امیر علی کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ میں نے استغاثہ کے اس گواہ کے بارے میں اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی تھی۔ گواہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ گواہوں والے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔

''امیر علی! کیا یہ درست ہے کہ تم بھی اسی دکان سے منسلک ہو جہاں ملزم کام کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے......مدینہ الیکٹرک اسٹور؟''

''جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' گواہ

نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم دونوں ہی مدینہ الیکٹریشن والوں کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''تم ملزم کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''لگ بھگ پانچ سال سے......''

''پانچ سال اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے۔'' وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم ملزم کی عادات اور طور طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو گے؟''

''جی، جی ہاں...... بالکل......'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

استغاثہ کے گواہ امیر علی کی حرکات و سکنات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کافی پڑھا سکھا کر عدالت کے کمرے تک لایا گیا ہے۔

''امیر علی!'' وکیل استغاثہ گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا ملزم نے تم سے مقتولہ کی کسی فیاضی کا ذکر کیا تھا؟''

''فیاضی...... کیسی فیاضی؟'' گواہ کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

گواہ کے اس استفسار پر وکیل استغاثہ نے پوری تفصیل کے ساتھ اسے وہ واقعہ سنایا جب چار اکتوبر کو پہلی مرتبہ ملزم مقتولہ کے گھر اے سی لگانے گیا تھا اور مقتولہ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس کی اجرت کے علاوہ سو روپے اسے انعام میں بھی دے ڈالے تھے۔

گواہ نے پوری بات توجہ سے سنی اور وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عرفان نے مجھے تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی البتہ......'' وہ بولتے بولتے اچانک ایسے رک گیا جیسے اسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو۔

وکیل استغاثہ بھلا اس نادر موقع سے کیسے فائدہ نہ اٹھاتا۔ اس نے بہ آواز بلند سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''البتہ...... کیا؟''

''عرفان نے مجھ سے ایک عجیب بات کی تھی۔'' گواہ متذبذب لہجے میں بولا۔

''کیسی عجیب بات!'' وکیل استغاثہ کی آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ''ذرا تفصیل سے بتاؤ......'' عدالت

سچائی جاننا چاہتی ہے۔''

''جب یہ مقتولہ کے گھر میں ''اے سی'' فٹ کر کے آیا تھا تو اس کے دوسرے دن اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر نجیب اللہ یا انیتا کے گھر سے الیکٹرک کے کسی کام کے لیے کوئی فون آئے تو میں ہرگز وہاں نہ جاؤں بلکہ اس گھر میں ہمیشہ یہی جایا کرے گا۔'' گواہ امیر علی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اور یہی بات مجھے عجیب سی لگی تھی۔''

''تو تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ ایسا کیوں!'' وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''تم مقتولہ کے گھر میں کسی کام سے کیوں نہیں جاسکتے......؟''

''اصل میں بات یہ ہے جناب کہ ''مدینہ الیکٹرک اسٹور'' پر الیکٹریشن صرف ہم دونوں ہی ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یا تو عرفان کہیں جاتا ہے یا پھر میں......'' لحاتی توقف کر کے گواہ امیر علی نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جب میں نے عرفان سے اس حوالے سے سوال کیا تو اس نے ایک بہانہ بنا دیا تھا......''

وکیل استغاثہ نے سنسناتے ہوئے الفاظ میں پوچھا۔ ''کیسا بہانہ......؟''

''عرفان نے مجھے بتایا تھا کہ مقتولہ کی طرف اس کی اجرت کے کچھ پیسے باقی ہیں۔'' امیر علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر دوبارہ بھی اس گھر میں یہی جائے گا تو وہ رکی ہوئی رقم وصول ہوگی ورنہ اس کے پیسے مارے جائیں گے۔''

''تو تمہارے خیال میں ملزم نے تم سے غلط بیانی کی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''جبکہ اس بہانے کی آڑ میں اس کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ پل رہا تھا؟''

''منصوبے کے پلنے کے بارے میں تو میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''عرفان نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔''

''او کے......!'' وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس خارج کی اور جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے گواہ سے استفسار کیا۔ ''تم نے ملزم کی بات کے جواب میں کیا کہا تھا؟''

''میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ اس سلسلے میں بالکل مطمئن ہو جائے۔''

''یعنی تم اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ آئندہ اگر مقتولہ کے گھر سے کسی بھی کام کے سلسلے میں بلاوا آئے گا تو تم ادھر کا رخ ہرگز ہرگز نہیں کرو گے۔'' وکیل استغاثہ نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''بلکہ وہاں صرف اور صرف ملزم ہی جایا کرے گا۔''

''جی ہاں...... میں نے اس سے یہی وعدہ کیا تھا۔''

''گویا اس دن کے بعد سے ملزم ہی مقتولہ کے گھر جاتا رہا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''جی...... یہی حقیقت ہے۔'' گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے...... اس روز کے بعد سے لے کر وقوعہ کے روز تک ملزم کتنی مرتبہ مقتولہ کے گھر گیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے گواہ امیر علی سے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے...... دو یا تین مرتبہ......'' گواہ نے بڑی سادگی سے بتایا۔

''دو یا تین مرتبہ......'' وکیل استغاثہ زیرلب دہراتے ہوئے جج کی جانب مڑا پھر... بہ آوازِ بلند بولا۔ ''یور آنر! ملزم معزز عدالت کے سامنے سراسر غلط بیانی سے کام لے رہا ہے کہ مقتولہ کی زبانی اپنی صحت خصوصاً بازوؤں کی مچھلیوں کی تعریف سن کر اس کے من میں خوشی کے لڈو نہیں پھوٹے تھے۔ استغاثہ کے موقف کی سچائی گواہ امیر علی کے بیان سے صاف ظاہر ہو گئی ہے...... اس کے من میں خوشی کے لڈو پھوٹے تھے جبھی اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والے دوسرے الیکٹریشن کو کسی بہانے مقتولہ کے گھر جانے سے روک دیا تھا تاکہ یہ مقتولہ کے قریب ہو کر اپنا مقصد حاصل کر سکے......'' لحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''یور آنر! شکل وصورت سے معصوم نظر آنے والا یہ شخص، اندر سے انتہائی عیار اور مکار ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اسے کڑی سے کڑی سزا دی جائے...... دیٹس آل یور آنر۔''

وکیل استغاثہ نے آخری جملہ اس انداز میں ادا کیا تھا کہ جج نے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے خاصے متعجب انداز میں پوچھا۔

''کیا تم نے اپنے ساتھ کام کرنے والے امیر علی سے اس قسم کی کوئی بات کی تھی؟''

''جی سر...... میں نے امیر علی کو مقتولہ کے گھر جانے سے منع کیا تھا۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''بیگ صاحب!'' جج مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب آپ اپنے مؤکل کے حوالے سے کیا کہیں گے......؟''

عدالت میں کسی کیس کی سماعت کے دوران میں جج عموماً خاموش بیٹھا سنتا رہتا ہے۔ دونوں پارٹیوں کی جانب سے ان کے وکیل اپنا اپنا موقف پیش کر کے کیس کو جیتنے کے لیے زور لگاتے ہیں۔ جج دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد تمام تر حالات و واقعات اور شواہد کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرتا ہے لیکن کبھی کسی خاص موقع پر وہ براہِ راست ملزم سے سوال بھی کرتا ہے جیسا کہ ابھی اس نے پوچھا تھا پھر مجھ سے بھی استفسار کیا تھا۔

میں نے جج کی فرمائش پر اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) کا رخ کیا پھر ملزم اور اپنے موکل سے کوئی سوال کرنے سے پہلے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! ابھی بھری عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا......'' پھر میں اپنے موکل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عرفان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''جیسا کہ تم معزز عدالت کے سامنے اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہو کہ تم نے ہی اپنے ساتھی امیر علی کو آئندہ کے لیے کسی بھی کام سے مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔ تمہارے اس فعل کی وجہ سے استغاثہ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو رہا ہے۔ استغاثہ کا موقف ہے کہ تم چونکہ کسی گہری سازش کے تحت مقتولہ کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے اس لیے تم چاہتے تھے کہ تمہارے سوا اور کوئی وہاں نہ جائے اور تمہیں اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کا زیادہ سے زیادہ موقع میسر......''

''استغاثہ کو کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہیں ہے......'' وکیل استغاثہ نے تیز چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہی حقیقت ہے......ایک ٹھوس حقیقت!''

''میں بات کر رہا ہوں نا......!'' میں نے ترکی بہ ترکی وکیل استغاثہ کو منہ توڑ جواب دیا۔ ''جب تک میں اپنی جرح مکمل نہ کر لوں، آپ کو مداخلت سے پرہیز کرنا چاہیے۔'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میرے فاضل دوست کو صبر اور سکون کی تلقین فرمائی جائے تاکہ میں ملزم پر نہایت ہی اہم جرح مکمل کر سکوں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کو مذکورہ ہدایات جاری کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔''

میں دوبارہ اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ...... استغاثہ کو تمہارے بارے میں شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی ہے کہ تم نے اپنے کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر استغاثہ کے گواہ امیر علی کو کسی بھی کمپلین پر مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔ اس بات میں کس حد تک حقیقت ہے؟''

''کسی بھی حد تک کوئی حقیقت نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرا ایسا کوئی مقصد تھا ہی نہیں جس کے حوالے سے استغاثہ کو کسی قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا ہو......''

''لیکن تم اس بات سے تو انکار نہیں کر سکتے نا کہ تم نے استغاثہ کے گواہ امیر علی کو کسی بھی کام سے مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر رکھا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ابھی چند لمحے پہلے تم نے معزز عدالت کے روبرو اس امر کا اقرار کیا ہے۔''

''جی ہاں......'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں نے واقعی امیر علی کو مقتولہ کے گھر کسی کام کے سلسلے میں جانے سے روک دیا تھا لیکن اس کی وجہ وہ نہیں جیسا کہ استغاثہ سمجھ رہے ہیں۔''

''اگر وہ وجہ نہیں تھی تو پھر کیا وجہ تھی؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''جو بھی وجہ تھی، اس کے دو پہلو ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ذرا وضاحت سے بیان کرنا چاہوں گا۔''

میں نے گردن گھما کر سوالیہ نظر سے جج کی جانب دیکھا۔ جج نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم لہجے میں ملزم سے کہا۔ ''اجازت ہے......''

''دیکھیں جناب! میں نے دو پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔'' ملزم عرفان نے بڑے پُراعتماد انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''پہلا پہلو تو یہ ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے والے الیکٹریشن امیر علی کی خوبیوں اور خامیوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ شخص......'' ملزم نے وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ امیر علی کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص اگرچہ اپنے کام میں بہت ماہر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مختلف معاملات میں ڈنڈی مارنے کے لیے بھی خاصا مشہور بلکہ خاصا بدنام ہے۔ یہ جہاں بھی کام کرنے کے لیے جاتا ہے، دوگنا اور تین گنا ریٹ لگاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سامان وغیرہ کے سلسلے میں بھی فراڈ کرتا ہے۔ سامان کی جو فہرست امیر علی پارٹی کو دیتا ہے اس میں مختلف چیزوں کے نرخ بڑھا چڑھا کر لگائے

گئے ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مقتولہ کبھی امیر علی کے دستِ ستم کا نشانہ بنے......''

''اور وہ دوسرا پہلو کیا ہے؟'' ملزم سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے سوال داغ دیا۔

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں چونکہ دل سے مقتولہ کی بہت عزت کرنے لگا تھا اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ امیر علی کے ہاتھوں بے وقوف بنے۔ بس، مقتولہ سے اسی ہمدردی کے جذبے کے تحت میں نے امیر علی کو کسی بھی کام کے لیے اس کے گھر جانے سے روک دیا...... اس کے علاوہ اور کوئی بھی بات نہیں۔''

''تمہارے اس جذبۂ ہمدردی کی تو واقعی بہت قدر کرنا چاہیے۔'' میں نے سراہنے والی نظر سے ملزم عرفان کی طرف دیکھا۔ ''مقتولہ نے ایک بھاری ٹپ دے کر تم پر احسان کیا تھا۔ وہ اس کے بعد بھی یقیناً تمہیں کام کے اصل معاوضے کے علاوہ اضافی رقم دیتی رہی ہوگی لہٰذا اس کے مفادات کی نگرانی اور تحفظ تم پر لازم ٹھہرا تھا۔ تم نے امیر علی کو اس کے گھر جانے سے روک کر جو بھی کیا، تمہارا وہ عمل قابلِ تعریف اور لائقِ تحسین ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کے گواہ امیر علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''امیر علی! کیا یہ درست ہے کہ تم اپنے کام میں بے انتہا مہارت رکھتے ہو؟''

اس نے ایک لمحے کے لیے اس سوال پر چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''جی، اللہ کا کرم ہے...... پچھلے پندرہ سال سے اس فیلڈ میں ہوں۔ اگر انسان طویل عرصے تک ایک کام کرتا رہے تو اس کام میں مہارت حاصل ہو ہی جاتی ہے۔''

''یعنی ہر وہ مہارت جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے ملزم نے کیا ہے؟'' میں نے ذومعنی انداز میں سوال کیا۔

''جی...... کیا مطلب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''امیر علی! مہارت کا کوئی مذہب، کوئی مسلک، کوئی کلچر، کوئی ملک، کوئی حلیہ اور کوئی نام نہیں ہوتا۔ بس اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ منفی اور مثبت...... کیا تم میری بات سے انکار کرو گے؟''

''ن...... نہیں......'' وہ متذبذب انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ملزم نے آپ کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ درست ہے؟''

''کیا مطلب......؟'' وہ مزید الجھ گیا۔ ''میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں......''

''مطلب بہت واضح ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ملزم نے آپ کے کام کی تعریف کرنے کے علاوہ معزز عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ تم اپنے پیشے کے ساتھ مخلص نہیں ہو، بے ایمانی اور فراڈ تمہاری سرشت میں شامل ہے۔ اکثر لوگوں کو تمہارے کام سے شکایت ہے اور......''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔ ''اگر تم ایسے نہیں تو پھر ملزم نے تمہارے بارے میں اس نوعیت کا بیان کیوں دیا......؟''

''اس میں سراسر ملزم کی بدنیتی کا دخل ہے۔'' وہ نفرت آمیز نظر سے میرے مؤکل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بدنیتی...... کیسی بدنیتی؟'' میں نے استغاثہ کے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ خاموش نہ رہ سکا اور اپنے گواہ کے تحفظ میں اس نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! میرے فاضل دوست ایک ہی نکتے کو گھما پھرا کر معزز عدالت کا وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات اس کیس کی ابتدا ہی میں کلیئر ہو گئی تھی کہ ملزم ایک بدنیت اور دھوکے باز شخص ہے۔ اس نے اپنی صحت، جسمانی وجاہت خصوصاً بازوؤں کی ابھری ہوئی خوب صورت مچھلیوں......''

''ایک منٹ وکیل صاحب......!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر وکیل استغاثہ کو مزید بولنے سے روک دیا۔ ''آپ بھی تو کافی دیر سے ایک ہی رٹا رٹایا سبق عدالت کو سنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملزم نے اپنے بازوؤں کی صحت مند مچھلیوں کی نمائش کر کے مقتولہ کو اپنے جال میں پھنسایا اور اپنا کام کر کے چلتا بنا...... مچھلیوں کا ذکر بہت ہو چکا میرے فاضل دوست، اب ذرا دوسری سمندری مخلوقات کا تذکرہ بھی ہو جائے۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں، مچھلیاں صرف سمندر ہی میں پائی جاتی ہیں؟'' وہ خاصے اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

وکیل استغاثہ کا یہ سوال مبنی بر حماقت تھا جو وقتی اشتعال کا نتیجہ بھی ہو سکتا تھا لیکن میں نے بڑے تحمل سے

جواب دیا۔
''نہیں...... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں بلکہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ مچھلیاں سمندر کے علاوہ دریاؤں، نہروں، تالابوں، جوہڑوں اور فش فارمز میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن......'' ڈرامائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''لیکن چونکہ ہم سمندر کے کنارے آباد ہیں اور کراچی میں زیادہ تر سمندر سے حاصل ہونے والی مچھلی استعمال کی جاتی ہے، اس لیے میں نے سمندر کا ذکر کیا تھا اور......''
''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ کی سرسراتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ''جناب عالی! اس وقت زیرسماعت کیس میں ملزم کے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کا ذکر ہو رہا ہے اور میرے فاضل دوست سمندری مچھلیوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور عین ممکن ہے، یہ مچھلیوں کے ساتھ ہی دیگر سمندری حیات جھینگے، کچھوے، کیکڑے اور نہ جانے کیا الابلا کو پکڑ کر عدالت میں حاضر کر دیں۔''
''ایسی کوئی بات نہیں میرے دوست۔'' میں نے بڑے سکون سے کہا۔ ''میرا سمندر کی طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ مچھلیوں کے ذکر پر آپ ہی نے مجھے مجبور کیا تھا ورنہ میں تو کچھ اور ہی کہنے والا تھا۔''
''کیا کہنے والے تھے آپ......؟'' وہ تیز نظر سے مجھے گھورنے لگا۔
''آپ کچھ کہنے کا موقع دیں گے تو میں کہوں گا نا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو استغاثہ کے گواہ سے سوال جواب کر رہا تھا اور آپ بیچ میں کود پڑے حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر ''آبجیکشن'' کی گنجائش نکلتی......'' پھر میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے گواہ پر اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع دیا جائے۔''
جج نے مختصر الفاظ میں وکیل استغاثہ کو ہدایت جاری کر دی کہ وہ اعتراض برائے اعتراض کی پالیسی کو موقوف کر کے مجھے اپنا کام مکمل کرنے دے۔
میں سبک قدموں سے چلتے ہوئے وٹنس باکس کی جانب بڑھ گیا اور استغاثہ کے گواہ امیر علی الیکٹریشن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''غالباً...... آپ ملزم کی کسی بدنیتی کا ذکر کر رہے تھے کہ...... اس نے بدنیتی کی وجہ سے آپ کے خلاف اس نوعیت کا بیان دیا تھا؟''
''جی ہاں، بالکل......'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میرا یہی خیال ہے۔''
''ذرا وضاحت کر دیں۔'' میں نے اسے گھیرنے کے لیے اپنا جال بچھانا شروع کر دیا۔ ''ملزم کی بدنیتی سے آپ کی کیا مراد ہے، وہ آپ سے اس قسم کی دشمنی کیوں کر رہا تھا؟ کیا آپ دونوں کے بیچ کسی نوعیت کا کوئی لین دین تھا؟''
''کوئی لین دین نہیں تھا......''
''پھر...... ملزم کے ایسا بیان دینے کی کوئی خاص وجہ؟''
''وہ...... میرا مطلب ہے یہ!'' گواہ نے انگلی سے میرے مؤکل کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ''یہ مجھ سے جلتا تھا۔''
''جلتا تھا...... بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے انجان بننے کی اداکاری کی۔ ''آپ الیکٹریشن ہیں یا الیکٹرک سٹی۔ میرا مطلب ہے، بجلی...... ملزم آپ سے کیسے جلتا تھا؟''
''میں اپنی صلاحیتوں کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''یہ میری مہارت سے جلتا تھا، مجھ سے حسد کرتا تھا۔''
''ملزم آپ سے جلتا تھا، آپ کی پیشہ ورانہ مہارت اور صلاحیت سے اسے شدید نوعیت کا حسد محسوس ہوتا تھا اسی لیے اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آپ کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور آپ کو بددیانت مشہور کرنے کی کوشش کی۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کچھ غلط تو نہیں بول دیا؟''
''جی نہیں۔'' وہ شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے جو کچھ بیان کیا، وہی حقیقت ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی......''
وہ بات ادھوری چھوڑ کر الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا تو میں نے فوراً سوال کر ڈالا۔ ''کون سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟''
''یہی کہ...... آپ تو وکیل صفائی ہیں۔''
''اگر میں اس کیس میں وکیل صفائی ہوں تو......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔
''آپ کو تو اپنے مؤکل کی حمایت کرنا چاہیے نا......'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔
''تو میں نے کب اپنے مؤکل کی مخالفت کی ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''آپ نے تھوڑی دیر پہلے ملزم کے حوالے سے جو کچھ

بیان کیا ہے، وہ اس کے خلاف ہی نہ جاتا ہے۔'' وہ بڑے عاقلانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' کہ اس نے میرے خلاف کوئی سازش کی تھی، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے بددیانت مشہور کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''ایسی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔'' میں نے اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑنا ضروری جانا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔'' میں نے دراصل آپ کے موقف کو ذرا مختلف اور واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ سب تو آپ کے دعوے کا حصہ ہے اور مجھے اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔''

''مطلب..... کیا آپ اپنے مؤکل کو سچا سمجھتے ہیں.....''
اس کی سرسراتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں ابھری۔

''جی بالکل..... میرا مؤکل اپنی جگہ بالکل درست ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔'' میں اس کے بیان سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔''

''گویا آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں؟'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''ایک سو ایک فیصد.....'' میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔'' اور میں اپنے اس دعوے کو معزز عدالت کے سامنے ثابت بھی کرسکتا ہوں۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ اپنے گواہ کے دفاع کے لیے ایک مرتبہ پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔'' یور آنر..... وکیل صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ وہ استغاثہ کے معزز گواہ کو جھوٹا کہہ رہے ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔''

''میں نے استغاثہ کے گواہ امیر علی کو صرف جھوٹا نہیں کہا جناب عالی!'' میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔'' بلکہ میں بھری عدالت میں اپنے اس دعوے کو درست ثابت بھی کرسکتا ہوں۔''

''آپ کے پاس ایسا کون سا ثبوت ہے جس سے گواہ کی دروغ گوئی ظاہر ہوتی ہو؟'' وکیل استغاثہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔

میں نے وکیل مخالف کے سوال کو درخور اعتنا جانتے ہوئے جج سے کہا۔'' جناب عالی! بہت پرانا محاورہ ہے کہ..... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ڈرامائی انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''یور آنر..... ہمارے تجربہ کار بزرگوں نے برسوں کے مشاہدے، تجربے اور عرق ریزی کے بعد یہ محاورے تخلیق کیے ہیں جو آج کتابوں کی زینت بنے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر محاورے کے اندر کوئی نہ کوئی حکمت اور دانش چھپی بیٹھی ہے۔ بس، اس حکمت اور دانش کو باہر نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں ابھی اپنے بیان کردہ محاورے کے اندر سے حقائق کی اصل شکل نکال کر معزز عدالت کے سامنے پیش کرنے والا ہوں۔''

جج پوری توجہ اور دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ حاضرین عدالت کی نظریں بھی مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں جیسے میں کوئی مداری ہوں۔ ابھی کوئی حیرت انگیز کرتب دکھا کر انہیں حیران و پریشان کردوں گا۔ وکیل استغاثہ کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ نفرت آمیز بے یقینی سے مجھے گھور رہا تھا۔

''جناب عالی.....!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کو گہری سنجیدگی سے آگے بڑھاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔'' جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کیا ہے کہ میں بھری عدالت میں استغاثہ کے گواہ امیر علی کی دروغ گوئی بہ الفاظ دیگر..... اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عرفان کی بے گناہی ثابت کر کے دکھا دوں گا تو اس دعوے کو بروئے کار لانے کے لیے میں ایک شخص کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں..... اگر آپ کی اجازت ہو تو.....!''

''وہ شخص کون ہے؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔'' اور اس کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟''

''جناب عالی! میں ابھی جس گواہ کو عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا زیر سماعت کیس سے براہِ راست تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس کی گواہی استغاثہ کے گواہ امیر علی کے جھوٹ کی قلعی کھول دے گی..... اس شخص کا نام ہے..... شاکر علی!''

''شاکر علی کون؟'' جج نے استفسار کیا۔

''مدینہ الیکٹرک اسٹور کا مالک شاکر علی!'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔'' جس کی دکان سے یہ دونوں افراد منسلک ہیں..... اس مقدمے کا ملزم عرفان اور استغاثہ کا گواہ امیر علی.....''

جج نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔'' کیا شاکر علی اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے؟''

''کمرے کے اندر نہیں، البتہ وہ کمرے کے باہر ضرور موجود ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں مدینہ الیکٹرک اسٹور کے مالک اور ملزم و گواہ کے ''سیٹھ'' شاکر علی کو کٹہرے میں

بلا کر اس سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

''اجازت ہے......'' جج نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شاکر علی وٹنس باکس میں موجود تھا۔ یوں تو عدالت میں موجود ہر شخص کی نظر اس وقت مجھ ہی پر لگی ہوئی تھی لیکن خصوصی طور پر میں وکیل استغاثہ کی نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی پٹاری میں سے کون سا سانپ نکالنے والا ہوں۔ میں اپنے حریف کو متذبذب اور الجھن زدہ چھوڑ کر ایک دم شاکر علی کی طرف بڑھ گیا۔

شاکر علی کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ متناسب بدن کا مالک اور میانہ قد شخص تھا جس کی کنپٹیاں سفید ہو چکی تھیں۔ وہ ایک سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ میں نے چند روز پہلے اس سے ایک تفصیلی ملاقات کی تھی جس کے نتیجے میں وہ سچائی کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ یہ گواہی اسی آمادگی کا ثبوت تھی۔ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا تو میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''شاکر صاحب! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''جی، اللہ کا شکر ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''بس پچھلے دنوں کچھ موسم کے اثرات تھے۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔''

''شاکر صاحب! آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ آج آپ کو کس سلسلے میں گواہی کے لیے یہاں بلایا گیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''جی، میں جانتا ہوں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ مجھ سے جو بھی سوال کریں گے میں اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گا کیونکہ میں ابھی آپ کے سامنے سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا ہوں۔''

''ویری گڈ......'' میں نے سراہنے والے انداز میں صفائی کے گواہ شاکر علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ کو ملزم کے بیان کی تصدیق یا تردید کے لیے یہاں آنے کی زحمت دی گئی ہے۔ میرے مؤکل کا دعویٰ ہے کہ استغاثہ کا گواہ امیر علی مالی معاملات میں ڈنڈی مارنے کا عادی ہے۔ یہ دونوں افراد (گواہ اور ملزم) چونکہ آپ کے پاس کام کرتے ہیں اس لیے آپ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں گے۔ آپ معزز عدالت کو بتائیں کہ آیا میرے مؤکل کا دعویٰ درست ہے یا گواہ امیر علی کی بات صحیح ہے؟ امیر علی نے ملزم کے دعوے کو سرے سے ماننے سے انکار کر دیا ہے......''

''جہاں تک امیر علی کی مالی معاملات میں ڈنڈی مارنے کی بات ہے تو میں کہوں گا کہ اس نے میرے ساتھ کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔'' گواہ شاکر علی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ کی بات نہیں ہو رہی شاکر صاحب۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''امیر علی جن گھروں میں الیکٹرک کا کام کرنے جاتا ہے، ان گھروں کے مالکان کا ذکر ہو رہا ہے۔ میرے مؤکل نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ چونکہ امیر علی الیکٹرک کے سامان میں ہیر پھیر اور بے ایمانی کرنے کا عادی ہے اس لیے اس نے امیر علی کو مقتولہ کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔ کیا آپ کی دکان سے الیکٹریشن کی سروس حاصل کرنے والے لوگوں میں سے کبھی کسی نے امیر علی کی بددیانتی کے حوالے سے ایسی کوئی شکایت آپ سے کی؟ آپ تک امیر علی کے کسی ایسے ہی کارنامے کی کوئی اطلاع پہنچی......؟''

''جی ہاں!'' شاکر علی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''امیر علی کی ذات سے اس قسم کی باتیں جڑی ہوئی ہیں۔''

''میں چند افراد کے نام گنوا رہا ہوں......'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''توفیق بھائی، مقیم فائزہ ہائٹس۔ حاجی حفیظ اللہ، رہائشی الفاطمہ اپارٹمنٹس، امتیاز حسین فرام علی پلازا، مختار شاہ، کبیرا اسکوائر......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''شاکر صاحب! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پچھلے دو سال میں کسی نہ کسی انداز میں آپ سے استغاثہ کے گواہ امیر علی کے کرتوتوں کے حوالے سے شکایت کی ہے۔ کبھی بل میں گڑبڑ، کبھی ناقص سامان کا استعمال، کبھی غیر معیاری سروس اور کبھی نرخ میں واضح فرق۔ میں نے صرف انہی لوگوں کے نام گنوائے ہیں جن کو بہ وقتِ ضرورت میں گواہی کے لیے عدالت میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی آپ کے پاس بہت سی شکایات پہنچتی رہتی ہوں گی؟''

''آپ نے بالکل درست کہا۔'' شاکر علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''امیر علی کے حوالے سے اس قسم کی شکایات عام ہے۔''

''اس کے باوجود بھی...... آپ نے اسے اپنی دکان پر رکھا ہوا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

"جی ہاں..... اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا آپ وہ وجہ معزز عدالت کے سامنے بیان کرنا پسند کریں گے شاکر صاحب؟"

"کیوں نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ نے تھوڑی دیر پہلے امیر علی کی جن خامیوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک پر میرا آپ سے اختلاف ہے۔"

"کس پر؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسا اختلاف شاکر صاحب؟"

"امیر علی میں بہت سی کاروباری خامیاں موجود ہیں جن کو آپ بے ایمانی اور بد دیانتی کے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں لیکن اس کی قابلیت اور اپنے کام میں مہارت پر کوئی دو رائے نہیں ہوسکتی۔ میں نے اس جیسا تجربہ کار الیکٹریشن اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں آپ کی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر علی نے کسی کو غیر معیاری سروس دی ہو۔"

"او کے..... آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں نا کہ امیر علی دیگر ہیر پھیر کے لیے مشہور ہے؟" میں نے اپنے پوائنٹ تک محدود رہتے ہوئے سوال کیا۔

"جی بالکل....." اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے گواہ شاکر علی سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے ابھی بہت کچھ پوچھنا ہے....." وکیل استغاثہ کی تیز آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا۔

جج نے آنکھیں سکوڑ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "وکیل صاحب! کیا آپ صفائی کے گواہ شاکر علی سے کوئی پوچھ تاچھ کرنا چاہتے ہیں؟"

"یس یور آنر! بس ایک دو سیدھے سادے سوالات۔" وہ گردن کو جھکاتے ہوئے بڑے احترام کے ساتھ بولا۔ "اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو....."

جج نے گردن کو معنی خیز اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اجازت ہے۔"

میں کندھے اچکاتے ہوئے اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ وکیل استغاثہ جج کی اجازت پانے کے بعد وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر شاکر علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ ایک انتہائی سنجیدہ اور سمجھ دار انسان ہیں۔"

وکیل استغاثہ کے اس تبصرے پر شاکر علی نے بس اتنا کہا۔ "آپ کی نوازش....."

"میرا یہ تجربہ ہے کہ سنجیدہ اور بردبار افراد کی یادداشت بہت مضبوط اور حافظہ نہایت ہی قوی ہوتا ہے۔" وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا پھر سوال کیا۔ "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا شاکر صاحب؟"

"میں آپ کے تجربے کو تو چیلنج نہیں کرسکتا البتہ اپنے بارے میں مجھے یقین ہے کہ مجھے اس عمر میں بھی اپنے بچپن اور لڑکپن کی ساری باتیں یاد ہیں۔"

"یہ تو لانگ ٹرم میموری ہے۔" وکیل استغاثہ نے کہا۔ "شارٹ ٹرم میموری کے بارے میں آپ کیا کہیں گے.....؟"

"وہ بھی اسی معیار کی ہے۔" شاکر علی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "مجھے کسی بات یا واقعے کو یاد نہیں رکھنا پڑتا بلکہ سب کچھ مجھے خود بخود یاد رہتا ہے۔"

"ویری گڈ..... خود بخود یاد رہتا ہے....." وکیل استغاثہ نے صفائی کے گواہ شاکر علی کے آخری الفاظ دہرائے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "پھر تو آپ کو مقتولہ انیتا کی موت یعنی وقوعہ کے دن کے بارے میں بھی سب کچھ اچھی طرح یاد ہوگا؟"

"وقوعہ پر کیا حالات پیش آئے تھے، اس کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا البتہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن دسمبر کی آٹھ تاریخ تھی۔"

"دسمبر کی آٹھ تاریخ اور سوموار کا دن..... ہیں نا؟"

"جی..... بالکل درست۔" گواہ نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"کیا آپ معزز عدالت کو بتاسکتے ہیں کہ اپنی گرفتاری سے پہلے آخری بار ملزم کب اور کس کے گھر کام کرنے گیا تھا؟"

گواہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "مقتولہ کے گھر ہی میں ایک چھوٹا سا کام تھا۔ شاید فریج کا سوئچ تبدیل کرنے گیا تھا۔"

"آپ نے میرے سوال کا پورا جواب نہیں دیا۔" وکیل استغاثہ اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے کب اور کس کے گھر کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ آپ نے یہ تو بتادیا کہ وہ مقتولہ کے گھر فریج کا سوئچ تبدیل کرنے گیا تھا لیکن معزز عدالت یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ..... کب؟"

"چھ دسمبر کو....." گواہ نے پُر اعتماد انداز میں جواب دیا۔

''چھ دسمبر.....'' وکیل استغاثہ نے گواہ کے الفاظ کو چبا چبا کر دہرایا اور بولا۔ ''یعنی وقوعہ سے ٹھیک ایک دن پہلے.....؟''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' گواہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''چھ دسمبر کو ہفتے کا دن تھا جب ملزم آخری بار..... میرا مطلب ہے، اپنی گرفتاری سے پہلے آخری بار مقتولہ کے گھر اس کے فریج کا سوئچ تبدیل کرنے گیا تھا۔ اس سے اگلے روز اتوار تھا اور اتوار کو ہماری چھٹی ہوتی ہے لہٰذا اس دن تو کہیں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور سوموار کو جب وہ دکان پر پہنچا تو تھوڑی دیر کے بعد پولیس نے وہاں پہنچ کر اسے گرفتار کرلیا تھا۔''

''آپ کی دکان صبح کتنے بجے کھل جاتی ہے شاکر صاحب؟'' وکیل استغاثہ نے اپنے اندازِ سوالات میں تھوڑی تبدیلی لاتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کوئی نو، سوا نو بجے۔'' گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے۔''

''اور ملزم کتنے بجے تک آپ کی دکان پر پہنچ جایا کرتا تھا؟''

''ساڑھے نو سے پہلے کسی بھی وقت۔'' گواہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا وقوعہ کے روز یعنی سوموار آٹھ دسمبر کو بھی ملزم ساڑھے نو بجے تک آپ کی دکان مدینہ الیکٹرک اسٹور واقع سولجر بازار پر پہنچ گیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے صفائی کے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''شاکر صاحب! بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا کیونکہ اس کے بعد میں آپ سے جو کچھ پوچھنے والا ہوں، اس کے غلط و صحیح کا دارومدار آپ کے جواب پر ہوگا۔''

''مجھے کسی قسم کی غلط بیانی کرنے کا نہ تو کوئی شوق ہے اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے۔'' گواہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آٹھ دسمبر کو ملزم دوپہر میں، لگ بھگ ایک بجے دکان پر پہنچا تھا۔''

''اس تاخیر کا سبب.....'' وکیل استغاثہ نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ نے ملزم سے پوچھا تھا کہ وہ دیر سے کیوں آیا ہے؟''

''استفسار تو لازمی بات تھی جناب۔'' گواہ شاکر علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے اس سے پوچھا تھا اور اس نے جو جواب دیا، میں اس سے مطمئن ہو گیا تھا۔''

''اور وہ جواب کیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے چونک کر پوچھا۔

''اس نے مجھے بتایا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔'' گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس نے ڈاکٹر سے دوا لے کر کھائی تھوڑا آرام کیا اور جب طبیعت ذرا سنبھلی تو یہ دکان پر چلا آیا۔''

''بہت خوب..... بڑی عمدہ اسٹوری ہے۔'' وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''طبیعت کی خرابی کے باعث ملزم لگ بھگ ایک بجے آپ کی دکان پر پہنچا اور ٹھیک دو بجے اسے آپ ہی کی دکان پر سے انیتا کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کرلیا۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا شاکر صاحب؟''

''جی نہیں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' گواہ نے وکیل استغاثہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''آٹھ دسمبر کی دوپہر دو بجے اسے پولیس نے انیتا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔''

''جب پولیس نے ملزم کو گرفتار کیا، کیا اس وقت آپ اپنی دکان پر موجود تھے؟'' وکیل استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''جی ہاں..... میری موجودگی ہی میں اس کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''آپ نے اس کی گرفتاری میں روک ڈالنے کی کوشش نہیں کی؟''

''کیسی روک.....؟'' گواہ الجھن زدہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ.....'' وکیل استغاثہ طنزیہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملزم نے تو آپ کو یہی بتایا تھا نا کہ اس روز ناشتے کے بعد اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ پھر یہ دوا لینے ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ دوا کھانے کے بعد اس نے آرام کیا اور پھر دکان پر چلا آیا تھا۔'' لمحے بھر کو رک کر وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے مخصوص انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آٹھ دسمبر بروز سوموار ملزم مقتولہ کے گھر تو جا ہی نہیں سکا تھا پھر اس نے مقتولہ انیتا کو کب اور کیسے قتل کردیا؟''

''میں نے یہ بات پولیس کو بتائی تھی۔'' گواہ نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔

''پھر..... پھر پولیس نے کیا کہا.....؟''

''میری اس وضاحت بہ الفاظِ دیگر ملزم کی صفائی کے جواب میں پولیس نے جو کچھ کہا، اسے سن کر میں خاموش

ہو گیا تھا۔'' گواہ نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔
''کیا..... پولیس نے آپ سے کیا کہا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
''پولیس کے بیان کے مطابق ملزم کو آٹھ دسمبر کی دوپہر مقتولہ کے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔'' صفائی کے گواہ شاکر علی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''پولیس کے پاس ایک عینی گواہ جواد حسین موجود تھا جس نے ملزم کو مقتولہ کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پولیس کی اتنی مضبوط دلیل کے بعد میں بھلا ان کی کارروائی میں کس طرح روک ڈال سکتا تھا۔''
''پولیس کی اس مضبوط دلیل کے بعد آپ کیا، کوئی بھی ملزم کی گرفتاری کے عمل میں روک نہیں ڈال سکتا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے بہ آوازِ بلند کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔
''یور آنر! حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ملزم وقوعہ کے روز یعنی آٹھ دسمبر کی دوپہر مقتولہ کے گھر پہنچا اور وہ بھی بغیر ان لوگوں کے بلائے۔ صفائی کا گواہ شاکر علی ابھی معزز عدالت کے سامنے اس امر کا اقرار کر چکا ہے کہ سوموار آٹھ دسمبر کو مقتولہ کے گھر سے کسی قسم کی کوئی کمپلین درج نہیں کرائی گئی تھی۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے ملزم سے چند ضروری سوال پوچھنا چاہتا ہوں......''
''ٹھیک ہے......'' جج نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ''کیا آپ کو صفائی کے گواہ شاکر علی سے مزید کچھ پوچھنا ہے؟''
''نہیں جناب......'' وکیل استغاثہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اس کے بعد شاکر علی کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سے پہلے جب ملزم کے ساتھی الیکٹریشن امیر علی کی گواہی مکمل ہو چکی تھی تو اسے بھی عدالت کے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ بات پہلے بھی وضاحت کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ عدالت میں، ایک وقت میں کسی ایک شخص کی ہی گواہی لی جاتی ہے تاکہ اس کے بیان سے دوسرے گواہوں کی گواہی متاثر نہ ہو۔
شاکر علی کے جانے کے بعد وکیل استغاثہ اس کیس کے ملزم اور میرے مؤکل عرفان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے ملزم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کی صبح یعنی سوموار آٹھ دسمبر کو ناشتے کے بعد اچانک تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی؟''

''جی ہاں۔'' ملزم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''یہ بات بالکل درست ہے۔''
''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس روز صبح ہی صبح آپ کی طبیعت کو ہوا کیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''ناشتے کے بعد اچانک میرا دل خراب ہونے لگا تھا۔ متلی اور الٹی سی محسوس ہو رہی تھی۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''اور پھر الٹی ہو بھی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔''
''اس کیفیت میں آپ فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ دوالی اور گھر آ کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔'' وکیل استغاثہ نے کہا پھر سوالیہ انداز میں ملزم کی طرف دیکھا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''
''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ملزم نے وکیل استغاثہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''
''تم نے کچھ دیر آرام کیا تو تمہاری طبیعت سنبھل گئی۔'' وکیل استغاثہ اپنی مخصوص کٹیلی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم معزز عدالت کو اس ڈاکٹر کا نام اور اس کے کلینک کا ایڈریس بتانا پسند کرو گے جس کی جادوئی اثر دوا نے تمہیں چٹکی بجاتے میں تندرست و توانا کر دیا......؟''
''وہ کلینک ہمارے محلے ہی میں ہے اور اس کا نام ہے شریف کلینک لیکن میں نے ڈاکٹر شریف سے دوا نہیں لی تھی۔'' ملزم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اور آپ کی اس بات پر بھی مجھے سخت اعتراض ہے کہ اس دوا نے چٹکی بجاتے میں مجھے بھلا چنگا کر دیا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے ملزم نے مجھے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''جب میں دکان پر پہنچا تو اس وقت بھی میری طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔''
ملزم نے جب اپنی بات ختم کرنے کے بعد مجھے دیکھا تھا تو میں نے خفیف انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں اس کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ واقعی وہ تسلی بخش جواب دے رہا تھا۔
وکیل استغاثہ، ملزم سے مستفسر ہوا۔ ''تمہارے دکان پر پہنچنے کا ذکر بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے تمہارے مقتولہ کے گھر پہنچنے کا تذکرہ ضروری ہے۔ کیا تم اس بات

سے انکار کرو گے کہ وقوعہ کی دوپہر یعنی آٹھ دسمبر سوموار کو تم مقتولہ کے گھر گئے تھے......'' لمحاتی توقف کے بعد وکیل استغاثہ نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''انکار کرنے سے پہلے ایک بات دھیان میں رکھنا کہ ہمارے پاس ایک ایسا شخص موجود ہے جس نے وقوعہ کے روز تمہیں مقتولہ کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص کا نام ہے جواد حسین۔ تمہارے انکار کی صورت میں جواد حسین کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دیا جائے گا جس کے بعد تمہارے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں بچے گی......''

''اگر آپ کے پاس کوئی گواہ نہیں بھی ہوتا تب بھی میں سچائی بیان کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی نہ جھجکتا اور کسی بھی صورت میں مجھے راہ فرار کی ضرورت پیش نہ آتی۔'' ملزم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے، تم وقوعہ کی دوپہر مقتولہ کے گھر جانے کا اقرار کر رہے ہو؟'' وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل......'' ملزم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا یور آنر......!''

وکیل استغاثہ ملزم عرفان کو چھوڑ کر جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ملزم کے اقرار کے بعد اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ وقوعہ کی دوپہر مقتولہ کے گھر گیا تھا حالانکہ اس روز مقتولہ کے گھر سے کسی قسم کی کوئی کمپلین بھی درج نہیں کرائی گئی تھی اور ملزم کی طبیعت صبح ہی سے خراب بھی تھی۔ ملزم نے ان سازگار حالات کو موقع غنیمت جانا اور اس وقت مقتولہ کے گھر پہنچ گیا جب وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا یعنی مقتولہ کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے کی رقم نکالی لیکن اس کی بری قسمت کہ یہ رقم چراتے ہوئے پکڑا گیا مگر اس نے پلک جھپکتے میں نہایت ہی چالاکی کے ساتھ اس بدقسمتی کو اپنی خوش قسمتی میں بدل ڈالا......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ڈرامائی انداز میں حاضرینِ عدالت کو دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کسی جرمیات کے ماہر نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ شاطر سے شاطر مجرم بھی اپنی کسی چھوٹی سی غلطی سے پکڑا جاتا ہے۔ یہی سب اس کیس میں بھی ہوا۔ چوری کرتے ہوئے مقتولہ نے ملزم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ اس کی زبان بندی کے لیے ملزم نے اپنی خطرناک ہتھوڑی کا استعمال کیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ مقتولہ اس جہان سے اس جہان میں منتقل ہو چکی ہے تو یہ بڑے اطمینان سے اس کے گھر سے نکل آیا لیکن چند قدم آگے آنے کے بعد ہی جواد حسین سے اس کا سامنا ہوا۔ جواد حسین اسے مقتولہ کے گھر سے نکلتے دیکھ چکا تھا۔ جواد نے اس سے کہا کہ بھائی صاحب! آپ دروازہ کھلا چھوڑ آئے ہو...... تو اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا...... جس کا گھر ہے، وہ خود ہی دروازہ بند کر لے گی......''

وکیل استغاثہ ایک مرتبہ پھر اکیوزڈ باکس کی جانب بڑھ گیا پھر ملزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے رحمی سے مستفسر ہوا۔

''کیا تم اس حقیقت سے انکاری ہو کہ استغاثہ کے گواہ جواد حسین کے ساتھ وقوعہ کے روز دوپہر میں تمہارا اس نوعیت کا مکالمہ ہوا تھا؟''

''ہرگز نہیں۔'' ملزم نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ''نہ میں نے پہلے انکار کیا ہے اور نہ ہی اب انکار کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ایک بندے کے ساتھ میرا اس نوعیت کا مکالمہ ہوا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بندے کا نام جواد حسین ہے اور...... یہ کہ وہ استغاثہ کا گواہ بھی ہے۔''

''کیس بالکل صاف ہے یور آنر......!'' وکیل استغاثہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بڑے غرور سے بولا۔ ''ملزم وقوعہ کے روز مقتولہ کے گھر پہنچا، اس نے مقتولہ کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے چرائے اور پکڑے جانے پر اس نے ہتھوڑی کا کاری وار کر کے مقتولہ کو موت کی نیند سلا دیا اور جائے وقوعہ سے رفوچکر ہو گیا ورنہ اس روز ملزم کا مقتولہ کے گھر جانے کا نہ کوئی جواز تھا اور نہ ہی کوئی پروگرام...... یہ صرف اور صرف اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے مقتولہ کے گھر پہنچا تھا...... یہ صرف ایک چور ہی نہیں بلکہ خطرناک قاتل بھی ہے۔ اسی نے مقتولہ کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے چرائے اور پھر رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اس نے مقتولہ کو ٹھکانے لگا دیا اور جائے وقوعہ سے خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں......'' چند لمحات کا وقفہ دے کر وکیل استغاثہ نے فاتحانہ نظر سے میری طرف دیکھا پھر دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''میں...... معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کو سخت سے سخت سزا سنائی جائے تاکہ آئندہ کسی کو اس نوعیت کی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو...... دیٹس آل یور آنر!''

جج نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر

کچھ لکھا پھر گردن اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

''بیگ صاحب! اس صورتِ حال میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''ضرور جنابِ عالی!'' میں نے بصد احترام گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں، میں اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم سے چند نہایت ہی اہم سوالات پوچھنا چاہوں گا۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلا دی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مجھے ملزم سے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ میں ملزم عرفان کی جانب بڑھ گیا۔

''اس امر میں تو کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ وقوعہ کے روز دوپہر میں تم مقتولہ کے گھر گئے تھے۔ تم ابھی معزز عدالت کے روبرو اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہو۔'' میں نے اہم ترین جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ کہ وقوعہ کے روز تم کتنے بجے مقتولہ کے گھر گئے تھے؟''

''یہی کوئی بارہ، سوا بارہ بجے...... یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ بجے۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''یعنی بارہ سے پہلے بھی نہیں اور ساڑھے بارہ کے بعد بھی نہیں۔'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ وہاں سے نکلنے کے بعد میں سیدھا دکان کی طرف چلا گیا تھا اور کم وبیش ایک بجے میں مدینہ الیکٹرک اسٹور پر پہنچ گیا تھا۔''

''تم لگ بھگ کتنی دیر تک مقتولہ کے گھر میں رہے تھے؟''

''یہی کوئی دس پندرہ منٹ......''

''کیا یہ صحیح ہے کہ وقوعہ سے ایک روز پہلے تم فریج کا سوئچ تبدیل کرنے مقتولہ کے گھر گئے تھے؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''جی ہاں، یہ درست ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ چھ دسمبر بروز ہفتہ کی بات ہے۔ مقتولہ کے فریج کے سوئچ میں کچھ گڑبڑ تھی۔ اسپارک کا معاملہ تھا۔ اس نے دکان پر فون کر کے اس کی کمپلین درج کرائی تھی لہٰذا اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد میں مقتولہ کے گھر پر چلا گیا تھا۔''

''اور تم نے فریج کا سوئچ تبدیل کر دیا تھا......؟''

''جی ہاں، میں نے ایسا ہی کیا تھا۔''

''کیا مقتولہ ہمیشہ دکان پر فون کر کے ہی اپنی کمپلین لکھوایا کرتی تھی یا وہ براہِ راست تم سے بھی رابطہ کر لیا کرتی تھی؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''صرف دکان پر فون کرتی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس نے کبھی ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔''

''اتوار کے روز مدینہ الیکٹرک اسٹور بند رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس دن تم بھی چھٹی کرتے ہوگے...... ہیں نا؟''

''جی بالکل...... اتوار کا دن میں اپنے گھر میں گزارتا ہوں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں بتایا۔ ''یا آس پڑوس والوں کا الیکٹرک کا کوئی چھوٹا موٹا کام ہو تو وہ کر دیتا ہوں۔''

''سوموار، آٹھ دسمبر کی صبح......'' میں نے جرح کے سلسلے کو کلائمیکس کی طرف لاتے ہوئے سوال کیا۔ ''ناشتے کے بعد تمہاری طبیعت خراب ہوگئی۔ تم نے قریبی کلینک سے دوا لی اور کچھ دیر گھر میں آرام کیا تو طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ وہی بیان کر رہے ہیں جو حقیقت ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن میں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ اس روز میں نے ڈاکٹر شریف کے کمپاؤنڈر سے دوا لی تھی کیونکہ اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کلینک نہیں پہنچے تھے اور میری طبیعت بہت بگڑ رہی تھی۔''

''اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے ڈاکٹر سے دوا لی تھی یا کمپاؤنڈر سے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ پوچھنا یا بتانا میرا مقصد نہیں ہے۔ میں دراصل کچھ اور ہی جاننا چاہتا ہوں......''

وہ ہمہ تن گوش ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز تم اپنے گھر سے سیدھے مقتولہ کے گھر گئے تھے؟''

''جی ہاں، یہ درست ہے۔''

''یعنی اس روز تم کسی کمپلین کے سلسلے میں مقتولہ کے گھر نہیں گئے تھے؟''

''جی بالکل نہیں......'' ملزم نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''پھر...... تم کیوں مقتولہ کے گھر گئے تھے......'' ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے میں نے ملزم سے استفسار کیا۔ ''عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ بلاوجہ اور بغیر کسی کمپلین کے تم مقتولہ کے گھر کس مقصد سے گئے تھے؟''

''وہ جی...... اس روز میں...... اپنے ایک ذاتی کام سے...... مقتولہ کے گھر گیا تھا۔'' وہ رک رک کر بولا۔

''ذاتی کام...... کون سا ذاتی کام...... کیسا ذاتی

کام......؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔
''اپنی ہتھوڑی لینے۔'' اس نے جواب دیا۔
''وہی ہتھوڑی نا...... جس کی مدد سے مقتولہ انیتا کو موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا اور چوبی میز کی طرف بڑھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''وہ ہتھوڑی جو آلۂ قتل کی حیثیت سے اس وقت بھی عدالت کے کمرے میں موجود ہے؟''
''جی ہاں۔'' عرفان نے اثبات میں گردن ہلائی۔
''میں اسی ہتھوڑی کی بات کر رہا ہوں۔''
میں نے سیلوفین بیگ میں محفوظ آلۂ قتل یعنی مذکورہ ہتھوڑی کو اٹھالیا پھر اپنے مؤکل کو دکھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔
''یہ ہتھوڑی تمہاری ہی ہے نا؟''
''جی...... بالکل۔'' اس نے جواب دیا۔
''یہ ہتھوڑی اس کیس میں آلۂ قتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور لیبارٹری رپورٹ کے مطابق نجیب اللہ کی خوب صورت بیوی انیتا کو اسی ہتھوڑی کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے لیکن......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''لیکن اس ہتھوڑی کو تو تمہاری ٹول کٹ کے اندر ہونا چاہیے تھا۔ تم اس کی تلاش میں مقتولہ کے گھر تک کیوں چلے گئے تھے؟''
قبل اس کے کہ میرا مؤکل اس سوال کا جواب دیتا، عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔
''دی کورٹ از اِیڈ جارنڈ......!'' جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔
آئندہ پیشی ایک ہفتے بعد یعنی آج ہی کے دن کی تھی۔
میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''جنابِ عالی! میرے فاضل دوست نے تھوڑی دیر پہلے استغاثہ کے ایک نہایت ہی اہم گواہ جواد حسین کا ذکر کیا ہے۔ ایک لحاظ سے جواد حسین کو ہاف آئی وٹنس یعنی نصف عینی شاہد کہا جا سکتا ہے کیونکہ استغاثہ کے دعوے کے مطابق اس شخص نے وقوعہ کے روز میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عرفان کو مقتولہ کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ اگلی پیشی پر جواد حسین کو عدالت میں پیش کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں۔ میں اس نادرِ روزگار گواہ سے چند ضروری سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''
جج نے میری فرمائش پوری کرتے ہوئے انکوائری

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ مایوس وہ ہوتا ہے جو اللہ پر یقین نہیں رکھتا اور محروم وہ ہوتا ہے جو اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔
☆ اپنے حصے کا کام کیے بغیر دعا پر بھروسا کرنا حماقت ہے اور اپنی محنت پر بھروسا کر کے دعا سے گریز کرنا تکبر ہے۔
☆ باہمت لوگ کبھی ہارا نہیں کرتے۔ وہ یا تو جیت جاتے ہیں یا پھر سیکھ جاتے ہیں۔
☆ انسان اپنی زبان اور پرندے اپنے پاؤں کی وجہ سے جال میں پھنستے ہیں۔
☆ جو غلطی کر نہیں سکتا وہ فرشتہ ہے۔ جو غلطی کر کے اس پر ڈٹ جائے، وہ شیطان ہے اور جو غلطی کر کے توبہ کر لے وہ انسان ہے اور جو توبہ کر کے اپنی توبہ پر قائم رہے، وہ اللہ کا محبوب بندہ ہے۔
☆ کمزور ہے وہ شخص جو کسی کو اپنا دوست نہ بنا سکے اور اس سے زیادہ کمزور ہے وہ شخص جو بنا ہوا دوست کھو دے۔
☆ اپنی ذات میں ایک ایسا انسان ڈھونڈو جسے اپنے لیے ہی نہیں، دوسروں کے لیے بھی جینے کا ہنر آتا ہو۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

الفاظ کا اثر

ایک فلسفی نے ماہرِ نفسیات سے کہا۔ ''الفاظ مر چکے ہیں، اب کسی لفظ کا کسی شخص پر اثر نہیں ہوتا۔''
ماہرِ نفسیات نے کہا۔ ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں، وہ بے وقوف ہیں، نالائق ہیں اور جاہل بھی ہیں۔''
فلسفی چیختے ہوئے بولا۔ ''بکواس بند کرو، ورنہ میں تمہارا منہ نوچ لوں گا۔''
ماہرِ نفسیات نے کہا۔ ''دیکھا الفاظ کا اثر کیسا ہوتا ہے۔''

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

آفیسر سے دریافت کیا۔ ''کیا مذکورہ گواہ کو آئندہ پیشی پر حاضر کیا جاسکتا ہے؟''

''ضرور.....!'' آئی او نے اثبات میں گردن ہلادی۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے اس کہانی کی ابتدا میں عرض کیا تھا کہ اس کیس کو عدالت میں لگے کافی عرصہ ہوگیا تھا اور آج اس کیس کو باقاعدہ سماعت کا موقع ملا تھا۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے..... دیر آید، درست آید!

یہ ٹھیک ہے کہ کسی بھی کیس کی ابتدائی کارروائیوں کے تقاضے پورے کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے لیکن ہمارے ساتھ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ جس روز ہمارے کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا، اس دن اس عدالت میں اور کوئی کیس نہیں تھا لہٰذا عدالت کا تمام وقت ہمیں مل گیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔ زیادہ وقت میسر ہونے کے باعث آدھے سے زیادہ کیس ایک ہی پیشی پر نمٹ گیا تھا۔

ابھی تک جو عدالتی کارروائی ہوئی تھی، اس میں وکیل استغاثہ کا پلہ بظاہر بھاری نظر آتا تھا لیکن میں اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہا تھا اسی لیے میں نے آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ جواد حسین کو عدالت میں طلب کرلیا تھا۔ میں وکیل استغاثہ کے ساتھ وہ ہینڈ کرنے والا تھا جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ آج کی کارروائی کے خاتمے پر وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا تھا جیسے اس نے میدان مار لیا ہو۔ اس بے چارے کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے میدان میں کون سا گھمسان کا رن پڑنے والا تھا.....

مجھے مزید تحقیق و تفتیش کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مل گئی تھی لہٰذا میں نے جواد حسین اور دیگر امور کے حوالے سے اپنا ہوم ورک مکمل کرلیا لیکن آئندہ پیشی پر ہمارے کیس کو بہت کم وقت مل سکا تھا جس میں ملزم عرفان پر ہونے والی ادھوری جرح کو میں نے مکمل کردیا۔

عدالت کا وقت ختم ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں چاہتا تو اگلی پیشی کی تاریخ لے لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور کیس کو آگے بڑھانے کے حق میں ووٹ دے دیا۔ ملزم عرفان اکیوزڈ باکس میں موجود تھا۔ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں اس کے قریب پہنچ گیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔

''عرفان! جس ہتھوڑی کو تمہاری ٹول کٹ میں ہونا چاہیے تھا وہ مقتولہ کے گھر میں کیسے پہنچ گئی تھی اور اس ہتھوڑی کی تلاش میں تم مقتولہ اینا کے گھر کیوں چلے گئے تھے؟ وہ ہتھوڑی کہیں اور بھی تو ہوسکتی تھی؟''

''سر! یہ ہتھوڑی تو ہمیشہ میری ٹول کٹ کے اندر ہی ہوا کرتی ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اتوار کی شام یعنی سات دسمبر کی شام جب مجھے ہتھوڑی کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ مجھے ٹول کٹ میں نہیں ملی۔ اس سے ایک دن پہلے چھ دسمبر کو میں اینا صاحبہ کے فریج کا سوئچ تبدیل کرنے ان کے گھر گیا تھا۔ انہوں نے کمپلین کی تھی کہ ان کے فریج کا سوئچ اسپارک کرتا ہے۔ میں نے ان کے گھر جاکر نیا سوئچ لگادیا تھا۔ جب میں سوئچ کی تبدیلی کا کام کررہا تھا تو اس وقت ہتھوڑی میری ٹول کٹ میں موجود تھی لہٰذا.....'' وہ سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بوقتِ ضرورت جب مجھے ہتھوڑی ٹول کٹ کے اندر نہیں ملی تو میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید میری ہتھوڑی اینا کے گھر میں کہیں رہ گئی ہے۔ میں نے سوچا، اگلی صبح دکان پر جاتے ہوئے میں اینا کے گھر سے اپنی ہتھوڑی اٹھالوں گا لیکن جب میں دوسری صبح بیدار ہوا تو میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس جاکر دوا لی اور دوپہر تک جب میری طبیعت قدرے سنبھلی تو میں گھر سے نکلا تھا اور سیدھا اینا کے گھر پہنچا تھا۔''

''میں یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ وقوعہ سے ایک رات پہلے تم نے کس ضرورت کے تحت ہتھوڑی تلاش کی تھی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''لیکن عدالت یہ جاننے میں ضرور دلچسپی رکھتی ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم ہتھوڑی کی تلاش میں مقتولہ کے گھر پہنچے تو کیا تمہیں مذکورہ ہتھوڑی مل گئی تھی؟''

''نن..... نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی ہتھوڑی مقتولہ اینا کے گھر نہیں بھول آئے تھے۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیسی بات ہے؟''

''دراصل، وقوعہ کے روز جب میں اینا کے گھر پہنچا تو میری اس سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''ملاقات نہیں ہوسکی تھی کا کیا مطلب؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا مقتولہ اس وقت اپنے گھر میں موجود نہیں تھی؟''

''پتا نہیں جناب۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''تمہارے اس جواب سے عدالت کی تسلی نہیں ہوگی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تفصیل سے بتاؤ، وقوعہ کے روز جب تم مقتولہ انیتا کے گھر پہنچے تو وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''میں نے انیتا کے فلیٹ پر پہنچ کر ڈور بیل کا بٹن دبایا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اندر گھنٹی بجی۔ میں باہر رک کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اس مرتبہ بھی اندر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر دروازے پر دستک دی اور اگلے ہی لمحے چونک اٹھا۔ دروازے کو اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ میرے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔''

یہاں تک بتانے کے بعد وہ خاموش ہوا تو میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ''کیا تم اس کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے؟''

''نہیں!'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''مطلب یہ کہ وقوعہ کی دوپہر تم مقتولہ کے گھر میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے؟''

''جی...... یہی حقیقت ہے۔''

''مگر تم تو اپنی ہتھوڑی کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے۔'' میں نے جاننا چاہا۔ ''پھر خالی ہاتھ واپس کیوں لوٹ گئے تھے؟''

''جب میری دستک کے جواب میں دروازہ کھلتا چلا گیا تو ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ میں اندر جا کر انیتا سے اپنی ہتھوڑی کے بارے میں استفسار کروں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ مجھے اجازت کے بغیر کسی کے گھر کے اندر داخل ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا اور ویسے بھی اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا میں نے ہتھوڑی کے معاملے پر لعنت بھیجی اور دکان کی طرف چلا گیا۔''

''تمہارے سیٹھ شاکر علی کے بیان کے مطابق تم ایک بجے دوپہر دکان پر پہنچے تھے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا تم عدالت کو بتا سکتے ہو کہ مقتولہ کے گھر سے تم کتنے بجے روانہ ہوئے تھے؟''

''انیتا کا فلیٹ گارڈن ایسٹ کے علاقے میں مچھی مارکیٹ کے قریب ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں واقع ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور میں جس دکان میں کام کرتا ہوں یعنی ''مدینہ الیکٹرک اسٹور'' سولجر بازار میں ہے۔ ان دو مقامات کے درمیان پندرہ سے بیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا پیدل کا راستہ ہے۔ اس حساب سے کہہ سکتے ہیں کہ جب میں انیتا والی بلڈنگ سے نکلا تو اس وقت کم و بیش دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔''

''جب تم وقوعہ کے روز مقتولہ کے فلیٹ سے واپس جا رہے تھے تو تمہاری کسی جواد حسین سے مختصر سی بات بھی ہوئی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''جواد نے تم سے کہا تھا، جس گھر سے تم نکل کر آئے ہو اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور تم نے جواب دیا تھا، جس کا گھر ہے وہ خود ہی دروازہ بند کر لے گی......''

''ہاں بالکل۔ میں نے اس شخص سے ایسا ہی کہا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں نہیں جانتا کہ اس شخص کا نام جواد حسین ہے۔''

''کیا تم اس شخص کے نام ہی سے واقف نہیں ہو یا اسے جانتے تک بھی نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دونوں ہی باتیں ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ شخص میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔''

''اگر تم اسے دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، اس کی شکل تمہارے ذہن میں محفوظ ہے؟''

''جی محفوظ ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں اگر اسے دوبارہ دیکھوں تو پہچان لوں گا۔''

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں چاہتا ہوں کہ استغاثہ اپنے اہم باف آئی ڈنس جواد حسین کو گواہی کے لیے اندر بلائے۔ اس شخص سے میں چند ضروری سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔ ''کیا گواہ جواد حسین اس وقت عدالت میں موجود ہے؟''

''یور آنر! جواد حسین کسی ایمرجنسی میں حیدرآباد چلا گیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے جج کو بتایا۔ ''آئندہ پیشی پر اسے ضرور پیش کر دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' جج نے اپنے مخصوص انداز میں کہا

پھر دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالنے کے بعد بولا۔ ''اگر وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا تو بھی اس کی گواہی نہیں ہوسکتی تھی لیکن آئندہ پیشی پر اسے لازماً حاضر ہونا چاہیے۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں مختصراً بتادوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ انیتا کی موت آٹھ دسمبر کی دوپہر گیارہ سے ایک بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب آہنی ہتھوڑی کی وہ خوف ناک ضرب تھی جو اس کے سر کے عقبی حصے پر لگائی گئی تھی۔ سر کے متاثرہ حصے سے کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔ یہ ضرب ایسی کاری ثابت ہوئی کہ وہ آناً فاناً ہی موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔

ہتھوڑی کے لیبارٹری ٹیسٹ سے بھی یہی ثابت ہوا تھا کہ انیتا کو اسی ہتھوڑی کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ ہتھوڑی کے چوبی دستے کی لمبائی کم و بیش ایک فٹ تھی اور آہنی ہیمر ایک جانب سے ڈیڑھ انچ اور دوسری طرف سے ایک انچ موٹا تھا۔ ڈیڑھ انچ سائز والے سرے سے انیتا کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر وار کیا گیا تھا جس کی وجہ سے انیتا کے چند بال ہتھوڑی کے ہیمر پر چپک گئے تھے۔ ہیمر پر انیتا کے خون کے آثار بھی ملے تھے۔ الغرض، اس امر میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ انیتا کو اسی ہتھوڑی کی مدد سے قتل کیا گیا تھا۔

مذکورہ ہتھوڑی یعنی آلۂ قتل پر میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عرفان کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔ اگرچہ یہ ایک تشویش ناک بات تھی تاہم میں جانتا تھا کہ اس مرحلے سے کس طرح اپنے مؤکل کو بچا کر نکالنا ہے۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور ملزموں والے کٹہرے میں میرا مؤکل عرفان کھڑا تھا۔ اس کیس سے متعلقہ تمام افراد عدالت میں موجود تھے سوائے ایک شخص کے اور...... وہ شخص تھا، استغاثہ کا اہم گواہ جواد حسین۔ جج نے حاضرین پر نظر ڈالی اور عدالتی کارروائی کا آغاز ہوگیا۔

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! آج مجھے استغاثہ کے گواہ جواد حسین سے نہایت ہی اہم سوالات کرنا تھے لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔''

بات کے اختتام پر میں نے نظر گھما کر عدالت کے کمرے میں چاروں جانب دیکھا۔

''آپ کا گواہ کہاں ہے وکیل صاحب؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔

''اس نے آنے کا وعدہ تو کیا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاید کہیں ٹریفک جام میں پھنس گیا ہے...... وہ آئے گا ضرور۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کا گواہ اگر ٹریفک کے اژدحام میں کہیں پھنس گیا ہے تو اس کی آمد تک میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے دو چار ضروری باتیں کرلیتا ہوں...... اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر یا انکوائری آفیسر یا آئی او کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا پڑتا ہے۔ جج کے حکم پر آئی او وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کیس کا تفتیشی افسر ایک سب انسپکٹر تھا۔

میں وٹنس باکس کے قریب پہنچا اور آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سب انسپکٹر صاحب! استغاثہ کی عمارت اس اسٹوری پر ایستادہ ہے کہ ملزم ایک چال باز شخص ہے اور اس کی چال بازی کا سب سے مؤثر ہتھیار اس کے بازو کی مچھلیاں ہیں۔ اس نے اپنی مردانہ وجاہت سے مقتولہ کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں مقتولہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی لہٰذا مقتولہ کے گھر میں ملزم کی آمد و شد میں کوئی رکاوٹ نہ رہی پھر ایک روز مناسب موقع دیکھ کر ملزم نے اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ملزم اچھی طرح یہ جان چکا تھا کہ مقتولہ دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔ اس کا شوہر نجیب اللہ صبح کا نکلا پھر رات ہی کو واپس گھر لوٹتا ہے لہٰذا دن میں وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ وقوعہ کے روز وہ جھوٹی موٹی کا بیمار ہوگیا تاکہ دکان پر دیر سے پہنچنے کا جواز پیدا ہوجائے۔ وہ اپنے پروگرام کے مطابق لگ بھگ بارہ بجے دن گھر سے نکلا۔ مقتولہ کی رہائش گاندھی گارڈن کے علاقے میں ہے جہاں سے مچھی مارکیٹ بہ آسانی پندرہ بیس منٹ میں پہنچا جاسکتا ہے۔ ملزم اپنی ہتھوڑی کی تلاش میں مقتولہ کے گھر پہنچ گیا حالانکہ یہ اس کا ایک بہانہ تھا۔ اس کی ہتھوڑی تو ٹول کٹ کے اندر موجود تھی۔ وہ ہتھوڑی کی تلاش کے بہانے تھوڑا وقت مقتولہ کے فلیٹ پر گزارنا چاہتا تھا تاکہ اپنے مقصد کو حاصل کرسکے اور پھر ایسا ہی ہوا......'' میں نے

ایک مرتبہ پھر لحاتی توقف کیا۔ اس کے بعد آئی او کو گھسنا شروع کیا۔

''استغاثہ کے مطابق ملزم نے موقع پاکر مقتولہ کے بیڈروم کا رخ کیا جہاں ایک الماری کے اندر ایک لاکھ روپے کی رقم رکھی تھی۔ اس رقم کو چرانا ہی ملزم کا اصل مقصد تھا۔ ملزم نے الماری کھول کر مذکورہ رقم چرالی اور عین موقع پر رنگے ہاتھوں پکڑا گیا کیونکہ اسی وقت مقتولہ بیڈروم میں آگئی تھی۔ جب ملزم نے دیکھا کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے تو اس کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ پہلی فرصت میں مقتولہ کی ''زبان بندی'' کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ اس کے ''کارنامے'' کا راز فاش نہ ہو۔ اس نے فوراً سے پیشتر اپنی ٹول کٹ میں سے ہتھوڑی نکالی اور مقتولہ کی دائمی خاموشی کے لیے ہتھوڑی سے اس کے سر پر ایک کاری ضرب لگائی۔ مقتولہ اس خطرناک وار سے زمین بوس ہوگئی اور ملزم ایک لاکھ روپے کی رقم لے کر وہاں سے فرار ہوگیا۔''

''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' میرے خاموش ہونے پر انکوائری آفیسر نے تیز لہجے میں کہا۔ ''جب ملزم مقتولہ کے گھر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک شخص جواد حسین نے اسے دیکھا بھی تھا اور ہتھوڑی کے دستے پر موجود ملزم کے فنگر پرنٹس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ قتل ملزم ہی نے کیا ہے۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے سب انسپکٹر صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ہتھوڑی کے دستے پر میرے مؤکل کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ وقوعہ کے روز کسی جواد حسین نے ملزم کو مقتولہ کے دروازے سے نکلتے دیکھا تھا حالانکہ وہ مقتولہ کے فلیٹ کے اندر سے برآمد نہیں ہوا تھا بلکہ کھلے ہوئے دروازے کو چھوڑ کر واپس جارہا تھا لیکن یہ کسی بھی طور ممکن نہیں کہ میرے مؤکل نے مقتولہ کی جان لی ہے۔''

''ساری شہادتیں ملزم کے خلاف جارہی ہیں اور آپ اسے بے قصور ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔'' آئی او عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب!''

''چلیں، اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو میں کمال نہیں کرتا بلکہ جمال کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا۔

''جمال کرتے ہیں۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''کیا مطلب ہے، آپ کا؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ مقتولہ بنیں گے یا ملزم بننا پسند فرمائیں گے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ اکتائے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا۔

''ہم دونوں مل کر ایک ڈیمو دیں گے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ یہ دیکھا اور معزز عدالت کو دکھایا جاسکے کہ وقوعہ کے روز مقتولہ کے فلیٹ پر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس واقعے کا ڈیمو یہاں عدالت کے کمرے میں دے پائیں؟'' اس کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

''آپ ممکن اور ناممکن کی بحث میں اپنے ذہن کو نہ تھکائیں آئی او صاحب۔'' میں نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا۔ ''یہ مشکل کام آپ میرے لیے چھوڑ دیں۔ آپ صرف اپنے لیے کردار کا انتخاب کریں...... مقتولہ بنیں گے یا ملزم؟''

''میں ملزم تو ہرگز نہیں بنوں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''بس تو پھر آپ چند لحات کے لیے مقتولہ کا کردار کریں۔'' میں نے کہا۔ ''باقی میں سنبھال لوں گا۔''

وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے نظرانداز کرکے اپنے بیگ کے اندر سے ایک اسکیل نکال لیا اور آئی او کی طرف سے رخ پھیر کر کہا۔ ''یہ اسکیل میں نے اپنے بیگ میں اسی ڈیمو کی غرض سے رکھا تھا۔ آئی او صاحب! فرض کریں کہ میں اس وقت ملزم عرفان مقتولہ کی الماری سے ایک لاکھ روپے چرا رہا ہوں۔ میری پشت آپ کی طرف ہے۔ استغاثہ کی رپورٹ کے عین مطابق آپ یعنی مقتولہ اینا موقع پر مجھے رنگے ہاتھوں چوری کرتے پکڑلیتی ہیں۔ آپ مجھے للکارتی ہیں......''

''ارے...... کیا کررہے ہو؟''

''میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ آپ میرے سامنے کھڑی ہیں۔ میں آپ کی زبان بند کرنے کے لیے اپنی ہتھوڑی سے آپ کے سر پر وار کرتا ہوں......''

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر آئی او کے سر پر اسکیل سے دکھاوے کا جھوٹا وار کردیا۔ میرا اسکیل اس کی پیشانی سے تھوڑا اوپر سر کے بالوں سے ٹکرایا۔

''ارے...... ارے...... یہ کیا کررہے ہیں......؟'' وہ جلدی سے پیچھے کو ہٹا۔

''ڈیمو دے رہا ہوں آئی او صاحب۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔''

میرا پوائنٹ اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا وہ بڑی بیزاری سے بولا۔ ''اس ڈیمو سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

''یہ ثابت ہوتا ہے کہ انیتا کو میرے مؤکل عرفان نے قتل نہیں کیا.....'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے؟'' وہ بیزاری سے بولا۔

''میرا اسٹکیل آپ کے سر کے کس حصے پر لگا؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

''یہاں پر......'' وہ اپنی پیشانی کے اوپر والے بالوں کو چھوتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولا۔

میں نے سر کو ہلکا سا خم دے کر کہا۔ ''شکریہ آئی او صاحب۔''

''کس بات کا شکریہ؟'' اس کی حیرت دیدنی تھی۔

میں نے انکوائری آفیسر کی حیرت کو اپنے جوتے کی نوک پر مارا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے... بہ آوازِ بلند کہنا شروع کیا۔

''جناب عالی! ابھی میں نے معزز عدالت کے سامنے جو ڈیمو دیا ہے اس کا اسکرپٹ میں نے نہیں لکھا بلکہ یہ استغاثہ کی مرتب کردہ رپورٹ کا ایک حصہ ہے۔ وہ رپورٹ جس میں میرے مؤکل کو نجیب اللہ کی خوب صورت بیوی انیتا کا قاتل ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ استغاثہ کی رپورٹ صد فیصد مبنی بر حقائق ہے تو پھر اگر میرا مؤکل اپنی چوری پکڑے جانے پر جب مقتولہ پر ہتھوڑی سے حملہ آور ہوتا تو اس صورت میں مقتولہ کی پیشانی یا سر کے سامنے والے حصے پر چوٹ لگتی جیسا کہ ابھی آئی او کے ساتھ پیش آیا لیکن......'' میں نے ڈرامائی انداز میں لمحاتی خاموشی اختیار کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ اس ڈیمو کی نفی کرتی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ہتھوڑی کی کاری ضرب لگائی گئی تھی جو اس کی موت کا سبب بنی۔ اب اگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو درست مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقتولہ پر اس کی بے خبری میں عقب سے وار کیا گیا تھا۔ اگر استغاثہ کی رپورٹ پر انحصار کیا جائے تو پھر میرے مؤکل کی ہتھوڑی کا وار مقتولہ کے سر کے سامنے والے حصے پر لگنا چاہیے تھا۔ اگر استغاثہ کی رپورٹ درست ہے تو پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ غلط ہے لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ اس لیے غلط نہیں ہوسکتی کہ ہتھوڑی کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ، پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تائید کرتی ہے جس کی رو سے مقتولہ کے عقب سے اس کے سر پر وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ قاتل کوئی ایسا شخص ہے جو پہلے سے مقتولہ کے فلیٹ پر موجود تھا اور وہ مقتولہ کے لیے قابلِ بھروسا بھی تھا چنانچہ مقتولہ اس کی موجودگی میں بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہی اور اس شخص نے موقع پا کر مقتولہ کے عقب سے اس کی کھوپڑی پر ہتھوڑی کا وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ آج کل یعنی وقوعہ کے وقت سردیوں کا موسم تھا اور عین ممکن ہے کہ اس شخص نے دستانے پہن رکھے ہوں جس کی وجہ سے اس کے فنگر پرنٹس ہتھوڑی پر نہیں آسکے۔''

''ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟'' انکوائری آفیسر کی سرسراتی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔

''اب وقت آگیا ہے کہ میں آپ کے الفاظ لوٹا دوں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے مؤکل کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر کے کوئی کمال کر رہا ہوں۔ میں آپ کے الفاظ لوٹاتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ''ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟'' یہ پوچھ کر آپ کمال کر رہے ہیں کیونکہ یہ سوال کرنا آپ کا حق نہیں بنتا۔''

''میرا حق کیوں نہیں بنتا۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے..... پوچھنا تو بنتا ہے نا!''

''میں نے اتنی بڑی بات ہوا میں نہیں کی آئی او صاحب۔'' میں نے ان کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

''اپنی بات کی صحت کی تصدیق کے لیے میں نے ٹھوس دلائل دیے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرچکا ہوں۔''

انکوائری آفیسر نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وکیل استغاثہ کافی دیر سے خاموش کھڑا ہمارے سوال و جواب کو سن رہا تھا۔ موجودہ صورتِ حال نے اسے بے حد پریشان کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آئی او کی سوالیہ نظر کا کیا جواب دے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی جھلکتا تھا کہ یہ کیس اس کے

ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں ان دونوں کو نظر انداز کر کے جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''جناب عالی! حالات و واقعات کی روشنی سے ثابت ہوتا ہے کہ میرا مؤکل عرفان بے گناہ ہے۔ اس نے انیتا کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ایک لاکھ روپے کی رقم چرائی ہے۔ اس سیدھے سادے معصوم انسان کو خوامخواہ قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قتل کی اس واردات کے پیچھے کوئی اور ہی سنسنی خیز کہانی چھپی ہوئی ہے۔ استغاثہ کی رپورٹ مبنی بر دروغ ہے۔ یہ میرے مؤکل کے خلاف ایک مذموم سازش ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں...... پوسٹ مارٹم رپورٹ، استغاثہ کی دھجیاں اڑانے کے لیے کافی ہے......'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنے ٹھوس دلائل کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ میرا مؤکل بے قصور ہے لہٰذا اس کی اس کیس سے بریت کے احکامات صادر کیے جائیں۔ دیٹس آل یور آنر!''

میری بات کے اختتام پر جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرنے لگا۔ انہی کاغذات میں پوسٹ مارٹم، لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹ اور استغاثہ کی فائل بھی شامل تھی۔ جج نے ایک کاغذ پر کچھ نوٹ کیا اور تین دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!''

ادھر جج کی بات ختم ہوئی، ادھر انکوائری آفیسر نے پُراشتیاق لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''وکیل صاحب! اس شخص کے بارے میں تو کچھ بتا دیں......!''

''کس شخص کے بارے میں؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... جس نے انیتا کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ہتھوڑی سے وار کیا تھا!''

''گویا ڈیمو نے آپ پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔'' میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''آپ میرے مؤکل کو بے گناہ تسلیم کر چکے ہیں؟''

''ملزم کو گناہ گار یا بے گناہ قرار دینا تو عدالت کا کام ہے۔'' وہ ہوشیاری سے بولا۔ ''لیکن میں اپنی تسلی کے لیے جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے فلسفے کے مطابق وقوعہ کے روز ایسا دستانہ پوش کون سا شخص مقتولہ کے فلیٹ پر موجود تھا، مقتولہ جس پر بھروسا کرتی تھی اور اسی شخص نے مقتولہ کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ہتھوڑی سے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چٹخا دیا تھا۔''

''آپ تو مجھ سے ایسے پوچھ رہے ہیں جیسے میں موقع پر موجود تھا۔'' میں نے اسے ٹھورا۔ ''اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس شخص کو قتل کی واردات کرتے دیکھا تھا؟''

رسی جل چکی تھی مگر اس کے بل ابھی باقی تھے۔ میری وضاحت کے جواب میں انکوائری آفیسر نے بے پروائی سے کہا۔ ''چلیں ٹھیک ہے، اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی ہے۔''

''مرضی صرف مالک کی ہوتی ہے آئی او صاحب۔'' میں نے اس کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''وہ مالک جو میرا، آپ کا اور ہم سب کا خالق ہے، رازق ہے اور پالنہار ہے۔ میں تو ایک معمولی سا انسان ہوں اور چونکہ میں قانون کے پیشے سے وابستہ ہوں۔ یہ پیشہ ہی میری روزی روٹی ہے اس لیے میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے اور وقت پڑنے پر قانون کی مدد بھی کی ہے۔ میں آپ کی مدد کرنے کو بھی تیار ہوں۔''

جج عدالت برخاست کر چکا تھا لیکن میرے اور آئی او کے بیچ ہونے والی دلچسپ گفتگو نے اسے چند لمحے عدالت کے کمرے میں موجود رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

آئی او نے کہا۔ ''تو پھر کریں ہماری مدد اور بتائیں کہ وقوعہ کے روز مقتولہ کے گھر میں کون ایسا بااعتماد شخص موجود تھا جس نے انیتا کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور ایک لاکھ روپے کی رقم لے کر غائب ہو گیا؟''

''میں ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے چالاکی سے اسے اپنے جال میں پھانستے ہوئے کہا۔ ''لیکن پہلے آپ کو ایک حقیقت کا اقرار کرنا ہوگا۔''

''کون سی حقیقت؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''یہ حقیقت کہ میرے مؤکل نے انیتا کا مرڈر نہیں کیا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس بے چارے الیکٹریشن کو خالی جگہ پُر کرنے کے لیے قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے......''

وہ ان لمحات میں ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ لیکن بھری عدالت کے سامنے وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ میرے مؤکل کو خوامخواہ اس کیس میں پھنسایا گیا تھا۔ اس اقرار سے اس کی نالائقی ثابت ہو جاتی اور کوئی بھی شخص خود کو نالائق ثابت کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کہا نا، ملزم

کو مجرم یا بے گناہ قرار دینا عدالت کا کام ہے۔ میں عدالتی معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتا۔''

''اوکے......!'' میں نے اس سے بھی زیادہ برا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اینا کے قاتل کو گرفتار کرنا پولیس کا کام ہے۔ میں پولیس کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرسکتا۔ میرا کام اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنا تھا اور مجھے یقین ہے کہ میں نے اپنا یہ کام بہ احسن طریق کر ڈالا ہے۔''

وہ مایوسی سے گردن جھٹک کر رہ گیا۔

''مایوسی گناہ ہے آئی او صاحب۔'' میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''دل چھوٹا نہ کریں۔ قانون کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ اگر میرے ''پہلا پتھر'' پھینکنے سے آپ کا کچھ بھلا ہوتا ہے تو میں ایک اشارہ دینے کو تیار ہوں......''

''کیسا اشارہ؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''دو افراد مقتولہ کے بہت زیادہ قریب تھے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک اس کا شوہر نجیب اللہ اور دوسرا......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو آئی او تڑپ کر بولا۔ ''دوسرا کون؟''

''نجیب اللہ کا بھتیجا۔'' میں نے اپنی ریسرچ کی روشنی میں بتایا۔ ''جو بڑی آزادی اور آسانی کے ساتھ مقتولہ کے گھر میں آتا جاتا تھا۔''

''مگر اس کا کوئی نام تو ہوگا؟'' آئی او سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ظاہر ہے، نام تو ہے اس کا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''کک...... کیا نام ہے...... اس کا......؟''

''جواد حسین!'' میں نے دھماکا کر دیا۔

☆☆☆

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو اس کیس میں باعزت بری کر دیا تھا۔

تین روز پہلے والی پیشی پر میں نے اپنے مؤکل عرفان کے حق میں ایسے دلائل دیے تھے جس سے اس کی بے گناہی ثابت ہوگئی تھی۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی تھی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر قاتل کو بے نقاب کرنے کے سلسلے میں استغاثہ کو واضح اشارہ بھی دے دیا تھا۔ مجھے نجیب اللہ پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن جواد حسین کے حوالے سے میری ریسرچ نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور میرا اس پر شبہ بعدازاں درست ثابت ہوا تھا۔ پولیس نے جب نجیب اللہ اور جواد حسین کو شاملِ تفتیش کیا تو اس کیس کے تمام پوشیدہ پہلو بھی عیاں ہوگئے۔ اگر وہ گواہی کے لیے پیش ہو جاتا تو میں کا سنگ سوڈا سے اسے ایسا دھوتا کہ ایک پیشی پہلے ہی یہ کیس ختم ہو چکا ہوتا لیکن کارخانہ قدرت میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

جواد حسین، نجیب اللہ کا بھتیجا تھا اور اکثر ان کے گھر میں آتا جاتا بھی رہتا تھا۔ مقتولہ اینا اس پر پورا بھروسا کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز جب وہ لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچا تو سردی سے بچنے کے لیے اس نے دستانے پہن رکھے تھے۔ اسے وہاں آئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اس نے مقتولہ کو ایک لاکھ کی رقم الماری میں رکھتے دیکھ لیا تھا اور اسی لیے اس کی نیت خراب ہوگئی تھی۔ اس نے موقع پا کر مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر وار کیا اور ایک لاکھ کی رقم سمیٹ کر وہاں سے نکل گیا۔

جب وہ فلیٹ سے نکل کر زینے کی جانب بڑھ رہا تھا تو اس نے ملزم کو مقتولہ کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ ملزم کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے یہ خبر تھی کہ اسی الیکٹریشن کی ہتھوڑی سے اس نے اپنی چچی کا کام تمام کر دیا ہے۔ وہ ایک سنگین جرم کر کے موقعِ واردات سے فرار ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں چور چھپا ہوا تھا لہٰذا وہ یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ یہ کون شخص ہے جو اس کی چچی کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ جب ملزم مایوس ہو کر وہاں سے جانے لگا تو جواد حسین نے اس کے ساتھ ایک مختصر سا مکالمہ بھی کیا تھا۔

اگر جواد حسین یہیں تک محدود رہتا تو اس کی بچت تھی لیکن بعدازاں جب اسے پتا چلا کہ کسی الیکٹریشن کو پولیس نے اس کیس میں قاتل کی حیثیت سے نامزد کیا ہے تو اس نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے خود کو استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے پیش کر دیا اور تبھی مجھے اس پر ریسرچ کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ یہ اس کی بدقسمتی اور میری خوش نصیبی تھی۔

جواد حسین نے میرے مؤکل کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے جو ہوشیاری دکھائی تھی، وہ میری ریسرچ کے نتیجے میں الٹی اسی کے گلے پڑ گئی۔ میری نشاندہی پر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا پھر پولیس کو اس کی زبان کھلوانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ بھلائی اور سچائی کے کاموں میں بس، پہل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی پہلا پتھر پھینکنے کی ہمت کرلے تو پھر اس کا ساتھ دینے والوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ حالات و واقعات خود بخود موافقت میں آجاتے ہیں۔

(تحریر: حسام بٹ)

آدھی رات کا وقت تھا۔ سارا گاؤں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ گاؤں کے باہر ویرانوں سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ روشن چاند کبھی بادلوں میں چھپ رہا تھا کبھی بادلوں سے جھانکنے لگتا تھا۔ ایسے عالم میں بانو گنے کے کھیت کے قریب اشرف کے گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اشرف اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

''میرے خیال میں اب چلنا چاہیے، کافی دیر ہوگئی ہے آئے ہوئے۔''

''ابھی تو آئی ہو اور ابھی جانے کی بھی جلدی ہوگئی۔'' اشرف نے دھیمے لہجے میں شکوہ کیا۔

''اگر میرے بھائیوں میں سے کوئی جاگ گیا نا تو وہ مجھے زندہ زمین میں دفن کردیں گے۔ تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر آتو جاتی ہوں مگر ہر لمحے خوف لگا رہتا ہے۔'' بانو نے جواب دیا۔

''ہاں بات تو تیری ٹھیک ہے مگر ہم دن کے اجالے

امانت

محمد زبیر سلیمانی

دل کی لگی جب دل میں تیر بن کر اتر جائے تو آنکھیں بھی لہو برساتی ہیں۔ یہی حال کچھ اس کا بھی تھا جس نے اپنی امانت کا محافظ ایک ایسے بے ایمان کو بنا دیا جو اس کے خیال میں سب سے زیادہ حقیقی اور سچا دوست تھا... جبکہ نہ اس کا اپنا سکہ کھرا تھا اور نہ ہی دوستی کی میزان... ایسے میں فریب تو کھانا ہی تھا۔

مکروہ چہرے اور کالے من کے سوداگروں کا چونکا دینے والا انجام



میں بھی تو نہیں مل سکتے نا، مجبوراً اس اندھیرے میں ملنا پڑتا ہے۔ اب تو میں تیرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تو پتا نہیں مجھے یاد بھی کرتی ہے کہ نہیں۔'' اشرف اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔

''تو کوئی راستہ نکال نا اشرف کہ ہماری شادی ہو جائے اور ہمیں یوں اس طرح نہ ملنا پڑے۔'' وہ دوپٹا درست کرتے ہوئے بولی جیسے جانے کو پر تول رہی ہو۔

''بس جا رہی ہو؟'' اشرف نے پھر سوال کیا۔

''ہاں جانا تو ہے۔ کیا ہماری شادی نہیں ہو سکتی؟'' بانو نے سوال دُہرایا۔

''نہیں۔'' اشرف نے مایوسی سے جواب دیا۔ ''میں نے دو تین بار ابا سے بات کی ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم اپنی برادری سے باہر تیری شادی نہیں کریں گے۔ تجھے تو پتا ہی ہے کہ میرا اباپ کتنا سخت آدمی ہے۔''

''میرے گھر میں بھی میرے بیاہ کی باتیں شروع ہو گئی ہیں۔ تنویر میرا منگیتر ہے میرے چاچا کا بیٹا بھی ہے۔ تین ماہ بعد دبئی سے آ رہا ہے شادی کے لیے۔'' بانو دوپٹا اوڑھتے ہوئے بولی۔

''اگر وہ تجھے بیاہ کر لے گیا تو نکاح والی رات اس کو شوٹ کر دوں گا۔'' اشرف حتمی لہجے میں بولا۔

''اس کو مارنے کے بعد میرا بیاہ تجھ سے پھر بھی نہیں ہوگا، اس لیے یہ خیال دل سے نکال دے۔'' بانو اس کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

''تو پھر کوئی طریقہ نکال، اس طرح آدھی رات کو اس کھیت میں کب تک ملتے رہیں گے؟'' اشرف بولا۔

''اچھا میں چلتی ہوں، باقی باتیں کل ہوں گی۔ تو بھی کوئی طریقہ سوچ، میں بھی سوچتی ہوں۔'' یہ کہہ کر بانو وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد اشرف نے بھی اپنے گھر کی راہ لی۔

بانو جب دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ دو کنال پر محیط اس وسیع گھر کے تمام مکین سوئے ہوئے تھے۔ سامنے ایک لائن میں چھ کمرے تھے۔ وہ دبے پاؤں بڑے سے صحن کو پار کر کے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی جہاں پر اس کی چھوٹی بہن جمیلہ بھی اس کے ساتھ سوتی تھی۔

''آدھی رات کو کہاں گئی تھی تو؟'' جمیلہ نے سوال کیا۔

''واش روم گئی تھی۔'' بانو اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''پورے دو گھنٹے سے جاگ رہی ہوں، گلی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سچ بتا کس سے مل کر آ رہی ہے؟''

''اشرف سے۔'' بانو نے راہِ فرار نہ پا کر سچ بول دیا۔

''کون اشرف!'' جمیلہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اشرف کھوکھر چاچے کریم دین کا پتر۔'' بانو نے جواب دیا۔

''بانو! جس طرح میں آج جاگ رہی ہوں، اس طرح ابا بھی جاگ کر یہاں آ سکتا ہے۔ پانچ بھائی ہیں ہمارے، اگر ان کو پتا چل گیا تو تیرے بیس ٹکڑے کر کے زمین میں دفن کر دیں گے اور ساتھ اس اشرف کے بھی، سنا تو نے۔ یہ ملنا ملانا چھوڑ، تین ماہ بعد تیری شادی ہونے والی ہے، کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔'' جمیلہ تشویش ناک لہجے میں اس کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

''میں اشرف کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' یہ کہہ کر وہ بستر پر دراز ہو گئی۔

دونوں کے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر جمیلہ بولی۔

''مجھے تیری سوچ پر حیرت ہو رہی ہے۔ تیرا منگیتر اتنا اچھا ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے، کیا رکھا ہے اشرف کھوکھر میں بہ مشکل دس جماعت پاس ہے، کام بھی کوئی نہیں کرتا، صرف دو سو کنال زمین ہے وہ بھی اس کے باپ کے نام۔ شکل بھی اس کی واجبی سی ہے۔''

''بس وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' بانو بے اختیار مسکرا دی۔

جمیلہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور لائٹ آف کر دی۔ ''تو روزانہ ملنے جاتی ہے اس سے؟'' جمیلہ نے سوال کیا۔

''ہاں اور کل سے تیری ایک اور ڈیوٹی ہے، وہ یہ کہ میرے جانے کے بعد گلی والا دروازہ بند کر دیا کر اور میں تجھے مس کال دوں، تب دروازہ کھول دیا کر۔ بس اب سو جا دو گھنٹے بعد نماز کے لیے بھی اٹھنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کروٹ بدل کے سو گئی، جمیلہ نے بھی آنکھیں موند لیں۔

اگلے روز کافی خوشگوار موسم تھا۔ نومبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ سردی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد دونوں بہنیں اپنے کمرے میں باتوں میں مصروف تھیں کہ کچھ دیر بعد بانو نے دروازہ بند کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھ کر میک اپ کرنے لگی۔

''آج پھر اس سے ملنے جاؤ گی؟'' جمیلہ نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' وہ لپ اسٹک ہونٹوں پر لگاتے ہوئے بولی

جو اس نے چھپا کر رکھی ہوئی تھی کیونکہ ان کا باپ اور بھائی ان کے میک اپ کرنے پر برہم ہوتے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل ان کی ماں اپنے جہیز میں لے کر آئی تھی جو بانو نے اپنے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔

''ذرا ٹیپ ریکارڈر پہ گانا تو لگا۔ وہ نور جہاں والا جدوں ہولی جئیں......'' بانو نے شوخ نظروں سے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو جمیلہ نے پہلے کمرے کی کنڈی لگائی پھر ہلکی آواز میں ٹیپ ریکارڈر پر گانا لگا دیا۔ گانا شروع ہوا تو بانو نے خوشگوار موڈ میں تھرکنا شروع کر دیا مگر چند لمحوں بعد ہی بڑے بھائی شہباز نے زور زور سے ڈانٹ کر ٹیپ بند کروا دیا۔ بھائی کے جانے کے بعد بانو بڑبڑانے لگی۔

''دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے اور ہمارے گھر والوں کے ابھی تک وہی دقیانوسی خیالات ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے کاش میں شہر میں پیدا ہوتی۔''

''روک ٹوک اچھی چیز ہے باجی۔'' جمیلہ نے سمجھانا چاہا۔ ''شہر کی لڑکیوں کا حال نہ پوچھو، باپ اور بھائیوں کی غیرت کیا سوئی حیا تو جیسے رخصت ہو گئی۔''

''بس بس رہنے دے اپنی فضول باتوں کو۔'' بانو اٹھلا کر بولی۔ ''مجھے دیکھ کیا صورت دی ہے میرے رب نے مگر زندگی ایک فضول سے گاؤں میں گزر رہی ہے۔ کیا ہے اس گھر میں...... گائے بھینس اور بڑی بڑی مونچھوں والے بھائی۔'' بانو بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔

''اور وہ تیرا اشرف کون سا افسر لگا ہوا ہے۔ وہ تو ہمارے بھائیوں سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے۔''

''وہ تو میری صورت کا عاشق ہے۔ جب وہ بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے تو اس وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں کتنی خوب صورت ہوں۔'' بانو نے دھیرے سے کہا۔

''مگر تیرے ہاتھ تو کچھ نہیں آئے گا، تین ماہ بعد تنویر سے تیری شادی ہے۔'' جمیلہ نے سرزنش کی۔

''میں تو اس سے شادی نہیں کروں گی۔ بکرے جیسی شکل ہے اس کی اور وہ کون سا دبئی میں کوئی افسر لگا ہوا ہے، ویلڈر ہی تو ہے۔'' بانو منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب...... کیا تو اس سے شادی نہیں کرے گی؟ کیا یہ تیرے بس میں ہے؟ تو نہیں جانتی بھائیوں کو، تجھے زبردستی ڈولی میں بٹھائیں گے۔'' جمیلہ نے جواب دیا۔

''میں گھر سے بھاگ جاؤں گی لیکن تنویر سے شادی نہیں کروں گی۔'' بانو کے عزائم سن کر جمیلہ کانپ کر رہ گئی۔

''کیا تو بوڑھے باپ کی عزت اپنے پاؤں تلے روندڈالے گی اشرم نہیں آئی یہ بات کہتے ہوئے؟'' وہ غصے سے بولی۔

''یہ میری زندگی ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ میں خود کروں گی۔'' بانو نے روٹھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

چند لمحوں تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی پھر بانو اس سے مخاطب ہوئی۔

''دیکھ جمیلہ! میں نے اپنے دل کی بات تیرے سامنے کردی ہے، امید ہے تو اس راز کو اپنے تک رکھے گی۔''

''تو اپنے گندے خیالات دل سے نکال دے تو بہتر ہے ورنہ میں اماں سے کہہ دوں گی۔'' جمیلہ نے جواب دیا۔

''کیا تو واقعی اماں کو بتا دے گی؟'' بانو نے سوال کیا۔

''ہاں اور اماں کو بتانا لازمی ہے، وہ ہی تجھے سمجھا سکتی ہے، بے فکر رہ وہ بھائیوں سے یا ابا سے بات نہیں کرے گی۔'' جمیلہ نے جواب دیا۔

''پاگل مت بن۔'' بانو نے جواب دیا۔ ''میں خود کسی روز موقع پا کر ان سے بات کرلوں گی وہ کوئی راستہ نکالے گی کہ میری شادی تنویر سے نہ ہو۔'' جمیلہ نے ماتھے پر آئے ہوئے بال سمیٹے اور ان کو سر کے پیچھے باندھتے ہوئے بولی۔

''لیکن اس اشرف کھوکھر سے تو تیرا بیاہ پھر بھی نہ ہو پائے گا پھر کیا فائدہ تنویر سے شادی نہ کرنے کا۔''

بانو کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ وہ اپنی گوری کلائیوں میں ڈالی ہوئی کانچ کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''جمیلہ! تو شہری لوگوں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے لیکن زندگی تو شہر میں ہی ہے۔ یہ لمبی سی کار، خوب صورت باورچی خانہ، گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیاں، آرام دہ صوفے اور فوم والے بیڈ۔'' یہ کہہ کر اس نے آس پاس طائرانہ نگاہ ڈالی جہاں پر بان کی چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں اور پیلے رنگ کا بلب مدھم دیئے جیسی روشنی بکھیر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چار سو اداسی پھیل گئی۔

باہر سے اماں کی آواز آئی۔ ''لڑکیو! آج روٹیاں نہیں لگانی کیا۔ میں نے کب کا تنور جلا رکھا ہے۔ جلدی سے باہر آؤ۔''

دونوں اپنے پیروں میں چپل پہن کر باہر نکلیں۔ دو کنال کے صحن میں سو واٹ کا ایک پیلا بلب جل رہا تھا۔ قریبی تپتے ہوئے تنور سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔

''سوئی رہتی ہو کیا۔'' اماں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تمہارے بھائی روٹی مانگیں گے۔

بانو...... تو روٹیاں لگا اور جمیلہ تو ذرا مجینسوں کو چارا ڈال۔ بھوری نے تو آج دودھ بھی کم دیا ہے۔''

بانو نے جھٹ سے گوندھے ہوئے آٹے کا تھال اٹھایا اور تنور کے پاس آ گئی، جمیلہ بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

اشرف کھوکھرا اپنے گھر کے صحن میں درخت کے نیچے بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹا درخت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ کاش وہ بھی پرندہ ہوتا اور اپنی بانو کو اڑا کر کسی دور دیس میں لے جاتا۔ اس نے دل میں سوچا۔ وہ بس جاگتی آنکھوں میں اسی کے خواب دیکھا رہتا تھا۔

''اوئے اشرف! کیا بات ہے خیر تو ہے نا...... آج کافی دیر سے تو چارپائی پر لیٹا ہے؟'' بوڑھے کرم دین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور حقے کی نے منہ سے لگائی۔

''ہاں ابا، خیر ہی ہے۔ ایک بات تو بتا۔'' وہ درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں پوچھ۔'' باپ نے حقے کی گڑگڑ کے بعد کہا۔

''یہ بتا کہ میری شادی بھی کرے گا یا نہیں۔ میرے تمام دوستوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ ایک میں ہی کنوارا رہ گیا ہوں۔'' وہ شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔

''اوئے بڑا بے شرم ہو گیا ہے تو...... باپ سے پوچھ رہا ہے کہ میری شادی کب ہو گی، کیا وقت آ گیا ہے۔'' وہ حقہ ایک طرف رکھتے ہوئے خفگی سے بولا۔ ''ایک ہمارا زمانہ تھا کہ شادی کے خیال سے ہی شرم آتی تھی۔ او بے شرم اپنی ماں سے بات کر یہ عورتوں کی ذمے داری ہوتی ہے۔''

''ارے ابا شرع میں کیا شرم۔'' وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولا پھر وہ باپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ گویا ہوا۔

''ابا! یہ اپنا فضل داد کس قسم کا آدمی ہے؟''

باپ نے آنکھوں کی پتلیوں کو سکیڑا اور پوچھا۔ ''کون فضل داد؟''

''شہباز کا باپ، اس کی ایک بیٹی کا نام بانو ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ایک نمبر کا کمینہ آدمی ہے۔ اپنے بدمعاش قسم کے بیٹوں پر بڑا ناز کرتا ہے مگر تو نے اس کی بیٹی کا نام کیوں لیا۔ شہباز کہنا کافی نہیں تھا کیا؟'' باپ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''اونہو ابا! یونہی نام لے لیا۔ کچھ اور نہ سمجھ لینا۔'' اشرف نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا زیادہ فضول باتیں نہ کر اور شہر چلا جا۔ ہاں پر میں نے ایک مکینک کو جنریٹر دیا تھا ٹھیک کرنے کے لیے۔ مین بازار میں اس کی دکان ہے، یہ لے اس کا کارڈ۔'' باپ نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''موٹر سائیکل تیز نہ چلانا۔'' باپ نے تاکید کی اور اشرف وہاں سے چل دیا۔ جب وہ موٹر سائیکل باہر نکال رہا تھا تب بھی بانو خیالوں میں اس کے ہمراہ تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی موٹر سائیکل پر ہی اس کے پیچھے بیٹھی ہو۔

☆☆☆

وقت دھیرے دھیرے گزرتا جا رہا تھا۔ بانو کے گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور اشرف کے پیروں تلے سے زمین کھسکتی جا رہی تھی۔ اشرف اور بانو ہفتے میں تین بار رات میں ملاقات کیا کرتے تھے۔ اس رات بھی وہ..... ... بارہ بجتے ہی گھر سے نکلا اور گنے کے کھیت کے قریب ہی اس کا انتظار کرنے لگا تھوڑی دیر بعد بانو بھی آ گئی۔

''سنا ہے تیری شادی ہو رہی ہے اگلے ہفتے؟'' اس نے اداس لہجے میں بانو سے سوال کیا۔

''ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔'' وہ اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

''تو، تو بڑی خوش ہو گی جہاز پر بٹھا کے دبئی جو لے جائے گا وہ تجھے۔'' شہباز نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میرے سینے پر تیر چلانے کے لیے بلایا ہے تو نے؟'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

اشرف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بس اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا وہ۔ چھوٹا سا تو قد ہے اس کا، سوکھا سڑا منہ ہے۔ وہ بھلا میرے قابل کہاں۔'' وہ اس کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

شہباز کے ہاتھ رک گئے۔ ''اس کا مطلب ہے وہ اگر لمبے قد کا ہوتا اور اس کا سوکھا ہوا منہ نہ ہوتا، تو تو اس سے خوشی خوشی بیاہ کر لیتی؟'' شہباز قدرے غصے سے بولا۔

''یہ میں نے کب کہا ہے؟'' بانو نے احتجاج کیا۔

''تو کہے تو میں اس کو ٹھکانے لگا دوں۔'' اشرف نیفے میں رکھے ہوئے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

''اس سے کیا ہو گا۔ تجھ سے تو میری شادی پھر بھی

نہیں ہوگی۔'' بانو نے جواب دیا۔

اشرف نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''کیا تو گھر چھوڑ سکتی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بولی۔

اشرف نے لمبی سانس نکالی اور گویا ہوا۔

''بانو! اپنی خوشی حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ میں تجھے بھگا کے شہر لے جاؤں، جہاں ہم دونوں کرائے کا کوئی گھر لے لیں گے۔ سنا ہے کورٹ کچہری میں بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ کیا تو اپنے اندر گھر سے بھاگنے کی جرأت رکھتی ہے؟''

شہر کا نام سنتے ہی بانو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''میں تیار ہوں۔ بس اب پیچھے نہ ہٹنا۔ میں خود کئی دنوں سے یہی سوچ رہی تھی مگر تجھ سے کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں گاؤں اور یہاں کی پابندیوں سے تنگ آ گئی ہوں، تو نے شہر کا نام لیا ہے تو میں تیرا ساتھ دینے کو تیار ہوں، بول کب چلنا ہے؟''

اشرف نے درخت سے ٹیک لگائی اور پھر گویا ہوا۔ اس کا ہاتھ بانو کے ہاتھ میں تھا۔ ''کیا تو سارا زیور اپنے ساتھ لا سکتی ہے؟ شہر میں نئی زندگی شروع کرنے کے لیے قدم قدم پر پیسے کی ضرورت ہوگی۔''

''بیس تولے زیور ہے میری شادی کے لیے۔ کیا وہ کافی رہے گا؟'' بانو نے سوال کیا۔

''ہاں، اس سے چھوٹا سا کاروبار ہو سکتا ہے۔ سن...... میں نے ذہن میں پروگرام ترتیب دے رکھا ہے۔''

بانو اس کے اتنا قریب آ گئی کہ اشرف کی گرم سانسیں اس کے رخساروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ہمہ تن گوش تھی۔

اشرف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہم اگر ایک ساتھ فرار ہوئے تو میرے بھائی مفت میں مارے جائیں گے اور دشمنی کا ایک لمبا سلسلہ چل نکلے گا۔ میں تجھے راتوں رات یہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ دوں گا اور خود واپس آ جاؤں گا۔ پھر ایک ہفتے بعد تیرے پاس آؤں گا اور ہم رات کے اندھیرے میں شہر چلے جائیں گے۔ تیرے گھر سے فرار کے بعد جب میں گاؤں میں ہی کچھ دن رہوں گا تو تیرے بھائی مجھ پر شک نہیں کریں گے، ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں بالکل ٹھیک۔'' بانو نے دبے لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر تو مجھے چھپائے گا کہاں؟''

''دریا کے پار کچے کے علاقے میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، وہاں میرا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ بہت قابلِ اعتماد ہے وہ۔ میں تجھے اس کے پاس چھوڑ کر راتوں رات واپس آ جاؤں گا۔ بس تو وہاں ایک ہفتہ رہے گی، اس کے گھر میں اس کی بیوی اور ماں بھی رہتی ہے۔ بے فکر ہو کر رہنا۔ تو ایسا کر کل رات ٹھیک بارہ بجے تمام زیور اور ہو سکے تو کچھ پیسے بھی لے کر آ جانا۔ تیر کر دریا پار کرنا ہے۔ آنے سے پہلے دیسی گھی پی لینا۔ سردی کا موسم ہے اور دریا کا پانی بہت ٹھنڈا ہوگا۔ دیسی گھی سے تجھ پر ٹھنڈا اثر نہیں کرے گی۔''

''مگر مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔'' بانو پریشان لہجے میں بولی۔

''کوئی بات نہیں، تیرا انتظام میں کر لوں گا۔ مجھے تو تیرنا آتا ہے۔ بس اب تو جا۔ کل اسی جگہ اسی وقت ملنا ہے۔ زیادہ سامان نہ ہو بس زیور اور کچھ روپے۔ روپوں کو پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ لینا، کپڑے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔'' بانو نے ادھر ادھر دیکھا پھر وہ اشرف کی طرف دیکھنے لگی، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں اس نے بہن کو ایک مس کال دے دی تھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو جمیلہ دروازہ کھول کے کھڑی تھی۔

☆☆☆

چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ سارا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دونوں ستاروں اور ادھورے چاند کی مدھم روشنی میں دریا کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بانو نے ایک ہاتھ میں گٹھری تھام رکھی تھی جبکہ اشرف کے ہاتھ میں گاڑی کی ٹیوب تھی جس میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ جہاں سے وہ چلے تھے وہاں سے دریا ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کا آخری گھر انہوں نے کراس کیا تو دور سے انہیں دریا کا چمکیلا پانی نظر آیا جو خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ وہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے کنارے پر آ گئے۔

''دیکھ بانو...... ایک ہاتھ سے تو نے ٹیوب کو تھامنا ہے اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا ہے، خبردار تیرے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہونی چاہیے۔ ٹیوب ہاتھ سے چھوٹ گئی تو دونوں ڈوب جائیں گے۔''

بانو نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''میں نے اپنے دوست کریم داد کو فون پر اطلاع دے دی تھی، وہ پرلے کنارے پر موجود ہوگا، میں تجھے اس کے حوالے کر کے واپس لوٹ جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' بانو نے جواب دیا۔

اشرف نے ٹیوب اس کو تھمائی اور اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا پھر دونوں دریا میں اتر گئے۔ ٹھنڈے پانی نے ان کا استقبال کیا۔ دونوں آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے گہرے پانی میں چلے گئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ بخیریت دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ ان کو دور سے کریم داد کی جلتی بجھتی ٹارچ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں پانی سے نکلے اور کچھ دیر بعد کریم داد کے پاس پہنچ گئے۔

''بڑی ہمت کی یار تم دونوں نے۔'' کریم داد سلام کرنے کے بعد بولا۔

''بس یار۔ پیار میں تو ہمت دکھانی پڑتی ہے۔ تو بانو کو لے جا، اس کو باہر نہ نکلنے دینا۔ میں آج ہی کے روز اگلے ہفتے تیرے پاس اپنی امانت لینے آجاؤں گا۔''

''بے فکر رہو دوست۔ تمہاری امانت ہے جب جی چاہے لے جانا۔ چل بہن۔'' کریم داد نے جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر دونوں اشرف سے جدا ہو گئے۔ اشرف نے اسی وقت دریا میں چھلانگ لگائی اور ٹیوب کے سہارے تیرتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف جانے لگا جہاں پر اس کا گاؤں تھا۔

☆☆☆

پانچوں بھائیوں کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ باپ اپنے کمرے میں بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا اور ماں نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ سرور سب سے چھوٹا تھا، اس نے اپنی چھوٹی بہن جمیلہ کو بالوں سے پکڑا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''ہم کیسے مان لیں کہ تجھے اس کے جانے کا پتا نہیں تھا۔ جلدی بتا وہ کہاں ہے ورنہ اسی کلاشنکوف سے تجھے چھلنی کر دوں گا۔''

شہباز آگے بڑھا۔ ''کس کے ساتھ گئی ہے وہ بتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ جمیلہ دور جا گری۔

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ رات کو کس وقت نکلی اور کس کے ساتھ گئی ہے۔ بھائی! قسم لے لو جو مجھے کچھ بھی پتا ہو۔'' جمیلہ روتے ہوئے بولی۔

ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ ''بتا دے جمیلہ اگر تجھے تھوڑی سی بھی خبر ہے۔'' ماں دروازے پر کھڑے کھڑے بولی۔

''اماں، مجھے معلوم ہوتا تو کب کی بتا چکی ہوتی۔ وہ اپنے راز کب کسی کو دیتی تھی۔'' جمیلہ سسکتے ہوئے بولی۔

''ہماری ساری عزت پاؤں تلے روند گئی ہے وہ۔'' تیسرا بھائی جاوید دانت پیستے ہوئے بولا۔

''اماں، نہ ہم باہر جا سکتے ہیں نہ پولیس میں رپورٹ کر سکتے ہیں۔ تباہ کر کے جانے کہاں گلچھرے اڑاتی پھر رہی ہوگی، ایک بار اس کا سراغ مل جائے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ کوئی پہچان بھی نہیں پائے گا۔'' شہباز بے بس لہجے میں بولا۔

سرور چارپائی پر بیٹھ گیا اور سب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''اسی گاؤں کا کوئی ہوگا جس کے ساتھ اس کا یارانہ چل رہا ہوگا، اب پتا نہیں وہ کون ہے، اب ہم حاضری تو نہیں لگا سکتے کہ گاؤں کا کون سا بندہ غائب ہے۔''

جاوید آگے بڑھا اور ماں سے مخاطب ہوا۔

''تجھے منع کیا تھا کہ اس کے ہاتھ سے موبائل لے مگر تو، تو کہتی تھی کہ سہیلیوں کو میسج کرتی ہے۔'' پھر وہ بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ضروری نہیں کہ اسی گاؤں کا ہو، باہر کا بھی ہو سکتا ہے اور مجھے پکا یقین ہے کہ باہر کا بندہ ہی ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ اضطرابی کیفیت میں مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ چوتھا بھائی اصغر جو اب تک خاموش کھڑا تھا، اس کی آواز گونجی۔

''اماں، اس جمیلہ کا جتنا جلدی ہو سکے بیاہ کر دے۔ خالہ صغراں سے بات کر کہ وہ جلد از جلد شادی کی تاریخ دے جائیں، ایسا نہ ہو کہ یہ بھی ہمارے منہ پر کالک مل کے بھاگ جائے۔''

جمیلہ نے زخمی نظروں سے اصغر کو دیکھا مگر احتجاج کا کوئی لفظ ادا نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد سب بھائی کمرے سے نکل گئے۔

سارے گھر پر سوگواری کا عالم طاری تھا۔ بانو کو گھر سے گئے دو دن ہو چکے تھے۔ بانو کے گھر سے بھاگنے کی خبر تقریباً سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ بانو کے بھائی دو دن سے اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ بھائیوں میں تھی اور نہ باپ میں مگر کب تک، بالآخر کام کاج کے سلسلے میں آہستہ آہستہ انہوں نے باہر جانا شروع کر دیا۔ لوگوں سے سلام دعا کے بغیر وہ آنے جانے لگے۔ کوئی شناسا سلام کرتا تو نظریں جھکا کر جواب دیتے۔ سینہ تان کر چلنے والے آج شانے جھکا کر چلنے لگے تھے۔

☆☆☆

اشرف دن میں دو تین بار بانو کے گھر کے سامنے سے

گزر جاتا کہ بانو کی گمشدگی پر کوئی اس پہ شک نہ کر سکے کیونکہ اگلے چند روز بعد اس کو بھی یہ گاؤں چھوڑنا تھا۔ ساتھ ساتھ یہ امید بھی تھی کہ اس گلی سے گزرتے ہوئے اس کے باپ یا بھائیوں میں کوئی نہ کوئی اس کو آتا جاتا دیکھ لے۔ آج بھی اشرف گلی سے گزر رہا تھا کہ رمضو دکاندار نے دیکھتے ہی اس کو سلام کیا۔

''کیا حال ہے رمضو۔'' وہ اس کی دکان کے تھڑے پر پاؤں رکھتے ہوئے بولا۔

''مولا کا کرم ہے بھائی۔ تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے آج کل؟'' وہ اس کے قریب آگیا۔

''بس یار قدرت کے رنگ دیکھ رہا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ بیٹی دے تو اچھے کردار والی دے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس نکالی۔

''کیا مطلب؟'' اشرف نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''یار! اپنے فضل داد کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ آواز دھیمی کرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے...... توبہ توبہ۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''ہاں یار! بہت برا ہوا، خیر اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ جو لوگ اپنی بیٹیوں پر کڑی نظر نہیں رکھتے ہیں ان کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ گاؤں کا ماحول بہت خراب ہو گیا ہے۔ میں تو دو تین روز تک یہ گاؤں چھوڑ دوں گا۔ شہر جا کر کوئی کام ڈھونڈوں گا۔'' اشرف نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار! یہاں تو نہ روزگار ہے نہ کاروبار۔ چائے پیئے گا؟'' رمضو ایک گاہک کو نمٹاتے ہوئے بولا۔

''نہیں یار چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دکان سے نکل کر گھر کی جانب چل دیا۔

بانو کا سراپا ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا لیکن دل اطمینان سے لبریز تھا کیونکہ وہ اب اس سے محض دو تین دن کے فاصلے پر تھی، پھر نہ چھپ چھپ کر ملنے کی ضرورت ہوگی اور نہ ملاقات کا انتظار ہوگا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں بانو کے ہمراہ کئی مقامات کی سیر کر چکا تھا، دو تین بچوں کے خواب بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کے یہ دن بڑی بے صبری سے گزر رہے تھے، وہ اپنے ماں باپ کو بھی کہہ چکا تھا کہ دو تین دن تک وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا جائے گا۔

گھر جاتے ہی اس نے کریم داد کو فون کیا مگر اس کا نمبر بند مل رہا تھا۔ دو تین گھنٹے بعد اس نے پھر کال کی مگر نمبر ہنوز بند رہا۔ رات کھانا کھانے کے بعد اس نے تیسری بار کوشش کی اس بار نمبر مل گیا۔

''کیا حال ہے کریم داد؟'' لائن ملتے ہی اشرف نے کہا۔

''مولا کا کرم ہے بھائی۔ تم سناؤ وہاں تو سب اچھا ہے نا؟'' کریم داد نے سوال کیا۔

''ہاں، کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ یہ بتاؤ وہ کیسی ہے ٹھیک تو ہے نا۔''

''بالکل ٹھیک ٹھاک ہے تم کہو تو تمہاری بات کرادوں؟'' کریم داد نے پوچھا۔

''نہیں نہیں، بس حال پوچھنا تھا، اوکے خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

اس نے فون کو جیب میں رکھا اور چھوٹی بہن کو آواز دی۔ ''صابرہ! ایک کپ چائے تو بنا۔''

''اچھا بھائی بناتی ہوں۔'' دور سے آواز آئی۔

اس کی ماں اندر داخل ہوئی۔ ''پتر شرفو! تیرا باپ کہہ رہا تھا کہ تو تین چار روز تک شہر چلا جائے گا، مجھے تو تو نے بتایا ہی نہیں۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اماں! تجھے اس لیے نہیں بتایا کہ تو جانے کی اجازت جو نہیں دے گی۔ ویسے بھی اماں اس گاؤں میں میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ گاڑی چلانا جانتا ہوں، شہر میں کوئی نہ کوئی نوکری مل ہی جائے گی۔''

اماں نے دوپٹا درست کیا اور بولی۔ ''شرفو پتر! میں تجھے روکتی تو نہیں کیونکہ جوان جہان ہے تو۔ روزگار تو تجھے چاہیے، بس اپنا خیال رکھنا اور روزانہ فون کرتے رہنا۔''

''اماں تو، تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے میں ابھی ابھی جا رہا ہوں۔ ابھی تین چار دن باقی ہیں۔'' اشرف بازو کو تکیہ بنا کر لیٹتے ہوئے بولا۔

اماں اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور رازدارانہ لہجے میں بولی۔

''بانو کا کچھ پتا چلا؟''

''معلوم نہیں اماں...... میں ایسی باتوں کی ٹوہ میں نہیں رہتا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''ہائے ہائے اللہ ایسی بیٹی کسی کو نہ دے۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ''باپ کی سفید داڑھی اور بھائیوں کا شملہ مٹی میں ملا گئی۔'' پھر اس نے طویل سانس باہر نکالی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

اشرف کا باپ دروازہ کھولنے چلا گیا۔ پھر وہ اشرف کے کمرے میں داخل ہوا۔

''شہباز آیا ہے، تجھے بلا رہا ہے۔'' اس نے کھانستے

ہوئے کہا۔

اشرف کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ ''کون شہباز......؟'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''فضل کا بڑا بیٹا۔'' باپ نے جواب دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

اشرف نے کچھ دیر سوچا پھر الماری کھول کر پستول نکال کے قمیص کی سائڈ والی جیب میں رکھا اور باہر نکل گیا۔

''جی کیا بات ہے؟'' اس نے سلام کے بعد پوچھا۔ اس کا ہاتھ پستول والی جیب پر تھا۔

''تم سے ایک کام تھا یار۔'' شہباز نے دھیمے لہجے میں کہا جس سے اشرف کی تسلی ہوئی۔

''اندر آجاتے، تمہارا پردہ تو نہیں۔'' اشرف نے سردتا کہا۔

''نہیں یار......بس یہیں ٹھیک ہے۔ کام تھا تو تمہاری طرف چلا آیا۔'' شہباز اس کے شانے پر بازو رکھ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ آج اس کی شانِ بے نیازی، عاجزی اور انکساری میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ ہر ایک سے انتہائی غرور سے بات کرتا تھا۔

''بات یہ ہے اشرف کہ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے جمال الدین کے پاس بیٹھا تھا، تمہیں تو پتا ہے ہمارے گھر پر قیامت گزر گئی ہے۔ مجھے کسی پہنچے ہوئے پیر کے آستانے کی ضرورت ہے، کوئی ایسا تعویذ درکار ہے جس سے ہم اپنے اس دشمن تک پہنچ سکیں جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ جمال الدین نے تمہارے بارے میں بتایا ہے کہ تم ملتان کے کسی پیر کے مرید ہو اور وہ بہت پہنچا ہوا ہے، تم مجھے اس کا ایڈریس بتا سکتے ہو؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' اشرف نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ بتاؤ کہ تم جاؤ گے تو ہو گے نا بنے'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ وہ دل ہی دل میں خود سے شرمندہ ہو رہا تھا۔

''نہیں دوست، بس تم مجھے اس کا ایڈریس بتاؤ۔'' شہباز نے جواب دیا اور اشرف نے اس کو کسی اور پیر کے آستانے کا ایڈریس بتا دیا۔ ایڈریس نوٹ کرتے ہی شہباز نے واپسی کی راہ لی۔

اشرف گھر واپس آگیا۔ آج اس کو بانو کی یاد ستا رہی تھی، اس کے جانے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ پھر اس نے اگلی صبح بانو کا حال جاننے کے لیے روانگی کا پروگرام بنا لیا۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کے لیے سخت بے چین ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بانو سے مل کر واپس آجائے گا، اس کا دل

ذرا مسکرائیں

داماد اپنے سسرال ''لکھنؤ'' گیا تو ساس نے پوچھا۔ ''دلہا بیٹا! آپ کے لیے میاں آلو پکا لیے جائیں۔ بھنڈی محترمہ کھانا پسند کریں گے یا پھر کدو صاحب نوش فرمائیں گے؟''

داماد بولا۔ ''جی میں گناہ گار بندہ ان کے لائق کہاں......آپ کوئی بے غیرت سا مرغا پکا لیں۔''

مرسلہ۔ محمد یونس چودھری، سلطان پورہ، لاہور

☆☆☆

ایک عورت (اپنے خاوند سے) ''آپ مجھے رانی کیوں کہتے ہیں؟''

خاوند۔ ''کیونکہ نوکرانی کہنا تھوڑا لمبا ہو جاتا ہے۔''

بیوی۔ ''آپ کو پتا ہے میں آپ کو جان کیوں کہتی ہوں؟''

خاوند۔ ''کیوں؟''

بیوی۔ ''کیونکہ جانور کہنا تھوڑا لمبا ہو جاتا ہے۔''

مرسلہ۔ عبدالغفار فردوس، نواں شہر، ایبٹ آباد

تو چاہ رہا تھا کہ رات ہوتے ہی تیر کر دریا پار کر جائے مگر سردی میں یہ کام بہت مشکل تھا۔ تب کی بات اور تھی، اب تو وہ صبح کو کشتی پر بیٹھ کر جا سکتا تھا۔ گاؤں کے لوگ دریا پار کشتی پر بیٹھ کر ہی جایا کرتے تھے۔

اگلی صبح نماز سے فراغت کے بعد اس نے ماں سے شام تک لوٹنے کا وعدہ کیا اور روانہ ہو گیا۔ گھر میں اس نے یہ بتایا کہ کریم داد کے پاس کسی ضروری کام سے جا رہا ہوں۔

دریا کے کنارے کشتی موجود تھی۔ چند مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی سوار ہو کر نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ تمام مسافر نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کشتی روانہ ہوئی، اس جگہ سے دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس نے موبائل پر کریم داد کا نمبر ملایا تا کہ اس کو اپنے آنے کی اطلاع دے سکے مگر اس کا نمبر بند مل رہا تھا، اس نے مزید دو بار کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ کشتی ڈیزل انجن والے جنریٹر کے ذریعے چل رہی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ کریم داد کے گاؤں میں تھا۔ کشتی سے اترتے ہی اس نے کریم داد کے گھر جانے والی پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔

کریم داد کا گھر گاؤں کے باقی گھروں سے ہٹ کر تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ گاؤں نہیں تھا، دوسرے دیہاتوں کی طرح یہاں کے گھر بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ کریم داد کے گھر کے آس پاس یا تو ریتیلا میدان تھا یا چھوٹے چھوٹے کھیت بنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر سرکنڈوں کے پودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دریا کا پانی جہاں جہاں سے غائب ہوجاتا تھا، وہاں پر سرکنڈوں کے خودرو پودے سر نکال لیتے تھے۔ وہ دل میں ملن کی بے چینی دبائے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دو تین منٹ کے بعد اس کو دور سے کریم داد کا گھر نظر آگیا۔ گھر کے باہر درخت کے نیچے دو تین بھینسیں بندھی ہوئی تھیں اور کافی فاصلے پر ایک ٹیوب ویل چل رہا تھا جس پر دو عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں غالباً یہ کریم داد کی ماں اور بیوی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد دروازے پر پہنچ گیا۔ لکڑی کا بڑا سا گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، اس نے دو تین بار کریم داد کا نام پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ وہ پہلے بھی کئی بار گھر کے اندر آچکا تھا۔ دو تین کنال پر مشتمل اس گھر کے صحن میں کوئی نہیں تھا، وہ چلتا ہوا ایک کمرے کے پاس رکا، وہ خالی تھا پھر دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ بانو کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ وہ کسی بات پر قہقہہ لگا رہی تھی پھر قہقہہ رکتے ہی وہ دیتا۔ وہ کہتی ''کریم داد! [illegible] چلی جاؤں نا تو تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' کریم داد کی آواز گونجی۔

''جب چلی جائے گی تو پھر کب یاد رکھے گی، گھر آباد ہوتے ہی تو تو اشرف کی ہوجائے گی۔''

''اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں کریم داد، میں تو بس گاؤں کے ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔ ویسے تو فکر نہ کر تیرا نمبر تو میرے پاس ہے نا بس جیسے ہی میرا دل تجھے دیکھنے کو چاہے گا میں تجھے فون کردوں گی تو آجانا۔''

کریم داد گویا ہوا۔

''اور وہ اشرف جو وہاں ہوگا پھر ہم کیسے ملیں گے؟''

''اس کو میں کسی ایسے کام پر لگا دوں گی کہ صبح کو جائے گا اور رات کو واپس آئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اشرف کے قدم جیسے پتھر کے ہوگئے تھے، اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ پھر کریم داد کی آواز آئی۔

''ادھر دور کیوں بیٹھی ہے؟''

''تیرا دل نہیں بھرا ابھی تک۔ صبر کر ابھی اماں اور تیری بیوی آجائے گی۔''

اشرف کا ہاتھ پستول کی جانب گیا، اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا تھا پھر اچانک اس کی عقل اس کے دل پر حاوی ہوگئی۔ اس نے ان کو خود سزا دینے کے بجائے کچھ اور کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ دبے پاؤں واپس جانے کو مڑا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کو نہیں یاد کہ وہ کس طرح کشتی تک پہنچا تھا۔ بچپن کے دوست اور محبوبہ کی بے وفائی اس کو اندر سے ختم کرگئی تھی۔ وہ خاموشی سے کشتی پر جا بیٹھا۔ کب مسافر جمع ہوئے اور کب کشتی روانہ ہوئی اس کو قطعی ہوش نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوسرے کنارے پر تھا۔ اب وہ قدرے حواس میں بھی تھا۔ گھر جانے کے بجائے اس نے شہباز سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ دو تین بار کی دستک دینے کے بعد شہباز کا باپ باہر نکلا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اشرف کی طرف دیکھا۔

''شہباز سے ضروری کام ہے، ذرا اس کو بھیجیں۔''

اشرف نے اس کے سوال سے پہلے ہی آنے کا مقصد بتا دیا۔

''وہ تو ملتان جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں اس کو بھیجتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شہباز باہر نکلا۔ اشرف کی طرف گرم جوشی سے بڑھا۔

''خیر تو ہے اشرف...... کیا کام ہے؟'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ہاں خیر ہے۔ [illegible] اچھی خبر ہوں یا بری۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔''

شہباز نے آنکھوں کی پتلیوں کو سکوڑا پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''بول بول اشرف، بتا کیا بات ہے؟''

اشرف نے چند لمحوں تک ادھر ادھر دیکھا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''میں آج سویرے دریا کے پار والے گاؤں جھوک سوہانہ گیا تھا۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ حکمت کا کام بھی جانتا ہے۔ اس سے کوئی دوا لینی تھی۔'' پھر وہ ذرا دیر کو رکا۔

''ہاں ہاں پھر؟'' شہباز نے جلدی سے کہا۔

''ہم دونوں کا ایک مشترکہ دوست ہے جس کا نام کریم داد ہے۔ باتوں باتوں میں میرے حکیم دوست نے بتایا کہ کریم داد کے گھر آج کل تین چار دن سے کوئی لڑکی چھپی ہوئی ہے جس کو وہ کہیں سے بھگا کر لے آیا ہے۔ مجھے شک سا ہو رہا ہے کہ وہ کہیں تمہاری بہن نہ ہو۔ یار! خفا نہ ہونا تم اپنے سے لگتے ہو، پریشان بھی ہو۔ میں ایک دوست

بن کر تمہیں خبر دینے آیا ہوں۔ آگے تمہارا کام ہے۔''

''تو چائے پیے گا؟'' شہباز نے رسماً پوچھا مگر بے تابی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''نہیں دوست، اب مجھے اجازت دو۔'' یہ کہہ کر اس نے شہباز کو خدا حافظ کہا اور گھر لوٹ گیا۔ جانے سے پہلے وہ کریم داد کا ایڈریس مکمل طور پر شہباز کو سمجھا گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے ایک بجے غلام رسول کے گھر پہ دستک ہوئی۔ غلام رسول اس کشتی کا ملاح تھا جو گاؤں والوں کو دریا پار کراتا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے شہباز کھڑا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو نقاب سے چھپا رکھا تھا۔

''کون ہو بھائی؟'' اس نے سوال کیا۔

''مجھے دوسرے کنارے پر جانا ہے۔'' شہباز نے جواب دیا۔

''مگر اس ٹائم تو ہم نہیں جاتے۔ آخری پھیرا مغرب سے ذرا پہلے لگاتے ہیں۔'' غلام رسول نے جواب دیا۔

شہباز نے پانچ سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ غلام رسول نے نوٹ کو دیکھا جیسے اس کے اصلی ہونے کی پہچان کر رہا ہو پھر وہ اندر گیا اور دو منٹ بعد ہی لوٹ آیا۔ ''آؤ۔'' وہ اس کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا اور شہباز اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دونوں دریا کے کنارے پہنچے، شہباز کشتی میں سوار ہوگیا اور غلام رسول نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ کشتی دھیرے دھیرے دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔

غلام رسول نے شہباز کو دیکھا جو بدستور نقاب لگائے ہوئے تھا اور بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

''تم نے منہ کیوں چھپا رکھا ہے..... کوئی ڈکیت تو نہیں ہو؟'' غلام رسول نے سوال کیا۔

''ڈکیت نہیں ہوں۔ گھبراؤ مت بس منہ چھپانا میری مجبوری ہے۔ تم جھوک موہانہ کے کریم داد کو جانتے ہو؟''

''جھوک موہانہ میں دو کریم داد ہیں۔ ایک کریم داد نائی ہے عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی اور دوسرا جوان آدمی ہے۔ دونوں کو جانتا ہوں۔'' غلام رسول نے جواب دیا۔

شہباز خاموش ہوگیا۔ کشتی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ چاند کی کرنیں پانی پر اپنا جلوہ بکھیر رہی تھیں۔ کافی دلفریب اور پراسرار منظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا کنارہ آگیا۔ شہباز کشتی سے اتر گیا اور غلام رسول سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے اس جوان کریم داد کا پتا سمجھا دو۔ کریم داد میرا دوست ہے۔ اس کا گھر گاؤں سے کچھ ہٹ کر ہے۔ میں کافی مدت بعد آیا ہوں، کیا تم مجھے اس کے گھر کی نشاندہی کر سکتے ہو؟''

غلام رسول نے انگلی کے اشارے سے...... درختوں کے جھنڈ کی نشان دہی کی۔ ''اس جھنڈ کے پیچھے اس کا گھر ہے۔ آس پاس کوئی اور گھر نہیں ہے، یہی اس کی نشانی ہے۔''

شہباز نے اس کو خدا حافظ کہا اور اپنی منزل کی طرف چل دیا۔ تقریباً آدھا کلومیٹر دریا کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد وہ جھنڈ میں آگیا۔ جھنڈ کے پیچھے دو کنال کا گھر تھا۔ آس پاس دور دور تک کوئی اور گھر نہیں تھا۔ شہباز نے کچھ دیر سوچا اور پھر اجالا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے انتظار کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں ہو پھر اس کو ایک چھوٹی سی کوٹھڑی نظر آگئی۔ وہ اس میں جا گھسا۔ یہ بھوسا رکھنے کی کوٹھڑی تھی۔ وہ وہیں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کو اونگھ سی آگئی۔ پھر اذان کی آواز کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ وہیں بیٹھا رہا یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوگیا۔ پھر جونہی چمکیلی دھوپ کمرے کے اندر آئی، وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے سائڈ والی جیب میں رکھے ہوئے پستول کو ٹٹولا اور پھر کوٹھڑی سے نکل کر گھر کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے گیٹ کو ہلکا سا دھکا دیا، وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ سامنے ایک بوڑھی عورت بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ اس نے حیرت سے شہباز کو دیکھا جس نے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ دوسری جوان عورت چولہا جلا رہی تھی۔ شہباز نے آواز دے کر بانو کو پکارا، اس کا خیال تھا کہ اس کی بہن اگر نہ ہوئی تو وہ خاموشی سے معذرت کر کے واپس چلا جائے گا لیکن اس کی آواز سنتے ہی بانو کمرے سے باہر نکلی۔ اس نے آواز سے بھائی کو نہیں پہچانا، وہ تو بس اپنا نام سن کر باہر آئی تھی۔ شہباز نے جونہی اس کو دیکھا اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے فوراً پستول نکالا اور یکے بعد دیگرے تین گولیاں بانو کے جسم میں اتار دیں۔ وہ ہلکی سی دردناک آواز نکالتے ہوئے زمین بوس ہوگئی۔ کریم داد فائر کی آواز سن کر بے ساختہ باہر نکلا۔ شہباز نے دو گولیاں اس پر بھی چلا دیں۔ وہ کٹے ہوئے درخت کے مانند زمین پر گر گیا۔ دونوں عورتیں شور مچانے لگیں۔ ان کا شور دھیرے دھیرے آہ و بکا میں تبدیل ہوتا گیا۔

شہباز نے اطمینان سے پستول واپس جیب میں رکھا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی راستے سے باہر نکل گیا۔



محفل شعر و سخن

* ملائکہ حریم......اوکاڑہ

اپنے ہاتھوں کی لکیریں نہ بدل پائے ہم
نصیب والوں سے بہت ہاتھ ملائے ہم نے

* جاوید اختر رانا ...... پاک پتن شریف

اس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار
کل آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے
وہ کر نہیں رہا تھا میری بات کا یقیں
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے

* سنعیہ منظور...... یوحنا آباد، لاہور

گفتگو ہم سے اور خیالوں میں کوئی اور
حال آپ کا بھی ہے میری نمازوں جیسا

* عبدالغفار فردوس......نواں شہر، ایبٹ آباد

کوئی شکوہ، کوئی گلہ نہ کوئی فریاد ہوگی
میرے محبوب میرے دل میں صرف تیری یاد ہوگی

* رانا بشیر احمد ایاز.....کراچی

میری بات وہ کیسے مانتا میرا درد وہ کیسے جانتا
وہ تو خود ہوا کے سفر پہ تھا اسے روکنا محال تھا
وہ ملا تھا برسوں بعد مگر میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
اسے میری چپ نے رلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا

* بادیہ ایمان، ماہا ایمان.....کھاناں

یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں زرتابی قباؤں میں
سحر کا نام لے کر رات کی تعلیم دیتے ہیں

* وردا جنید، محمد آریز ملک.....کراچی

ہم جانتے ہیں تمہیں ہماری قدر نہیں
ان سے جا کے پوچھو جن کے مقدر میں ہم نہیں

* سیدہ ثانیہ کاظمی.....ڈیرہ اسماعیل خان

پربت پربت گونج رہی ہے میرے عشق کی شہنائی
اڑتے پنچھی دور افق سے گیت سنانے آتے ہیں
من کی آگ میں جلتے ہیں اور انگاروں پہ چلتے ہیں
دشت بلا میں لوگ جو کوئی شہر بسانے آتے ہیں

* رعنا رضوی.....یوکے

اب کے برس بہار تھی کھولے ہوئے قبا
اب ہی کے ہم سے چاک گریباں نہ ہو سکا

* زرین آفریدی.....حیدر آباد

مانا کہ انمول ہو کثرتِ نایاب ہو تم
ہم بھی وہ لوگ ہیں جو ہر دہلیز پہ نہیں ملتے

* مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......ضلع خانیوال

پردیس میں یاد آئے گی دھیان میں رکھ
اپنے شہر کی مٹی بھی سامان میں رکھ
سارے جسم کو لے کر گھوم زمانے میں
بس ایک دل کی دھڑکن پاکستان میں رکھ

* زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

وہ کیا جانیں پیار کے رسیا کتنے پاگل ہوتے ہیں
دیپ جلانے آجاتے ہیں پروانوں کی بستی میں

❊ تنویر لودھی...... آفیسرز کالونی، واہ کینٹ
عشق آیا ہے رفعتِ خیالی لے کر
حسن آیا ہے شوکتِ جمالی لے کر
سب اہلِ کمال لے کر آئے ہیں کمال
بیدم آیا ہے بے کمالی لے کر

❊ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی
عید لیل و نہار دیکھو تم
جوانی کی بہار دیکھو تم
صرف آج کے دن پہ ہی ہے کیا موقوف
ایسی خوشیاں ہزار دیکھو تم

❊ سید عبادت کاظمی...... ڈیرہ اسماعیل خان
سکوتِ شام خزاں ہے قریب آجاؤ
بڑا اداس سماں ہے قریب آجاؤ
جو دشت عشق میں بچھڑے وہ کبھی نہ ملے
یہاں دھواں ہی دھواں ہے قریب آجاؤ

❊ صادق معاویہ سعیدی...... خان پور، رحیم یار خان
تم بھی سوچو میں بھی سوچوں
کس نے کس کو چھوڑ دیا ہے

❊ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی
بار ہا ساتھ وہ جس راہ گزر سے گزرے
جی بھر آیا کبھی تنہا جو ادھر سے گزرے

❊ اظہر حسین بیچار...... ہزاری، جتوئی
بچھڑ کے پھر ملیں گے یقین کتنا تھا
تھا تو اک خواب مگر حسین کتنا تھا
وہ میرے زوال سے پہلے ہی مجھ کو چھوڑ گیا
حسین تو تھا ہی مگر ذہین کتنا تھا

❊ اشفاق شاہین...... کراچی
نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا کہ تیری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کب کی ہے

❊ ماہین فاطمہ...... اوکاڑہ
راستے میں کہیں وہ مل جائے تو مقدر میرا
منزل پہ کہیں میں کھو جاؤں تو قسمت اس کی

❊ داؤد اشفاق...... اوکاڑہ
دیواریں سن رہی ہیں قاصد، ذرا آرام سے کہو
کیا وہ ہم سے بچھڑ کر سچ میں خوش ہے

❊ احسان سحر...... میانوالی
اپنے دامن میں کسی روز چھپا کر لے جا
میں اگر روٹھ گیا ہوں تو منا کر لے جا
سب یہ کہتے ہیں چرایا ہے ترا دل میں نے
ہے اگر کوئی نشانی تو بتا کر لے جا

❊ معراج محبوب عباسی...... ہری پور، ہزارہ
ایسے ہے جیسے آنکھ سے بینائی چھن گئی
ایسے ہے جیسے دل نے کوئی بھید پالیا
کاغذ کے پھول سر پہ سجا کے نکلی حیات
نکلی بیرونِ شہر تو بارش نے آلیا

❊ وزیر محمد خان...... بفہ ہزارہ
بھیگی ہوئی اک شام کی دہلیز پہ بیٹھے
میں دل کے سلگنے کا سبب سوچ رہا ہوں
دنیا کی تو عادت ہے بدل لیتی ہیں آنکھیں
میں تیرے بدلنے کا سبب سوچ رہا ہوں

❊ محمد یونس چودھری...... سلطان پورہ، لاہور
بسا لینا کسی کو دل میں دل ہی کا کلیجا ہے
پہاڑوں کو تو بس آتا ہے جل کر طور ہو جانا

❊ محمد حسان گل سیال...... روہڑی ضلع سکھر
یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

❊ مدحت...... کراچی
وہ اشک بن کے میری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

❊ ظفر احمد...... راولپنڈی
جو تو نہیں تو عید بھی کیسے منائیں ہم
اک بار آ تجھ کو گلے سے لگائیں ہم
سنتے ہیں زندگی کا نہیں کوئی اعتبار
پھر اس کے بعد عید تلک مر نہ جائیں ہم

❊ محمد شہباز اکرم نوئی...... ڈھپئی پاک پتن شریف
سوچتا ہوں جو ہو کبھی حکم زیارت دلنشین
میں لاؤں گا کہاں سے تیرے معیار کی آنکھیں؟

❊ مرجا گل، رمنا گل...... درابن وکلاں
نگاہِ قیس سے دیکھو ہمیشہ حسن لیلیٰ کو
صنم جیسا بھی جس کا ہو بے مثال ہوتا ہے

❊ ناز امتیاز..... سرگودھا
کوئے جاناں میں سوگ برپا ہے
کہ اچانک سدھر گیا ہوں میں

❊ ریاض بٹ..... حسن ابدال
دیکھنا بادِ سحر میں بُو نہ ہو بارود کی
دیکھنا جشنِ خوشی میں غم نہ رکھا ہو کہیں

❊ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
ہوا کے دوش پہ رکھ کر سنبھالنا سیکھو
فقط چراغ جلانا کوئی کمال نہیں

❊ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تو نے
وہی چراغ جلیں گے تو اجالا ہوگا

❊ سعید عباسی..... بہاولپور
کبھی اف بھی آہ بھی فریاد کرتے ہیں
خدایا وہ ہمیں کیوں نہیں ملتے جنہیں ہم یاد کرتے ہیں

❊ وحید عباسی..... بہاولپور
کاش میں کبوتر ہوتا پرواز کرتا آسمان پر
لگاتا بازی عشق کی اور گرتا تیرے مکان پر

❊ گے گے عباسی..... بہاولپور
دستار اتر بھی جاتی ہے چھوٹی سی بات پر
دستار کو نہ وجۂ فضیلت شمار کر

❊ محمد وقار..... اسلام آباد
خوشی کے رنگ میں ہوں یا صلیب ودار کی صورت
ہم اہلِ دل کسی بھی غم کو ٹھکرایا نہیں کرتے

❊ ثنا عظیم..... ناظم آباد، کراچی
جان کے بازی ہار کے بھی ہم ان کا دل نہ جیت سکے
مل نہ پائے دل کے بدلے صبح وشام محبت کے

❊ نورین..... گجرانوالہ
برکھا رت میں پنچھی مل کر گائیں راگ ملہار
اس موسم میں کیسے آؤں ساجن تورے دوار

❊ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
ٹوٹ گیا آنکھوں میں سپنا چھوڑ دیا یاروں نے ساتھ
راہِ سفر میں سب کے ہی پیمانِ وفا بے کار گئے

❊ ارشد علی..... فیصل آباد
اشکوں سے کیا آگ بجھے گی، عشق تو نام ہے جلنے کا
ہم تو جلے ہیں انگاروں پہ آبلے تو پڑ جانے تھے

❊ مدثر رضا..... سیالکوٹ
جب دل میں ہو تنہائی بہت اور غم میں ملے گہرائی بہت
کوئی ساتھ کہاں کب دیتا ہے جب ساتھ چلے رسوائی بہت

❊ شازیہ..... کراچی
ٹھہرو بھی صحرا کے سفر میں کس نے منزل پائی ہے
کب تک یونہی تنہا جل کر دھوپ میں جلنا اور ہنسنا

❊ محمد آصف..... لاہور
آج تم یاد کیوں نہیں آئے
آج تم سے بہت خفا ہوں میں

❊ دانش عمیر..... کراچی
بکتے ہوئے بازار میں ہم نے دیکھے دام محبت کے
گلی گلی میں شور ہوا جب گر گئے دام محبت کے

❊ بشریٰ غزل..... راولپنڈی
کیا خوب ہے یہ حسن بھی اور حسن ادا بھی
قربت ہے رقیبوں سے بھی اور ہم سے وفا بھی

❊ معازیہ مغل..... ایبٹ آباد
ہمیں دیکھ کر یوں ہی بدگماں نہ ہو جایا کرو
دلوں کے اندر تو نہیں نا، جھانک سکتے تم

❊ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
آسائش حیات مل ہی جاتی ہیں سبھی
لیکن سکونِ قلب مقدر کی بات ہے

❊ عبدالجبار رومی انصاری..... چوہنگ، لاہور
صرف اک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر
روز روتے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے

کوپن
2016

نام: ____________________

پتا: ____________________

سوپر گرل

علی اختر

رب کائنات کسی کو سرمایا دے کر... کسی کو عقل وشعور اور کسی کو حسن کی دولت دے کر مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے اس کی کارکردگی کو آزماتا ہے... اسے بھی حسن کا مجسمہ بنا کر زمین پر اتارا گیا تھا اور اس کا ساتھ چاہنے والے اسے موم کی بے جان گڑیا سمجھ کر کھیلنے کی کوشش کرتے رہے مگر... وقت نے ثابت کردیا کہ نہ تو وہ موم تھی کہ جسے ہر کوئی اپنی مرضی کے سانچوں میں ڈھال سکے اور دلوں کی دھڑکن بنانے والے بھی جان گئے کہ وہ بے جان بھی ہرگز نہ تھی۔ کیونکہ اس نے ثابت کردیا تھا کہ قدرت نے جتنی فیاضی سے حسن سے نوازا تھا اس نے اتنی ہی سخاوت سے اس کا استعمال بھی کیا۔

سنگ مرمر پر چلنے والے قدموں کی لرزشوں کا دلفریب ماجرا



ٹاپ ہیٹ کیفے گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہالی وڈ جیسے عالمی شہرت رکھنے والے اسٹوڈیو کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس میں ہمیشہ گاہکوں کا رش رہتا تھا۔ جس میں اکثریت ایسی عورتوں اور مردوں کی ہوتی تھی جو اسٹوڈیو میں بننے والی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کے لیے مختلف شہروں یا علاقوں سے ادھر آتے تھے یا پھر ایسے ایکسٹرا فنکار جو کسی نہ کسی فلم میں اپنے مختصر کرداروں کی وجہ سے بک ہوتے تھے۔ کبھی کبھار ایسے گاہک بھی ادھر آجاتے جو کسی فنانسر کو

پھانسنے کے چکر میں ہوتے تھے اور کسی سرمایہ دار کو اپنی باتوں کے گرداب میں پھانس کر اپنے لیے آسودگی کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میڈیا اور شوبز رسائل کے نمائندے اپنے اپنے گلے میں انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے کیمرے ڈالے ہوئے کیفے میں بیٹھنے کے لیے جگہ ڈھونڈتے اکثر نظر آتے تھے۔ جو چٹ پٹی کہانی ڈھونڈتے یا ابھرتے ہوئے ستاروں کے نام پر لڑکیوں کی تلاش میں ہوتے۔ پھرتیلے بیرے گاہکوں کے آرڈرز بھگتانے کے لیے تیزی سے گاہکوں کے اردگرد منڈلاتے پھر رہے ہوتے جبکہ گینگسٹرز خاموشی سے بیٹھے جائزہ لے رہے ہوتے تھے۔

وہ چند سر پھرے اور منچلے لڑکوں کا ایک ٹولا تھا۔ جو ہنستے اور شرارتیں کرتے ہوئے کیفے میں آگیا تھا۔ اس وقت کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ناگواری سے ان قہقہے لگاتے لڑکوں کی طرف دیکھا۔ وہ کیفے میں موجود خواتین سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگے تھے۔ ان میں سے ایک نے قریبی ٹیبل پر پڑے سافٹ ڈرنک کے گلاس کو اٹھایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے لاکر فلمی انداز میں گھما کر پینا شروع کر دیا تو دوسرے نے ایک خوب صورت نوجوان لڑکی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور بانہوں میں لے کر ناچنے لگا۔

ان کے ایسا کرنے سے گاہکوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ قریب تھا کہ ان کی شرارتوں میں تیزی آتی کہ کیفے کے گینگسٹرز فوراً اندرونی دروازے سے نکلے، ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پسٹلو کا رخ ان کی طرف تھا۔ وہ آتے ہی للکارے۔

''خبردار بھاگنے کی کوشش نہ کرنا......''

ان کی دہاڑ سن کر لڑکے بوکھلا گئے۔ وہ تیزی سے بھاگنے لگے، لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے اور زیادہ بوکھلاہٹ اس وقت ہوئی جب ان گینگسٹرز نے پسٹلو کا رخ اوپر کی جانب کر کے فائر کرنا شروع کیے۔ تڑ تڑ چلتی گولیوں نے ماحول میں خوف سا بھر دیا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے ہوئے کیفے کے بیرونی دروازے تک آئے۔ یہ کیفے میں ہونے والا کوئی نیا واقعہ نہ تھا۔ گردونواح میں تمام دوسرے کیفے میں بھی ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے۔ بھی ان لوگوں نے اپنی حفاظت اور بدمعاشوں سے نمٹنے کے لیے ایسے پالتو غنڈوں کو باقاعدہ کیفے میں ملازم رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر کی بدمزگی کے بعد دوبارہ سے ماحول بہتر ہو گیا تھا کہ اتنے میں پولیس انسپکٹر اپنے کچھ ساتھیوں سمیت کیفے میں داخل ہوا اور سیدھا چلتا ہوا منیجر کے کاؤنٹر پر آگیا، اس کے دوسرے ساتھی اس کی معیت میں کاؤنٹر کے نزدیک جا کھڑے ہوئے تھے۔

''ابھی ابھی یہاں فائرنگ کی آواز سنی گئی ہے......''

''جی ہاں...... فائرنگ ہمارے ہی آدمیوں نے کی تھی۔''

''میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' انسپکٹر نے دوبارہ پوچھا۔

''کچھ لڑکے شور و غل کر رہے تھے۔ ان کو بھگانے کے لیے فائرنگ کی گئی تھی۔'' منیجر نے دھیرے سے جواب دیا۔

''آپ کو پتا ہے۔ یہ قانون کی خلاف ورزی ہے۔'' انسپکٹر نے جیسے اپنی طرف سے یاددہانی کرائی ہو۔

''ہمیں علم ہے مگر کیا کرتے۔ وہ گاہکوں سے بدتمیزی کر رہے تھے۔'' منیجر نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ہمیں فائرنگ کرنے والے بندے مطلوب ہیں۔ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں......'' انسپکٹر نے تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ادھر میرے کیبن میں آجائیں۔ باقی باتیں وہیں کرتے ہیں۔'' منیجر نے کاؤنٹر چھوڑا اور انہیں لے کر اپنے آفس نما کیبن میں آگیا۔

کیفے میں بیٹھے گاہک جو اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے، ان میں سے ایک نے آوازہ کسا۔

''رشوت خور......''

مگر انسپکٹر سن کر بھی نہایت ڈھٹائی سے منیجر کے آفس میں چلا گیا۔ اب تقریباً تمام گاہکوں کی نظر منیجر کے آفس کے بند دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اپنے مشروبات اور اسنیکس سے شغل بھی کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد آفس کا دروازہ دوبارہ کھلا اور انسپکٹر مسکراتا ہوا باہر نکلا اور بڑی تیزی سے چلتا ہوا کیفے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی منیجر دوبارہ کاؤنٹر پر آگیا۔ آہستہ آہستہ تمام گینگسٹرز بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔

''تم سب نکمے ہو...... کیا ضرورت پڑی تھی تمہیں فائر کرنے کی...... یہ جو اتنے لمبے قد اور پہاڑ سے جسم لیے ہوئے ہو ان سے فائدہ اٹھالیتے......'' منیجر نے انہیں ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

''وہ بہت تیز طرار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی اسلحہ تھا منیجر......'' ان میں سے ایک بولا۔

''اور یہ ریکارڈو...... جو اپنے آپ کو بہترین کِک باز سمجھتا ہے اور ہاف بازو کی ٹی شرٹس پہن کر اپنے مسل کی اس

طرح نمائش کرتا رہتا ہے جیسے ابھی رِنگ سے فاتح ہوکر نکلا ہے۔ ایک گھونسا مارتا تو ان کو دن میں تارے نظر آنے لگتے۔ یہ بھی بھیگی بلی کی طرح انہیں دیکھتا رہا۔کیوں نہ میں پولیس کو رشوت دینے والے پیسے تمہاری تنخواہوں سے کاٹ لوں۔" چڑچڑے منیجر نے دھمکی دی۔

"تم ہماری توہین کر رہے ہو منیجر...... یہ اچھی بات نہیں...... یہ فائرنگ کا سلسلہ تو یہاں کا معمول ہے۔تم یوں کرو کسی مضافاتی علاقے کے کیفے میں چلے جاؤ جہاں بہت کم ایسی وارداتیں ہوتی ہیں۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا تو وہ تمام قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ان کے ساتھ ہی گاہکوں کے چہروں سے بھی تناؤ کی کیفیت ختم ہوگئی۔ بیرے ایک بار پھر معمول کے مطابق آرڈرز بھگتانے لگے اور نئی فلموں کے لیے سرمایہ داروں اور ہدایت کاروں کو پھانسنے والے مسننوں کے سین سنانے کے انداز نے ماحول کو اس طرح گرما دیا تھا جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں اپنے چھتوں کے قریب آکر بھنبھناتی ہیں۔ ابھی صبح کے گیارہ ہی تو بجے تھے اور ٹاپ ہیٹ کیفے میں لوگوں کو بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ نشے میں دھت ایک ادھیڑ عمر کا مرد اچانک ایک میز سے کھڑا ہوا۔اس نے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا۔نوجوان نے بوکھلا کر اپنا گریبان چھڑایا تو بوڑھے نے اس کے چہرے پر ایک گھونسا مار دیا اور اونچی آواز میں مغلظات بکنا شروع کر دیں۔

کچھ دیر تک تو نوجوان محض اپنا دفاع کرتا رہا مگر جب اس نے بوڑھے کی جارحیت بڑھتی دیکھی تو اس نے کیفے کی کرسی اٹھائی اور اس پر حملہ آور ہوا۔قریب بیٹھے لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور معاملہ رفع دفع کرا دیا۔نوجوان خفت زدہ ہوکر کیفے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

مرسیڈیز بارخا کیفے کے قریب ٹائپنگ اسکول کی طالبہ تھی۔ وہ اکثر جب بھی بور ہوتی تو اپنی کلاس کا ناغہ کر کے کیفے میں کسی مشروب سے جی بہلانے آجاتی تھی۔ آج صبح سے ہی اس کی طبیعت میں عجیب سی اداسی اور بے چینی در آئی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کیفے کے مین دروازے پر آئی اور پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر سے دروازہ کھلا۔ اس وقت کیفے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس نے اندر داخل ہوکر چند ثانیے کھڑے ہوکر ادھر ادھر نظر گھمائی تو بہت سے لوگوں کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ مرسیڈیز بارخا اپنی عمر کے اوائلِ شباب کے زمانے میں تھی۔ وہ بے حد خوب صورت تھی اور اس کا حسن دیومالائی داستانوں کی دیوی کو بھی شرماتا تھا۔ سنہری لمبی زلفیں، بلوریں آنکھیں اور قیامت خیز سراپا پر اسکن ٹائٹ سویٹر نے اس کے کسمسائے بدن کے ابھرتے ہوئے نقوش کو اور بھی نمایاں کر ڈالا تھا اور اسکن ٹائٹ سویٹر تو اس کے بدن پر ایسا جچتا تھا جیسے کسی انگوٹھی میں نگینہ...... وہ لوگوں کے رش میں سے جگہ بناتی ہوئی گزرنے لگی تو ایک طرف سے آواز ابھری۔" سویٹ گرل......!"

اس آواز کو سن کر مرسیڈیز نے اپنے شربتی سرخ ہونٹوں کا ایک دائرہ سا بنایا۔اس کے ہونٹوں کی لالی انگلش گلابوں کی یاد دلا رہی تھی۔ وہ بچتی بچاتی کسی سیٹ کی تلاش میں آگے بڑھی تو پھر وہی آواز سنائی دی......سویٹ گرل!

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہاں موجود سارے گاہکوں نے ایک کورس کی شکل میں سویٹ گرل...... سویٹ گرل...... گانا شروع کر دیا تو مرسیڈیز خاصی خوش دلی سے مسکرائی اور ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے یہ جگہ ایک منچلے نوجوان نے خود اٹھ کر دی تھی۔ ایک بیرا آرڈر لینے کے لیے فوراً اس کے پاس آیا۔

مرسیڈیز بارخا کو اپنی خوب صورتی کا احساس تھا لیکن ابھی اسے اپنے اس حسن سے فائدہ اٹھانے کا گر نہیں آیا تھا۔ اس نے تو آج ہی یہ اسکن ٹائٹ سویٹر پہنا تھا۔اسے خبر نہیں تھی کہ یہ اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگا دے گا۔ اس کے قیامت خیز جسمانی نقوش کو اس طرح نمایاں کر ڈالے گا کہ ہر کوئی اس کا دلدادہ ہوکر رہ جائے گا۔

"سافٹ ڈرنک......" اس نے آہستگی سے آرڈر دیا۔

کچھ ہی دیر میں سافٹ ڈرنک اس کی میز پر تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ سے ایک بوڑھا ایک نفرت کی نگاہ اس پر ڈالتا ہوا اٹھ گیا تھا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں......؟" اس کے قریب سے ایک آواز آئی۔

"یس پلیز......!" مرسیڈیز نے دھیمے انداز میں کہا۔

"میں ٹیلنٹ ایجنٹ زیپو مارکس ہوں...... میری ایجنسی نئے ٹیلنٹ کو فلموں میں متعارف کرواتی ہے۔ شاید آپ کو علم نہیں میں نے اپنی ایجنسی کے ذریعے کئی ایسے لوگوں کو متعارف کرایا ہے جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کی شخصیت میں ایک بہترین فنکار چھپا ہوا ہے اور آج وہ فلموں کے بہترین اداکار مانے جاتے ہیں۔ آپ کا جسم، آپ کی چال اور لافانی حسن...... یوں لگتا ہے کہ آپ کسی فلم کی ہی

بنائی ہیروئن ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو کسی بھی اچھی فلم میں ہیروئن کا کردار دلوا سکتا ہوں۔''

مرسیڈیز نے اپنے سامنے رکھے سافٹ ڈرنک کے گھونٹ لیتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک بہترین ایجنٹ ہو...... اپنی کاروباری گفتگو میں بھی خاصے ماہر ہو مگر یقیناً تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں......''

''اوہ......'' مارکس کو جیسے کرنٹ لگا ہو...... ''ادھر کئی ایسے پروڈیوسرز ہر وقت ایسی چکروں میں یہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کی خوب صورتی کا ہی اتنا رعب ہے کہ آپ کو اپنی جیب سے بھی کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ ذرا ادھر اپنے بائیں دیکھیں۔ وہ مشہور و معروف ہدایت کار مروین لیروے بیٹھے ہیں اور آپ کے دائیں نارما جین بیٹھی ہے۔ اسے ہماری کمپنی نے ہی متعارف کروایا تھا۔ آپ سوچ لیں اس وقت جلدی بھی نہیں ہے۔'' وہ اپنی چرب زبانی سے اسے ہر حال میں قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''آپ کا شکریہ...... میں نے بتایا نا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہیں۔''

''آپ کی مرضی...... جاتے جاتے ایک بات کہوں، لگتا ہے خدا نے آپ کو فارغ وقت میں بنایا ہے۔ یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے، کبھی بھی یاد کرلیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اوہ، یاد آیا...... میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟'' اس نے اختتامی جملے بولے۔

''مجھے مرسیڈیز بارخا کہتے ہیں......'' اس نے سافٹ ڈرنک کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''مرسیڈیز بارخا عرف سویٹ گرل!'' زیپو مارکس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے پکڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ''امید ہے، ہم بہت جلد پھر ملیں گے۔''

اس کے جاتے ہی مرسیڈیز جلدی سے اٹھی اور کیفے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

وہ رات اس نے یقیناً بڑی بے چینی سے گزاری تھی۔ کیفے میں گزارے وقت کی میٹھی لیکن خوشگوار یادیں اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھو رہی تھیں۔ کیا اسے زیپو مارکس کی پیشکش کو قبول کرلینا چاہیے یا اسے اپنی ٹائپنگ کی ٹریننگ مکمل کر کے کسی آفس میں سیکریٹری شپ کا کام کرنے پر اکتفا کرنا ہوگا؟ اس کا ماضی بھی اس کے سامنے تھا۔ وہ امریکی ریاست ایڈاہو کے شہر ویلیس میں پیدا ہوئی تھی۔

اس کا والد گریس بارخا ایک کان کن تھا۔ صرف زندگی کی گاڑی کو وہ دھکا ہی لگا سکتا تھا اور زندگی تھی جو مصائب و مشکلات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ پھر اس کے والد نے کان کنی کا کام چھوڑ دیا اور وہ ویلیس شہر چھوڑ کر سان فرانسسکو میں آ گئے۔ یہاں آ کر تھوڑی سی زندگی میں آسانی پیدا ہوئی۔ اس کی والدہ گلیڈیز بھی اسی کی طرح خوب صورت تھی اور جوان بھی......

جم ڈیہور بھی اس کے والد کے ساتھ ہی کام کرتا تھا اور وہ اکثر ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ وہ بڑا ہی شوخ اور دل پھینک قسم کا مرد تھا۔ مرسیڈیز بارخا اس وقت اسکول میں پڑھتی تھی۔ جم جب بھی ان کے گھر آتا تو مرسیڈیز اس کو دیکھتے ہی چھپ جایا کرتی تھی۔ اسے جم کا چھچھورا پن اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے کئی بار اس بات کی شکایت اپنی والدہ سے بھی کی اور ایک روز تو بالکل رو دینے کے انداز میں اس نے اپنی والدہ سے کہا۔ ''مما...... آخر جم انکل کو آپ اپنے گھر آنے سے منع کیوں نہیں کرتیں؟ مجھے وہ ایک دم برے لگتے ہیں۔''

''لیکن بے بی...... وہ تمہارے پاپا کے دوست ہیں۔'' اس کی والدہ نے جواب دیا۔

''تو پھر آپ پاپا سے کہیں۔ وہ اسے گھر آنے سے روکیں...... وہ گھر آتے ہی بہانے بہانے سے مجھے اپنی گود میں لینے کے چکر میں ہوتے ہیں اور پیار لینے کا تو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میں اب بچی تو ہوں نہیں۔ ہائی کلاس کے درجے میں پڑھتی ہوں۔'' مرسیڈیز نے والدہ کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''وہ سب ٹھیک ہے مگر اس کا اختیار تمہارے پاپا کے پاس ہے۔'' والدہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے پاپا سے میں خود بات کروں گی۔'' مرسیڈیز نے کہا۔

''تم ان سے کچھ نہیں کہوگی۔ میں خود بات کرلوں گی۔'' اس کی والدہ نے اسے مطمئن تو کر دیا مگر اندر ہی اندر وہ خوفزدہ ہو چکی تھی۔

جم ڈیہور بھی سان فرانسسکو میں ان کا واحد آسرا تھا۔ وہ نہ صرف گریس بارخا کا دوست تھا بلکہ مشکل وقت میں وہ روپے پیسوں سے بھی ان کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس بہانے سے اسے ان کے ہاں آنے جانے کا بہانہ مل گیا تھا۔ اس کی نظروں کا شبد ایپن گلیڈیز کو بھی دکھائی دیتا تھا مگر وہ مجبور تھی۔

جم ڈیمبو بھی کسی ماہر شکاری کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے شکار کو دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا جس کا احساس گلیڈیز کو بھی تھا اور پھر اس رات تو حد ہی ہو گئی۔ گریس کام پر تھا جب اچانک اس کے گھر کا دروازہ بجنے لگا۔ گلیڈیز نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے جم کھڑا تھا۔

''گریس تو اس وقت کام پر ہے۔'' اس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ میں نے آج کام سے چھٹی کی تھی۔ گھر سے نکلا تو سوچا ادھر سے ہو آؤں۔ اندر آنے کو نہیں کہو گی؟'' اس نے بڑے ولار سے پوچھا۔

''میں نے کہا نا گریس کام پر ہے۔'' گلیڈیز نے لہجے کو ذرا سا درشت کرتے ہوئے کہا۔

''کس قدر احسان فراموش ہو۔ یقین کرو تمہارے جسم کے خدوخال نے میری راتوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔ ذرا مجھے اندر تو آنے دو۔'' گلیڈیز کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب مرسیڈیز اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مرسیڈیز کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ تب اس نے جرأت کر کے دروازہ بند کر دیا۔

''کتیا! میں صبح آؤں گا۔ اپنے بے غیرت شوہر سے کہنا کہ وہ میرے سارے پیسے تیار رکھے۔ اسی کے کہنے پر آیا تھا۔ نمٹ لوں گا اس سے بھی.....'' یہ کہتا ہوا جم ڈیمبورکی واپس پلٹ گیا۔

اگلی صبح جب گریس کام سے واپس آیا تو رات والے واقعے کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں بے حد جھگڑا ہوا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو..... میں بکاؤ مال ہوں......'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔

''تم قانونی طور پر میری بیوی ہو اور میں جیسے چاہوں تمہیں استعمال کرنے کا حق رکھتا ہوں۔'' گریس غصے سے دہاڑا۔

''میں جیتی جاگتی عورت ہوں۔ شطرنج کا مہرہ نہیں۔ میں تمہارے راستوں پر نہیں چلوں گی۔'' وہ ایک بار پھر چیخی۔

''تو پھر میرے گھر سے نکل جاؤ۔'' اس نے زور سے کہا۔

''کونسا گھر..... جس میں کبھی مجھے سکھ نہیں مل سکا...... اگر مجھے یہی کچھ کرنا ہے تو اکیلی رہ کر بھی بہ آسانی کر سکتی ہوں۔'' گلیڈیز نے جواب دیا۔

میاں بیوی کے رشتے میں پڑنے والی یہ دراڑ دونوں کے تعلقات میں ایک خلیج بنتی چلی گئی۔ گریس بات بات پر اور بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس سے جھگڑنے لگا۔ تعلقات یہاں تک بگڑنے کہ پھر دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ گلیڈیز کے لیے اب یہاں رہنا مشکل ہو چکا تھا۔ گریس اب گھر آنے سے بھی کترانے لگا تھا۔ اسے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ گریس اب روز ہی کسی پب یا کسی پارک میں نشہ کر کے پڑا رہتا ہے۔ گلیڈیز کی مشکلات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر ایک روز پتا چلا کہ کسی پارک میں گریس کا کسی کالے کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس کالے نے گریس کو پسٹل کے فائر سے قتل کر ڈالا اور خود بھاگ گیا۔ گلیڈیز کو خبر ہوئی تو اسے بے انتہا دکھ ہوا مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ افسوس کے لیے آنے والے جم نے اس روز ایک بار پھر اسے پیشکش کی۔

''دیکھو گلیڈیز...... جس کا تمہیں خوف تھا، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ زندگی بہت بڑا بوجھ ہے۔ میری مانو تو اب میری زندگی میں شامل ہو جاؤ...... ساری زندگی خوش رکھوں گا۔''

''میں اب بھی تم سے اسی قدر نفرت کرتی ہوں جیسے پہلے کرتی تھی۔ اب یہاں کا رخ نہ کرنا ورنہ پولیس اسٹیشن میں بند کروا دوں گی۔'' گلیڈیز نے کہا۔ اس سے اگلے روز وہ اپنی انیس سالہ بیٹی مرسیڈیز کو لے کر لاس اینجلس منتقل ہو گئی۔

گلیڈیز نے یہاں آکر چھوٹی موٹی ملازمت کر لی اور مرسیڈیز ہالی وڈ کے علاقے میں تاہم ایک اسکول میں داخل ہو گئی۔ یہ واحد کیفے تھا جو اسکول سے نزدیک پڑتا تھا۔ یہاں پر اس کی طرح دیگر طالب علم اور طالبات سافٹ ڈرنک یا ہلکے پھلکے لنچ کے لیے جاتے تھے۔

مرسیڈیز بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی کہ زندگی کے مشکل لمحوں کو گزارنے کے لیے اسے زیپو مارکس کی پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے یا نہیں؟..... اس نے اس کا وزیٹنگ کارڈ ایک بار پھر دیکھا تو اس کی والدہ کی آواز نے اسے ہڑبڑا دیا۔

''مرسیڈیز جاگ رہی ہو ابھی......؟''

''مما نیند نہیں آ رہی۔'' مرسیڈیز نے جواباً کہا۔

''سو جاؤ ڈارلنگ رات بہت ہو چکی ہے۔'' اس کی والدہ نے دوبارہ کہا۔

''کوشش تو کر رہی ہوں۔'' مرسیڈیز بولی اور کروٹ لے کر پڑی رہی۔

☆☆☆

لاس اینجلس جیسے بڑے شہر میں آکر انہیں مالی طور پر تھوڑی سی آسودگی ملی تو مرسیڈیز کو بھی بننے سنورنے کا پتا چل گیا اور پھر کچھ اس کے ارد گرد والے ساتھیوں نے اس

کی اتنی تعریفیں کر ڈالی تھیں کہ اسے اپنے حسن کا جادو سر چڑھ کر بولتا نظر آیا۔ وہ کتنے دنوں کے بعد ایک بار پھر اسکن ٹائٹ لباس پہنے کیفے میں آکے بیٹھی تھی۔ اب کیفے کے بیروں کو بھی مرسیڈیز کے پسندیدہ مشروب کا پتا چل گیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کیفے میں ایک نامعلوم سی ہلچلی مچ گئی۔ ابھی اس نے سافٹ ڈرنک کا پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ ٹیلنٹ ایجنٹ زیپو مارکس جانے کہاں سے نکل کر اس کے قریب آن بیٹھا۔

''باربی ڈول...... تم نے فلموں کے بارے میں کیا سوچا؟'' مرسیڈیز نے قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں باربی ڈول نہیں مرسیڈیز بار خا ہوں۔ تم مجھے مرسیڈیز کہہ سکتے ہو۔ یاد رکھو کسی ایسے القاب جس سے خوشامد جھلکتی ہو مجھے قطعاً پسند نہیں۔''

''کیا حسن کی تعریف کرنا توہین ہے؟'' مارکس نے کھسیانے انداز میں کہا۔

''پھر میں آپ کو سویٹر گرل کہہ لیتا ہوں۔ ایک یہی نام ہے جس سے آپ کیفے میں مشہور ہیں اور یہ نام آپ پر سجتا بھی بہت ہے۔'' مارکس جیسے ہارنا جانتا ہی نہیں تھا۔

''بات سے بات نکالنا شاید تمہارے شعبے کا تقاضا ہے۔ بہرحال میں بتادوں کہ میں نے ابھی اس بارے میں نہیں سوچا۔'' مرسیڈیز نے اجنبیت سے جواب دیا۔

''اوہو...... میرا خیال ہے اس طرح وقت ہاتھ سے نہ نکل جائے اور اگر ایک بار وقت نکل گیا تو دوبارہ واپس نہیں آتا۔ یہاں شوبز میں جو بھی آتا ہے کنگلا ہوتا ہے مگر جب قسمت یاوری کرتی ہے تو کروڑ پتی ہوجاتا ہے اور تمہیں پتا ہے۔ آج کے زمانے میں دولت ہی سب کچھ ہے۔ میں تو کہتا ہوں وقت کو ہاتھ سے نہ گنواؤ...... مردین لیروے اپنی نئی فلم کی ابتدا کررہا ہے۔ اسے اس کے لیے نئی لڑکی کی ضرورت ہے تو پھر کیوں نہ اس کی نئی ہیروئن تم بن جاؤ۔''

''میں نے تمہیں بتایا تو ہے...... ابھی میں اپنی تعلیم مکمل کررہی ہوں۔ جب تعلیم مکمل ہوجائے گی تو دیکھوں گی۔'' مرسیڈیز نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

ابھی وہ باتیں کررہے تھے کہ کیفے کے باہر والے دروازے کو کسی نے نہایت حقارت سے کھولا۔ کیفے میں بیٹھے تمام لوگوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ کاؤبوائے ٹائپ کا لباس پہنے ایک شخص اندر داخل ہوا اس کی کمر میں گولیوں سمیت ہولسٹر تھا جس سے پسٹل کا سرا باہر جھانک رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایک دوسرا پستول اس کے ہاتھ میں تھا جس کا سرا آسمان کی طرف تھا۔ لمبا اور چوڑا چکلا قد کاٹھ...... وہ یقیناً کسی فوج کا سپہ سالار نظر آرہا تھا۔

''اوہ، جونی آج پھر آگیا۔'' زیپو مارکس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کون جونی......؟'' مرسیڈیز نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم نہیں جانتی ہو۔ یہ یہاں کا سب سے بڑا گینگسٹر ہے۔ اردگرد کے جتنے بھی کیفے ہیں، ان میں کام کرنے والے سارے بدمعاش اس کے سامنے چوہے ہیں...... اور یہ تو شاید ادھر ہی آرہا ہے...... بڑا ہی سفاک ہے۔ میں تو چلا......'' یہ کہہ کر زیپو مارکس اٹھ کر ایک طرف نکل گیا۔

''اوہو جونی تمہیں بھی آج ہی آنا تھا۔'' زیپو مارکس جاتے جاتے بڑبڑایا۔ جونی لوگوں کے رش میں سے راستہ بناتا ہوا سیدھا منیجر کے کاؤنٹر کی طرف گیا۔ مرسیڈیز کی نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ وہاں جاکر اس نے منیجر سے جانے کیا پوچھا۔ منیجر نے اس کو اشارے سے جواب دیا پھر وہ واپس مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا مرسیڈیز کی میز پر آگیا۔

''واؤ...... خوب صورتی کا یہ مجسمہ کس نے یہاں رکھ دیا۔'' مرسیڈیز نے پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اچھا وہ تم ہو جس کا پورے کیفے میں چرچا ہے۔ کیا نام تھا بھلا......'' جونی نے دوبارہ سوال کیا۔

مرسیڈیز کی نگاہوں میں پریشانی کے ساتھ خوف بھی اتر آیا تھا۔ کیفے میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جونی کے پوچھنے پر کسی طرف سے آواز ابھری۔

''سویٹر گرل......''

''ہاں...... ہاں...... یہی......'' جونی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ''سنو منیجر...... یہ میری پری ہے۔ ایک مرد کی حیثیت سے میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ آج سے اس کیفے میں اگر کسی نے بھی میلی نظر سے اس کو دیکھا تو جونی اس کی آنکھیں نکال دے گا۔''

مرسیڈیز سہمی ہوئی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''جونی کی پسند کو اس طرح ڈرنا نہیں چاہیے۔ میری طرح بہادر بنو۔'' جونی نے اس کے گال تھپتھپائے اور پھر کچھ گنگناتا ہوا واپس چلا گیا۔

مرسیڈیز اس قدر خوف زدہ ہوچکی تھی کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے سافٹ ڈرنک کا بل دینا چاہا مگر منیجر کے اشارے پر بیرے نے بل لینے سے

انکار کر دیا۔

اس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کیفے میں مفت سافٹ ڈرنک پیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی اور منیجر کے کاؤنٹر پر جا کر اسے بل کی ادائیگی کرنا چاہی تو منیجر بولا۔

''خاتون، ہم معذرت خواہ ہیں۔ جونی کے غصے کا ہم ہرگز سامنا نہیں کر پائیں گے۔ وہ نہ صرف غصے کا تیز ہے بلکہ بہت سفاک انسان بھی ہے۔ اس علاقے کا ہر آدمی اس کی دہشت سے گھبراتا ہے۔ وہ آپ کو پسند کرتا ہے۔ جب اسے پتا چل جائے گا کہ ہم نے اس کی پسند سے بل لیا ہے تو یہ دن مصیبت کا دن ہوگا۔ آپ جا سکتی ہیں۔''

''مگر میں کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتی۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔

''ہم بھی کسی قسم کی پریشانی مول نہیں لینا چاہتے۔'' منیجر نے دوبارہ کہا۔

مرسیڈیز کیفے سے باہر نکل آئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے مزید احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ اسے اب کیفے میں آنا بند کرنا ہوگا چنانچہ اس نے کیفے میں جانا ہی بند کر دیا۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب وہ اپنے اسکول سے نکل کر گھر جانے والے راستے پر تھوڑی دور گئی تھی کہ ایک کالے رنگ کی کار مخالف سمت سے آتی ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ یوٹرن تک گئی اور پھر اسی تیزی کے ساتھ اس ٹریک پر آ گئی جس ٹریک کے فٹ پاتھ پر مرسیڈیز چل رہی تھی۔ مرسیڈیز نے ایک انجانے خوف کے تحت پیچھے مڑ کر دیکھا تو کار کے پہیے بڑے شور کے ساتھ چیخے۔ آناً فاناً اس میں سے دو لمبے تڑنگے آدمی نکلے جنہوں نے اپنے چہروں کو نقاب سے ڈھانپا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ انہوں نے مرسیڈیز کو گاڑی میں ڈالا اور آگے بڑھ گئے۔ مرسیڈیز کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ٹی ٹی گن تھی، جس کی نال اس کے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔

''شور مچانے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔'' وہ غرایا۔

مرسیڈیز کی گھگی بندھ گئی تھی۔ ''مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو......؟''

''تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا۔ اگر خاموش رہو گی تو تمہارے ساتھ ہمارا ابھی بھلا ہوگا۔'' وہی دوبارہ بولا۔

کار مختلف موڑ کاٹتی ہوئی ایک ویرانے میں جا پہنچی تھی۔ اس ویرانے میں ایک پرانی سی بلڈنگ تھی جس کے کمپاؤنڈ میں کار رکی۔ مرسیڈیز کو گن پوائنٹ پر باہر نکال کر بلڈنگ میں پہنچا دیا گیا اور پھر ایک کمرے کے تہ خانے میں پہنچا کر وہاں پڑی کرسی کے ساتھ اسے باندھ دیا گیا۔

☆☆☆

نیم تاریک اس کمرے کی دیواروں پر مختلف قسم کے اذیتیں دینے والے ہتھیار لٹکے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ کسی سفاک تنظیم کا عقوبت خانہ ہے۔ مرسیڈیز اسے دیکھ کر اور بھی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی دہشت گرد تنظیم کے ہاتھوں اغوا ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ اب کیا سلوک ہونے والا تھا، یہ سوچ کر ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کس لیے اغوا کیا گیا ہے۔

ابھی وہ اسی کشمکش میں پڑی تھی کہ دو آدمی ایک نوجوان کو سہارا دیے ہوئے وہاں لے آئے۔ نوجوان پر اس قدر تشدد کیا گیا تھا کہ اس سے اپنے پاؤں پر چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ابھی تک دہشت موجود تھی۔

ان دونوں نے مرسیڈیز کے سامنے لا کر اس نوجوان کو بھی باندھ دیا۔ نوجوان کی آنکھیں کمزوری کی وجہ سے بند تھیں اور گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ مرسیڈیز نے دیکھا کبھی یہ نوجوان انتہائی خوب صورت اور مضبوط ہوگا مگر اب تشدد کی وجہ سے انتہائی لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔

ان میں سے ایک نے دیوار پر لٹکی ہوئی ڈرل مشین کو اتارا۔ اس کا پلگ بجلی کے بورڈ سے لگا کر اسے چیک کیا۔

''نہیں...... تم یہ نہیں کرو گے۔'' مرسیڈیز اونچی آواز میں چیخی تو جس نے ڈرل مشین پکڑی ہوئی تھی اس نے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی بولتی بند کرو......''

دوسرے نے آگے بڑھ کر اپنے ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر کی جیب سے ٹیپ نکالا اور مرسیڈیز کے منہ پر لگا دیا۔ مرسیڈیز صرف تلملا کر رہ گئی۔

وہ ڈرل مشین لے کر اس نوجوان کے پاس گیا اور نوجوان کے ماتھے پر سوراخ کرنے لگا۔ نوجوان شدتِ تکلیف سے بہت تڑپا مگر مضبوطی کے ساتھ بندھے اس کے ہاتھ پاؤں کے سبب وہ صرف تڑپ کر ہی رہ گیا۔ اس کی چیخوں سے کمرا گونج اٹھا... مرسیڈیز نے اپنی آنکھیں خوف سے بند کر لی تھیں۔ تشدد کرنے والوں میں سے ایک نے اس کی نبض ٹٹولی اور اونچی آواز میں بولا۔

''بڑا ڈھیٹ ہے...... ابھی زندہ ہے......''

''جلدی کرو...... باس کے آنے تک کام نمٹا لو۔''

دوسرے نے جواب دیا۔

مرسڈیز اس ساری کارروائی کو دیکھتے ہوئے نیم بے ہوش ہوچکی تھی پھر بھی اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اتنی دیر میں کمرے کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔

مرسڈیز کی آنکھیں خوف سے اور زیادہ کھل گئیں۔ یہ وہی تھا...... کیفے میں آنے والا بدمعاش...... جسے سب لوگ انتہائی سفاک اور ظالم کہتے تھے۔ جونی اسٹوپناٹو......

اسے دیکھ کر وہ دونوں نوجوان کے جھولتے جسم کو چھوڑ کر ایک طرف ہوگئے تھے۔ جونی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پسٹل سے دو تین گولیاں داغیں اور نوجوان کے جسم میں رہی سہی زندگی کا بھی خاتمہ کرڈالا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔

''اس کی لاش لے جاؤ اور دور ویرانے میں جانوروں کے سامنے ڈال دو۔''

اس حکم کے مطابق وہ جلدی سے لاش کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ تب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مرسڈیز کے قریب آیا۔ مرسڈیز کی خوفزدہ آنکھیں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں۔ اس نے مرسڈیز کے گال تھپتھپائے تو اس نے آنکھیں ایک بار پھر کھول دیں۔ جونی نے اس کے منہ سے لگا ٹیپ اتارا۔

''کہو...... کھیل پسند آیا......'' جونی نے مسکراتے ہوئے مرسڈیز سے پوچھا۔

''تم بہت ہی سفاک ہو۔'' مرسڈیز بڑبڑائی۔

''صرف اپنے دشمنوں کے لیے...... اور جن کے ساتھ جونی پیار کرتا ہے انہیں پھولوں کا زخم بھی نہیں لگنے دیتا۔ اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرتا ہے ان کی...... یہ کھیل تمہیں صرف اس لیے دکھایا گیا ہے کہ جونی کے پیار سے انکار تمہیں کسی وقت بھی اس سے زیادہ اذیت کا شکار کرسکتا ہے۔ میں بہت ٹھنڈا کھلاڑی ہوں...... مگر کیا کروں بعض اوقات مجبوری کے تحت مجھے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے حصے کا شکار میں خود ہی کرنا پسند کرتا ہوں۔ کسی دوسرے کو نہ تو حصے دار بناتا ہوں اور نہ ہی اسے اپنے شکار کے نزدیک بھٹکنے کی اجازت دیتا ہوں...... کیا سمجھیں......'' جونی نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''تم بے خوف ہوکر جدھر مرضی گھومو پھرو...... جونی کی نگاہیں تمہارے اردگرد ہی رہیں گی اور تمہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا پھر اس نے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹی بجائی تو چند لمحوں بعد ایک آدمی اندر داخل ہوا۔

''کلارک...... دیکھو میری گڑیا کو بحفاظت جہاں یہ چاہے، چھوڑ آؤ...... خیال رہے اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے...... اسے کھول دو...... اور ساتھ لے جاؤ۔''

کلارک نے آگے بڑھ کر مرسڈیز کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ کرسی کے ساتھ کسے ہوئے ہاتھوں کی کلائیوں پر نشان سے پڑ گئے تھے۔ مرسڈیز نے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑا اور پھر خاموشی کے ساتھ کلارک کے پیچھے پیچھے چل دی۔ دونوں کمرے سے نکل کر دوبارہ کمپاؤنڈ میں آئے جہاں وہی سیاہ رنگ کی کار کھڑی تھی۔ کلارک نے اس کا دروازہ کھولا اور مرسڈیز خاموشی کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نوجوان کے وحشیانہ قتل کا منظر جم کر رہ گیا تھا۔ جونی نے اسے یہ سب کیوں دکھایا...... کیا وہ اپنا خوف اس کے سینے میں بٹھانا چاہتا تھا یا اس کا مقصد کچھ اور تھا؟ وہ کتنے ہی دن اسی خوف کی وجہ سے اسکول نہ جاسکی اور اپنی والدہ کو یہی بتاتی رہی کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ وہ ہر وقت کمرے میں اپنے بیڈ پر پڑی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ اس کا حسن اس کے لیے ایک عذاب بن کر رہ گیا تھا۔ جونی کا ہیولا ہر وقت اس کے آس پاس گھومتا رہتا تھا۔ اگر جونی بدمعاش نہ ہوتا تو وہ اس کے لیے ایک آئیڈیل تھا۔ مضبوط اعضا اور خوب صورت نقش و نگار کا مالک مگر اب اسے ہر حال میں جونی سے بچنا ہوگا۔ وہ اس سے چھٹکارے کے طریقے سوچنے لگی مگر ہر بار وہ کسی مکڑے کے جال میں پھنسی مکھی کی طرح اس کے در و دیوار سے سر ٹکرا کر رہ جاتی۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ یقین بھی ہو چلا تھا کہ وہ کسی صورت اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پائے گی۔ وہ اپنی والدہ کو یہ سب بتا کر اس کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی مصیبتوں سے خود ہی چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

☆☆☆

کتنے دنوں کے بعد وہ آج اسکول آئی تھی۔ اس کے ذہن سے اپنے سامنے ہونے والے قتل کی دہشت ختم تو نہیں ہوئی تھی مگر کچھ دھندلا ہوگیا تھا۔ اس کے اسکول کا ہر ساتھی اس سے اسکول سے غیر حاضری کا سبب پوچھ رہا تھا اور وہ جواب دے دے کر تھک چکی تھی۔ اس نئی افتاد سے بچنے کے لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر ناسب بیٹ کیفے میں آگئی۔ کیفے میں اسی طرح رش تھا۔ وہ جگہ ڈھونڈتی ہوئی ایک کرسی پر آ بیٹھی تو اس ٹیبل کا بیرا فوراً اس کے پاس آگیا۔

''آرڈر پلیز......'' اس نے مینیو کارڈ اس کے آگے رکھ دیا۔

مرسیڈیز نے نظریں گھما کر اس کی طرف دیکھا تو وہ فوراً بولا۔

''آخاہ.....سویٹ گرل..... بڑے دنوں کے بعد آئی ہو۔ تمہارے چہرے کی پیلاہٹ بتارہی ہے کہ تم بیمار رہی ہو۔ اب طبیعت کیسی ہے۔ ٹھہرو...... میں تمہارا پسندیدہ سافٹ ڈرنک لاتا ہوں اور منیجر کو بھی تمہاری آمد کے بارے میں بتاتا ہوں۔ جونی..... یہاں کئی مرتبہ آیا تھا تمہارا پوچھنے کے لیے۔ آدمی تو اچھا ہے مگر نہ جانے کیوں بدمعاش بن گیا.....اس کا دل بہت خوب صورت ہے۔ وہ تمہیں بہت چاہتا ہے..... !'' یہ لوگ اس قدر باتونی کیوں ہوتے ہیں۔ مرسیڈیز سوچنے لگی۔ وہ اسے خاموش پاکر منیجر کے کاؤنٹر تک چلا گیا۔ پھر دونوں کے درمیان کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مرسیڈیز آنکھیں بند کیے اپنی نقاہت بھری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی جب بیرا اس کے آگے سافٹ ڈرنک رکھ کر چلا گیا۔

''کچھ بیمار لگ رہی ہو......'' اس کے سامنے بیٹھے ایک بڑی عمر کے شخص نے پوچھا تو مرسیڈیز نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا اور تقریباً مسکرا کر بولی۔

''تھی......اب ٹھیک ہوں......'' آواز میں ابھی تک کمزوری نمایاں تھی۔

''کیا یہاں کسی فلم میں کام کرتی ہو؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں..... میں یہاں قریبی اسکول میں ٹائپنگ کلاس میں پڑھتی ہوں۔''

''اوہ......تو تمہیں اس کیفے میں ہرگز نہیں آنا چاہیے۔ یہاں تو تمہیں ہر طرف گدھ نظر آئیں گے۔ جو ادھر ادھر متوحش آنکھوں سے اپنے اپنے شکار کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ تمہارے جیسی خوب صورت اور معصوم لڑکی کو یہاں نہیں آنا چاہیے۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''وہ اسکول یہاں سے نزدیک ہے اور پھر یہاں تو ہر کیفے ایک ہی جیسا ہے۔ کوئی کہاں جائے، ہمارے اسکول کی اکثر طالبات اور طالب علم ادھر ہی آتے ہیں۔ اسکول میں تک شاپ بہت مہنگی ہے، اس سے بھی زیادہ......'' مرسیڈیز نے آہستہ آہستہ اسے بتایا۔

''اوں.....ہوں......تم ٹھیک کہتی ہو۔ بچوں کو والدین جیب خرچ بھی کتنا دیتے ہوں گے۔'' بات آگے بڑھی۔

مرسیڈیز کو وہ اوور ایج شخص بہت ہمدرد سا لگا۔ اگرچہ وہ عمر میں اس سے کافی بڑا تھا مگر اس کے جسمانی اعضا کی مضبوطی نے اس کی عمر کو چھپا رکھا تھا، سفید مونچھوں اور سفید براق بالوں والا شخص...... اس کی ناک پر رکھی خوب صورت سنہری کمانی والی عینک اور گڑگڑاتا ہوا نفیس پہناوا اس کے امیر ہونے کی چغلی کر رہا تھا۔

''ایک بات اور پوچھوں......؟'' اس نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

''جی......'' مرسیڈیز آہستگی سے گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

''تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟''

''وہ...... رت ہوئی قتل کردیے گئے تھے۔''

مرسیڈیز کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

''اوہ......بہت افسوس ہوا۔''

''گھر میں کفالت کرنے والا کون ہے......؟'' اس نے افسوس کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''والدہ ہے..... جو ایک چھوٹی سی فیکٹری میں ملازمت کرتی ہے۔'' مرسیڈیز نے بتایا۔

''فلموں میں کام کرنا چاہو گی۔ تمہارے چہرے کے نقوش اور خوب صورتی قیامت ڈھانے والی ہے۔'' اس نے رکتے رکتے کہا تو مرسیڈیز نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں اس کے سراپا کا طواف کررہی تھیں۔

''ہوں......'' اس نے دوبارہ سے زور دے کر کہا۔

''یہاں میرے کئی دوست پروڈیوسر بیٹھے ہیں اگر پسند کرو تو میں کسی سے سفارش کرسکتا ہوں۔''

''نہیں...... میں اس دلدل میں نہیں پھنسنا چاہتی۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔

''گڈ...... میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کسی کے ہتھے نہ چڑھ جانا...... میں یہاں آتا جاتا رہتا ہوں، میرا اپنا نہایت وسیع کاروبار ہے۔ دولت تو میرے گھر کی باندی ہے۔ یہاں ایک دو فلمیں پروڈیوس کررہا ہوں۔ یہ میرا شوق ہے۔ شیئرز کا کاروبار بھی کرتا ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ اگر کبھی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کرلینا...... میں اپنا نام بتانا تو بھول ہی گیا، جوزف اسٹیفن کرین......'' یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''میرا نام مرسیڈیز بارخا ہے۔'' مرسیڈیز نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ابھی باتوں میں مصروف تھے کہ ایک بار پھر سے کیفے کا دروازہ اسی انداز میں کھلا۔ مرسیڈیز نے فوراً نظریں

تھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ جونی تھا۔ اس بار وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ دو ساتھی بھی تھے جن کے ہاتھوں میں کھلا ہوا اسلحہ تھا۔ انہوں نے بڑی رعونت کے ساتھ ان کو اپنے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ جونی کے ہاتھ میں حسب معمول پسٹل تھا جس سے وہ کھیلتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی مرسیڈیز کے چہرے پر ایک بار پھر سے خوف سا لہرانے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی ساری رگوں سے خون نچوڑ لیا ہو۔ زرد پڑتے چہرے کو دیکھ کر جوزف نے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

''خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے گڑیا......'' جوزف نے حوصلہ دیا۔

''یہ......!'' مرسیڈیز کے حلق سے بہ مشکل نکلا۔

''یہ جونی اسٹوپناٹو ہے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا بدمعاش۔ دوسروں پر اس کی بڑی دہشت ہے، بڑا ظالم اور سفاک انسان ہے لیکن تمہارے اس دوست سے دبتا ہے۔''

جونی اپنے ہی انداز سے آگے بڑھتا رہا پھر اچانک اس کی نظر مرسیڈیز پر پڑی تو اس کے چہرے پر خوشی سی پھیل گئی۔ وہ چلتا ہوا اس کے نزدیک آیا۔

''کہاں رہی ہو اتنے دنوں گڑیا......'' اس نے پستول کی نال سے مرسیڈیز کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں...... میں......'' مرسیڈیز کے حلق سے صرف اتنا ہی نکلا۔

''جونی...... لڑکی کو اور خوفزدہ مت کرو۔'' جوزف نے اس کے پسٹل کی نال پرے کرتے ہوئے کہا۔

''ارے...... بابا جوزف...... آپ بھی ادھر بیٹھے ہیں۔'' جونی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اور کیا...... دیکھ نہیں رہے۔ لڑکی کا سارا خون سوکھ گیا ہے۔'' جوزف نے دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔

''میں اسے پسند کرتا ہوں......'' جونی نے اسی اوفرانہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... مگر اس وقت وہ خوفزدہ ہے۔ اس طرح کرنے سے اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔'' جوزف نے پھر سے جواب دیا۔ ''آؤ...... میں تمہیں چھوڑ آؤں......'' جوزف نے مرسیڈیز کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پریشانی اور مصائب اگر پوچھ کر انسانی زندگی میں آئیں تو کبھی بھی کوئی انسان انہیں اپنے قریب نہ آنے دے۔ یہی کچھ اچانک مرسیڈیز کی زندگی میں ہوا۔ اس واقعے کے کتنے روز بعد اچانک ایک دن جب اس کی والدہ فیکٹری سے واپس آئی تو اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس روز مرسیڈیز اسکول نہیں گئی تھی اور گھر پر ہی موجود تھی، اس نے فوراً والدہ کو لیا اور جنرل اسپتال میں لے گئی۔

ڈاکٹروں نے اس کی بیماری کو تقریباً جان لیوا جانتے ہوئے اسے اسپتال میں داخل کرلیا۔ مرسیڈیز کے لیے یہ بہت مشکل لمحات تھے۔ جو جمع پونجی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ پے در پے ایسے جھٹکوں سے وہ پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ جب خود اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے پر آیا تو اچانک اسے جوزف کا خیال آیا۔ قریبی ٹیلی فون بوتھ سے اس نے وزیٹنگ کارڈ پر لکھے نمبروں کو ملایا، کچھ دیر تک بیل بجتی رہی۔ پھر دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ فون جوزف ہی نے اٹھایا تھا۔ ''کون ہے؟''

''مرسیڈیز ہوں...... میں...... وہی ناپ ہیٹ والی......'' مرسیڈیز نے تیزی سے اپنا تعارف کروایا۔

''ہاں...... ہاں...... میں سمجھ گیا۔ کہو کیا بات ہے۔ جونی نے دوبارہ تنگ تو نہیں کیا؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''نہیں...... میری والدہ بیمار ہے اور جنرل اسپتال میں داخل ہے۔ مجھے آپ......'' مرسیڈیز کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ دوسری طرف سے جوزف دوبارہ بولا۔

''دیکھو مرسیڈیز...... میں اس وقت کام میں مصروف ہوں۔ میرا ڈرائیور تم تک پہنچ رہا ہے، وہ خود معاملات سنبھال لے گا۔ میں ساتھ میں کچھ رقم بھی بھجوا رہا ہوں۔ تم اس کے پہنچنے کا انتظار کرو۔ میں بھی شام کو تمہیں ملنے آؤں گا۔''

جوزف نے یہ کہہ کر ٹیلی فون بند کر دیا تو مرسیڈیز کو کچھ حوصلہ ہوا۔ عورتوں کی زندگی میں کسی نہ کسی مرد کے سہارے کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ وہ اسپتال کے باہر کھڑی جوزف کے ڈرائیور کی منتظر تھی۔ اتنی دیر میں جوزف کا ڈرائیور کار پارکنگ میں کار کھڑی کر کے اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ''مرسیڈیز......؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں مرسیڈیز بارخا......'' مرسیڈیز نے اپنا پورا نام بتایا۔

''مجھے جوزف آسٹنن نے بھیجا ہے اور ساتھ یہ رقم بھی بھجوائی ہے، میری ضرورت آپ کو اور کہاں ہے......'' اس نے رقم مرسیڈیز کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ......'' مرسیڈیز نے رقم لیتے ہوئے اسے

حالات سے باخبر کیا۔
''میں ڈاکٹر سے مل لیتا ہوں اور ان سے پوچھ لیتا ہوں۔ مجھے سر جوزف نے اپنے آنے تک آپ کے پاس ہی ٹھہرنے کا کہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک طرف چلا گیا۔
جنرل اسپتال کے باہر کمپاؤنڈ میں بچھے بینچ پر مرسیڈیز اکیلی بیٹھی سوچوں میں گم تھی کہ جوزف کا ڈرائیور بڑی پریشانی سے اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔
''سر جوزف...... ابھی نہیں آئے......''
''نہیں...... مما کیسی ہیں؟'' مرسیڈیز نے پوچھا۔
''ڈاکٹر اپنی کوششوں میں مصروف تو ہیں۔ سر جوزف نے آنے کا کہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے ان کی بات بھی کرائی تھی۔'' ڈرائیور نے مبہم سا جواب دیا تو مرسیڈیز اور بھی پریشان ہوگئی۔ اتنے میں جوزف اپنی گاڑی میں آتا دکھائی دیا۔ گاڑی پارک کر کے وہ ان کے نزدیک آیا تو شدتِ جذبات سے مرسیڈیز اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔
''پلیز میری مما کو بچالیں...... پلیز......''
''ڈاکٹر کوشش تو کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مرض اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، پہلے آجاتے تو زیادہ بہتر ہوتا......''
''جہاں بھوک زندگی کی تانکا جھانکی میں لگی ہو، وہاں علاج کی کہاں سوجھتی ہے۔'' مرسیڈیز ڈبڈبائی ہوئی آواز میں بولی۔
''بہرحال وہ کوششوں میں مصروف ہیں، میں ہوں نا یہاں تمہارے پاس......'' جوزف نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا پھر کچھ ہی دیر بعد ایک ڈاکٹر باہر نکلا۔ وہ نہ جانے ادھر ادھر کیا تلاش کر رہا تھا۔ جوزف تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور پھر اسی تیزی کے ساتھ مرسیڈیز کے پاس آیا۔
''افسوس ہے کہ ڈاکٹر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود تمہاری مما کو نہیں بچا پائے......'' جوزف نے بتایا تو مرسیڈیز ایک بار پھر جوزف کے سینے میں چھپ گئی۔ جوزف روتی ہوئی مرسیڈیز کی لمبی اور سنہری زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلاسا دے رہا تھا۔
اسی شام مرسیڈیز کی والدہ گلیڈیز کی آخری رسوم ادا کردی گئیں۔ وہ رات مرسیڈیز کے لیے قیامت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جوزف اس رات مرسیڈیز کے پاس ہی رہا اور تمام رسوم کی اس طرح نگرانی کرتا رہا جیسے اس کے اپنے کسی عزیز کی موت واقع ہوئی ہو۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری والدہ کو نہیں بچا پایا۔'' اس نے ایک بار پھر سے وہی موضوع چھیڑ دیا۔ ''اب آگے تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میرا مطلب ہے زندگی کا یہ بھاری بوجھ اکیلے کس طرح اٹھاپاؤ گی...... مجھے ڈر ہے جب جونی کو پتا چلے گا کہ تم اکیلی رہ گئی ہو تو وہ تمہارا جینا دوبھر کردے گا۔'' جوزف آہستہ آہستہ کھلنے لگا تھا۔
''مسٹر جوزف...... میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔
''ایک راستہ ہے میرے پاس...... اگر تم پسند کرو تو......'' جوزف نے مطمئن لہجے میں کہا۔
''وہ کیا؟'' مرسیڈیز نے سوجی ہوئی آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں۔
''تم شادی کرلو......'' جوزف نے مشورہ دیا۔
''مگر کس سے...... میں نے تو ابھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں ہے اور پھر کیا گارنٹی ہے کہ میں شادی کرلوں گی تو جونی میرا راستہ چھوڑ دے گا۔ میں سوچتی ہوں یہ شہر چھوڑ دوں...... کہیں دور چلی جاؤں۔'' مرسیڈیز نے مرجھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''یہ تو کوئی حل نہ ہوا۔ تم شادی کرلو۔ کسی ایسے آدمی سے...... جو اس بدمعاش سے مقابلہ کرنا جانتا ہو۔'' جوزف بولا۔
''ایسا مجھے یہاں کوئی دکھائی نہیں دیتا۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔
''ہے...... جونی سے زیادہ طاقتور بھی یہاں موجود ہیں۔ جونی وہ بدمعاش ہے جس کے آگے اگر دولت کی ہڈی ڈال دی جائے تو وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔'' جوزف نے بتایا۔
''میں تو اتنا بھی نہیں کرسکتی۔'' مرسیڈیز نحیف آواز میں بولی۔
''میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ یقین کرو اگر تم اس پر رضامند ہوجاؤ گی تو جونی تمہارے سامنے بھیگی بلی سے زیادہ نہیں رہے گا۔ میں اپنی بے پناہ دولت میں سے ایک بہت بڑا حصہ تمہارے نام کرنے کو بھی تیار ہوں۔ تم سوچ لو......'' جوزف نے پانسا پھینکا۔
''یہ نہ ہو کہ میرے لیے مصائب کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جائیں پھر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم میرے لیے یہ سب کرڈالو گے۔'' مرسیڈیز نے پوچھا۔
''تم کل چلو میں کوئی بھی پسندیدہ گھر تمہارے نام کروادوں گا اور تمہارے اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم بھی ٹرانسفر کردوں گا۔ اس سے بڑی گارنٹی اور کیا ہوگی؟'' جوزف نے اسے مطمئن کردیا۔
جوزف نے اسی طرح کیا اور اپنا وعدہ اگلی صبح تک نبھا

دیا۔ مرسیڈیز کو زندگی میں پہلی بار بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا تھا کہ دنیا میں اگر جینا ہے تو دولت اتنی سمیٹ لو کہ باقی ماندہ جینا آسان ہو جائے۔ اس کے دو تین روز بعد مسیڈیز بار خا...... مرسیڈیز جوزف بن کر نئے گھر میں منتقل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شادی کے بعد سب سے پہلا دھماکا اس روز ہوا جب مرسیڈیز اپنی کار میں کیش اینڈ کیری سے گھر کے لیے کچھ چیزیں خریدنے کے لیے گئی۔ وہ کیش اینڈ کیری سے باہر نکل رہی تھی جب جونی اسٹو پنا اپنے ساتھیوں کو لے کر کیش اینڈ کیری میں داخل ہو رہا تھا۔ مرسیڈیز نے بہت کوشش کی کہ وہ کنی کترا کر نکل جائے مگر وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

''آج کل بڑی ڈیٹ مار رہی ہو۔''

''چھوڑو مجھے......'' مرسیڈیز کسمساتے ہوئے بولی۔

''مجھے سب علم ہے، تم کیا کر رہی ہو۔ میں فی الحال کیوبا جا رہا ہوں۔ وہاں سے گوریلا ٹریننگ لے کر آؤں گا پھر تمہیں پوچھوں گا۔ کہیں بھی اڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ تمہارا حشر بھی اسی نوجوان جیسا ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے مرسیڈیز کا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ چھوڑا اور کیش اینڈ کیری میں چلا گیا۔ مرسیڈیز تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھی اور گھر روانہ ہو گئی۔

رات اس نے جوزف کو ساری بات بتائی تو جوزف نے اسے حوصلہ دیا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو جب میرے ساتھ تمہاری شادی کا علم ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''جوزف! مجھے اس سے بہت خوف آتا ہے۔ وہ جو کہتا ہے کر ڈالتا ہے۔'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے نہیں، یقین کرو وہ تمہارے جوزف کے آگے چوہے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ دولت کے ٹکڑے اس کے آگے پھینکنے سے اس کے سارے کس بل اور سارا زہر نکل چکا ہے، وہ دوسروں کے لیے تیز دھار چھری ہوگا مگر جوزف کے لیے نہیں......''

کتنے ہی روز اس کے ساتھ رہنے کے بعد ایک روز جوزف نے مرسیڈیز سے کہا۔ ''دیکھو مرسی...... میں اتنے روز تمہارے پاس رہ چکا ہوں۔ اب مجھے اپنے اصل گھر میں بھی چند روز کے لیے جانا ہوگا۔ کچھ روز میں تمہارے پاس نہ آسکوں گا۔''

''تو کیا میں اب یہاں اکیلی رہوں گی......؟''

مرسیڈیز نے پوچھا۔

''نہیں۔ میں وقتاً فوقتاً چکر لگاتا رہوں گا۔'' جوزف نے پیار سے جواب دیا۔

''میں بھی تو تمہاری بیوی ہوں۔ داشتہ تو نہیں ہوں کہ دل بہلایا اور نکل گئے۔'' مرسیڈیز کے لہجے میں غصے کا عنصر چھپا ہوا تھا۔

''ارے...... رے...... تم تو ناراض ہونے لگی ہو۔ مجھے کھلتے گلاب کی خوب صورتی پسند ہے۔ سوگوار حسن مجھے قطعاً اچھا نہیں لگتا۔ اچھا چلو...... یوں کرتے ہیں کہ میں دوپہر کا کھانا تمہارے ساتھ کھایا کروں گا۔ ڈارلنگ! میری مجبوری بھی سمجھنے کی کوشش کرو......'' جوزف اسے پیار سے سمجھا رہا تھا۔

''اوکے......'' مرسیڈیز نے مرجھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''دیکھو۔ گاڑی تمہارے پاس ہے۔ فون موجود ہے۔ تم مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کر سکتی ہو۔ میں خود بھی تم سے رابطے میں رہوں گا۔''

''جوزف اگر تم مناسب جانو تو میں اسکول میں دوبارہ جانے لگوں۔ اس طرح تنہائی اور اکیلے پن سے بھی میری جان چھوٹی رہے گی۔'' مرسیڈیز نے پوچھا۔

''تمہیں اب اسکول جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس اتنی دولت موجود ہے کہ تم تو کیا تمہارے بچے بھی تمام عمر کھاتے رہیں تو یہ ختم نہ ہوگی۔ عیش کرو۔'' جوزف نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ وہ اب گھر میں بیٹھی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتی رہتی۔ جب بھی بور ہو جاتی تو جوزف سے فون پر باتیں کرنے لگتی۔

شادی کے بعد پانچ چھ ماہ اسی طرح گزر چکے تھے کہ ایک روز اچانک دوپہر کے وقت اس کے گھر کا دروازہ بجنے لگا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو باہر تقریباً اسی کا ہم عمر ایک نوجوان کھڑا تھا۔

''جی فرمائیے؟'' مرسیڈیز نے پوچھا۔

''باتیں زیادہ ہیں۔ مجھے اندر آنے کا نہیں کہو گی۔'' نوجوان کے لہجے میں بڑی خنکی سی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں اجنبی مردوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ تم نے جو کہنا ہے کہو۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔

''اجنبی مردوں سے نفرت کرتی ہو اور اجنبی بوڑھوں کو

اپنے گلے سے لگا کر رکھتی ہو......'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔
''مطلب......!'' مرسیڈیز نے حیرانی سے پوچھا۔
''اسی لیے تو کہتا ہوں...... مجھے اندر آنے دو...... ورنہ مجھے اتنا حق تو پہنچتا ہے کہ میں زبردستی اندر آ جاؤں۔'' نوجوان ذرا غصے سے بولا۔
''پولیس تم جیسوں کو جیل بھجوانے میں دیر نہیں کرتی۔'' مرسیڈیز نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔
''کس پولیس کی بات کرتی ہو جو میری جیب میں ہمیشہ سے رہتی ہے۔ ذرا ہٹو......'' وہ یہ کہہ کر مرسیڈیز کا بازو ہٹا کر اندر داخل ہو گیا اور کمرے میں بیٹھتے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
''حسین میں اتنا جادو ہوتا ہے میں نے آج تک نہیں سوچا تھا۔ تبھی تو میں بھی کہوں...... میرے پاپا...... کس پر مرمٹے ہیں۔'' وہ بولا۔
مرسیڈیز کو یہ دوسرا جھٹکا لگا تھا۔ تب اس نے بڑے تحمل سے کہا۔
''کھل کر بات کیوں نہیں کرتے...... کس لیے آئے ہو یہاں......'' مرسیڈیز زچ ہو کر بولی۔
''میں جوزف اسٹیفن کرین کا بڑا بیٹا رابرٹ اسٹیفن ہوں...... لگتا ہے میرے پاپا کی دولت نے تمہاری آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں جو تم نے انہیں اس بڑھاپے میں بھی پھانسنے میں کچھ برا محسوس نہیں کیا۔ کیا تمہیں اپنی عمر کا کوئی لڑکا نہیں ملا تھا......'' اس کے لہجے کی تلخی ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔
''دیکھو لڑکے...... تم جو کوئی بھی ہو احتیاط سے گفتگو کرو۔ میں نے جوزف سے باقاعدہ شادی کی ہے۔ میں اس کی رکھیل نہیں ہوں...... اور اس شادی میں ہم دونوں کی مرضی شامل تھی۔'' مرسیڈیز نے روکھے انداز میں جواب دیا۔
''بہتر ہے کہ ہماری زندگی سے نکل جاؤ ورنہ بہت برا ہو گا۔''
''کیا نقصان کرو گے۔ مجھے جان سے مار دو گے...... ہوں......'' مرسیڈیز غصے سے بولی۔
''کچھ بھی ہو سکتا ہے، پالتو کتے غنڈوں کی صورت گلی گلی بھونکتے پھرتے ہیں۔ دم ہلاتے ہوئے کسی کے پیچھے بھی آ سکتے ہیں اور ان کے لیے کسی کی جان لینا بہت آسان ہوتا ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں...... تم خود ہی سوچ لو...... تمہیں کونسا راستہ اختیار کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔
اس کے جانے کے بعد مرسیڈیز عجیب و غریب سوچوں میں گھر گئی۔ اس نے جوزف کو فون کرنا چاہا مگر بار بار فون ملانے کے باوجود جوزف سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس نئی مصیبت کے بارے میں تو مرسیڈیز نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس کے ذہن میں آیا کہ وہ خود جوزف کے آفس میں چلی جائے یا کم از کم پولیس ہی کو اس دھمکی کے بارے میں بتا کر قبل از وقت کیس رجسٹرڈ کرا دے۔ جوزف بھی بڑے دنوں سے نہیں آیا تھا۔ وہ رات اس نے بڑی ہی بے چینی سے گزاری۔ اگلی صبح اس نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا تھا کہ...... جوزف کا فون آ گیا۔
''مجھے افسوس ہے جان جوزف کل تمہیں سن نہیں سکا۔ دراصل کل کچھ لوگوں کے ساتھ کاروباری مصروفیت تھی اور دوسری اپنی نئی فلم کی شوٹنگ کروانے کی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔ تم کہو...... کیسی ہو......'' جوزف نے اپنی مصروفیت کا بتاتے ہوئے معذرت کی۔
''میں بہت پریشان ہوں جوزف...... مجھ سے فوراً ملو۔ جلدی سے گھر آ جاؤ ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔'' مرسیڈیز نے روہانسی آواز میں کہا۔
''میں آتا ہوں...... ابھی آ رہا ہوں، تم اس قدر خوفزدہ کیوں ہو...... میں آ رہا ہوں۔'' جوزف نے پریشانی سے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔
اگلے ہی لمحے وہ مرسیڈیز کے پاس تھا۔ جوزف کو دیکھتے ہی وہ اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جوزف بڑے پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''کچھ منہ سے بھی کہو پلیز۔''
''وہ آیا تھا......'' ابھی اس نے یہ کہا ہی تھا کہ جوزف بول اٹھا۔
''کون...... جونی...... تم نے تو مجھے بتایا تھا اور میری بھی یہی اطلاع ہے کہ وہ کینیڈا چلا گیا ہے۔'' جوزف نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔
''نہیں...... وہ نہیں...... وہ کوئی رابرٹ تھا...... تمہارا بیٹا رابرٹ اسٹیفن......'' مرسیڈیز نے روتے ہوئے کہا۔
''کیا کہا تھا اس نے...... کوئی دھمکی وغیرہ دے کر گیا ہے، بتاؤ مجھے...... اسے یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی......'' جوزف نے غصے سے پوچھا۔
تب مرسیڈیز نے سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔
''تم فکر نہ کرو...... میں خود ہی سنبھالتا ہوں اسے......'' جوزف نے دھیرج سے کہا۔ ''آئندہ وہ تمہیں

تنگ نہیں کرے گا۔'' اس نے مرسیڈیز کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مرسیڈیز اب ایک بہت ہی پیاری سی بیٹی شیرل کی ماں بن چکی تھی۔ جوزف کے دونوں گھرانوں میں سوتیلے پن کی آگ گویا دب چکی تھی۔ مگر اس کی راکھ میں اب بھی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ جوزف کی پہلی بیوی نے مرسیڈیز کو قبول کرنے سے یکسر انکار کردیا تھا اور ان کے درمیان کھنچی نفرت کی لکیر باقاعدہ خلیج بنتی جارہی تھی۔ اس روز تو انتہا ہوچکی تھی۔ جب مرسیڈیز اپنی بیٹی شیرل کو تیار کرکے اسکول چھوڑ کر آرہی تھی۔ ابھی اس نے گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ زور سے کال بیل بجی..... لگتا تھا کال بیل پر کوئی انگلی رکھ کر اٹھانا بھول ہی گیا ہے۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے جوزف کی پہلی بیوی اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ایک طرف ہوتے ہوئے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ اندر آتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کرتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا۔

''کمینی..... میرے شوہر کی دولت چھیننا چاہتی ہے۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ اس پر جھپٹی۔

مرسیڈیز نے بڑی ہی مشکل سے اپنا آپ بچایا۔ لڑکے نے والدہ کو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ ''میں نے کہا تھا ناما کہ تم وہاں جاکر جھگڑا نہیں کروگی۔''

''چھوڑ دو مجھے۔ میرا خون کھول رہا ہے۔ جس خوبصورتی کا اسے غرور ہے، میں وہ خوبصورتی ہی نہیں رہنے دوں گی۔ تیزاب پھینک دوں گی اس کے چہرے پر.....''

وہ اپنا آپ چھڑا کر دوبارہ اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہی تھی۔

مرسیڈیز کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس طرح اس مصیبت سے جان چھڑائے۔ بالآخر وہ لڑکا اسے لے کر چلا گیا اور مرسیڈیز ایک بار پھر گھر میں اکیلی رہ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جس سکون کے لیے اس نے شادی کی تھی وہ اس کے لیے وبال بن گیا ہے۔ دولت..... دولت..... ہر کوئی اسی کے پیچھے پاگل ہوا پھرتا ہے۔ اسے تو تحفظ کی ضرورت تھی۔ جونی جیسے بدمعاش سے بچنے کے لیے اس نے جوزف کو سہارا بنایا تھا..... جوزف اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے سبب اپنی ساری طاقت کے پرسمیٹ رہا تھا۔ اس کی اولاد جوان ہوچکی تھی اور وہ اس کے قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ اس نے اس جھگڑے کا ذکر جوزف سے کیا تھا مگر اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی اولاد سے کس طرح نمٹے..... اگرچہ جس معاشرے میں وہ سانس لے رہے تھے وہاں بچوں کو جوانی کی دہلیز پر پہلا پاؤں رکھتے ہی آزادی مل جاتی تھی۔

آخر وہ کب تک ان جھگڑوں میں پڑی رہے گی۔ آگے اس کی اپنی بیٹی بھی جوان ہورہی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے جوزف سے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ وہ یہ علاقہ ہی چھوڑ دے گی۔ جس دولت کا واویلا پورے معاشرے کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہے، وہ خود اس کے حصول کے لیے ہر حد پار کرجائے گی۔ ابھی اس کے حسن کا بگڑا ہی کیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور کمرے میں لگے ہوئے قد آدم شیشے کے سامنے جاکر اپنی خوب صورتی کا جائزہ لینے لگی۔ وہ ہر زاویے سے اپنے حسن کو پرکھ رہی تھی۔ کیا ہوا اگر وہ ایک نوعمر لڑکی کی ماں بن چکی ہے مگر اس کے جسمانی خدوخال کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا بلکہ ماں بن کر اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ اس کے کانوں میں برسوں پہلے کی عرفیت گونجنے لگی۔ وہ اب بھی سویٹ گرل تھی..... پھر وہ جوزف ہی کی محتاج بن کر کیوں رہے؟

بالآخر ایک روز تنگ آکر اس نے جوزف سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ سنادیا۔ جوزف نے بڑے تحمل سے اس کا یہ فیصلہ سنا پھر اس پر اس نے اپنے خدشات کا اظہار بھی کرڈالا۔

''حفاظتی دیواروں میں رہ کر بھی تو میرا جینا دوبھر ہی ہے۔ اس سے بہتر نہیں، میں آزاد فضاؤں میں اپنی مرضی سے اڑانیں بھروں.....'' مرسیڈیز نے کہا۔

''تمہاری مرضی..... بہرحال میری دولت اور میری دوستی کے دروازے تم پر بند نہیں ہوئے۔ تمہیں جب بھی میری مدد کی ضرورت پڑے بلا خوف وخطر مجھے آواز دے سکتی ہو۔ میری بیٹی شیرل.....''

''میں اسے تمام عمر کڑھنے اور احساس کمتری میں جینے کے لیے تمہارے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ میرے پاس ہی رہے گی.....'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔

بوڑھے جوزف نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

آرٹی شا میرا فلورس علاقے کی امیر ترین شخصیت تھی۔ مرسیڈیز نے جوزف سے چھٹکارا حاصل کیا تو چند روز وہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لینے کی غرض سے باہر نکلی۔ ایک روز اس کی ملاقات اسکول کی ایک سہیلی لئی سے ہوگئی۔

للی بھی اسی علاقے کی رہنے والی تھی جہاں آرنی شا رہتا تھا۔ مرسیڈیز ایک دو بار اس علاقے میں گئی تھی۔ وہاں اس نے دو چیزوں کی بڑی شہرت سنی تھی۔ ایک آرنی شا کی امارت اور دوسرے وہاں کا ''مابوڈانس''......

''میں بھی مابوڈانس دیکھوں گی۔'' اس نے ایک روز اپنی سہیلی سے کہا۔

''رہنے دو...... اس کی بری شہرت سنی ہے۔ یہ جنسی ہیجان پیدا کرنے والا ڈانس دیکھ کر تم کیا کرو گی......؟'' للی نے نفرت سے کہا۔

''تمام بگڑے ہوئے نوجوان اور بے پناہ دولت رکھنے والے رئیسوں کی یہی پناہ گاہ ہوتی ہے۔ میں اس جگہ ضرور جاؤں گی۔ اگر تم میرے ساتھ چلو گی تو ٹھیک ورنہ میں اکیلی چلی جاؤں گی۔'' مرسیڈیز نے اسے دھمکی دی تو وہ بھی جانے کے لیے رضامند ہوگئی۔ حسب معمول اس رات بھی کیسینو میں بے تحاشا رش تھا۔ وہ اندر جا کر بیٹھ گئیں۔ ابھی شو شروع نہیں ہوا تھا جب آرنی شا بھی کیسینو میں آگیا۔ للی نے اسے دیکھتے ہی مرسیڈیز کو ٹہوکا مارا۔ ''آرنی شا......'' انسان خوب صورت نہ بھی ہو تو بھی دولت اس کا نک سک سنوار دیتی ہے۔ مرسیڈیز کو اس کا ہر انداز اچھا لگا تھا۔ جب شا کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ بھی ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا۔

''میں آرنی شا ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام مرسیڈیز کرین ہے...... میں لاس اینجلس سے ہوں۔'' مرسیڈیز نے اپنے سابقہ شوہر کے حوالے سے اپنا نام بتایا۔

''او...... میرا پروگرام بھی لاس اینجلس میں کاروبار جمانے کا ہو رہا ہے۔ آپ وہاں کہاں رہتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''گڈ......'' مرسیڈیز کھل اٹھی۔ ''میں شہر سے ذرا آگے نکل کر نئے قصبے میں رہتی ہوں۔'' مرسیڈیز نے بتایا۔

''چکر لگا تو آؤں گا...... چاند کے قریب جانے کا تو ہر کسی کو شوق ہوتا ہے اور کتنے دن یہاں ہیں؟'' آرنی شا نے بات آگے بڑھائی۔

''شاید کل واپس چلی جاؤں۔'' مرسیڈیز بولی۔

وہیں اس نے رات کے کھانے کا پروگرام بنالیا۔ پروگرام ختم ہوا تو آرنی شا کی گاڑی ان کو لے کر ایک جدید ہوٹل میں آگئی۔ مرسیڈیز کی عشوہ طرازیاں دیکھ کر وہ اس پر بری طرح سے فریفتہ ہو چکا تھا۔

''یقیناً مرسیڈیز آپ کا اپنا نام ہوگا اور کرین آپ کے......'' آرنی شا نے ایک ماہر شکاری کی طرح اسے باتوں کے جال میں پھنسالیا تھا۔

''کرین میرے شوہر کے نام کا حصہ تھا۔ اس کا پورا نام جوزف اسٹیفن کرین تھا۔'' مرسیڈیز نے بتایا تو آرنی شا کچھ سرد سا پڑ گیا۔

''تو کیا میں یہ چاند اپنے آنگن میں اتار سکتا ہوں۔ یقین کریں آپ کی ساری پریشانیاں میرے ساتھ وابستہ ہونے سے خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ میں اپنی دولت کا ایک خطیر حصہ آپ کے نام کرنے کو تیار ہوں۔'' شا نے پوچھا۔

''کیا مجھے سوچنے کا موقع نہیں دو گے؟'' مرسیڈیز نے ہنس کر پوچھا۔

''یقیناً...... یہ آپ کا حق ہے۔'' آرنی شا بولا۔

''تم لاس اینجلس ہو آؤ...... تب تک میں سوچ لوں گی۔'' مرسیڈیز نے کہا۔

''اوکے...... میں جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔''

اس واقعے کے کچھ ہی روز بعد آرنی شا اور مرسیڈیز قریبی گرجا میں جا کر شادی کر چکے تھے۔ آرنی شا لاس اینجلس میں منتقل ہو چکا تھا اور ایک خطیر رقم مرسیڈیز کے اکاؤنٹ میں ایک بار پھر جمع ہو چکی تھی۔ ایک روز آرنی شا اور مرسیڈیز ایک بہت بڑے شاپنگ مال سے خریداری کرنے کے بعد باہر نکل رہے تھے جب اچانک ہی کہیں سے جونی ان کے سامنے آگیا۔ مرسیڈیز اسے دیکھتے ہی پریشان ہوگئی۔

''ہیلو سویٹ گرل...... دیکھو میں واپس آگیا ہوں......'' اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے کر دیا تو ناچار مرسیڈیز کو بھی اس سے مصافحہ کرنا پڑا۔

آرنی شا حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مرسیڈیز نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی دوسرا سوال کرتا، مرسیڈیز نے جلدی سے اس کی توجہ شا کی طرف کروائی۔

''یہ میرے شوہر آرنی شا ہیں......'' اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ مصافحہ کرنے کے کچھ ہی دیر بعد آرنی شا کی کال آگئی اور وہ سوری کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مسز جوزف سے تم مسز آرنی شا کب ہوئیں؟'' جونی نے حیرانی سے پوچھا۔

''میں اپنی ذاتی زندگی میں کچھ بھی کرنے کا حق رکھتی ہوں۔'' مرسیڈیز نے روکھے پن سے جواب دیا۔

''اوہ...... تو گویا باتیں کرنا بھی سیکھ گئی ہو۔ میں آؤں گا، کسی روز تمہارے گھر...... میرا انتظار کرنا۔'' جونی نے تیکھے انداز میں انتباہ کرتے ہوئے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔

''کون تھا یہ......؟'' آرنی شا نے پوچھا۔

''جس اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کے قریب ٹاپ ہیٹ کیفے کا ملازم تھا۔ جب ہم اسکول کے کسی پیریڈ سے فارغ ہوتے تھے تو اس کیفے میں بیٹھ جاتے تھے۔ وہیں اس سے واقفیت ہوئی تھی۔'' مرسیڈیز نے بتایا۔

''شکل سے مجھے گینگسٹر لگتا ہے......'' آرنی شا نے کہا۔

''ہاں اسی کام کے لیے کیفے کے مالکان نے اسے ملازمت دی تھی۔'' مرسیڈیز نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا تو دونوں آگے بڑھ گئے۔ آرنی شا کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ اسی لیے گھر آکر اس نے ایک بار پھر وہی موضوع چھیڑ دیا۔

''مگر وہ...... کیا نام بتایا تھا اس نے......'' آرنی شا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''جونی......'' مرسیڈیز نے اسے بتایا۔

''ہاں...... جونی...... وہ تو تم سے اس طرح مل رہا تھا جیسے اس کے تمہارے ساتھ بڑے گہرے تعلقات ہوں۔ وہ گھر آنے کا بھی کہہ رہا تھا۔ میں نے خود سنا تھا......'' آرنی شا بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نے ایسا ضرور کہا تھا مگر وہ میرا گھر کہاں جانتا ہے، یہ سب رسمی باتیں ہوتی ہیں۔ تم انہیں دل پر مت لو۔'' مرسیڈیز نے اس کی تشفی کی۔

آرنی شا ایک شکی مزاج آدمی تھا۔ اس بات پر اس کا ذہن الجھتا چلا گیا۔ وہ میرا فلورس سے اپنا تمام کاروبار سمیٹ کر لاس اینجلس آچکا تھا۔ ایک چھوٹے شہر اور بڑے شہر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رہن سہن، طرزِ معاشرت اور کاروباری انداز چھوٹے شہر سے کہیں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ آرنی کے ذہن کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ اب وہ بات بات پر مرسیڈیز کو ٹوکنے اور اس پر پابندیاں لگانے لگا تھا۔ مرسیڈیز نے آزاد فضاؤں میں پہلی بار کھل کر سانس لیا تھا۔ اس لیے اسے یہ پابندیاں بالکل اچھی نہ لگتی تھیں اور اس روز تو انتہا ہی ہوگئی۔ آرنی شا مرسیڈیز کو بتا کر گیا تھا کہ وہ ایک دو روز کے لیے اپنے آبائی گھر جا رہا ہے۔ مرسیڈیز نے کہا تھا کہ شیرل کی اسکول سے چھٹیاں ہیں۔ اس لیے وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے جائے مگر اس نے ''پھر کبھی'' کا کہہ کر بات ٹال دی اور اکیلا ہی چلا گیا۔

اسی روز دوپہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی، مرسیڈیز نے شیرل کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ شیرل نے دروازہ کھولا تو باہر جونی کھڑا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول اور لباس وغیرہ دیکھ کر شیرل سہم گئی۔ اس کے گلے میں آواز پھنس کر رہ گئی۔

اس سے پہلے کہ مرسیڈیز دروازے تک آتی۔ جونی نے شیرل کو ایک طرف دھکا دیا اور اندر آگیا۔

''تم یقیناً سمجھتی ہوگی کہ جونی وعدہ کر کے بھول گیا ہے اور تمہیں یہ بھی اطمینان ہوگا کہ مجھے تمہارا گھر کبھی نہیں ملے گا۔ جونی سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ پھر میں نے شاید ایک بار تمہیں بتایا تھا کہ جونی اپنی پسند پر پوری نظر رکھتا ہے۔ اس کی ہر حرکت جونی کی نظر میں ہوتی ہے۔'' جونی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں آئے ہو یہاں......'' مرسیڈیز نے نفرت سے پوچھا۔

''اپنا گھر ہے...... یاد رکھو سویٹ گرل تم جہاں مرضی چلی جاؤ۔ کسی کے بھی پہلو میں چھپ جاؤ۔ رہو گی جونی کی ہی...... اور میں جب چاہوں تمہیں اچک کر لے جاؤں گا۔ یہ نئی تتلی کہاں سے پکڑ کر اپنے گھر ڈال لی ہے تم نے......'' جونی نے شیرل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹی ہے میری......'' مرسیڈیز نے اس کی نگاہوں کا مفہوم جانتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... میں اتنی دیر بعد تم سے ملا ہوں کہ تمہاری بیٹی بھی تمہارے کندھوں تک آپہنچی ہے۔'' جونی نے تیزی سے کہا اور پھر ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''اب تم اگر اپنی مسافت سے تھک چکی ہو تو آؤ میں تمہیں سمیٹ لوں...... بہت دیر ہو چکی ہے۔ جونی کسی کام میں اتنی دیر نہیں کرتا۔ پتا نہیں تمہارے بارے میں اتنی ڈھیل کیوں برت رہا ہوں......'' جونی نے مسکراتے ہوئے مرسیڈیز کو یاد دلایا۔

''آرنی شا...... میرا شوہر ہے۔ ایک بہت بڑی کاروباری شخصیت ہے وہ......'' مرسیڈیز نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر اسے رکھ کر دوسرے ہاتھ سے مسلنا جونی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔'' جونی نے مذاق اڑایا۔ ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور آرنی شا اندر داخل ہوا۔

''کون ہو تم..... اور یہاں میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟'' وہ غصے سے دہاڑا۔

''اتنی جلدی بھول گئے ہو۔ جونی نام ہے میرا.....'' وہ ہولسٹر سے پسٹل نکال کر ہاتھ میں نچاتے ہوئے بولا۔

''یہ میری پسند ہے اور جونی اپنی پسند کو کبھی چھوڑتا نہیں ہے۔ یہ دیکھو..... یہ ننھا سا لو ہے کا کھلونا کس قدر ظالم ہے، مجال ہے کسی سے رعایت کرتا ہو.....'' جونی نے انگلیوں پر پسٹل اچھالتے ہوئے کہا۔ ''اب چلتا ہوں پھر آؤں گا.....'' یہ کہہ کر وہ بھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔

مرسیڈیز جانتی تھی کہ اس کی طرح آرنی شا کو بھی جونی ناپسند ہے مگر وہ اس ناگہانی آفت کو کس طرح ٹال سکتی تھی۔ آرنی شا بھی غصے سے باہر نکل گیا۔ ذرا سی دیر میں ایک قیامت سی آکر گزر گئی تھی۔ ان کے جانے کے فوراً بعد شیرل نے مرسیڈیز سے پوچھا۔

''کون تھا یہ..... غنڈا لگتا ہے۔ اسے منع کر دو، یہ دوبارہ ہمارے گھر نہ آئے۔''

''پہلے کونسا میں نے اسے بلایا تھا۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔

''پھر یہ کیسے آیا؟ میں ابھی پولیس میں اس کی رپورٹ درج کرواتی ہوں۔'' شیرل غصے سے بولی۔

''میرے خیال میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ شا کی نفرت بتا رہی تھی کہ وہ خود ہی اس سے نمٹ لے گا ویسے میرا اندازہ ہے کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔'' مرسیڈیز نے اس کے گرم مزاج کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔

مگر آرنی شا گھر چھوڑ کر گیا تو پھر دوبارہ واپس نہیں آیا بلکہ اس نے مرسیڈیز کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا پیغام بھجوا دیا۔ جیسے ہی مرسیڈیز کو علیحدگی کا پیغام ملا، وہ بہ ظاہر افسوس کرتے ہوئے بولی۔

''اوہ..... بیچارہ آرنی شا کس قدر بزدل نکلا۔''

☆☆☆

آزادی کیا ملی کہ مرسیڈیز کو اب کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اب معاشی طور پر مرسیڈیز کو کسی قسم کی فکر نہ تھی۔ اس لیے وہ معاشرتی سرگرمیوں کے دریا میں کود گئی۔ اس نے کلبوں، کیسینوز اور ایسی پارٹیوں میں آنا جانا شروع کر دیا جہاں معاشرے کی کوئی حد یا پابندی لاگو نہیں ہوتی تھی۔ پھر اس نے چار پانچ سالوں میں چھ سات شادیاں کر ڈالیں۔ ہنری لوپنگ، فلیکس پارکر، فریڈے، رونالڈ ہیلر، ٹائرون پاور کے ساتھ اس نے باقاعدہ شادیاں کیں اور ہر شادی کی مدت چھ سات ماہ سے زیادہ نہ رہی۔ اسے اب مردوں کو بے وقوف بنا کر ان کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ مرسیڈیز مرد کی فطرت سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی اور اپنے حسن و خوب صورتی کا فائدہ اٹھانے میں ماہر بھی۔ ایک محفل میں ..... اس کی ایک ملنے والی نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

''مرسی..... کو تو زندگی میں ہمیشہ کامیاب مرد ہی ملے ہیں اور اسے پہلے سے علم ہو جاتا ہے کہ کامیاب مرد کیسا ہوتا ہے..... کیوں ڈارلنگ؟''

''بے بی سنو..... کامیاب مرد وہ ہے جو اس سے زیادہ کمائے کہ جتنا اس کی بیوی خرچ کر سکتی ہے جبکہ کامیاب عورت وہ ہے جو ایسا مرد ڈھونڈ سکے۔'' یہ کہہ کر مرسیڈیز قہقہہ مار کر ہنس دی۔

''بڑی خوب صورت منطق ہے..... اپنی طرح تم باتیں بھی بڑی خوب صورت کرتی ہو بھی تو مرد تمہارے گرد لٹو کی طرح گھومتے ہیں۔''

''اپنا اپنا..... ہنر ہے..... تم بھی آزمانے کی کوشش کرو۔'' مرسیڈیز نے ہاتھ میں پکڑے گلاس سے مشروب کا آخری گھونٹ لیا..... تو قریب سے گزرتے ہوئے بیرے نے اٹھائی ہوئی بوتل کا ڈھکنا کھول کر دوبارہ اس کا گلاس بھر دیا۔

''اب کونسے نمبر کی شادی چل رہی ہے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''میں ہمیشہ سے اس حساب میں کمزور ہوں۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔

''تم بہت ذہین عورت ہو اور جواب دینے میں کوئی تمہارا جوڑ نہیں ہو سکتا۔'' وہ اب باقاعدہ اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملانے پر تل گئی تھی۔

تعریف کسے اچھی نہیں لگتی اور پھر، بھی عورت کے حسن، اس کی ذہانت اور اس کے قول و فعل کی تعریف تو اس کی جوانی کے لیے ایک قوت بخش دوا کا کام کرتی ہے۔

''ٹھہرو..... ٹھہرو..... ڈارلنگ! تم شاید کچھ غلط کہہ گئی ہو۔ تم نے ابھی ابھی مجھے ذہین عورت کہا۔ ذرا اپنا ذہن درست کر لو..... مرسیڈیز ابھی عورت نہیں بنی..... لڑکی ہے..... لڑکی وہی انیس بیس سال کی کنواری لڑکی.....'' مرسیڈیز نے ہنس کر کہا تو وہ بولی۔

''اوہ تم ایک شرارتی لڑکی ہو۔'' اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

مردوں کے بارے میں مرسیڈیز کا کہا ہوا فقرہ اتنا مشہور ہوا تھا کہ اب وہ جس فنکشن میں بھی جاتی عورتیں اور لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو کر ضرور اس سے سنتیں اور پھر اس کی تعریف کیے بنا نہ رہتی تھیں۔ یہ ایک ایسی ہی نیم سیاسی پارٹی تھی جہاں مرسیڈیز بھی مدعو تھی۔ جب ایک مشہور زمانہ شوبز میگزین ''ہالی ووڈ رپورٹر'' کا پبلشر ''ولیم ولکرسن'' بھی اپنے میگزین کے فوٹو گرافر اور نمائندے کے ساتھ وہاں آیا ہوا تھا۔

مرسیڈیز کی گھومتی اور ڈھونڈتی بلوریں آنکھیں ادھر ادھر اپنا شکار ڈھونڈ رہی تھیں۔ ولیم ولکرسن نے اپنے نمائندے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ نمائندے کی نگاہیں مرسیڈیز کی نظروں سے ملیں تو وہ فوٹو گرافر کو لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''میں ڈاک گوا ورز ہوں..... ہالی ووڈ رپورٹر میگزین سے میرا تعلق ہے۔ میرے پبلشر ولیم ولکرسن آپ کے بلاخیز حسن اور آپ کی خوب صورتی کی حشر سامانیوں سے مرعوب ہیں۔ میں اپنے میگزین کے لیے آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔ آپ اسے انٹرویو بھی کہہ سکتی ہیں۔''

''میرا نام مرسیڈیز ہارنا ہے۔ کبھی میں سویٹز گرل کی عرفیت سے مشہور تھی۔''

''اوہ تو آپ ہیں وہ جس کی شہرت کی بازگشت آج بھی ٹاپ ہیٹ کیفے میں سنائی دیتی ہے؟'' نمائندے نے پوچھا۔

''بلاشبہ وہ میں ہی ہوں۔'' مرسیڈیز نے فخر سے کہا۔

''اگر میں جھوٹ نہیں کہہ رہا تو میڈم آج بھی آپ کا حسن نوجوان لڑکی سے کم نہیں ہے۔'' نمائندہ بولا۔

''بس دیکھ لیں، کتنی مشکل سے میں نے اپنے جسم کو متناسب رکھا ہوا ہے۔'' مرسیڈیز بولی۔

''آپ لاس اینجلس کے مشہور و معروف فلمی اسٹوڈیو کے قریب رہیں۔ آپ کے ظاہری حسن کو بھی کسی بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر بھی آپ نے فلموں میں کردار نہیں کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''بس یونہی مجھے شوق نہیں رہا.....'' مرسیڈیز بولی۔

''آپ شادی شدہ ہیں.....'' اس نے اگلا سوال کیا تو قریب سے گزرتی ایک دوسری عورت نے لقمہ دیا۔

''ایک شادی..... کم وبیش آٹھ شادیاں تو کر ہی چکی ہیں۔'' عورت ہنستی ہوئی لقمہ دے کر... آگے نکل گئی۔

''کیوں ایک بھی شادی آپ کو راس نہیں آئی؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ کامیاب مرد وہ ہے جو اس سے زیادہ کمائے جتنا اس کی بیوی خرچ کر سکتی ہو جبکہ میں اس عورت کو کامیاب کہتی ہوں جو ایسا مرد ڈھونڈ سکے.....'' مرسیڈیز نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''تو گویا.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں..... بالکل کچھ ایسا ہی میرے ساتھ اکثر ہوا ہے۔'' مرسیڈیز نے جواباً کہا۔

نمائندے نے مزید کچھ باتیں پوچھیں اور پھر شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے چند ماہ مرسیڈیز کے لیے خاصے مشکل تھے۔ جونی اس دوران ایک دو بار گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ اب دونوں کے درمیان ... کبھی صلح کبھی لڑائی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ وہ جب بھی آتا اس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ مرسیڈیز اگر دوسرے مردوں کے ساتھ شادی کر سکتی ہے تو اس میں کیا کمی ہے مگر مرسیڈیز ہر بار اس کو ٹال دیتی تھی۔ اس روز وہ پھر صبح ہی صبح آ دھمکا۔

''میرے ساتھ چلو..... آج میں بھی تمہیں ڈیٹ پر لے جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں..... آج میں کہیں نہیں جا سکتی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' مرسیڈیز نے جواب دیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا..... دیکھو..... جو گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے وہ جونی انگلیاں ٹیڑھی کر کے نکالنا بھی جانتا ہے..... مگر نہ جانے کیوں تمہارے ساتھ میں زبردستی نہیں کرنا چاہتا..... حالانکہ یہ میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں نے اگر اتنا انتظار کیا ہے تو اس کی بھی وجہ تھی۔ میں نے کیوبا جانا تھا واپس آیا تو پتا چلا کہ تم نے میرے دوست اور کرم فرما جوزف اسٹیفن کرین سے شادی کر لی ہے۔ میں تب خاموش رہا..... تم نے اسے چھوڑ کر اور جگہ شادی کی پھر کئی مردوں کے پہلو گرماتی نظر آئیں۔ پھر آرٹی شا، فریڈو لاماس، رابرٹ ٹیلر، گلی رونی، جان وین اور جیکل کی بغل میں نظر آتی رہیں۔ اب میں تمہیں کسی صورت نہیں چھوڑوں گا۔'' جونی تو جیسے اس کی ہر شادی اور ہر معاشقے سے واقف رہا تھا۔

''تم مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہو کہ میں جگہ جگہ منہ مارتی ہوئی نظر آتی ہوں۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ اور آئندہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ جیل بھجوا دوں گی۔''

مرسیڈیز نے غصے سے کہا تو جونی بھی اشتعال میں آ گیا۔

"کونسی پولیس کی دھمکی دے رہی ہو جو ہمیشہ سے جونی کی جوتیوں میں پڑی رہتی ہے۔ آج میں تمہیں ہر حال میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کیسے انکار کرتی ہو۔" یہ کہہ کر جونی نے مرسیڈیز کو بازو سے پکڑا اور باہر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ مرسیڈیز اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی مگر جونی کی سخت گرفت سے آزاد نہیں ہو پا رہی تھی۔ شیرل اسکول گئی ہوئی تھی۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا پھر اچانک شیرل اسکول سے واپس آ گئی۔

جونی اور اپنی والدہ کو تُو تُو میں میں اور ہاتھا پائی کرتے دیکھ کر شیرل سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے اسکول بیگ ایک طرف پھینکا اور دوڑ کر باورچی خانے سے سبزی کاٹنے والی چھری اٹھا لائی۔

"چھوڑ دو میری مما کو....." وہ دور سے دہاڑی۔

"کیا کر لو گی تم ننھی پری....." جونی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔ بہت ہو چکا..... اب مزید انتظار نہیں ہو سکتا۔" اس نے مرسیڈیز کو پیچھے سے پکڑ کر دونوں بازوؤں میں جکڑا اور اٹھا کر باہر لے جانے لگا۔

شیرل غصے سے آگے بڑھی اور تیز چھری سے اس کی پشت پر وار کر دیا۔ چھری وہاں سے نکالی اور پھر گردن میں گھونپ دی۔ جونی اس اچانک حملے سے گھبرا کر واپس پلٹا تو شیرل نے جرأت کر کے ایک دو وار اس کے دل کے قریب کر ڈالے۔ جونی چھریوں کے پے در پے وار سے زمین پر گر پڑا۔ خون کے فوارے اس کے جسم سے نکل کر زمین کو سیراب کرنے لگے تھے۔ رہی سہی کسر اس کے گرے ہوئے جسم پر مزید چھریاں مار کر شیرل نے پوری کر دی۔ وہ غصے سے بپھری ہوئی تھی۔ جونی کا تڑپتا ہوا وجود جلد ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

جونی اسٹو پناٹو قتل ہو چکا تھا۔ ایک بہت بڑا بدمعاش اور دہشت کا پہاڑ گر چکا تھا۔ ایک بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔ مرسیڈیز کو ہوش آیا تو اس نے فوراً خود ہی پولیس کو فون کر دیا۔ شیرل کو آلۂ قتل سمیت گرفتار کر لیا گیا تھا۔

اگلی صبح شہر کے اخبارات میں جونی اسٹو پناٹو کے قتل کی خبر بڑی نمایاں کر کے شائع کی گئی جس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ملزمہ آلۂ قتل سمیت گرفتار کر لی گئی ہے۔ دوپہر کو مرسیڈیز کو جو پہلا فون ملا وہ جوزف اسٹیفن کرین کا تھا۔

"مری..... یہ میں نے کیا پڑھا ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے جوزف..... شیرل نے جونی اسٹو پناٹو کو چھری سے وار کر کے ختم کر ڈالا ہے۔ اسے خطرہ ہو گیا تھا کہ کہیں جونی اس کی ماں کو مار ہی نہ دے۔"

"وہ کب آیا تھا.....؟" جوزف نے پوچھا۔

"اس نے میرا پیچھا چھوڑا ہی کب تھا۔ وہ میں ہی تھی جو آج تک اس سے بچتی چلی آ رہی تھی۔ وہ اس وقت تک مجھ سے دور رہا جب تک میں تمہارے ساتھ رہی۔ تم ٹھیک کہتے تھے جوزف..... کہ جونی تم سے خوف زدہ ہے مگر جونہی میرا اور تمہارا ساتھ چھوٹا، وہ مجھے جب بھی ملتا ہمیشہ دھمکی آمیز اور توہین کر دینے والا رویہ رکھتا تھا۔ پھر اس روز تو حد ہی ہو گئی۔ شیرل اس روز اسکول گئی ہوئی تھی کہ وہ دندناتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور مجھ سے زبردستی کرنے لگا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا باہر لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھا جب شیرل آ گئی۔ اس نے جونی کو مجھ سے ہاتھا پائی کرتے دیکھ لیا تھا پھر اس نے غصے میں آ کر چھری سے اسے قتل کر ڈالا۔"

"تم فکر نہ کرو..... میں کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر جوزف نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ جوزف کی واقفیت اور دولت دونوں نے مل کر شیرل کی جلد ہی ضمانت کروائی۔ جونی کا قتل پولیس کی تحقیقی رپورٹ کے مطابق ذاتی تحفظ کے لیے کیا جانے والا قتل قرار دیا گیا جس کی بنیاد پر اس کی جلد ضمانت ہو گئی۔ کچھ عرصہ کیس عدالت میں چلنے کے بعد کوئی گواہ نہ ہونے اور عدم شہادتوں کی وجہ سے اسے خارج کر دیا گیا..... اور شیرل رہا ہو کر واپس گھر آ گئی۔ شیرل کی رہائی کے بعد منعقدہ ایک فنکشن میں مرسیڈیز نے دوبارہ جوزف اسٹیفن کرین سے شادی کر لی۔ اتنے سارے مردوں میں جوزف پہلا بوڑھا مرد تھا جس سے مرسیڈیز نے دوسری بار شادی کی تھی۔ اس کی شادی اور شیرل کی رہائی کی خوشی میں ہونے والے جشن میں اس نے خود ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ "مرسیڈیز وہ خوش قسمت عورت ہے جس نے ہمیشہ کامیاب مردوں کا چناؤ کیا۔ یہ دیکھ کر آیا یہ مرد اتنا کما سکتا ہے جتنا وہ خرچ کر دیتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی کامیاب ترین عورت ہے۔" مگر آخر میں مرسیڈیز ایڈز کا شکار ہو کر انتہائی برے حالات میں موت کے ہاتھوں شکست کھا گئی.....

وہ ٹوکیو سے آنے والی فلائٹ پر پہلے سے موجود تھا اور جب جزیرہ ''ہواٹی'' سے میں جہاز پر سوار ہوا تو مجھے اس کے ساتھ والی نشست ملی۔ میں اس گینڈے اور بن مانس کی مخلوط نسل کے آدمی نما پہاڑ کے ساتھ چوہے کی طرح دبک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی غیر معمولی جسامت کا جائزہ میں نے اس وقت لیا جب اطمینان سے بیٹھنے کے بعد مجھے یقین آگیا کہ جہاز بہ حفاظت ٹیک آف کر چکا ہے اور سیٹ بیلٹ کھولنے کے علاوہ سگریٹ پینے کی اجازت بھی ملی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی، دنیا میں کنگ کانگ اور ڈریکولا کے نمونے نظر آجاتے ہیں چنانچہ میں نے ...... ائر ہوسٹس کی پیش کردہ کافی قبول کی اور اخبار نکالا۔ اسی وقت ریچھ جیسا پنجہ میرے شانے پر پڑا اور میں عملاً اچھل پڑا۔ کافی نیچے گر گئی اور کچھ لوگوں نے ناپسندیدگی کے ساتھ مجھے گھورا۔ شکر ہے کہ چھت کافی بلند تھی ورنہ میرا سر ٹکرانے سے جہاز کا توازن بگڑ جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔

دیوزار کے حلق سے سڑک کوٹنے والے انجن جیسی صدا بلند ہوئی جو دراصل اس کی ہنسی کی آواز تھی۔ میں نے شانے کو پھلایا اور متانت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ملامت

نسیم جاوید سید

ناواقف

وقت کا اگر وجود ہوتا تو شاید دنیا میں اس سے زیادہ طاقت کسی کے پاس نہ ہوتی مگر... اس کے باوجود وقت میں ایک کمزوری بھی اللہ نے رکھ دی ہے۔ آگے بڑھنے میں یہ جس قدر تیزی دکھاتا ہے اتنی ہی خوب صورتی سے اس کے واپسی کے راستے بھی مسدود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بھی وقت کی سوئی اپنی مرضی سے پلٹا دیتا۔ بہرحال وقت کے ہی حوالے سے ذرا سی ناواقفیت نے اسے کال کوٹھڑی تک پہنچا دیا۔ بات وہی ہے... مجرم چاہے جتنی چالاکی دکھائے... کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے۔

پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے مجرم کی بدلتی سمتوں کا ماجرا



آمیز نظروں سے گھورا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔'' اس نے اپنے میلے دانتوں کی نمائش کی۔ ''تم وہی ہونا، اخباری نمائندے؟ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس جہاز میں کوئی اخبار والا بھی ہے۔ تم نے پہچانا مجھے؟''

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ ذہن میں ان گنت چہروں کے نقوش تھے اور یہ چہرہ نہ جانے کس سے ملتا جلتا تھا۔ دماغ کا کمپیوٹر جھنجلاہٹ کے باعث صحیح کام نہیں کررہا تھا۔ چھ ساڑھے چھ فٹ قد اور ڈھائی تین سو پونڈ وزن کا یہ شخص بڑے عامیانہ حلیے میں تھا۔ گریز سے بے نیاز پتلون جس کا رنگ گھٹنوں پر سے سیاہ اور باقی مقامات پر سیاہ وسفید کا امتزاج تھا۔ زرد قمیص جس کا کالر بھی گردن کے گرد سیاہ پڑ چکا تھا۔ جوتوں پر غالباً اسی عہد میں پالش ہوئی تھی جب انہیں بنایا گیا تھا۔ بکھرتے ہوئے بال، بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں کے حلقے اس کی صورت کے کرخت نقوش کی بدصورتی میں اضافہ کررہے تھے۔ اس حلیے کا کوئی شخص میرا دوست نہیں ہوسکتا تھا۔

''میں جوزف ہوں، جوزف کلارک...... یاد آیا؟''

وہ بولا۔

یک لخت مجھے محسوس ہوا کہ چاروں جیٹ انجن فیل ہوگئے ہیں لیکن باقی مسافر مطمئن بیٹھے تھے کیونکہ درا صل ایک لمحے کے لیے میری حرکت قلب بندی ہوگئی تھی۔ جہاز کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ دل نے دوبارہ دھڑکنا شروع کیا تو گزشتہ چھ سال کے واقعات کی فلم ذہن کے پردے پر سے چند منٹ میں گزر گئی۔ پانچ چھ سال پہلے جوزف نے سات سال کے ایک بچے کو اغوا کیا تھا جو لکھ پتی والدین کا اکلوتا بیٹا تھا چنانچہ مطالبے پر انہوں نے ڈھائی لاکھ ڈالرز خاموشی سے ادا کردیے تھے مگر جوزف نے رقم وصول کرنے کے بعد بچے کو قتل کردیا تھا اور غائب ہوگیا تھا۔ اس سانحے پر بڑا کہرام مچا تھا۔ اخبارات ہاتھ دھو کر پولیس اور سراغ رساں اداروں کے پیچھے پڑ گئے۔ پارلیمنٹ میں طوفان آگیا اور وزیر داخلہ کی کرسی اور عزت ہی نہیں، برسراقتدار حکومت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی تھیں۔ اغوا کرکے تاوان کی رقم ملنے تک دھمکیاں تو سب ہی مجرم دیتے ہیں مگر مطالبہ پورا ہوجانے کے بعد ایک معصوم بچے کو کسی جواز کے بغیر ہلاک کردینے والے بے ضمیر اور سفاک مجرم بہت کم ہوتے ہیں چنانچہ نفرت اور غصے کا پھیلنا ایک فطری امر تھا اور پولیس کے ساتھ پبلک بھی جوزف کی تلاش میں لگ گئی جس کی تصویر رسائل و اخبارات، ٹیلی وژن، اور پوسٹروں میں ہر جگہ دکھائی جارہی تھی۔ جوزف بالآخر پکڑا گیا اور اس پر سزائے موت کے شدید مطالبے کے ساتھ مقدمہ چلا مگر قانونی پیچیدگی اور وکیل صفائی کی موشگافی کے باعث بنیادی گواہ منحرف قرار دے دیا گیا اور استغاثہ کی کمزور شہادتوں کے نتیجے میں جوزف صاف بچ گیا۔ یہ قانون کی بے بسی کے ان متعدد واقعات میں سے ایک واقعہ تھا، جب شبہے کی ایک فیصد گنجائش نہ ہونے کے باوجود جرم ثابت نہیں ہوتا اور سزا دینے والے بے بسی میں پیچ وتاب کھاتے رہ جاتے ہیں۔ سرکاری وکیل نے عدالت کے باہر چیخ چیخ کر کہا تھا کہ جوزف، کسی روز میں تمہیں گھسیٹ کر موت کی کرسی تک نہ لے گیا تو تمہیں یا خود کو شوٹ کردوں گا۔ جوزف نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور غائب ہوگیا۔ ان گنت لوگ جو اس کی جان کے دشمن تھے جھک مارتے رہ گئے۔ ان حالات میں جوزف کے تعارف سے مجھ پر سکتہ طاری ہوجانا قدرتی بات تھی۔

میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا اور قاتل یا مقتول بننے سے بچ گیا۔ ''تم؟'' میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں۔'' وہ میری حالت دیکھ کر مسکرایا۔ ''میں بھی سان فرانسسکو ہی جارہا ہوں۔''

''تمہیں معلوم ہے سان فرانسسکو میں تمہارا حشر کیا ہوگا۔'' میں نے جرأت...... خوف اور صدمے کے ابتدائی اثرات سے سنبھل کر کہا...... ''تم یہ سمجھ رہے ہو کہ پانچ چھ سال بعد کوئی تمہیں نہیں پہچانے گا یا لوگ بھول چکے ہوں گے......''

اس نے ایک بار پھر میرے شانے پر ہاتھ مارا جس سے میرے بدن کی کل دو سو بیالیس ہڈیاں ہل گئیں۔ اس کے گڑگڑاہٹ جیسے قہقہے پر بہت سے لوگوں نے سر گھما کر دیکھا مگر جوزف پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں رپورٹر...... لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بقائمی ہوش وحواس کہہ رہا ہوں۔ پولیس اور قانون کی ایسی تیسی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ مجھ سے زیادہ تو تمہاری حالت غیر ہورہی ہے۔ حالانکہ میں نے یہ بات تمہیں اس لیے بتائی ہے کہ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔ تمہارے سوا یہ کام کوئی نہیں کرسکتا۔''

''میں......؟ میں کیوں کروں گا تمہارا کوئی کام......'' میں نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہارا تو باپ بھی کرے گا۔'' وہ بولا۔ ''میں اس کا معاوضہ دوں گا حالانکہ فائدہ اس کام سے تمہیں بھی کم نہیں

ہوگا۔" ایک جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے پچاس ڈالر کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور واپس رکھ لی۔ پھر دوسری جیب سے سو سو ڈالرز کے نوٹ نکالے اور گڈی کو کسی اندازے کے بغیر درمیان سے موڑ کر آدھے نوٹ میری طرف بڑھائے جو تقریباً پانچ ہزار ڈالرز کی رقم تھی۔ نوٹ پرانے اور اصلی تھے مگر میں نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔

"لے لو اور میری بات سن لو ورنہ ایک جھانپڑ مار کر دماغ درست کردوں گا۔" اس نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔

جھانپڑ کے نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے نوٹ جیب میں ڈال لیے۔ مجرم قانون کی گرفت میں تھا اور یہ رقم میں کسی بھی وقت واپس کرسکتا تھا۔ لیکن جبڑا ٹوٹ جاتا تو کوئی میرے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ سوائے مجھ پر ہنسنے کے۔

"یہ بیعانہ ہے۔" وہ آنکھ مار کے مسکرایا۔ "بعد میں اتنا دوں گا کہ چاہو تو اپنا اخبار نکال لینا۔ ہر رپورٹر ایڈیٹر بننے کا خواب دیکھتا ہے۔ کام صرف یہ ہے کہ تم بطور گواہ میرے ساتھ رہو۔ میں نے اپنے دوستوں کو تو اطلاع دے دی ہے اور وہ سب میرے استقبال کے لیے یقیناً موجود ہوں گے مگر ایک اخباری نمائندہ بھی تو ہونا چاہیے جو دیکھ لے کہ جوزف دی گریٹ کس شان سے اور کتنی بے خوفی کے ساتھ واپس آیا ہے۔ چوری چھپے نہیں علی الاعلان وہ ڈھائی لاکھ ڈالرز یہیں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھی میں تمہارے سامنے وصول کروں گا۔ پولیس اور قانون کے محافظوں کی نظروں کے سامنے...... اور یہ سب کچھ تم ابتدا سے انتہا تک اپنے اخبار میں چھاپ دینا۔ اب بتاؤ یہ زبردست کہانی ہے یا نہیں؟ تمہارا اسٹیج بن جائے گا۔ میں کسی اور اخبار والے کو فون کردیتا تو وہ مجھے ایک لاکھ ڈالرز دے دیتا۔ پچاس ہزار تو کہیں نہیں گئے۔ مجھے دیکھو، الٹا تمہیں دے رہا ہوں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں نشے میں ہوں یا میرا دماغ چل گیا ہے۔"

میں بھونچکا بیٹھا رہا کیونکہ اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ یہ کہانی نہیں ایٹم بم کے دھماکے جیسی خبر تھی اور مجھے اس کے جملہ حقوق دُہرے معاوضے کے ساتھ مل رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرا اپنا اخبار بھی مجھے پچاس ہزار ڈالرز ہاتھ باندھ کر دے دے گا۔ ورنہ صرف اتنی دھمکی بہت ہوگی کہ یہ رہا میرا استعفا اور میں اب فلاں اخبار میں جارہا ہوں جو اس سے دگنے بھی دے سکتے ہیں۔ اپنے ذاتی اخبار کی ملکیت کا خواب یکلخت حقیقت کے روپ میں ڈھلنے لگا تھا چنانچہ میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ خوف کی جگہ اضطراب نے لے لی اور حیرت پر تجسس غالب آگیا۔

"تمہارے یہ ڈھائی لاکھ ڈالرز ہیں کہاں......؟" میں نے کہا۔

"میرے ساتھ ساتھ رہو......" وہ ہنسا۔ "تمہیں سب معلوم ہوجائے گا۔ برسوں سے میں اسی دن کے انتظار میں تھا اور میں نے اپنے کیلنڈر میں اس تاریخ کو نوٹ کر رکھا تھا۔ جب دن ڈھلتا تھا اور رات آتی تھی تو میں سوچتا تھا اور رات کو کسی وقت تاریخ بدل جاتی تھی اور میری آنکھ نئے دن کے ساتھ کھلتی تھی۔ جیسے جیسے یہ تاریخ قریب آتی گئی میرے صبر کی آزمائش سخت سے سخت تر ہوتی گئی لیکن میں مجبور تھا اگر میں صرف ایک دن پہلے بھی آگیا ہوتا تو قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا تھا لیکن آج میرے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے کیونکہ اس مخصوص دن نے مجھے ڈھائی لاکھ ڈالرز کی اس دولت کا مالک بنا دیا ہے جو میں نے چھ سال پہلے کمائی تھی۔ اب تک یہ دولت میری تھی مگر میں اس کا مالک نہیں تھا۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک دن کے فرق سے اس کے جرم کی سنگینی اچانک ختم کیسے ہوسکتی ہے اور اگر کل تک وہ ڈھائی لاکھ ڈالرز کی ملکیت سے محروم تھا تو آج اچانک یہ دولت اس کی کیسے ہوگئی؟ یقیناً اس میں کوئی قانونی چکر تھا نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ قانون اتنا اندھا گونگا اور اپاہج نہیں ہے کہ ایک بے ضمیر مجرم اس کے سامنے کھڑا ہوکر اس کا مذاق اڑاتا رہے۔ وہ دولت انسانیت کے نام پر بدنما داغ تھی...... ایک بے گناہ معصوم لہو کا داغ۔ مگر وہ مکمل تحفظ کے احساس اور اعتماد کے ساتھ ان سب کو کھلا چیلنج دینے آگیا تھا جواب تک اپنے ضمیر کی عدالت میں شرمندہ کھڑے تھے کہ اپنے نظامِ انصاف کی کوتاہیوں کے باعث وہ اصل مجرم کو سزا نہ دے سکے۔ مجھے امید تھی کہ شاید اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ نکل جائے۔ وہ شیخی میں کوئی ایسی شہادت بیان کردے جو مقدمے کے دوران سامنے نہیں آئی تھی۔ کسی گواہ کا ذکر کردے جو اب تک پس پردہ رہا تھا پھر جہاز سے اترتے ہی میں اس کی رقم اس کے منہ پر ماردوں گا کہ دنیا بھر کی دولت اس خون کے ایک قطرے کا بھی قصاص نہیں ہوسکتی جس سے اس کا دامن آلودہ ہے اور قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اسے قانون کے حوالے کردوں گا۔

"تم کیسے احمق رپورٹر ہو......" وہ مذاق اڑاتے

ہوئے بولا۔ ”ہفتہ بھر سے میں رچی کے معمولات کی نگرانی کر رہا تھا اور موقع کی تاک میں تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ہر جمعرات کی شام کو وہ اس موسیقارِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے جو خود گدھے سے زیادہ بے سرا گاتا ہے۔ وہ تھا بھی بالکل گھامڑ ٹائپ۔ بالکل کاٹھ کا الو...... میں نے سوچا یہی جگہ بہتر رہے گی۔ جمعرات کو میں اس پیانو ماسٹر کے گھر پہنچا۔ پیانو تو ذرا بھاری تھا میں نے ایک وائلن اس کے طبلے جیسے سر پر مارا تو وہ حلق سے ایک سُر بلند کیے بغیر لیٹ گیا۔ پھر وہ بچہ آگیا۔ ایک تھپڑ کھا کر وہ چپ ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھے، حلق میں کپڑا ٹھونسا اور گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔ یہ تو تم نے بھی سنا ہوگا کیونکہ ہوش میں آتے ہی وہ موسیقار کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگا تھا اور اس نے فوراً سب کو بتا دیا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ کوئی عام قسم کا بچہ نہیں تھا۔ یہ جو گلیوں میں کتے کے پلّوں کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں...... وہ بے حد قیمتی بچہ تھا۔“ جوزف مکروہ انداز میں ہنسا۔

خون میری رگوں میں تیزاب کی طرح سنسنانے لگا۔ اگر میں بزدل نہ ہوتا تو وہیں اس شیطان کو قتل کر دیتا مگر میں عقل اور مصلحت کے تقاضوں میں الجھ گیا۔ ”جوزف......“ میں نے کہا۔ ”رقم مل چکی تھی مگر اس کے باوجود تم نے اس بچے کو قتل کر دیا...... آخر کیوں؟ کیا ضرورت تھی اس خون ریزی کی......؟“

”وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ذہین تھا۔“ وہ سوچ کر بولا۔ ”وہ مجھے شناخت کر لیتا۔“

”شناخت تو تمہیں اس پیانو ماسٹر نے بھی کر لیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر تمہارے ساتھ چند اجنبی دائیں بائیں کھڑے کیے گئے تو بات بگڑ گئی۔ اس پیانو ماسٹر نے کسی اور کی طرف انگلی اٹھا دی۔ مجھے ہی نہیں سب کو یقین تھا کہ پیانو ماسٹر نے عمداً ایسا کیا ہے۔ وہ خوفزدہ تھا اور واحد عینی گواہ کو منحرف قرار دے دیا گیا تو تم بالکل صاف بچ گئے......“

”اس پیانو ماسٹر کی جگہ تم ہوتے مسٹر رپورٹر، تو تم بھی یہی کرتے۔“ وہ بولا۔ ”سمجھانے والے نے اسے سمجھا دیا کہ دوبارہ شناخت کی غلطی کی تو خود اس کی لاش کی شناخت بھی نہیں ہو سکے گی۔“

”سمجھانے والے تمہارے گروہ کے لوگ تھے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں! اور میں اس گروہ کا سرغنہ اس لیے تھا کہ ان سب سے زیادہ سمجھ دار تھا۔“ جوزف نے کہا۔ ”یہ قانون کے ماہر بنتے ہیں۔ میں ان سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ جیسے چور نقب لگانے سے پہلے جائے واردات کا جائزہ لے کر سمجھ لیتا ہے کہ حفاظتی نظام میں کمزوری کہاں ہے ایسے ہی قانون شکنی سے پہلے قانون کی کمزوریوں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے مسٹر رپورٹر...... اور میں سمجھتا ہوں کہ قانون کی کمزوری میری وہ طاقت ہے جس کے سہارے پر میں اب بے خوف و خطر لوٹ آیا ہوں۔“

مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس کمزوری کا حوالہ دے رہا ہے۔ ہر جرم، ہر قانونی کارروائی کے لیے میعاد مقرر ہے۔ کوئی شخص مہینوں بعد عدالت میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص نے مجھے گینڈا کہا تھا چنانچہ ہتک عزت اور ہرجانے کا دعویٰ آج تسلیم کیا جائے کیونکہ گینڈا میں نے آج دیکھا ہے اور بے عزتی کا احساس مجھے آج ہوا ہے۔ ہر واردات کی فوری رپورٹ ضروری ہے ورنہ ایک خاص میعاد کے بعد قانونی کارروائی غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔

”تمہاری یہ دولت اب تک کہاں تھی؟“ میں نے کہا۔ ”کسی بینک میں تو جمع نہیں کرائی تھی تم نے......؟“

وہ ہنسا...... ”اگر ایک نوٹ بھی اِدھر اُدھر ہو جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ رقم کہاں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں جانتا تھا وہ نمبروں کی لسٹ لیے شکاری کتوں کی طرح نوٹوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔“

”چنانچہ تم نے کسی فرضی نام سے کسی بینک کے لاکر میں ڈھائی لاکھ ڈالرز جمع کرا دیے......“ میں نے قیاس آرائی کی۔

اس نے وہی خوفناک قہقہہ بلند کیا اور پھر اپنا ہاتھ میرے شانے پر مارا۔ ”تم اتنے بے وقوف بھی نہیں ہو جتنے نظر آتے ہو۔“

”ہاں!“ میں نے کندھے کو ہلا کر تمام ہڈیوں کی سلامتی کا یقین کیا۔ جوڑ غالباً ہل گئے تھے۔ ”اب تم کس امید پر لوٹے ہو؟ قانون کی کسی کمزوری کا ذکر کیا تھا تم نے...... کیا اب وقت اتنا گزر گیا ہے کہ تم پر مقدمہ دوبارہ نہیں چل سکتا؟“

”مقدمہ کیسا......؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”میں نے چوری نہیں کی ڈاکا نہیں ڈالا۔ ایک شخص نے اپنی مرضی سے یہ رقم مجھے دی تھی۔ اس کے بچے کو اغوا اور قتل کرنے کے الزام سے تو عدالت مجھے پہلے ہی بری کر چکی ہے۔“

”پھر تم اس ایک تاریخ کا انتظار کیوں کر رہے تھے؟“ میں نے کہا۔

”اس لیے کہ چھ سال پورے ہونے سے پہلے میں یہ

رقم نکالتا تو انکم ٹیکس والے مجھے پکڑ لیتے ......'' وہ حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ ''وہ فرماتے مسٹر جوزف! پچھلے سال تمہاری آمدنی یہ تھی، اب اس سال کی آمدنی کا ذریعہ بتاؤ۔ مگر چھ سال بعد قانون غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ چھ سال پہلے کی آمدنی پر نہ انکم ٹیکس لگایا جا سکتا ہے نہ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ رقم کہاں سے آئی۔ پولیس ہر نوٹ کا نمبر دیکھ لے گی۔ یہ وہی نوٹ ہیں جو چھ سال پہلے رچی کے باپ میلوف نے مجھے دیے تھے لیکن آج پورے چھ سال بعد کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس میں سے ایک پیسا بھی نہیں لے سکتا......''

شیطان کے سامنے انسان کتنا کمزور اور بے بس ہے، سفر کے ان آٹھ گھنٹوں میں یہ بات ثابت ہوگئی۔ دوپہر کے ایک بجے جہاز سان فرانسسکو ائرپورٹ پر اترا۔ میں جوزف سے ایک قدم پیچھے رہ کر مسافروں کی قطار میں ہوائی اڈے کی عمارت تک پہنچا۔ جوزف کے کارندے میرے جانے پہچانے تھے لیکن وہاں ان میں سے کوئی اپنے چیف کو جلاوطنی کے چھ سال بعد خوش آمدید کہنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ ''کوئی کمینہ نہیں آیا ......سب سالے بزدل ہیں......'' جوزف نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کر برہمی سے کہا۔ ''خیر، اب میں آگیا ہوں۔ ہر نمک حرام سے نمٹ لوں گا۔''

اسی وقت کیلی نمودار ہوا جو ایک اور گروہ کا سرغنہ تھا۔ کیلی اور جوزف کی دوستی مشہور تھی اور ان کی متحدہ قوت کے سامنے چھوٹے موٹے بدمعاشوں کی دال نہیں گلتی تھی...... دبلا پتلا شریف صورت اور معزز نظر آنے والا شخص کیلی جو کسی بدمعاش کے بجائے پروفیسر لگتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے کسی نے اس کی موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ وہ شانِ بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ٹہلتا ہوا قریب آیا۔ ''ہیلو جوزف......'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیلی ......میں نے سب کو اطلاع دے دی تھی......'' جوزف نے خفگی سے کہا۔ ''کہاں مر گئے ہیں سب لوگ......؟''

''انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔'' کیلی نے کہا۔ ''یہ پوچھنے کے لیے کہ اس حماقت کا مقصد کیا ہے؟''

''میں وہ پیسا لینے آیا ہوں جو اب قانونی طور پر میرا ہے۔'' جوزف مزید مشتعل ہوگیا۔ ''کون اسے حماقت کہہ سکتا ہے......؟''

''یہ حماقت ہی ہے۔'' کیلی نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری عدم موجودگی میں تحقیق و تفتیش جاری تھی۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہارے دشمن اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ سرکاری وکیل......''

''ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں اس وکیل کی اولاد کو بلا کر کہتا ہوں کہ میں واپس آگیا ہوں اور دیکھتا ہوں وہ کیا تیر مارتا ہے۔'' جوزف نے چیخ کر کہا...... ''میں اس سے بینک میں ملاقات کروں گا......''

''جوزف......'' کیلی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''تم قانون سے کھیلنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک بار پھر سوچ لو۔''

''سوچنے کے لیے میں نے ایک بہت بڑے وکیل کو ٹوکیو سے بلوایا تھا۔'' جوزف نے کہا۔ ''سوچنا میرا کام نہیں ہے۔ اس وکیل نے بہت سوچ بچار کے بعد مجھ سے کہا تھا، جاؤ سرکاری وکیل کا باپ بھی تم پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ معلوم ہے یہ کون آیا ہے میرے ساتھ...... ایک رپورٹر...... اسے میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' اس نے بڑے فخر سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''آجاؤ مسٹر رپورٹر، اُد وکیل صفاکی سے کہو آدھے گھنٹے بعد تھرڈ نیشنل بینک میں آجائے اور چاہے تو پولیس کو بھی لیتا آئے۔''

میں بڑی عجلت میں رخصت ہوا اور ایک ٹیلی فون بوتھ میں گھس گیا جہاں سے مجھے جوزف اور کیلی ایک گوشے میں سب سے الگ ہونے کے باوجود صاف نظر آرہے تھے۔ کیلی غالباً جوزف کو اس بہادری کے مظاہرے سے باز رکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا مگر جوزف قائل ہونے کے بجائے مشتعل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ فرار ہونے کا ہرگز نہیں تھا۔

میں نے اپنے اخبار کا نمبر ملا کر کم سے کم الفاظ میں ایڈیٹر کو ساری بات بتائی جواب میں کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایسی آواز آئی جیسے کرسی گری ہو۔ ''اوہ!'' میں نے سر پکڑ کے سوچا۔ نہ جانے یہ صدمے کا اثر ہے یا ہارٹ اٹیک......

''ہیلو...... ہیلو......'' میں نے کہا۔ ''تم ...... تم ٹھیک ہو نا؟ سن رہے ہو میری بات؟ یہ دھما کا کیسا تھا؟''

''ہاں...... ہاں......'' ایڈیٹر نے کہا۔ ''میں نے وِلیم کی ایک گولی کھائی تھی دراز سے نکال کے...... بات سنو! تم نے جہاز پر کتنی پی تھی؟ بے شک اخراجات ہم ادا کریں گے مگر فون پر ایسی گفتگو...... پچاس ہزار......''

میں نے بڑی مشکل سے اسے دونوں نکات پر قائل کیا یعنی یہ کہ میں کسی نشے کے زیرِ اثر نہیں ہوں اور پاگل بھی نہیں ہوا ہوں۔ ''یہ دھما کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ تم پچاس ہزار ڈالرز کا انتظام کرو اور فوٹو گرافر

کو اسی وقت روانہ کر دو...... نیجر شام تک مکمل ہو جائے گا اور اگر تم نے حسب عادت چون و چرا کی تو......''

''بس بس...... دھمکی کی ضرورت نہیں بلیک میلر......''

اس نے فون بند کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ باقی کام وہ خود کر لے گا۔ یعنی سرکاری وکیل اور پولیس وغیرہ کو مطلع کرنا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ جوزف نہ کھسک جائے یا کیلی اسے غائب ہونے پر مجبور نہ کر دے۔ میں نے جوزف کو بتایا کہ استقبالیہ کمیٹی تھرڈ نیشنل بینک میں موجود ہوگی اور اس میں ایک فوٹو گرافر بھی ہوگا۔

اگر کیلی کی کار میں میری نشست پیچھے نہ ہوتی تو شاباشی کے بہانے ایک اور دھپ میرے شانے پر پڑتا۔

''بہت خوب! مسٹر رپورٹر...... میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ بدمعاش بھی قانون اور آئین کی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ تمہیں مشاہدہ کرنا ہے کہ میں ہر مرحلہ کیسے طے کرتا ہوں۔ پبلسٹی کے لیے میں نے معاوضہ اس لیے ادا کیا ہے کہ تم میرے نقطۂ نظر سے اس معاملے کو پبلک کے سامنے پیش کرو ورنہ خبر تو ہر صورت میں آ ہی جاتی ہے اخبار میں۔ تم بتاؤ گے کہ میری تمہاری ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوئی۔ پھر میری اور تمہاری گفتگو کا ذکر ہوگا اور تم یہ بات خاص طور پر بیان کرو گے کہ اگر ایک دن پہلے یعنی میں کل آجاتا تو کیا ہوتا جو آج نہیں ہو سکتا۔ اپنے فوٹو گرافر کو ہدایات دے دینا کہ وہ ہر موقع کی تصویر اتار لے۔ میرے آنے کی۔ رقم نکالنے کی وکیل سے ہاتھ ملانے کی اور پھر بخیر و عافیت رخصت ہونے کی۔ چھ سال تک میں جلاوطن رہا اور اتنی دولت ہونے کے باوجود اس سے حاصل ہونے والی عیش و عشرت کی زندگی سے محرومی کا عذاب برداشت کرتا رہا۔ اب میں ان سب کی بے بسی کا تماشا دیکھ کر زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ جو قانون میں بال کی کھال نکالتے ہیں پھر وہ مجرموں کی کھال کھینچ لیتے ہیں اور اس کھال میں بھس بھر دیتے ہیں۔'' وہ جس اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قانون اس کے معاملے میں واقعی بے بس ہو چکا ہے اور اس کا اعتماد غلط ثابت ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ خود اس کے کہنے کے مطابق نیویارک سے ایک بہت بڑا وکیل ٹوکیو گیا تھا اور اس نے بال کی کھال نکال کر جوزف کو قانون کا وہ باریک نکتہ سمجھا دیا تھا جس پر تکیہ کر کے وہ چوری چھپے آنے کے بجائے ڈنکے کی چوٹ پر آیا تھا۔ اس کی فتح یقینی نظر آتی تھی۔

تھرڈ نیشنل بینک سے کچھ دور کیلی نے ہمیں کار سے اتار دیا اور ہم تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کر کے بینک میں داخل ہوئے۔ بینک میں کاروبار معمول کے مطابق جاری تھا۔ پولیس، سرکاری وکیل اور پریس فوٹو گرافر وغیرہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مسلح محافظ ایک عورت کی مدد کر رہا تھا جس کے بیگ سے مٹھی بھر سکے فرش پر گر کر بکھر گئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بینک کا عملہ لین دین میں مصروف تھا اور پیچھے شیشے کے کیبن میں منیجر کسی سے فون پر باتیں کرتا نظر آ رہا تھا......

''کدھر ہیں سب...... تمہارا فوٹو گرافر اور سرکاری وکیل وغیرہ؟'' جوزف نے مایوسی سے کہا۔

''میرا خیال ہے، ہم بہت جلدی پہنچ گئے ہیں۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔

''اچھا تم یہاں انتظار کرو، میں آتا ہوں۔'' وہ آگے بڑھا اسٹیل کے مضبوط اور مقفل دروازے پر رک کر اس نے محافظ سے کچھ کہا۔ ایک کارڈ پر دستخط کیے اور جیب سے چابی نکالی' چند سنٹ بعد اسے ویسی ہی دوسری چابی مل گئی اور دروازہ کھل کر بند ہو گیا۔ جوزف تہ خانے میں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے خود کو اس خطرناک ڈرامے کا قطعی غیر ضروری کردار محسوس کیا جس سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ خاموش تماشائی کی حیثیت سے تماشا دیکھتے رہنے کے سوا جس کا کوئی کام نہ تھا۔ میں حیران اور مضطرب سا ڈراپ سین کا منتظر کھڑا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ ڈراما جلد از جلد ختم ہو جائے کیونکہ میرے ضمیر کے اندر ایک خلش سی تھی کہ رپورٹر کے بجائے میں نے... ایک فرض شناس باضمیر شہری کا کردار کیوں قبول نہیں کیا۔ اچانک مجھے اپنے اخبار کا فوٹو گرافر اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سرکاری وکیل بھی تھا جو خاصی الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔

''یہ...... یہ مذاق تو نہیں ہے مسٹر......؟'' سرکاری وکیل نے میرے قریب آ کر کہا۔ ''کہاں ہے جوزف؟''

''لاکر روم میں گیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آتا ہی ہوگا۔''

فوٹو گرافر نے اپنا کیمرا فوکس کیا ہی تھا کہ جوزف تہ خانے سے نمودار ہوا۔ فلیش کی چمک پیدا ہوئی اور فتح و مسرت کی مظہر مسکراہٹ کے ساتھ ڈھائی لاکھ ڈالرز کا خوش گوار بوجھ اٹھا کر نکلنے والے جوزف کا عکس فلم پر محفوظ ہو گیا۔ دولت کا یہ بوجھ ایک صندوق کی صورت میں تھا جسے جوزف نے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے بینک کی چابی واپس کی اور اپنی چابی جیب میں ڈال کر آگے آ گیا۔

''ہیلو......'' وہ بیک وقت سب سے مخاطب ہو کر

بولا۔ ''آگئے تم سب لوگ؟ نہ آتے تو مجھے سخت مایوسی ہوتی۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھو یہ وہی رقم ہے یا نہیں جو میں نے چھ سال پہلے وصول کی تھی؟ نمبر تو نوٹ کیے تھے نا تم نے؟ ملا کر دیکھ لو، یہ نوٹ وہی ہیں......'' اس نے صندوقچی کھول دی فوٹو گرافر نے دوسری تصویر اتاری پھر تیسری پھر چوتھی، وہ ہر زاویے سے جوزف کی، وکیل ...... کی اور نوٹوں سے بھرے ہوئے صندوق کی تصویریں بنائے جا رہا تھا کہ ہر لمحے کو کیمرے میں قید کرلے اور پبلک کے سامنے یہ ڈرامائی منظر اسی طرح پیش کرسکے جس طرح وہ خود دیکھ رہا ہے۔

جوزف نے قہقہہ مارا۔ ''تم پر تو بجلی گر پڑی ہے دوست۔'' اس نے سرکاری وکیل کے کندھے پر دھپ مارنے کی کوشش کی مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ''میرا مشورہ مانو تو اس قانون میں ترمیم کرالو۔ میرے پاس اگر کوئی ریوالور ہوا اور چھ سال بعد مجھے بعد میں پتا چلے کہ یہ تو فائر ہی نہیں کرتا پھر میں اسے رکھ کر کیا کروں گا؟ ایسے قانون کو گڑھے میں ڈال دو جو ضرورت کے وقت تمہارے کام نہ آسکے۔'' سرکاری وکیل کے پیچھے ایف بی آئی کے سراغ رساں مستعد اور حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔ دروازے پر اور اس سے باہر مسلح پولیس کی پوری جمعیت موجود تھی۔

''جوزف۔'' سرکاری وکیل نے کہا۔ ''مجھے یقین آنے لگا تھا کہ بالآخر مجھے خود کو ہی گولی مارنی پڑے گی۔''

''بزرگوں نے اسی لیے کہا ہے کہ پہلے تولو اور پھر بولو......'' جوزف نے ہنس کر کہا۔ ''تم نے خوامخواہ ایک بات کہہ دی تھی مگر اب بھی تم زندہ رہنا چاہو تو اپنی بات سے پھر سکتے ہو۔ جذبات کی رو میں بہہ کر آدمی بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ قانونا اور اخلاقاً تم اپنے کہے پر عمل کرنے کے پابند نہیں ہو......''

سرکاری وکیل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہ میں نے سوچے سمجھے بغیر بات کی تھی اور نہ میرا ارادہ اپنی بات سے پھرنے کا ہے۔ دراصل مجھے قدرت کے نظام انصاف پر جو بھروسا پہلے تھا، وہ آج بھی ہے۔ تم اقرار کرتے ہو کہ یہ وہی رقم ہے جو میلوف نے تمہیں دی تھی...... ربجی کے باپ نے؟''

''ہاں...... ملا کے دیکھ لو۔ میں غلط بیانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔'' جوزف نے سینہ تان کر کہا۔

''تم نے ٹیکس کے ریکارڈ پر کس سال کی آمدنی کے گوشوارے میں یہ رقم دکھائی ہے؟'' سرکاری وکیل بولا۔

جوزف نے فلک شگاف نعرہ مارا جس نے بینک کے اندر موجود سب لوگوں کو چونکا دیا جو اب تک احمقوں کی طرح منہ کھولے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور کچھ سمجھ نہ پانے کے خوف اور تجسس کا شکار تھے۔

''مائی ڈیئر وکیل سرکار......'' جوزف نے کہا۔ ''چھ سال پہلے کی آمدنی کے بارے میں قانوناً میں کچھ بتانے کا پابند نہیں......''

سرکاری وکیل غالباً یہ نکتہ پہلے سے سمجھتا تھا کیونکہ اس بات سے وہ حیران یا ہراساں نہیں ہوا۔ وہ اسی نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی خون آشام نظروں سے جوزف کو دیکھتا رہا۔ ''چھ سال، اس بات کو چھ سال ہوگئے ہیں؟''

''یس سر آج پندرہ تاریخ ہے۔'' جوزف نے کہا۔ ''آج اس بات کو چھ سال بیت چکے ہیں۔''

سرکاری وکیل نے چٹکی بجا کے اپنے پیچھے صف بستہ سراغ رسانوں اور ایجنٹوں کو اشارہ کیا۔ ''اسے گرفتار کرکے ذرا ہتھکڑی ڈال دو۔'' بیک وقت تین افراد آگے بڑھے۔ تین اپنی جگہ ریوالور تانے کھڑے رہے۔

''یہ...... یہ کیا بکواس ہے؟'' جوزف نے چیخ کر کہا۔ ''میں تم سب سے نمٹ لوں گا۔ تم قانون کے خلاف ایک شخص کو گرفتار کر رہے ہو۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنے دفاع کا انتظام کرکے نہیں آیا تھا۔ میرے درجن بھر وکیل تم پر حبسِ بے جا کا مقدمہ قائم کرنے کے منتظر کھڑے ہیں۔''

لیکن اس چیخ و پکار کا نوٹس لیے بغیر جوزف کو بے قابو کرکے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔ سرکاری وکیل قطعی بے تعلقی کے ساتھ اپنے احکامات کی تعمیل ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر وہ طمانیت تھی جو برسوں پرانے دشمن سے انتقام کی آرزو پوری ہونے پر پیدا ہوتی ہے۔

''تم ایک بات بھول گئے تھے جوزف......'' سرکاری وکیل نے کہا۔ ''جب کوئی مشرق یا مغرب کی سمت سفر کرتا ہے تو وقت کو آگے یا پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی جگہ وقت کی وہ دیوار آجاتی ہے جسے انٹرنیشنل ڈیٹ لائن کہتے ہیں۔ اس دیوار کو آدمی کی نظر نہیں دیکھ سکتی لیکن اس دیوار کے ادھر پندرہ تاریخ آجائے تب بھی ادھر بدستور چودہ تاریخ ہی رہتی ہے۔ جاپان اور لندن کے درمیان فاصلہ صرف مقام ہی کا نہیں۔ وقت کا بھی ہے۔ دونوں کے مقامی وقت میں بارہ گھنٹے کا فرق ہے تم نے مشرق بعید سے مغرب کی طرف سفر کیا تو ڈیٹ لائن عبور کر آئے۔ وقت کی دیوار کے ادھر واقعی پندرہ تاریخ ہوگئی تھی مگر یہاں اب بھی چودہ تاریخ ہے جو رات کے بارہ بجے تبدیل ہوگی۔ چھ سال ابھی کہاں پورے ہوئے ہیں... جوزف؟ پورے نو گھنٹے باقی ہیں ابھی!''

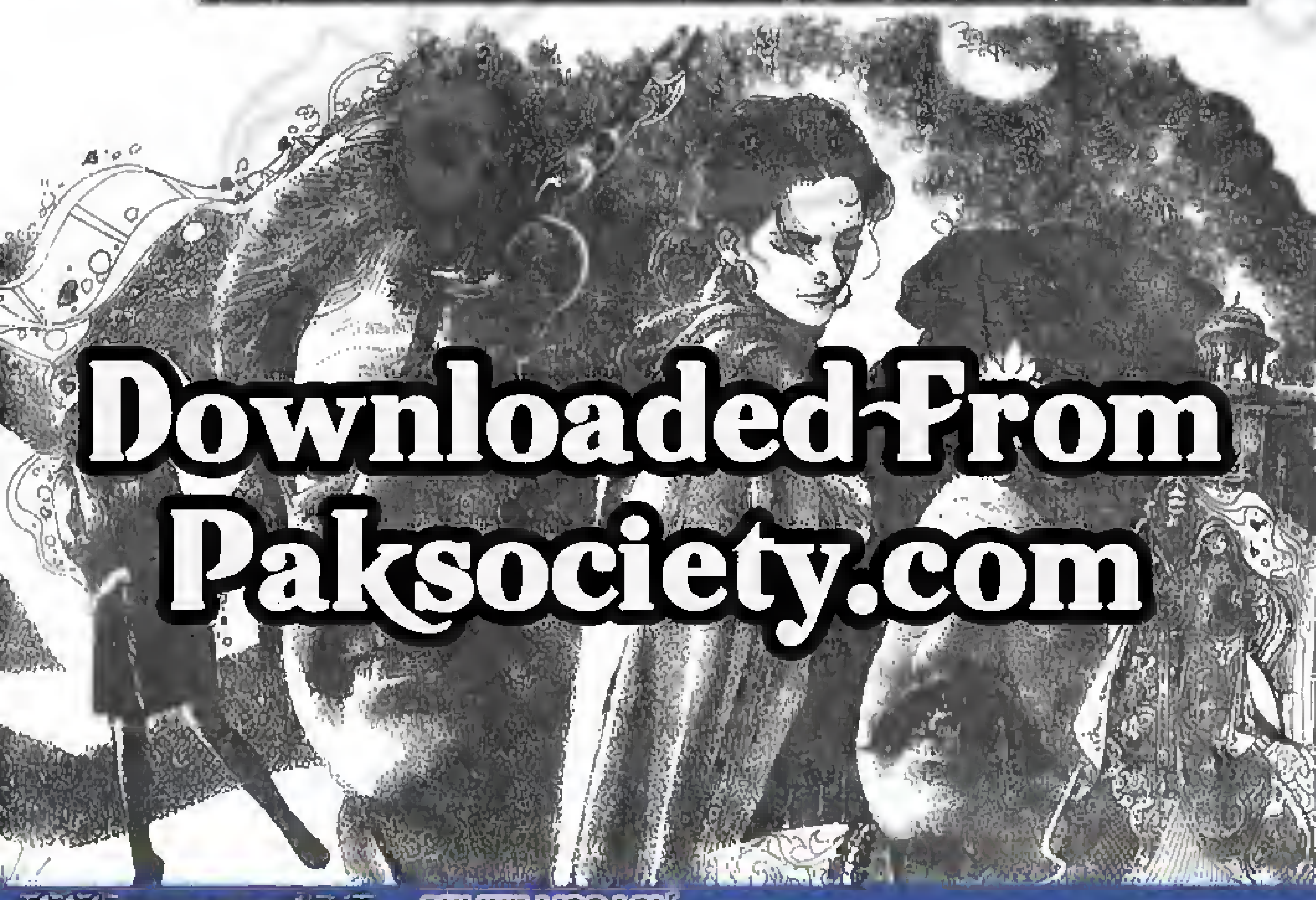
ماروی

محی الدین نواب

بتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی سنگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر اور چاچی بختی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے سیمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا اور چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف بگٹی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گئی تھی تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور داراکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے نہارتا رہتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے راز داری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر نمی من سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر نمی من کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھگانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں سنگی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے سنگی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور سنگی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈرنا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی

جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر ریشہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور ہلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسراقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد، دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے ادھر دشمن مراد کو پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنادی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور جنگی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔ مراد کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا کہ اس کے تابع کئی جنات ہیں جن سے وہ دشمنوں کو زیر کرتا آرہا ہے۔ دشمن اس کا توڑ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ ادھر دشمن تنظیموں نے مراد کو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کا سرپرست بن جائے ورنہ اپنے انجام کے لیے تیار رہے۔ مراد نے جنگی برادن کو فون کیا اور اسے انجام سے خبردار کیا تو وہ مراد سے دشمنی سے باز آگیا اور اس نے مراد کے دس دشمنوں کو ٹھکانے لگادیا۔ ادھر جینی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو حیران کرنا شروع کردیا۔ وہ کروٹ بھی لے رہا تھا اور دودھ کی فیڈر کو ہاتھوں سے پکڑ کر دودھ پیتا تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی بلنگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے دین پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عالی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عالی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عالی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عالی نے ان کو ٹھکانے لگادیا۔ دو اغوا کاروں کو عالی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا۔ مراد اور ہم زاد اس کے لیے پریشان تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ عالی اغوا کاروں کے ساتھ اپنی مرضی سے گیا ہے۔ ادھر یہودی تنظیم فری میسن کے عہدیدار اس کا برین واش کرنے کی تدبیر بھی سوچ رہے تھے۔ عالی وہاں کے دارالسلطنت کس تا ز پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک لڑکی کی آبرو بچائی اور بھاری جرمانے کا مطالبہ کردیا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اس نے کہا کہ وہ اس شخص کو جان سے ماردے گا۔ عالی کو چاروں طرف سے پولیس والوں نے گھیر رکھا تھا۔ تاہم وہ وہاں سے فرار ہوگیا۔ ماتھیو بوز نے جرمانہ ادا کردیا عالی وہاں سے رومانیہ آگیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہ دوئی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کرڈالا تھا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی جو عالی کی طرح عجوبہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بچی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النسا بھی خوش ہوجائے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کرگئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں تین ماہ کی بچی متحرک ہوگئی تھی ادھر یہودی عالی کی ہر بات برداشت کررہے تھے۔ ان کی اپنی حکمت عملی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے اسے تل ابیب لے جارہے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ان کی اپنی پلاننگ تھی۔ اس پلاننگ کے نتیجے میں دو ہی باتیں ہونے والی تھیں۔ یا تو عالی ان کے نفسیاتی طریقہ کار کے مطابق وہاں پہنچتے تک ماں کی طرح یہودی بن جاتا، یا پھر ان کے پیشوائے اعظم کا آخری فیصلہ ہوتا کہ اس سر پھرے مسلمان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

وہ تفریحی میلارات ایک بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس رات پرنس کی آمد کے باعث رونق بڑھ گئی تھی۔ لوگ خاصی تعداد میں آرہے تھے۔ فن فیئر آرگنائزر کا مالی منافع بڑھ رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے صبح تک جاری رکھا تھا۔

پھر اعلان ہوا کہ دروازے بند کیے جارہے ہیں۔ لوگ پرنس کے ساتھ وہاں سے باہر آگئے۔ کئی مرد اور عورتیں، جوان اور بوڑھے پرنس کو عبادت کرتے دیکھ کر متاثر ہوئے تھے۔ عالی نے بڑی خوش الحانی سے پہلے عربی زبان میں تلاوت کی تھی پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ پیش کیا تھا۔

ایک بوڑھے نے کہا۔ ''آنر ایبل پرنس! آپ نے بڑی دیدہ دلیری سے وہ آیت سنائی ہے جو ہم یہودیوں کے مزاج کے خلاف ہے۔''

ایک جوان نے کہا۔ ''آپ اس لیے بے باک ہیں کہ ہمارے یہودی اکابرین نے آپ کو بہت مضبوط سیکیورٹی دی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آپ یہاں سے زندہ نہ جاتے۔''

کسی نے کہا۔ ''ہم ابھی آپ پر حملہ نہیں کرسکتے۔ آپ کی جسمانی قوت سے مرعوب ہیں۔ آپ یہاں سے سیکڑوں افراد کو مار پیٹ کر نکل جائیں گے۔''

کسی نے کہا۔ ''اگر آپ دجال معظم کے نمائندے ہیں تو ہمارے ہوجائیں۔ ورنہ اس شہر سے چلے جائیں۔''

وہ چلتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے بولنے والے اس کی حمایت میں بھی بول رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ ''پرنس! آپ نہیں جائیں گے۔ یہ غصے میں بولنے والے نادان ہیں۔ یہ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ میں ایک ماہر رمال ہوں۔ میں نے علم رمل سے معلوم کیا ہے۔ آپ ابھی جو ہیں، وہ نہیں رہیں گے۔ جو نہیں ہیں، وہ ہوجائیں گے۔ آپ

ہمارے ہیں۔ ہمارے ہو جائیں گے۔"

وہاں اس کی حمایت میں بولنے والے عقیدت مند زیادہ تھے۔ اسے اپنے نجات دہندہ کا نمائندہ مانتے تھے۔ رمال کی باتوں نے ان کی عقیدت مندی کو اور بھڑکا دیا تو کتنے ہی لوگ اس کے آگے جھکنے لگے۔ اس نے فوراً ہی ان سب کو دور ہٹاتے ہوئے ایک لمبی چھلانگ ماری پھر آگے بھی چھلانگیں مارتا ہوا ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے اپنی رہائش گاہ میں پہنچ کر یہ طے کیا کہ اگلے پندرہ بیس گھنٹوں تک اس چار دیواری سے باہر نہیں جائے گا۔ جب مراد پیرس پہنچ جائے گا اور یہ بتائے گا کہ وہاں کی شہریت حاصل کر چکا ہے، تب وہ بھی یہ شہر چھوڑ کر پیرس جائے گا۔ اس نے تمام دروازوں کو اندر سے بند کیا پھر بیڈ پر آ کر آرام سے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ گہری نیند میں تھا۔

☆☆☆

مراد ماسٹر گوبو بو کے ایک کارندے سیمسن کی رہائش گاہ میں تھا۔ وہاں اپنی پلاننگ کے مطابق اسے چہرہ بدلنا تھا۔ اپنی شخصیت تبدیل کرنا تھی پھر اس شخصیت کے مطابق پاسپورٹ وغیرہ بنوا کر پیرس تک جانا تھا۔

دو ہفتے پہلے ماسٹر کا ایک کارندہ اپنے مخالفین سے مقابلہ کرنے کے دوران میں مارا گیا تھا۔ ماسٹر کے تین کارندوں نے مصلحتاً اس کی لاش کو رازداری سے دفن کر دیا تھا۔ دشمنوں سے یہ بات چھپائی تھی کہ ان کی تعداد کم ہو گئی ہے۔

اس کا نام حمد اللہ تھا۔ اسے حماد کہا جاتا تھا۔ اب اس کی صورت، اس کا پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات مراد کے کام آ رہے تھے۔ اسی رات ایک ماہر سرجن کو بھاری رشوت دینے کے بعد اس کا چہرہ تبدیل ہو گیا۔ پھر دوسرے ہی دن شام کی ایک فلائٹ میں اس کے لیے سیٹ کنفرم ہو گئی۔ حماد ایک بہت بڑے صنعت کار کا پرسنل سیکریٹری تھا۔ وہ صنعت کار اپنے غلط دھندے کے باعث ماسٹر گوبو بو کی پناہ میں رہتا تھا۔ ماسٹر اپنے کارندوں کے ذریعے اسے مشکلات سے نکالتا رہتا تھا۔ وہ ماسٹر کا احسان مند رہا کرتا تھا اسی لیے اس نے حماد کو اپنا پرسنل سیکریٹری بنا لیا تھا۔ ماسٹر کے کارندوں نے مراد کو بتایا کہ حماد کا اور کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ بہت زندہ دل تھا اور عیش و عشرت میں دن گزار رہا تھا۔

جس رات مراد کا چہرہ تبدیل ہوا اس کے دوسرے دن حماد کے فون کو آن کر دیا گیا۔ مراد نے حماد کی حیثیت سے اس باس صنعت کار کو فون پر کہا۔ "میں پیرس جا رہا ہوں۔ واپس نہیں آؤں گا۔ آپ کسی اور کو میری جگہ رکھ لیں۔ یہ یاد رکھیں کہ یہودیوں کی طرف سے کال آ سکتی ہے۔ میرے بارے میں انکوائری ہو سکتی ہے۔ ایسے وقت آپ میری ذہانت اور نیک نامی کا قصیدہ پڑھیں گے تاکہ وہ لوگ مجھ پر اعتماد کر سکیں۔"

اس نے فون بند کیا۔ یہ ارادہ کیا کہ شام تک چار دیواری سے باہر نہیں جائے گا۔ کسی دشمن کی نظروں میں نہیں آئے گا۔ سیدھا ائرپورٹ جا کر یہ شہر چھوڑ دے گا۔ اس نے فون پر بیٹے سے کہا۔ "بیٹے...... ! میرا چہرہ، میری شخصیت بدل گئی ہے۔ میرا موجودہ نام حمد اللہ عرف حماد ہے۔ میں کل شام کی فلائٹ سے پیرس جا رہا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "اوکے بابا جانی! میں پرسوں کسی فلائٹ سے وہاں پہنچوں گا۔ جب ہمارے اشتہار کے مطابق آپ انٹرویو دینے آئیں گے، تب ہی آپ کے نئے روپ کو دیکھوں گا۔ اوکے...... ہم پھر ملیں گے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی کسی نے کال کی۔ فون کی ننھی سی اسکرین پر نام لکھا ہوا تھا...... جمائکہ۔

مراد نے سوچا۔ 'یہ کون ہے؟ حماد عیش و عشرت کی زندگی گزارتا تھا۔ کیا یہ اس کی کوئی گرل فرینڈ ہے؟'

رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ وہ تذبذب میں تھا کہ کال اٹینڈ کرے یا ٹال دے؟ کہیں حماد کی بلا اس کے گلے نہ پڑ جائے۔ فون چیختے رہنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس نے سوچا۔ 'چلو اچھا ہے۔ بلا ٹل گئی۔'

وہ فون کو ایک طرف رکھ کر اٹھنے لگا۔ اسی وقت وہ پھر چیخ پڑا۔ اس نے سوچا۔ 'اٹینڈ کرنا چاہیے۔ کوئی چپکنے والی بلا ہوئی تو ہوتی رہے۔ وہ تو شام کو یہ شہر چھوڑ دے گا۔'

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو...... !"

ادھر سے مسرتوں بھری چیخ سنائی دی۔ "تھینکس گاڈ! تمہاری آواز سنائی دے رہی ہے۔ ایک ہفتے سے کال کر رہی ہوں۔ جواب میں یہی سنائی دیتا تھا کہ رابطہ نہیں ہو سکتا۔ پھر کہا گیا کہ فون بند ہو چکا ہے۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟ کیوں فون کا سوئچ آف کر دیا تھا؟"

"میں اسپتال میں تھا۔ کار کے حادثے میں سر پر چوٹ لگی ہے۔ میری یادداشت بہت ہی کمزور ہو گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہیں بھول گیا ہوں۔ فون پر نام پڑھ کر معلوم ہوا کہ تمہارا نام جمائکہ ہے۔"

وہ بولی۔ ”ویری سیڈ۔ یاخدا! تم مجھے بھول گئے ہو۔ مجھے بتاؤ کس اسپتال میں ہو؟ میں ابھی آؤں گی تو مجھے دیکھتے ہی پہچان لوگے۔ تمہاری یادداشت واپس آجائے گی۔“

”میں اسپتال سے گھر آگیا ہوں۔ ڈاکٹر نے کسی سے ملنے اور باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔ میں علاج کے لیے آج شام کی فلائٹ سے پیرس جارہا ہوں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ کیا واقعی پیرس جارہے ہو؟“

”ہاں۔ سیٹ کنفرم ہے۔“

جمائلہ نے خوش ہوکر پوچھا۔ ”کیا آج شام کی فلائٹ سے جارہے ہو؟ پکی بات ہے؟“

”ہاں مگر تم خوش کیوں ہورہی ہو؟“

اس کی خوشی کسی اور وجہ سے تھی۔ وہ بات بدل کر بولی۔ ”کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ وہاں جاؤ گے، علاج کراؤ گے پھر یادداشت واپس آئے گی تو یہاں آکر مجھے پہچان کر گلے سے لگاؤ گے۔“

”ہاں۔ دعا کرو کہ میرا حافظہ درست ہوجائے اور میں فوراً ہی تمہارے پاس چلا آؤں۔“

”علاج کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہے بولو۔ میں دوں گی۔“

”لاکھوں ڈالرز خرچ ہوں گے۔ تم کہاں سے دوگی؟“

وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ”واقعی تمہارا دماغ کمزور ہوگیا ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ سونے چاندی کے محل میں رہتی ہوں۔ پیرس کے اور سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ تم جب کہوگے، تمہارے پاس رقم پہنچ جائے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”شکریہ۔ رقم کی ضرورت ہوگی تو ضرور تمہیں کال کروں گا۔ تم سے ضرور ملوں گا۔ ابھی اجازت دو۔ مجھے سفر کی تیاریاں کرنی ہیں۔“

وہ بولی۔ ”پلیز وعدہ کرو۔ شام کو جانے سے پہلے ضرور کال کروگے۔“

”ضرور کروں گا۔ خدا حافظ۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا۔ ’یہ کون ہے؟ اس قدر دولت مند ہے کہ کئی ملکوں میں بینک اکاؤنٹ رکھتی ہے۔ اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہوگی؟ اگر یہ وسیع ذرائع کی مالکہ ہوگی تو کسی وقت گلے کا پھندا بن جائے گی۔‘

مراد نے حماد کے سامان سے تصویروں کی ایک البم نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ اس البم میں صرف ایک ہی دوشیزہ کی چند تصویریں تھیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ وہ بہت ہی شوخ و چنچل ہے اور بہت ہی خوش لباس ہے۔ اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ کون ہے اور کس دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس نے ماسٹر کے کارندے کو بلاکر تصویریں دکھائیں پھر پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ ابھی اس نے مجھے کال کی تھی۔“

”اس کا نام جمائلہ ہے۔ یہ ایک بہت ہی دولت مند بیوہ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس بیوہ کا نام شائلہ شانی ہے۔ اس کا شوہر یعنی جمائلہ کا باپ عبداللہ شانی سونے کا اسمگلر تھا۔“

”تھا کا مطلب ہے...... اب نہیں ہے؟“

”ہاں۔ یہ دھندا اب شائلہ سنبھالتی ہے۔ بہت خطرناک عورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس خطرناک بلا نے اپنی بیٹی کو عشق و محبت سے دور رکھنے کے لیے حماد کو قتل کرایا ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے مجھے اتنی اہم بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟“

”ہم نے سوچا ابھی آپ یہاں سے باہر نہیں جائیں گے اور شائلہ کے آدمی آپ کو نہیں دیکھیں گے۔ ہم آپ کے لیے تمام حفاظتی انتظامات کرنے کے بعد اس عورت کا ذکر کرنے والے تھے۔“

پھر وہ بتانے لگا۔ ”عبداللہ شانی مڈل ایسٹ اور ترکی سے سونا اسمگل کراتا تھا۔ یہ صرف شائلہ جانتی ہے کہ سونے کا انڈر گراؤنڈ ذخیرہ کہاں ہے؟ جرائم کی دنیا میں یہ سب کہتے ہیں کہ وہ عورت بہت ہی تیز طرار، خود غرض اور خطرناک ہے۔ اس نے سیکڑوں من سونے کے ذخیرے کی تنہا مالکہ بننے کے لیے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔ وہ بہت چالباز ہے۔ اس کی سیکرٹ آرمی کسی کو نظر نہیں آتی۔ اس آرمی کے جوان کسی بھی ٹارگٹ پر اچانک ہی پہنچ جاتے ہیں۔“

مراد نے پوچھا۔ ”حماد کیسے مارا گیا تھا؟“

”جمائلہ نے اسے کال کی تھی۔ ریورسائڈ پارک میں ملنے کے لیے بلایا تھا۔ ہم حماد کے پیچھے چھپ کر گئے تھے۔ اس پر اچانک گولی چلائی گئی تھی۔ وہ بڑا جی دار تھا۔ اس نے زخمی ہونے کے باوجود مقابلہ کیا۔ ان سے بڑی دیر تک کاؤنٹر فائرنگ جاری رہی۔ پھر حماد کے ہلاک ہوتے ہی وہ فرار ہوگئے۔ ہم ان کا تعاقب نہ کرسکے۔“

”کیا جمائلہ نے ماں کے حکم پر حماد کو کال کی ہوگی؟“

”حماد نے کہا تھا کہ جمائلہ اس کی دیوانی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ اس خطرناک عورت کی بیٹی سے کتراتا تھا۔ ماسٹر نے بھی حماد کو اس سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔“

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ "مجھ سے ایک غلطی ہوگئی بلکہ دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ میں نے اس کی کال اٹینڈ کی۔ دونوں ماں بیٹی کو معلوم ہوگیا ہے کہ حماد زندہ ہے۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ جمائلہ سے کہہ دیا ہے کہ آج شام کی فلائٹ سے پیرس جارہا ہوں۔"

میزبان نے پریشان ہو کر کہا۔ "او گاڈ...... ان ماں بیٹی کی طرف سے آپ پر حملہ ہوسکتا ہے۔ مجھے ابھی ائرپورٹ میں اپنے شوٹرز کی ڈیوٹی لگانی ہوگی۔"

وہ جانے لگا۔ مراد نے کہا۔ "جسٹ اے منٹ۔"

وہ رک گیا۔ مراد نے فون پر جمائلہ کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ چند لمحوں میں ہی اس کی آواز سنائی دی۔ "ہائے حماد! تم مجھے کال کررہے ہو۔ کیا میں تمہاری میموری میں آگئی ہوں؟ کیا مجھے پہچان رہے ہو؟"

"سوری جمائلہ! مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید دیکھتے ہی پہچان جاؤں۔ مجھ سے ملنے ائرپورٹ آؤ گی تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"او حماد! آئی لو یو۔ میں سر کے بل آؤں گی۔"

"او کے۔ سی یو۔"

وہ فون بند کر کے میزبان سے بولا۔ "میں نے نصف تحفظ حاصل کرلیا ہے۔ اگر وہ ماں کے اشاروں پر چل رہی ہے تو اس کی شامت آجائے گی۔ گولیاں چلتے ہی میں اسے جکڑ کر ڈھال بنالوں گا۔ اپنے شوٹرز سے کہنا کہ کوئی اس پر گولی نہ چلائے وہ میرا شکار ہے۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی جمائلہ نے کال کی۔ اس نے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں۔ بولو؟"

اس نے کہا۔ "تم ائرپورٹ آؤ گے۔ کیا عارضی میک اپ کے ذریعے اپنی صورت بدل کر آسکو گے؟"

"مجھے بہروپ میں آنے کو کیوں کہہ رہی ہو؟"

"او مائی ڈیئر! تم اہم باتیں بھی بھول گئے ہو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری ماما تمہیں پسند نہیں کرتی ہیں۔ اب ایک اہم بات بتارہی ہوں۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ کار کے حادثے میں تمہاری یادداشت کو نقصان پہنچا ہے۔ نہیں حماد......! میری ماما کے آدمیوں نے تم پر گولیاں چلائی تھیں۔ خدا کا شکر ہے تم زندہ ہو۔ میں بڑی دیر سے سوچ رہی ہوں کہ تمہاری سلامتی کے لیے کیا کروں؟"

"کیا کروگی؟"

"میرے دماغ میں ایک ہی بات آرہی ہے کہ تمہیں ائرپورٹ جانے سے روک دوں۔"

"میری فکر نہ کرو۔ میں ہر حال میں علاج کے لیے پیرس جاؤں گا۔ تم مجھے اپنی صورت دکھانے کے لیے ضرور آؤ گی۔"

"ضرور آؤں گی۔ اللہ حافظ۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ جمائلہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ حماد کی محبت میں ماں کے خلاف ہے۔ ویسے حقیقت کیا ہے یہ میدانِ جنگ میں معلوم ہونے والا تھا۔ وہ شام کو ائرپورٹ پہنچ گیا۔ ائرپورٹ ایسی جگہ ہے جہاں دنیا کی تمام قومیں آتی جاتی ہیں۔ ایسی جگہ سخت سیکیورٹی ہوتی ہے۔ ماسٹر کے کارندے اور شوٹرز مراد کو فون پر بتارہے تھے کہ ائرپورٹ میں کوئی دشمن نظر نہیں آرہا ہے۔ مراد کار سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا وزیٹرز لابی سے گزرتا ہوا ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ جمائلہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

وہ ایک منٹ کے لیے بھی وہاں نہیں رکا۔ تیزی سے چلتا ہوا بورڈنگ کارڈ لینے کے لیے اندر چلا گیا۔ وہاں کوئی گولیاں چلانے والا نہیں آسکتا تھا۔ بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے لیے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ جمائلہ کو وہاں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ایسی ہی لڑکی حماد کی البم میں بھی تھی۔

وہ ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم...... یہاں؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "میں بھی جارہی ہوں۔ تمہیں سرپرائز دینے کے لیے بات چھپائی تھی۔ اپنا ٹکٹ مجھے دو۔ میں بورڈنگ کارڈ لوں گی۔"

مراد نے دل میں کہا۔ "یہ تو گلے پڑگئی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "ہاں۔ میں نے دو دن پہلے ہی سیٹ کنفرم کرائی تھی۔ یہ خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تم بھی اسی فلائٹ سے جاؤ گے اور میں پیرس کیوں جارہی ہوں یہ جہاز میں بتاؤں گی۔"

مراد نے کہا۔ "کم آن۔ اپنا ٹکٹ مجھے دو۔ مردوں کو قطار میں رہنا چاہیے۔"

وہ ٹکٹ لے کر اس کی جگہ قطار میں آگیا۔ اس نے سوچا تھا کہ ائرپورٹ میں اس کی ماں شمائلہ شانی سے اور اس کے شوٹروں سے سامنا ہوگا جبکہ ایسا کچھ نہیں ہورہا تھا اور اب پیرس پہنچنے تک کسی طرح کا خطرہ نہیں تھا۔

پھر بھی بے چینی تھی کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ وہ پیرس کیوں جارہی ہے؟ وہ اس سے بہت سے سوالات کرنا چاہتا تھا۔ وہ قطار سے باہر اس کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے

پوچھا۔ ''تم انگریزی کے علاوہ اور کون سی زبان جانتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''فرنچ لینگویج اور انڈین لینگویج۔ میرے پاپا ایک انڈین تھے۔ اینڈ آئی لَو انڈینز۔''

مراد نے اردو زبان میں کہا۔ ''اردو اور ہندی ایک جیسی دو بہنیں ہیں۔ ہماری یہ زبان یہاں کوئی نہیں سمجھے گا۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''او گاڈ! تم بھی یہ زبان جانتے ہو پھر تو مشکل آسان ہو گئی۔''

''تم پیرس کیوں جا رہی ہو؟''

''ماما سے میرا جھگڑا ہے۔ انہوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میری اور ان کی آواز...... اور لہجہ ایک جیسا ہے۔ انہوں نے جمائلہ بن کر تمہیں کال کی تھی اور ریور سائڈ پارک میں ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ جب وہاں گولیاں چلیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ تم مر چکے ہو، تب انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہیں کس طرح دھوکے سے بلایا تھا۔ یہ سن کر میں بہت روئی تھی۔ ماما مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں اور مجھے سمجھاتی ہیں کہ مرد سے دوستی کرو۔ اپنی خواہش پوری کرو لیکن اس پر بھروسا نہ کرو۔ اس سے عشق کرو گی، اسے سر پر چڑھاؤ گی تو وہ تم پر سوکن لے آئے گا۔ تمہارے پاپا یہی غلطی کرنے والے تھے۔ ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا لیکن ان کی شامت آ گئی تھی۔ سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر اسے میری سوکن بنا دیتے تو وہ بھی ہمارے سونے کے ذخیرے تک پہنچ جاتی۔ آدھا سونا وہ لے جاتی۔''

انہوں نے میرے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''سو سوری۔ میں نے تمہارے باپ کو بہت سمجھایا۔ وہ نہیں مانا تو میں نے مجبوراً اسے اوپر پہنچا دیا۔''

وہ دونوں بورڈنگ کارڈ لے کر ویٹنگ ہال میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ بول رہی تھی۔ ''ماما چاہتی ہیں کہ میں بھی ان کی طرح سنگدل بن جاؤں۔ جو مرد پسند آ جائے، میں اسے جوتیوں میں رکھوں۔ سر پر نہ بٹھاؤں۔ اسمگلنگ کے دھندے پر توجہ دیتی رہوں اور سونے کے ذخیرے میں اضافہ کرتی رہوں لیکن مجھے ان سے اختلاف ہے۔ میں ان سے جھگڑتی رہتی ہوں۔ وہ بہت ہی بے رحم ہیں۔ کسی کے منہ سے انکار نہیں سنتی ہیں۔ جو ان کے مزاج کے خلاف بولتا ہے، اسے بڑی درندگی سے ہلاک کر دیتی ہیں۔ صرف مجھے ڈھیل دیتی ہیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مجھے ہلاک نہیں کرتیں۔ میرے انکار کی وجوہات کو ختم کر دیتی ہیں۔''

وہ مراد کو دیکھ کر بولی۔ ''جیسا کہ انہوں نے تمہیں ختم کرا دیا تھا۔ اچھا ہے، وہ یہی سمجھ رہی ہیں کہ تم مر چکے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں روز تمہیں فون کرتی تھی۔ پھر میں نے ماما سے کہا کہ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں کچھ روز کے لیے پیرس جاؤں گی۔ انہوں نے انکار نہیں کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میرا دل بہل جائے اور میں تمہیں بھول جاؤں۔''

اس نے ہنستے ہوئے مراد کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''وہ سمجھ رہی ہیں کہ میں تمہاری موت کا غم بھلانے جا رہی ہوں۔ کیا خدا کی شان ہے۔ تم میرے زندہ ہم سفر بن گئے ہو۔''

مراد نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے درمیان فاصلہ رہنا چاہیے۔''

وہ روٹھنے کے انداز میں بولی۔ ''میں جب بھی قریب آنا چاہتی ہوں تم یہی کہتے ہو۔ کیا میری ماما سے ڈرتے ہو؟''

''میں صرف خدا سے ڈرتا ہوں۔ شادی سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کو چھونا بھی نہیں چاہیے۔''

''ہم پیرس پہنچ کر کورٹ میرج کر لیں گے۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا تمہاری ماما تمہیں آسانی سے چھوڑ دیں گی؟ نہیں کبھی نہیں...... میں تمہاری ماما کے شوٹروں کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ لیکن یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ تم سمجھ سکتی ہو تمہاری ماما اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئیں گی۔''

''ہم کہیں دور جا کر چھپ کر رہیں گے۔''

''مرد بزدلوں کی طرح چھپ کر نہیں رہتے۔ میں لڑتا رہوں گا پھر ایک دن مارا جاؤں گا پھر کیا کرو گی؟ کچھ نہیں کر سکو گی۔ میری جان گنوانے کے بعد ساری عمر کنواری نہیں رہو گی۔ پھر دل بہلانے کے لیے پیرس جاؤ گی۔ میں تو اپنی جان سے گزر جاؤں گا۔''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ دونوں جہاز میں آ کر بیٹھ گئے۔ مراد نے کہا۔ ''کیا تمہاری ماما نے پیرس جانے کے لیے تمہیں تنہا آزادی دے دی ہے؟ میرا ذہن نہیں مانتا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان کے جاسوس دور سے تمہاری نگرانی کر رہے ہوں گے۔ وہ اس جہاز میں موجود ہوں گے۔ وہ جہاز میں ہتھیار نہیں لا سکتے لیکن پیرس پہنچتے ہی انہیں ہتھیار مل جائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری ماما کی ایک سیکرٹ فورس ہے۔ وہ تمہاری جیسی لاڈلی بیٹی کو بھی نظر نہیں آتی ہوگی لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ میں...... ایک بار پھر بارود کے ڈھیر میں پہنچ گیا ہوں۔ پھر مجھ پر گولیاں چلائی جائیں گی، تب کیا کرو گی؟''

وہ بے اختیار سر گھما کر سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر ادھر

ادھر دیکھنے لگی۔ مراد نے پوچھا۔ ''کیا اپنی ماں کے سپاہیوں کو اور سراغ رسانوں کو پہچانتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''نہیں......''

''تو پھر بیٹھ جاؤ۔ کیوں انہیں سمجھا رہی ہو کہ ہم ان کی موجودگی کو سمجھ رہے ہیں؟''

وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بے بسی سے بولی۔ ''میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ تم بولو اب ہم کیا کریں؟''

''تمہیں میری موت پر صبر آگیا تھا۔ اب بھی صبر کرو۔ یقین کرو کہ حماد مرچکا ہے۔ میں اس کی پرچھائیں ہوں۔ حماد نہیں کوئی اور ہوں۔''

وہ اسے چھو کر بولی۔ ''میں کیسے مان لوں؟ میرے سامنے زندہ سلامت موجود ہو۔''

''اگر تم مان لوگی تو یہ دوسرا حماد کہیں سے آنے والی اندھی گولی سے بچ جائے گا۔ پلیز اپنی ماں سے فون پر کہہ دو کہ میں حماد نہیں ہوں۔''

''ماما بھی یقین نہیں کریں گی۔''

''تم کہو گی کہ میری طلب سے باز آرہی ہو اور ماما کے پاس واپس جارہی ہو تو وہ مجھ سے دشمنی سے باز آجائیں گی۔''

''کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟ مجھ سے دور بھاگنا چاہتے ہو؟''

''کیا تم چاہتی ہو، تمہارے ساتھ رہوں اور مرجاؤں؟''

وہ کیسے کہتی کہ اس کے ساتھ رہ کر جان دے دے وہ رونے لگی۔ مراد نے کہا۔ ''یہ جہاز ہنگری میں ایک گھنٹے کے لیے رکے گا۔ تم باہر جا کر ماما سے بات کرو۔ ان سے کہو کہ تم دھوکا کھا گئی تھیں۔ میں حماد نہیں ہوں۔ اس کا ہم شکل ہوں۔ تم واپس آرہی ہو۔''

وہ اسکارف میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''میں واپس نہیں جاؤں گی۔ وہ گیارہ برس کے ایک لڑکے سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

''کیا......؟'' مراد نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہ چاہتی ہیں، میں دنیا کے سب سے طاقتور شخص کی بیوی بن جاؤں۔ وہ میرا محافظ رہے گا۔ ہمارے سونے کے ذخیرے پر آنچ نہیں آنے دے گا۔''

''تم کہہ رہی ہو وہ گیارہ برس کا ہے۔ کیا پرنس عابد علی سنگی کی بات کررہی ہو؟''

''ہاں۔ وہ عجیب و غریب لڑکا ہے۔ پوری دنیا میں اس کی شہرت ہورہی ہے۔ میں پچیس برس کی ہوں۔ وہ مجھ سے چودہ برس پیچھے ہے۔''

''کیا تمہاری ماما سے اس کی شناسائی ہے؟ کیا اس سے رشتے کی بات چل رہی ہے؟''

''نہیں۔ ماما اس سے رابطہ کرنے کی کوششیں کررہی ہیں۔ یہودی اکابرین کسی کو پرنس سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور پرنس کے پاس اپنا ذاتی فون نہیں ہے۔''

''ایسے حالات میں تمہاری ماما نے کیسے سمجھ لیا کہ تمہیں پرنس کی دلہن بنائیں گی؟''

''ماما جو ارادہ کرلیتی ہیں اسے ہر قیمت پر پورا کرتی ہیں۔ وہ پرنس کو داماد بنانے کے لیے یہودیوں سے ٹکرانے والی ہیں۔ ان کی باتیں چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔''

مراد نے دل میں کہا۔ ''یہ اچھا ہو رہا ہے۔ یہودیوں سے ٹکرانے والا ایک نیا محاذ کھل رہا ہے۔ اس محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی طرف سے سہولتیں فراہم کرنی چاہئیں۔''

وہ بولا۔ ''اپنی بات یہ ہے کہ تمہاری ماں فولادی ارادوں کی حامل ہے اور تم ان کے شکنجے سے کبھی نکل نہیں سکو گی۔ میری موت کے بعد کسی اور سے دل لگاؤ گی تو تمہاری ماں اسے بھی کچا چبا جائے گی۔ صاف سن لو کہ مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ میں حماد نہیں ہوں اور تمہارے حماد کی طرح نادان نہیں ہوں۔ تمہیں سمجھاتا ہوں کہ ماں کے سائے میں ہی تم کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار سکو گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔''

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری زندگی کو داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔''

پھر اپنا سر تھام کر بولی۔ ''او گاڈ......! ماما کے پاس واپس جانا ہوگا۔ یہ کیسی ماں ہے۔ مجھے سر اٹھانے ہی نہیں دیتی۔ ہمیشہ جھکا دیتی ہے۔''

وہ سیٹ بیلٹ باندھنے لگے۔ جہاز ہنگری کے ایک ائرپورٹ پر اترنے والا تھا۔ مراد نے کہا۔ ''ہم تھوڑی دیر کے لیے جہاز سے باہر جائیں گے۔ ائرپورٹ کے لاؤنج میں تم ماما سے فون پر بات کرو گی پھر مجھ سے بھی باتیں کراؤ گی۔''

جہاز رن وے پر دوڑتا ہوا رک گیا۔ مراد اس آفت کی پرکالہ سے پہلی بار باتیں کرنے والا تھا۔ وہ بھڑکتا ہوا شعلہ تھی۔ اسے یہودیوں کے خلاف اور بھڑکانے والا تھا۔

جمائلہ نے جہاز سے باہر آتے ہی اپنی ماں کو فون پر مخاطب کیا۔ ''ہیلو ماما! میں آپ سے ضروری بات کرنے

والی ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں۔ وہ ضروری بات یہ ہے کہ تم ابھی حماد کے ساتھ پیرس جارہی ہو۔ بے وقوف لڑکی میرے سراغ رسانوں نے حماد کی ہلاکت کے بعد معلوم کیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی لاش چھپادی تھی۔ اب کسی بہروپیے کو حماد بنا کر پیش کررہے ہیں اور تم دھوکا کھارہی ہو۔''

جمائلہ نے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ حماد نہیں ہے۔ اب اس کی ماں بھی یہی کہہ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''یس ماما! یہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ حماد نہیں ہے۔ اس کا ہم شکل ہے۔ میں یقین نہیں کررہی تھی، اب آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں۔''

پھر وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں ہار گئی ماما! آپ سے کبھی جیت نہیں سکوں گی۔ مجھے آپ کی ہی مرضی سے شادی کرنی ہوگی۔''

''میری بچی! ماں دشمن نہیں ہوتی۔ واپس آجاؤ۔''

''نہیں ماما! میں پیرس میں کچھ روز تمہارا ہوں گی۔ یہ حماد کا ہم شکل بہت اچھا ہے۔ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا ہے کہ میں آپ کی بات مان لوں آپ جہاں چاہتی ہیں، وہاں شادی کے لیے راضی ہوجاؤں۔''

''وہ بہروپیا ہے کون؟ اس سے بات کراؤ۔''

اس نے مراد کی طرف فون بڑھایا۔ اس نے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو...... حماد بول رہا ہوں جبکہ حماد نہیں ہوں۔''

شائلہ شانی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ حماد بن کر میری بیٹی کے سامنے کیوں آئے ہو؟''

''میں نہیں، آپ کی بیٹی میرے سامنے آئی ہے۔''

''تم نے حماد کی صورت کیوں بنوائی ہے؟''

''میں بہروپیا ہوں۔ ضرورت مندوں کے کام آنے کے لیے چہرے بدلتا رہتا ہوں۔ یہ سن لو کہ آج سے میں تمہاری بھی ضرورت بن جاؤں گا۔''

''کیا بکواس کررہے ہو؟ تم اور میری ضرورت...... اونہہ! میں تھوکتی ہوں تم جیسوں پر۔''

''تم نے جو تھوکا ہے اسے چاٹو گی تو ابھی پرنس عابی سے فون پر تمہارا رابطہ کراؤں گا۔''

وہ یکلخت چونک کر بولی۔ ''کیا......؟ کیا تم پرنس عابی سے رابطہ کراسکتے ہو؟ میں کیسے مان لوں؟''

''رابطہ ہوجائے گا تو مان لوگی۔''

''بے شک مان لوں گی، ابھی بات کراؤ۔''

''پرنس فون پر ہیلو کہیں گے۔ صرف دو باتیں کریں گے۔ اس سے زیادہ باتیں کرنے سے پہلے میری شرط پوری کرنی ہوگی۔''

''کون سی شرط؟''

''تمہیں تھوک کر چاٹنا ہوگا۔''

''بکواس مت کرو۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔''

اس نے جواباً فون بند کرکے اسے جمائلہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا پھر جہاز میں واپس جانے لگا۔ فون پھر بولنے لگا۔ جمائلہ نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''یس ماما؟''

''وہ کیا بکواس کررہا تھا؟ کیا واقعی پرنس سے رابطہ کراسکتا ہے؟ آخر یہ ہے کون؟ کیا کرتا ہے؟''

مراد کی باتوں نے اسے بے چین کردیا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''پرنس تک میں پہنچ نہیں پائی۔ یہ کیسے پہنچ جائے گا؟ یہ معلوم کرو کہ وہاں تک اس کی پہنچ ہے یا نہیں۔''

''اوکے ماما! ابھی معلوم کرتی ہوں۔''

اس نے آواز دی۔ ''حماد! رک جاؤ۔ ابھی جہاز میں نہ جاؤ۔ مجھ سے کچھ باتیں کرو۔''

وہ رک گیا۔ پلٹ کر آتے ہوئے بولا۔ ''کیا باتیں کروگی؟''

اس نے پوچھا۔ ''کیا واقعی تمہاری پرنس تک پہنچ ہے؟''

''مجھ سے نہ پوچھو۔ تمہاری ماں کو یقین نہیں آرہا ہے۔''

''کیسے یقین آئے گا جبکہ یہودی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ کیا وہ تمہیں نہیں روکیں گے؟''

''وہ مجھے نہیں روک سکتے۔ میں پرنس کا پرسنل نمبر جانتا ہوں۔''

''پلیز میری ماما کو وہ نمبر بتاؤ۔''

''تمہاری ماں کو میری شرط منظور نہیں ہے۔''

''شرط کیا ہے؟''

''یہ اپنی ماں سے پوچھو۔''

وہ فون پر بولی۔ ''آپ ہماری باتیں سن رہی ہیں نا؟ شرط کیا ہے؟ آپ مانتی کیوں نہیں ہیں؟''

''وہ بکواس کررہا ہے۔ میں نے غصے میں تھوکا تھا۔ اب کہہ رہا ہے کہ تھوکا ہوا چاٹو۔ کمینہ کہیں کا۔ میرے سامنے ہوتا تو کھڑے کھڑے گولی ماردیتی۔''

اس نے مراد سے شکایت کی۔ ''تم میری ماما کی انسلٹ کررہے ہو۔ انہوں نے غصے میں تھوکا تھا۔ تم نہیں جانتے، یہ ان کی عادت ہے۔ اسے بھول جاؤ۔''

''میری بھی عادت ہے۔ مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ تھوکا

ہوا جانے پر مجبور کر دیتا ہوں۔"

"کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو؟ تم ماما کے غصے کو نہیں جانتے۔ وہ تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گی۔"

"اپنی ماما سے بولو، میں زندہ رہوں گا تب ہی وہ پرنس سے تمہارا رشتہ کرا سکیں گی۔"

شائلہ شانی ہر قیمت پر عالی کو داماد بنانا چاہتی تھی اور وہ جس بات کی ضد کر لیتی تھی اُسے پورا کر کے ہی رہتی تھی۔ وہ مراد کی باتیں سن کر تلملا رہی تھی۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ مراد واقعی اس سے رابطہ کرا سکتا ہے یا نہیں؟

اس نے غصے سے کہا۔ "جمائلہ! اس سے بولو، پہلے پرنس سے بات کرائے۔ پہلے یقین دلائے۔ اس کے بعد اپنی شرط منوانے کی بات کرے۔"

جمائلہ نے کہا۔ "کیوں بات بڑھا رہے ہو؟ ماما کو یقین تو دلاؤ کہ وہاں تک تمہاری پہنچ ہے۔"

وہ بولا۔ "وہ مجھے کوئی معمولی آدمی سمجھ رہی ہے۔ اچھی بات ہے۔ ابھی یقین ہو جائے گا۔ ذرا انتظار کرو۔"

وہ اپنے فون پر بیٹے کے نمبر پنچ کرتا ہوا جمائلہ سے دور چلا گیا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ سن نہیں پا رہی تھی کہ کسی سے کیا بول رہا ہے؟

شائلہ شانی نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟"

"میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ذرا دور چلا گیا ہے۔ کسی سے کچھ بول رہا ہے۔"

"وہ میرا وقت برباد کر رہا ہے۔"

"آپ مجبور کیوں ہو گئی ہیں ماما؟"

"تم نادان بچی نہیں ہو۔ یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تم کو اور تمہارے مستقبل کو ایک شہ زور کے ہاتھوں میں دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم ایک ریاست کی مہارانی سے بھی زیادہ دولت مند ہو۔ میں مر جاؤں گی تو دوست اور دشمن تمہیں چیل کوؤں کی طرح نوچ کھائیں گے۔

"میری بچی! میری شہزادی! صرف پرنس عالی کی ہی آغوش میں رہ کر گدھ جیسے نوچنے والے مردوں کو مات دیتی رہو گی۔ ایک بار..... صرف ایک بار پرنس سے میرا رابطہ ہو جائے پھر میں اسے اپنا داماد بنا کر ہی رہوں گی۔"

پھر وہ جھنجلا کر بولی۔ "وہ رابطہ کرنے والا بہرو پیا کیا کر رہا ہے؟ وہ اتنی لمبی باتیں کس سے کر رہا ہے؟ میں کسی کے انتظار میں لٹکنا نہیں جانتی۔ اسے بولو کہ....."

بیٹی نے بات کاٹ کر کہا۔ "وہ واپس آ رہا ہے۔"

مراد نے قریب آ کر کہا۔ "ایک نمبر بتا رہا ہوں۔ اس پر پرنس سے بات ہو سکے گی۔"

جمائلہ نے اس کے بتائے ہوئے نمبر کو فون پر درج کیا۔ وہ بولا۔ "اور میں جہاز میں جا رہا ہوں۔ پیرس پہنچنے تک تمہاری ماں سے بات نہیں کروں گا۔"

وہ پلٹ کر چلا گیا۔ جمائلہ نے ماں کو وہ نمبر نوٹ کرانے کے بعد کہا۔ "یہ بہت مغرور ہے۔ جہاز میں چلا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا آئندہ وہ پیرس پہنچنے کے بعد ہی آپ سے بات کرے گا۔"

"ماما! یہ آپ کی بہت بری عادت ہے۔ آپ کسی پر بھی تھو کنے کی باتیں کیوں کرتی ہیں؟"

"میں دنیا کے تمام مردوں کو قابلِ نفرت سمجھتی ہوں۔ جب تم میری طرح بااختیار/با اقتدار خاتون بن جاؤ گی تو میرا رویہ تمہاری سمجھ میں آئے گا۔ بہر حال پہلے میں اس فون نمبر کو تو آزما لوں۔"

اس نے بیٹی سے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ اپنے شاہانہ طرز کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مسلح باڈی گارڈز اس بنگلے کے اندر اور باہر مستعد کھڑے رہتے تھے۔ وہ بنگلا اس کی عارضی رہائش گاہ تھی۔ پیرس میں اس کا ایک عالی شان محل تھا۔ وہ ایک بڑی سیکیورٹی فورس کے ساتھ وہاں ایک ملکہ معظمہ کی طرح رہتی تھی۔ دوسرے دن بیٹی کے پیچھے پیرس پہنچنے والی تھی۔

اس نے حماد کے بتائے ہوئے فون نمبرز کو بے یقینی سے پنچ کیا پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جانے لگی پھر تھوڑی دیر بعد ہی عالی کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ "ہیلو فرمائیں۔ کون ہیں آپ؟"

اس نے کہا۔ "میں ملکہ شائلہ شانی بول رہی ہوں۔ سب مجھے گولڈن کوئین (سونے کی ملکہ) کہتے ہیں۔ اگر آپ پرنس عابد علی منگی ہیں تو پھر ہم ایک ہی اسٹیٹس کے افراد ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں عابد علی منگی ہوں۔"

"پلیز آپ مائنڈ نہ کریں۔ فون پر بڑے فراڈ ہوتے ہیں۔ آپ یقین دلائیں کہ واقعی پرنس عالی ہیں۔"

عالی نے کہا۔ "میں یہودیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ پیرس جانے والا ہوں۔ اس ٹیم کے سربراہ مسٹر کریگ ہوسٹن ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ میں نے مسٹر ہوسٹن سے گزارش کی تھی کہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں لیکن انہوں نے انکار کر کے میری انسلٹ کی ہے۔ آئی ہیٹ ہم۔"

"آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت غصے میں رہنے والی خاتون ہیں۔"

"میں صرف ناپسندیدہ افراد کو برداشت نہیں کرتی۔ ورنہ آپ اگر آنرایبل پرنس عابد علی منگی ہیں تو پھر میں آپ کے لیے ممتا سے بھرپور موم کی طرح پگھلنے والی ماں ہوں۔ پلیز یقین دلائیں۔"

"فون بند کریں۔ تھوڑی ہی دیر میں کریگ ہوسٹن آپ سے اپنے رویے کی معافی مانگیں گے اور مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے بھی نمبر دیں گے۔"

فون بند ہو گیا۔ شائلہ شانی نے مطمئن ہو کر اپنے فون کو دیکھا۔ امید روشن ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ہونے والے داماد تک پہنچنے والی تھی۔

اس کی پرسنل سیکریٹری نے انٹرکام پر کہا۔ "میڈم! دی رائٹ مین کی کال ہے۔"

رائٹ مین اہم خفیہ معاملات میں اس کا دست راست تھا۔ کوئی اہم بات کرنے والا تھا لیکن ان لمحات میں بتانی سے زیادہ کوئی اہم نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "میں آدھے گھنٹے تک کوئی کال ریسیو نہیں کروں گی۔"

"کیا آپ پیغام سننا چاہیں گی؟"

"ویل۔ سناؤ۔"

"آپ کا کاروباری حریف سائمن گولڈی مشکل میں ہے۔ اس کے سونے کا جہاز گہرے پانیوں میں کھڑا ہے۔ یونان کی جنوبی بندرگاہ میں آری آ گئی ہے۔ وہ اس بندرگاہ میں مال ڈیلیور نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف آئی لینڈ کریٹ میں ہماری اجارہ داری ہے۔"

شائلہ شانی نے کہا۔ "سمجھ گئی۔ رائٹ مین سے بولو سائمن گولڈی سے پرسنٹیج پر ڈیل کرے۔ میں تھوڑی دیر بعد رائٹ مین سے بات کروں گی۔"

اس نے انٹرکام کا سوئچ آف کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے حیرانی سے دیکھا۔ سیل اسکرین پر کریگ ہوسٹن کے نمبر تھے۔

وہ خوشی سے کھل گئی۔ یقین ہونے لگا کہ پرنس بتانی سے رابطہ ہونے والا ہے۔ اس نے بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگا کر اپنے مزاج کے مطابق خشک لہجے میں پوچھا۔ "ہیلو۔ کون ہے؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میڈم! میں فری میسن کا ایک عہدیدار کریگ ہوسٹن بول رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ آپ آنرایبل پرنس عابد علی منگی سے گفتگو کرنا چاہتی تھیں۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "اور میں آپ کی ناقدری کے باعث گفتگو نہ کر سکی۔ آپ یہودی حضرات نے پرنس پر اپنے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ آئی ہیٹ یور بی ہیویر......"

"سوری میڈم! آپ یہودیوں کے خلاف ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم وسیع قلب ونظر رکھتے ہیں۔ آپ ان سے گفتگو کر سکتی ہیں۔ میں ان کا موجودہ فون نمبر بھیج رہا ہوں۔"

ایک منٹ کے اندر ہی اس کے فون پر وہی نمبر آیا جو مراد پہلے ہی دے چکا تھا۔ وہ جسے بہروپیا کہہ رہی تھی، وہ کام کا آدمی نکلا۔ اس نے فوراً ہی ان نمبروں کو پنچ کیا۔

رابطہ ہوا اور مرادیں بر آئیں۔ بتانی کی آواز سنائی دی۔

"ویل مادام! یقین ہو گیا کہ میں پرنس بول رہا ہوں؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "او مائی گڈنس۔ آج کا دن میرے لیے یادگار رہے گا۔ میں آپ سے بہت سی اہم باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے کہا۔ "میرے استاد محترم اجازت دیں گے تو ضرور باتیں کروں گا۔"

"کون ہیں آپ کے استاد محترم؟"

"آپ جانتی ہیں۔ انہوں نے میرا فون نمبر آپ کو دیا ہے۔"

"کیا......؟" وہ حیرت سے چیخ پڑی۔ "وہ......وہ حماد...... میرا مطلب ہے محترم حماد صاحب آپ کے استاد ہیں؟"

"استاد بھی ہیں اور مشیر بھی۔ میں ان کے مشوروں کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کرتا۔ ابھی انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ سے گفتگو کروں۔"

"او مائی گاڈ! کتنے نیک دل ہیں آپ کے استاد اور مشیر۔ میں ابھی ان کا شکریہ ادا کروں گی۔"

"شکریہ ادا کریں اور ان کی شرط بھی پوری کریں۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "کیسی شرط؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ وہ اپنے معاملات مجھے بھی نہیں بتاتے ہیں۔ مجھ سے اتنا کہا ہے کہ جب آپ شرط پوری کریں گی تب وہ مجھے آپ سے شناسائی پیدا کرنے کی اجازت دیں گے۔"

وہ بوکھلا گئی۔ ابھی پرنس سے معاملہ سلجھ گیا تھا اور ابھی چشم زدن میں الجھ گیا۔ اپنا ہی تھوک چاٹنے والی بات پھر ابھر آئی تھی۔

وہ بولی۔ "پرنس! وہ بہت ہی ناگوار سی شرط ہے۔ مسٹر حماد نے آپ سے ذکر کیا ہوگا؟"

’’میں نے کہا نا۔ وہ اپنے معاملات کسی کو نہیں بتاتے ہیں پلیز آپ ان سے نمٹ لیں پھر مجھ سے باتیں ہوں گی۔‘‘

فون بند ہو گیا۔ پھر انکار...... پھر رکاوٹ...... پھر انسلٹ......وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ غلطی کی سزائیں کمزوروں کو دی جاتی ہیں۔ وہ شہ زور تھی۔ گہرے سمندروں میں جہازوں کے رخ موڑ دیتی تھی۔ ہر ملک کی زمین پر پاؤنڈ کی کرنسی رائج رہتی ہے۔ وہ سونے کے سکے کھنکھناتی تھی اور حکمرانوں کے فیصلے بدل دیتی تھی۔

وہ حماد...... کیا پدی کیا پدی کا شوربا؟ وہ اسے تھوکا ہوا چاٹنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ اس کی موت آ گئی ہے، وہ مرے گا۔ پیرس پہنچتے ہی مرے گا۔ وہ غصے سے تلملاتے ہوئے فیصلہ کر رہی تھی۔

لیکن نہیں...... عقل نے سمجھایا۔ وہ نہ پدی ہے نہ پدی کا شوربا، وہ پرنس کو داماد بنانے والا ایک حربہ ہے۔ اسے مار ڈالے گی تو پرنس کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس سے بات نہیں کرے گا۔

وہ بہت ہی ضدی تھی۔ پرنس کو داماد بنانے کا حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے کسی بات کی ضد کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو لیکن وہ حماد گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا تھا۔ بامر مجبوری اسے زندہ رکھنا تھا اور اسے قائل کرنا تھا کہ وہ تھوک کر چاٹنے والی بات نہ کرے۔

اس نے مراد سے باتیں کرنے کے لیے بیٹی کے نمبر پنچ کیے۔ معلوم ہوا کہ ادھر سوئچ آف ہے۔ یقیناً وہ جہاز کے اندر ہو گی۔ اب پیرس پہنچنے کے بعد ہی بات آگے بڑھ سکتی تھی۔ اسے اگلے چار گھنٹوں تک انتظار کرنا تھا۔ اس نے دوسرے اہم معاملے پر توجہ دی۔ اس کے کاروباری حریف سائمن گولڈی کا جہاز گہرے پانیوں میں رکا ہوا تھا۔ اسے ایتھنز کی ایک بندرگاہ میں بڑی رازداری سے سونا ڈلیور کرنا تھا لیکن اطلاع ملی کہ وہاں کے ساحلی علاقوں میں فوج گشت کر رہی ہے۔ اب وہ جہاز آگے کسی بھی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا چاہتا تو اس جہاز کا عملہ قانونی گرفت میں آ جاتا۔ تمام سونا ضبط کر لیا جاتا۔ سائمن گولڈی اپنے عالی شان محل میں محفوظ تھا لیکن کروڑوں ڈالرز کا نقصان اٹھانے والا تھا۔

اب مجرمانہ تنظیمیں ہی اس کے سونے کو ڈوبنے سے بچا سکتی تھیں۔ اس جہاز کے آگے مغرب کی سمت جزیرہ سسلی تھا۔ وہاں ریڈ الرٹ کی حکمرانی تھی۔ ریڈ الرٹ کے موجودہ سربراہ جیکی براؤن کو اطلاع مل گئی تھی کہ سائمن گولڈی اپنا سونا بچانے کی فکر میں ہے۔ جب اسے کوئی راستہ نہیں ملے گا تو اسے سسلی کی بندرگاہ میں یعنی ریڈ الرٹ کی پناہ میں آنا ہی ہو گا۔

اس جہاز کے پیچھے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر کریٹ آئی لینڈ تھا۔ اس جزیرے پر شائلہ شانی کی اجارہ داری تھی۔ اس کی سمندری فوج کسی اسمگلر کو وہاں آنے نہیں دیتی تھی۔ کوئی بھی اپنے جہاز کو ان لوڈ کرنا چاہتا تو اس سے جائز مال کے پانچ پرسنٹ اور غیر قانونی مال کے پچاس پرسنٹ وصول کرتی تھی۔

مراد نے ماضی میں ریڈ الرٹ کے کئی سربراہوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ انہوں نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز رکھی تھی لیکن دنیا کے تمام ماہر شوٹرز میں سے کوئی اسے گولی نہ مار سکا۔ آخر براؤن خاندان کا ایک ہی سربراہ جیکی براؤن رہ گیا۔ بارہ برس پہلے جیکی باپ بننے والا تھا۔ اس کا وارث یعنی ریڈ الرٹ کا آئندہ سربراہ پیدا ہونے والا تھا۔

ایسے وقت مراد نے اس سے کہا تھا۔ ’’تمہارے باپ دادا نے میرے سر کی قیمت لگا رکھی ہے۔ میرا اللہ مجھے سلامتی دے رہا ہے۔ میرا سر سلامت ہے اور ریڈ الرٹ کے سربراہوں کے سر شانوں سے الگ ہوتے آ رہے ہیں۔ اب تمہارا وارث...... آئندہ کا سربراہ بڑی رازداری سے میونخ کے ایک کاٹیج میں پیدا ہونے والا ہے اور اتفاق سے میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ تمہاری مضبوط سیکیورٹی پہلے بھی مجھے نہ روک سکی۔ اب بھی نہیں روک سکے گی۔ یہ لکھ لو کہ تمہارا وارث پیدا ہوتے ہی میرا نشانہ بن جائے گا۔‘‘

یہ چیلنج سنتے ہی جیکی براؤن خوف سے تھرا گیا تھا۔ مراد نے کہا تھا۔ ’’میں تمہیں بھی ختم کر دوں گا تو براؤن فیملی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ میرے تمام حملے کامیاب رہے ہیں۔ سوچ لو۔‘‘

مراد ایسا درندہ نہیں تھا کہ ایک نوزائدہ بچے کو مار ڈالتا اس نے محض دھمکی دی تھی۔ جیکی براؤن اپنے بچے کی قسم کھا کر کہنے لگا۔ ’’میں توبہ کر رہا ہوں۔ دشمنی سے باز آ رہا ہوں۔ میں نے اپنے بزرگوں کی لاشیں اٹھائی ہیں۔ اپنے بچے کی لاش دیکھتے ہی مر جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔ میری نسل کو آگے بڑھنے دو۔ میں ہر قیمت پر تم سے سمجھوتا کروں گا۔‘‘

پھر اس نے سمجھوتا کر لیا۔ وہ جو مراد کا جانی دشمن تھا۔ اس کا دل سے دوست بن گیا تھا۔ اس کا وارث اس کا اکلوتا بیٹا اب بارہ برس کا ہو گیا تھا اور ہر سال اپنی سالگرہ کے دن فون پر مراد کو سلام کرتا تھا۔ ریڈ الرٹ جرائم کی دنیا میں

بہت ہی مضبوط اور منظم تنظیم مانی جاتی تھی۔ اس کے سربراہ سے دوستی ہوتے ہی دوسرے تمام مجرم مراد سے دشمنی بھول گئے تھے۔

ہم زاد ریاستی معاملات میں مصروف تھا۔ چونکہ مراد بن کر رہتا تھا اس لیے مراد کا فون اس کے پاس رہا کرتا تھا تمام ممالک کے اعلیٰ عہدیدار اسی نمبر پر اس سے رابطہ کیا کرتے تھے۔ جیکی براؤن نے اسے کال کی۔ ہم زاد نے اس کے نمبر پڑھے پھر بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔

''ڈیل مسٹر براؤن! کیسے یاد کیا؟ خیریت تو ہے؟''

''ہاں خیریت ہے۔ فی الحال ایک ایسا معاملہ درپیش ہے جس کا تعلق کسی حد تک آپ سے ہے۔''

''معاملہ کیا ہے؟''

''پیرس میں ایک شائلہ شانی نام کی بیوہ دولت مند خاتون ہے۔ سونا اسمگل کرتی ہے۔ بہت ہی خطرناک عورت ہے۔ مکاری اور درندگی اس پر ختم ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ یورپ اور افریقا کی چھ کرمنل تنظیمیں میری اتحادی ہیں۔ ان میں سے ایک کرمنل تنظیم کا سربراہ اینڈی گارسن، شائلہ کی حسین بیٹی جمائلہ پر عاشق ہو گیا ہے۔ اینڈی نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے لیے جمائلہ کا رشتہ اس کی ماں سے مانگوں۔ میں نے پیرس میں شائلہ سے ملاقات کی پھر جمائلہ اور اینڈی گارسن کے رشتے کی بات کی۔''

اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنی بیٹی کو کسی مجرم کے سائے میں نہیں جانے دوں گی۔ میں اس دنیا کے سب سے طاقتور شخص سے بیٹی کا رشتہ کروں گی۔ میرے پاس بے حساب سونے کا ذخیرہ ہے۔ کروڑوں ڈالرز کی جائیداد ہے۔ میرا ہونے والا داماد میری بیٹی کا اور اس کی دولت اور جائیداد کا محافظ بن کر رہے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ایسا کون شہ زور ہے، جسے تم داماد بنانے والی ہو؟ تب اس نے کہا کہ وہ ریاست ارضِ اسلام کا شہزادہ عابد علی منگی ہے۔ میں اور اینڈی گارسن آپ کے صاحبزادے کا نام سنتے ہی پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ ہم تصدیق کرنا چاہتے ہیں' کیا پرنس عابد علی منگی سے جمائلہ کا رشتہ ہونے والا ہے؟''

ہم زاد نے کہا۔ ''یہ فضول سی بات ہے۔ میرا بیٹا ابھی گیارہ برس کا ہے۔ وہ آئندہ کئی برسوں تک شادی بیاہ کے بارے میں نہیں سوچے گا۔ ایک بار میرے پی اے نے کہا تھا کہ شائلہ نامی ایک خاتون سونے کی تاجر ہے۔ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے مصروفیات کے باعث گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تھا۔''

''ہو سکتا ہے، وہ آپ کے صاحبزادے سے رابطے میں ہو۔''

''میں بیٹے سے پوچھوں گا۔''

''ایک اور معاملہ ہے۔ سونے سے لدا ہوا ایک جہاز ہمارے جزیرہ سسلی سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر رکا ہوا ہے۔ جہاں اسے مال اتارنا تھا، وہاں آر ی آ گئی ہے۔ اب اس سونے کا اسمگلر سائمن گولڈی ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ دوسری طرف گریٹ آئی لینڈ پر شائلہ کی حکمرانی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ سائمن گولڈی مجبور ہو کر شائلہ سے ڈیل کرے۔ اس سے ہم ڈیل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سائمن ہم سے ڈیل نہیں کرے گا تو آدھی رات کے بعد ہمارے آدمی وہ سونا لوٹ کر لے آئیں گے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہم یقین کرنا چاہتے ہیں کہ پرنس عابی کا کوئی تعلق شائلہ سے نہیں ہے۔ اگر پرنس شائلہ اور اس کی بیٹی کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں تو ہم شائلہ کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اس جہاز میں جتنا بھی سونا ہے، ہم پرنس کی خاطر اس کے حصول سے باز آ جائیں گے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''میں ابھی بیٹے سے بات کروں گا۔ میری کال کا انتظار کرو۔''

اس نے رابطہ ختم کیا پھر بیٹے کو فون پر مخاطب کیا۔

''ہیلو عابی! یہ شائلہ اور اس کی بیٹی کا کیا معاملہ ہے؟''

عابی نے بتایا کہ شائلہ اس سے رابطہ کرنے اور تعلقات استوار کرنے کے سلسلے میں ناکام ہو رہی تھی۔ بابا جانی حماد نامی ایک جوان کے بہروپ میں اپنے طور پر اسے الجھا رہے ہیں۔

اس نے اپنے اور مراد کے بارے میں تمام معاملات تفصیل سے بتائے۔ یہ بھی بتایا کہ بابا جانی آئندہ ان ماں بیٹی سے کھیل کرنے والے ہیں۔ شائلہ پرنس کو داماد بنانے کے لیے یہودیوں سے ٹکرائے گی۔ اس طرح یہودیوں کے خلاف جلد ہی ایک نیا محاذ کھل جائے گا۔

موجودہ کھیل یہ ہے کہ حماد (مراد) نامی بہروپیا پرنس عابی کا استاد اور مشیر ہے۔ پرنس عابی اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا ہے اور یہ کہ شائلہ جب تک حماد کی شرط پوری نہیں کرے گی تب تک پرنس اس سے فون پر بات نہیں کرے گا اور شرط یہ ہے کہ شائلہ تھوک کر چاٹے اور وہ مغرور عورت ایسا کبھی نہیں کرے گی۔

فی الحال بات یہاں آ کر رکی ہے کہ شائلہ پھر ایک بار

حماد سے فون پر بات کر کے اسے منانا چاہتی ہے کہ وہ تھوک کر چاٹنے والی شرط بدل دے۔ کوئی دوسری بڑی سے بڑی شرط منوالے لیکن فون پر ابھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

چار گھنٹے بعد اس سے رابطہ ہونے والا تھا۔ اُدھر شائلہ انتظار کر رہی تھی اور فون پر سائمن گولڈی سے بول رہی تھی۔ ''یاد رکھو۔ مجھ سے ڈیل نہیں کرو گے تو آگے ریڈالرٹ کے بحری قزاق ہیں۔ وہ جہاز پر دھاوا بول کر تمام سونا لے جائیں گے۔ فوراً عقل سے کام لو۔ کپتان کو حکم دو کہ جہاز کو میرے آئی لینڈ کے قریب لے آئے۔ رات کی تاریکی میں میری مسلح فورس جہاز کو سیکیورٹی دے گی۔ وہ بحری قزاق اتنی دور میرے مقابلے پر نہیں آئیں گے۔''

سائمن نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں۔ تم سمندروں کی ملکہ ہو۔ ریڈالرٹ کے قزاق اپنی حدود سے باہر تمہارے مقابلے پر نہیں آئیں گے لیکن تم آدھا سونا حاصل کرنا چاہتی ہو۔ یہ بالکل ہی نامناسب ہے۔ پچیس پرسنٹ پر راضی ہو جاؤ۔ ورنہ ریڈالرٹ سے بھی ڈیلنگ ہو رہی ہے۔ تم میں سے جو پچیس پرسنٹ پر راضی ہوگا، میں اُدھر اپنا جہاز لے جاؤں گا۔''

شائلہ کے ایک ہاتھ میں ایک خوب صورت سی چھڑی تھی۔ وہ چھڑی سے کھیلنے کے انداز میں اسے اِدھر سے اُدھر لہرا رہی تھی اور فون پر باتیں کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں ٹہل رہی تھی۔ وہ چھڑی خالص چاندی کی تھی۔ اس کا دستہ خالص سونے کا تھا۔ اس میں قیمتی ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ انٹرکام سے کالنگ ٹون ابھری۔ اس نے فون بند کر کے انٹرکام کے بٹن کو دبایا۔ اس کے پی اے نے کہا۔ ''مسٹر اینڈی گارسن کا بھائی تحائف لے کر آیا ہے۔ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔''

''اسے آنے دو۔''

اس نے انٹرکام کو آف کیا پھر چھڑی ٹیکتی ہوئی ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بوڑھی نہیں تھی۔ محض شاہانہ غرور کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس چھڑی کو ہاتھ میں رکھتی تھی۔

ایک مسلح گارڈ نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ چار کنیزیں اپنے سروں پر چاندی کی تھال اٹھائے ایک قطار میں چلتی ہوئی اندر آئیں۔ پھر شائلہ کے سامنے جھک کر ان تھالوں کو اس کے قدموں کے پاس رکھ دیا پھر ان سے رنگین خوان پوش ہٹائے۔

شائلہ نے دیکھا چاندی کے تھالوں میں ہیرے موتی سے جڑے ہوئے زیورات اور دلہن کے قیمتی ملبوسات تھے۔ ایک تھال میں مٹھائیاں اور خشک میوے تھے۔ ایک اور تھال میں موسم کے تازہ پھل نظر آرہے تھے۔

کھلے ہوئے دروازے پر ایک قدآور شخص کھڑا تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''یہ خادم اینڈی گارسن کا بڑا بھائی ہے۔''

وہ دروازے سے اندر آیا۔ کنیزیں باہر چلی گئیں۔ مسلح گارڈ نے بھی باہر جا کر دروازے کو بند کر دیا۔ شائلہ نے چھڑی ٹیک کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے رشتے سے انکار کیا تھا پھر میرے پاس یہ کچرا لے کر کیوں آئے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''میں کیا بول سکتا ہوں۔ بھائی بولے گا اور ابھی بولے گا۔ جسٹ اے منٹ۔''

اس نے اپنا فون نکال کر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ''بھائی! میں میڈم کی خدمت میں حاضر ہوں۔''

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر اپنا فون بند کر کے بولا۔ ''آپ کے فون پر کال آنے والی ہے۔ بائی دا وے آپ نے اپنے لیے بڑے سخت حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ یہاں کوئی ہتھیار چھپا کر نہیں لا سکتا۔''

پھر وہ ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے جیسے شہ زوروں کے لیے ہتھیار لازمی نہیں ہوتے۔ میں ایک ہاتھ سے کسی کی گردن دبوچ لوں تو وہ پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہے۔ دم نکلنے کے بعد ہی گرفت سے نکلتا ہے۔''

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ شائلہ نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے اینڈی گارسن نے کہا۔ ''میں اپنی ہونے والی خوش دامن صاحبہ کو سلام کرتا ہوں۔''

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''اینڈی! میں نے انکار کیا تھا۔''

''بے شک۔ جب تم نے کہا کہ مراد علی منگی کے بیٹے سے اپنی بیٹی کا رشتہ کر رہی ہو تو میں پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن تم نے مجھے ٹالنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے، پرنس جالی سے رشتہ ہونا تو دور کی بات ہے تم ان سے دو باتیں بھی نہیں کر سکتی ہو۔ تم نے مراد علی منگی سے فون پر گفتگو کرنا چاہی تھی لیکن اس نے تمہیں گھاس بھی نہیں ڈالی۔ کیوں اپنی پرواز سے زیادہ اونچی اڑنا چاہتی ہو۔ مراد علی منگی کو کوئی مجرم کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ ایک ریاست کا حکمران بن گیا ہے۔ پلیز عقل سے کام لو۔ مجرمانہ اوقات میں رہ کر مجھے داماد بنا لو۔''

"یہ درست ہے کہ مراد علی شنگی نے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں اپنی توہین کا بدلہ لینا جانتی ہوں۔ میں نے اس کے بیٹے سے رابطہ کرلیا ہے اور میں جانتی ہوں کہ اسے کیسے شیشے میں اتاروں گی۔ اپنے بھائی سے بولو یہ تحائف اٹھا کر یہاں سے دفع ہوجائے۔"

"میڈم! میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا بھائی ابھی تمہاری گردن دبوچ لے گا تو سیکیورٹی گارڈز تمہیں اس کے شکنجے سے نہیں چھڑا سکیں گے۔ تم زندگی کی بھیک مانگو گی پھر زندگی اس طرح ملے گی کہ تم بھائی کے شکنجے میں یہاں میرے پاس آؤ گی پھر ساس بننے کے بعد واپس جاسکو گی۔"

شائلہ نے سامنے کھڑے ہوئے قدآور شخص کو دیکھ کر پوچھا۔ "تم کہتے ہو یہ بہت شہ زور ہے۔ میں اس کی شہ زوری کو پہلے آزماؤں گی۔"

"ضرور آزماؤ لیکن کسی گارڈ کو بلانا چاہو گی تو یہ تمہاری گردن دبوچ لے گا۔"

"میں یہاں تنہا رہوں گی۔ کسی کو کال نہیں کروں گی۔ میرے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے۔ اگر یہ اس چھڑی کو مجھ سے چھین لے گا تو ہار مان کر تمہیں داماد بنالوں گی۔"

سامنے کھڑے ہوئے باڈی بلڈر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اسے تو ایک چٹکی میں لے کر تمہارے ہاتھ سے چھین لوں گا۔"

شائلہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دستے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے چھڑی اس کی طرف بڑھائی۔ شہ زور نے اس کے آخری سرے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف ایک جھٹکے سے کھینچا۔ وہ بڑی آسانی سے اس کے ہاتھ میں آگئی لیکن.....

چاندی کا خول اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔ اس کے اندر سے دودھاری تلوار نکل آئی تھی۔

وہ ننجا کی ماہر تھی۔ ہُو ہُو ہا ہا کی آوازیں نکالتی ہوئی اتنی پھرتی سے پینترے بدل رہی تھی کہ دیکھنے والی نگاہیں ایک جگہ ٹھہر نہیں پا رہی تھیں۔ تلوار کا پھل بجلی کی طرح ادھر سے ادھر لپک رہا تھا۔ اسے سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی۔ تلوار کی نوک اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزرتی ہوئی اس کے نرخرے کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔

کٹے ہوئے نرخرے سے سانسوں کی آواز نکلنے لگی۔ وہ گر پڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے حلق کو دبا رہا تھا۔ کٹے ہوئے نرخرے کو ایک دوسرے سے ملا کر سانسوں کو پھیپھڑوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت تلوار کی نوک دوسری بار وہاں سے گزری اور دونوں کلائیوں کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ وہ ہزاروں ڈالرز کے قیمتی قالین پر لہو میں بھیگتے ہوئے پھڑ پھڑانے لگا۔ سانسوں کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ذرا دیر تڑپنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگیا۔

شائلہ اسے چند لمحوں تک گھورتی رہی پھر اس نے تلوار کے لہو کو مقتول کے لباس سے اچھی طرح صاف کیا۔ اسے چاندی کے خول میں ڈال کر دوبارہ چھڑی بنائی۔ پھر سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے کالنگ بیل کے بٹن کو دبایا۔

دو مسلح گارڈز فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر آئے پھر لاش کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ شائلہ نے حقارت سے کہا۔ "اس کتے کے مردہ وجود کو غائب کردو۔ قالین کو تبدیل کرادو اور اس کے فون سے سم نکال کر پھینک دو۔"

وہ حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ دوسرے ملازم بھی آگئے۔ وہ چھڑی ٹیکتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ مسلح گارڈز لاش کو اٹھاتے ہوئے حیرانی سے سوچ رہے تھے کہ میڈم کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے پھر اسے کس طرح لہو میں ڈبو دیا ہے؟

وہ اپنی مالکہ سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ چپ چاپ حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ شائلہ شانی نے دوسرے کمرے میں آکر فون پر اینڈی گارسن سے کہا۔ "تمہارا بھائی واقعی شہ زور ہے۔ اس نے میرے ہاتھ سے چھڑی چھین لی تھی۔ میں ہار مان کر تمہارا رشتہ منظور کررہی ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ برات میں اپنے بھائی کو ضرور لاؤ گے۔"

اس نے پوچھا۔ "بھائی کہاں ہے؟ بات کراؤ۔"

اس نے فون بند کردیا۔ دس منٹ کے بعد اینڈی نے کال کی۔ بڑی بے چینی سے چیخ کر پوچھا۔ "ہیلو۔ بھائی سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔ اس کا فون خاموش کیوں ہے؟"

"میں کیا جانوں کیوں خاموش ہے؟"

"تم نے رشتہ منظور کیا ہے۔ وہ اتنی بڑی خوش خبری مجھے ضرور سناتا لیکن رابطہ ہی نہیں ہورہا ہے۔ وہ بولتا کیوں نہیں ہے؟"

"یہ تو وہی بولے گا کہ بولتا کیوں نہیں ہے؟ میں ایک ہی بات جانتی ہوں۔ برات میں بھائی کو ساتھ لاؤ گے، تب ہی بیٹی دوں گی۔ ورنہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

اس نے فون بند کرکے اسے صوفے پر پھینک دیا۔

☆☆☆

عابی سے باتیں کرنے کے بعد ہمزاد کی سمجھ میں آگیا کہ مراد کس طرح شائلہ کے ساتھ گیم کھیلنا چاہتا ہے۔ اس

نے ریڈ الرٹ کے سربراہ جیکی براؤن سے فون پر کہا۔ ''میں اپنے بیٹے سے معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ اسے شائلہ اور اس کی بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن دیکھنا چاہتا ہوں کہ شائلہ کس حد تک خطرناک ہے۔ میں اپنے طور پر اس سے گیم کھیلنا چاہتا ہوں۔''

''آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟''

''میں چاہتا ہوں، سونے سے لدے ہوئے اس جہاز کو شائلہ تک نہ پہنچنے دو۔ اگر وہ تم سے کوئی سودا کرنا چاہے تو اس سے کہو کہ جناب حماد علی تمہارے پیر و مرشد ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر تم کسی طرح کی ڈیل نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے، میں یہی کہوں گا۔''

''شائلہ کے لیے ایسی رکاوٹیں پیدا کرو کہ وہ کم سے کم پرسنٹیج پر سونا حاصل کرنے پر راضی ہو جائے۔''

''او کے۔ میں یہی کروں گا لیکن مراد صاحب! وہ سونا میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''جیسا کہ تم نے کہا ہے، وہ سائمن گولڈی کا آدھا سونا حاصل کرنا چاہتی ہے، یعنی ففٹی پرسنٹ چاہتی ہے۔ تم ریٹ گرا دو۔ چالیس پرسنٹ کا مطالبہ کرو۔''

''پھر وہ بھی ریٹ گرائے گی۔''

''تم اور بھی ریٹ گراؤ گے۔ وہ ضدی اور بہت غصے میں آنے والی عورت ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرے گی۔ ان حالات کے مطابق میں تم سے جو کہوں گا' تم وہ کرو گے۔''

''آل رائٹ...... ہم شائلہ شانی سے پلے کریں گے۔''

ادھر مراد اور جمائلہ کا سفر تمام ہوا۔ وہ پیرس پہنچ گئے۔ سفر کے دوران میں جمائلہ نے اس سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ حماد کے بہروپ میں ہو۔ حقیقت میں کیا ہو؟

اس نے اپنے بارے میں سچ کہا تھا۔ ''میں بہروپیا نہیں ہوں۔ حماد کا ہم شکل ہوں۔ نام میرا کچھ اور ہے۔ میں حماد کا پاسپورٹ لے کر پیرس جا رہا ہوں۔''

اب وہ پیرس پہنچ کر بولی۔ ''پرنس نے مام سے کہا ہے کہ تم اس کے استاد اور مشیر ہو لیکن تم کوئی بزرگ اور استادوں جیسے تو نہیں لگ رہے ہو؟ تم پرنس تک کیسے پہنچ گئے ہو؟''

''سوری۔ میں اپنے پرسنل معاملات کسی کو نہیں بتاتا۔ کوئی اور بات کرو۔ خوانخواہ انکوائری نہ کرو۔''

''میری مام کو غصہ نہ دلاؤ۔ دوستی کر لو۔''

''میں چاہتا ہوں، تمہاری ماں غصے میں پاگل ہو جائے۔''

''تم نہیں جانتے' وہ کیسی خطرناک بلا ہیں۔ وہ جب چاہیں گی' تمہاری سانسیں چھین لیں گی۔''

''چلو میں تمہاری ماں سے ڈرتا رہوں گا۔ تم خوش ہو جاؤ۔''

وہ جھنجلا گئی۔ مراد اس کی مام کو کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اسے دوستی کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ ماں کو کال کرنے لگی۔

مراد نے فون پر عالی سے پوچھا۔ ''کیا حالات ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''آپ بابا سے بات کریں۔''

مراد نے ہم زاد سے رابطہ کیا۔ وہ اسے ریڈ الرٹ' شائلہ شانی اور سائمن گولڈی کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔ ادھر شائلہ نے بیٹی سے کہا۔ ''حماد سے بات کراؤ۔''

اس نے دور مراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہا ہے۔''

''اس سے بولو، میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ مراد کے پاس آ کر بولی۔ ''پلیز میری مام سے بات کرو۔''

وہ بولا۔ ''تم دیکھ رہی ہو کہ میں اہم باتوں میں مصروف ہوں۔ اپنی مام سے کہو انتظار کریں۔''

وہ فون پر بولی۔ ''مام! یہ اپنے اہم معاملات میں مصروف ہے۔ پتا نہیں کس سے باتیں کر رہا ہے۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔''

''شٹ۔'' وہ ناگواری سے بولی۔ ''وہ ٹکے کا آدمی مجھ سے زیادہ کسی اور کو اہمیت دے رہا ہے۔ پتا نہیں وہ کب تک کسی سے باتیں کرتا رہے گا۔''

''مام! مجھے بھی اپنی توہین محسوس ہو رہی ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی اور یہ کمبخت مجھ سے خوشامدیں کرا رہا ہے۔''

مراد ہم زاد سے معلومات حاصل کرنے کے بعد دوسرے نمبر پنچ کرنے لگا۔ جمائلہ نے فوراً ہی قریب آ کر کہا۔ ''اب تو مام سے بات کر لو۔''

وہ بولا۔ ''جسٹ اے منٹ۔ یہ بھی ضروری کال ہے۔''

ماسٹر کو بوبو کے کارندے اسے سیکیورٹی دینے کے لیے ائرپورٹ کی عمارت کے اندر اور باہر موجود تھے۔ مراد ابھی باہر نہیں نکلا تھا' لاؤنج ہال میں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''ہاں' کیا پوزیشن ہے؟''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''سر! اس شہر کے تمام مجرم اور کرائے کے شوٹرز ہمیں جانتے ہیں اور ہم انہیں جانتے ہیں۔ اس وقت تین تھرڈ ریٹ قسم کے شوٹرز ہماری نظروں میں

ہیں۔ ان میں سے ایک وزیٹرز لابی میں ہے اور دو یہاں سے باہر ٹہل رہے ہیں۔ ہمارے ساتھی انہیں گن نکالنے نہیں دیں گے۔"

مراد نے فون بند کردیا۔ اپنی اٹیچی کیس اور سفری بیگ ایک ٹرالی پر رکھتے ہوئے ثمائلہ سے کہا۔ "میں باہر وزیٹرز لابی میں پہنچ کر تمہاری ماں سے بات کروں گا۔"

"میں باہر نکلتے ہی تم سے دور ہوجاؤں گی۔ سخت سیکیورٹی میں یہاں سے جاؤں گی۔"

"سخت سیکیورٹی اس لیے ہے کہ تمہاری ماں کے حکم سے جو گولی میری طرف آئے گی' وہ غلطی سے تمہیں نہ لگے۔ اسی لیے تمہیں مجھ سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

ثمائلہ تیج ہال سے باہر آتے ہی دو باڈی گارڈز کے ساتھ چلتی ہوئی وزیٹرز لابی سے گزر کر ایک کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی پھر اس نے فون پر پوچھا۔ "کیا آپ کے آدمی یہاں اتنی بھیڑ میں اس پر گولی چلائیں گے؟"

شمائلہ شانی نے کہا۔ "وہ مجھ سے سمجھوتا نہیں کرے گا تو یہیں حرام موت مرے گا لیکن اب تک اس سے بات نہیں ہوئی ہے۔ بات ہوگی تو معلوم ہوگا کہ وہ ہم سے راضی ہے یا نہیں؟ ابھی اس کی موت ٹل رہی ہے۔"

"مام! میں اس کا فون نمبر بھیج رہی ہوں۔ اب وہ ضرور بات کرے گا۔"

ادھر ماسٹر اور شمائلہ کے کارندوں کے درمیان معاملات طے ہو رہے تھے۔ ماسٹر کے ایک کارندے نے ان سے پوچھا۔ "تمہارا ٹارگٹ کون ہے اور کہاں ہے؟"

شمائلہ کے کارندے نے کہا۔ "وہ جو بلیو جینز اور وائٹ شرٹ میں ہے اور ہنڈا اکارڈ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے جارہا ہے۔"

شمائلہ کے تینوں شوٹرز اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے بول رہے تھے۔ ماسٹر کے آدمی نے کہا۔ "وہی وائٹ شرٹ والا ہمارا بھی شکار ہے لیکن ماسٹر نے تاکید کی ہے کہ اس سے سمجھوتا نہیں ہوگا، تب ہم اسے گولی ماریں گے۔"

دوسرے کارندے نے کہا۔ "میڈم نے بھی ہم سے یہی کہا ہے کہ ہم اس کا تعاقب کرتے رہیں۔ جب وہ حکم دیں گی تب اسے گولی ماریں گے۔ ورنہ زندہ رہنے دیں گے۔"

ماسٹر کے آدمی ان کی گاڑی میں گھس کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "یہاں کیوں گھس رہے ہو۔ اپنی گاڑی میں جاؤ۔"

ماسٹر کے کارندے نے کہا۔ "ماسٹر ہمیں حکم دے گا کہ اس سے سمجھوتا ہوگیا ہے اسے قتل نہ کریں اور میڈم تمہیں حکم دے گی کہ قتل کرو تو ہم تمہیں گولی چلانے نہیں دیں گے۔"

یہ ایسی پوزیشن تھی کہ سب نے اپنی گنیں نکال لیں۔ سب ایک دوسرے کے نشانے پر آگئے۔ ایک نے کہا۔ "ہم بعد میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ پہلے گاڑی آگے بڑھاؤ۔ وہ ہنڈا اکارڈ جارہی ہے۔"

ان کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ دوست اور دشمن مراد کے تعاقب میں جانے لگے۔ ایک نے کہا۔ "ہم سب کرائے کے شوٹرز ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ میڈم اور ماسٹر اس شخص حماد سے کس طرح کی ڈیلنگ کر رہے ہیں۔"

دوسرے نے اپنی گن کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے میڈم اور ماسٹر ایک دوسرے کے مخالف ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کے مقاصد ایک ہوں۔ ویسے ہمیں ان کی ڈیلنگ سے کیا لینا ہے؟ اپنی بات کرو۔"

ایک اور کارندے نے کہا۔ "ہمیں آپس میں لڑنا مرنا نہیں چاہیے۔ ہم پیشگی رقم لے چکے ہیں۔ تم لوگوں نے بھی پیمنٹ لی ہوگی۔ اب دیکھنا ہے کہ باقی پیمنٹ کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے؟ میں ابھی میڈم سے پوچھتا ہوں۔"

اس نے شمائلہ شانی سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا فون انگیج ہے۔ ماسٹر کے آدمی نے بھی ایک مس کال دے کر کہا۔ "ماسٹر بھی مصروف ہے۔ ہم حماد کا تعاقب کرتے رہیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ان سے رابطہ کریں گے۔"

مراد کار کی پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ شمائلہ نے اس سے رابطہ کیا۔ بڑے ہی ٹھنڈے میٹھے لہجے میں بولی۔ "حماد! تم کمال کے آدمی ہو۔ پرنس عالی کہہ رہے تھے کہ تم ان کے استاد اور مشیر ہو۔ میں حیران ہوں۔ میں نے تھوکنے والی بات کہہ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ پلیز میری اس غلطی کو درگزر کردو۔"

"اچھی بات ہے۔ میرا دین سمجھاتا ہے کہ کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ شرمندہ ہو تو اسے معاف کردینا چاہیے۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔"

شمائلہ کے غرور کو ٹھیس پہنچی۔ اس نے کہا۔ "پلیز میرے اسٹیٹس کو سمجھو۔ میں گرے ہوئے لوگوں کی طرح معافی نہیں مانگ رہی ہوں۔ پلیز! میرے شایانِ شان الفاظ استعمال کرو۔ جو ہوگیا اسے درگزر کردو۔"

"غلطیاں کرنے والوں کا کوئی اسٹیٹس نہیں ہوتا۔ کوئی شان و شوکت نہیں ہوتی۔ جب اسے معافی مل جائے، تب ہی اس کی سابقہ حیثیت بحال ہوتی ہے۔"

"پلیز! ایک معمولی سی بات کو طول نہ دو۔"

''غلطی چھوٹی ہو یا بڑی' وہ معمولی نہیں ہوتی۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہوگی۔ تھوکنے کی غلطی کی ہے تو اسے چاٹو یا پھر معافی مانگو۔ سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟''

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ غصے سے چیخ پڑی۔ اسے گالیاں دیتی ہوئی ادھر سے ادھر پاؤں پٹخ کر جانے لگی۔ بیڈروم کے باہر گارڈز کھڑے ہوئے اس کے منہ سے چیختی ہوئی گالیاں سن رہے تھے۔ جب تک وہ کال نہ کرتی، کوئی اندر نہیں جاسکتا تھا۔ کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا کہ وہ کس عذاب میں مبتلا ہے اور اپنے بیڈروم کے در و دیوار کو کیوں گالیاں دے رہی ہے؟

اس نے فون اٹھا کر اپنے ایک شوٹر کو حکم دیا اور چیخ کر بولی۔ ''اس کتے کو گولی مار دو۔''

شوٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کک..... کتے کو ماریں؟ آپ نے تو حماد کو مارنے کی ڈیل کی ہے۔''

وہ اور زیادہ چیخ پڑی۔ ''میں اسی کتے کی بات کر رہی ہوں۔ کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے؟ کیا اس کا تعاقب کر رہے ہو؟ کیا وہ تمہاری نظروں میں ہے؟''

''ہاں۔ وہ آگے ایک ہنڈا اکارڈ میں جا رہا ہے لیکن ایک پرابلم ہے۔ ماسٹر کو بوبو کے آدمی بھی اس کا تعاقب کرنے کے لیے ہماری گاڑی میں آگئے ہیں۔''

''وہ تمہاری گاڑی میں کیوں ہیں؟''

''وہ کہتے ہیں' ماسٹر حکم دے گا تو حماد کو گولی ماریں گے ورنہ اسے زندہ رکھیں گے اور ہمیں بھی گولی چلانے نہیں دیں گے۔''

''وہاٹ نان سنس؟ کیا تم لوگ ماسٹر کے آدمیوں کے مقابلے میں کمزور ہو؟''

''نہیں میڈم! ہمارے ہاتھوں میں بھی گنیں ہیں۔ یہ ہمارے نشانے پر ہیں اور ہم ان کے نشانے پر ہیں۔ آپ کا اور ماسٹر کا فیصلہ ایک ہی ہوگا تو ہم حماد کو گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ میڈم! آپ کا حکم ہے اسے گولی مار دیں۔ اب ماسٹر کے حکم کا انتظار ہے۔ اگر وہ کہے گا کہ اسے نہ مارو تو ہم یہاں مشکل میں پڑ جائیں گے۔ ہم ایک دوسرے کے نشانے پر ہیں اور ہم میں سے کوئی حرام موت مرنا نہیں چاہے گا۔''

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' شائلہ شانی کا دماغ پھٹ پڑا۔ اس کے شوٹرز ناکام ہونے والے تھے۔ حماد نشانے پر ہوتے ہوئے بھی زندہ رہنے والا تھا۔ وہ چیخ پڑی۔ ''آخر یہ کتا ہے کون؟ یہ ماسٹر ہمارے درمیان کیوں کود پڑا ہے؟''

اس نے فوراً ہی ماسٹر کے نمبر پنچ کیے۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ وہ بولی۔ ''ماسٹر! میں شائلہ شانی بول رہی ہوں۔ آپ کے کارندے میرے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ میرے آدمیوں کو گولیاں چلانے سے روک رہے ہیں۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''اچھا تو وہ تمہارے شوٹرز ہیں۔ تم ظل سبحانی حماد علی سے دشمنی کرنے کی غلطی کیوں کر رہی ہو؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم اس حماد کا نام اتنی عزت اور تعظیم سے کیوں لے رہے ہو؟''

''گاڈ از گریٹ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ میرے پیر و مرشد' استاد محترم اور مشیر اعلیٰ ہیں۔''

شائلہ کا منہ شدید حیرانی سے کھل گیا۔ جرائم کی دنیا میں دی ماسٹرز سنڈیکیٹ ایک ایسی طاقتور تنظیم تھی جو ریڈ الرٹ اور اس کے اتحادیوں سے ٹکراتی تھی اور ہمیشہ ان پر بھاری پڑتی تھی۔ اس تنظیم کا ماسٹر' حماد کو اپنا پیر و مرشد کہہ رہا تھا اور جرائم کی دنیا میں ناقابل شکست کہلانے والے مراد علی منگی کا بیٹا پرنس عابد علی منگی بھی حماد کو اپنا استاد اور مشیر کہہ چکا تھا۔

شائلہ نے پوچھا۔ ''یہ حضرت ہیں کون؟ میں پہلی بار ان کا نام سن رہی ہوں۔ حیران ہوں کہ پرنس عابد علی منگی بھی آپ کے پیر و مرشد کو اپنا استاد اور مشیر کہہ رہے تھے۔ پلیز ان کے بارے میں کچھ بتائیں۔ یہ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں؟''

ماسٹر نے کہا۔ ''پیر و مرشد جس ملک میں جاتے ہیں، وہاں ان کا سکہ چلنے لگتا ہے۔ وہ اب تک گوشہ نشین تھے۔ اب کچھ اہم دنیاوی معاملات سے نمٹنے کے لیے منظر عام پر آئے ہیں۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ ان کی دشمن بن کر رہنے سے باز آجائیں۔''

ماسٹر نے فون بند کر دیا پھر اپنے کارندے سے رابطہ کر کے حکم دیا۔ ''حماد کا تعاقب کرنے والوں کو روک دو۔ کھیل ختم کر دو۔''

اس کارندے نے ڈرائیو کرنے والے کو نشانے پر رکھ کر کہا۔ ''گاڑی روکو۔ ماسٹر کا حکم ہے کہ حماد کو سلامتی دی جائے۔''

گاڑی رک گئی۔ وہ سب ہاتھوں میں گن لیے ایک دوسرے کے نشانے پر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ مراد کی ہنڈا اکارڈ کو دور جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ایک نے اپنے ریوالور کو لباس کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم پاگل نہیں ہیں کہ مرنے کے لیے گولیاں چلائیں۔''

دوسرے نے بھی اپنا ریوالور لباس میں چھپاتے ہوئے کہا۔ ''ہم لائف انجوائے کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب تک جی سکتے ہیں' جینا چاہیے۔''

ماسٹر کے کارندے ان سے مصافحہ کرکے گاڑی سے باہر آگئے۔ ان کی ایک گاڑی پیچھے آرہی تھی۔ انہوں نے دانش مندی سے کام لیا تھا۔ ان کے راستے سلامتی سے الگ ہوگئے تھے۔

شائلہ شانی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ جسے ایک معمولی آدمی سمجھ رہی تھی، وہ خاص لوگوں سے زیادہ خاص تھا۔ اسے پیرومرشد کہا جارہا تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اس جوان پیر بابا کی خوشنودی حاصل کیے بغیر پرنس عابی سے بات بھی نہیں کرسکے گی۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچنے لگی: میں معلوم کروں گی کہ یہ کون ہے؟ اچانک کہاں سے آٹپکا ہے؟ جب تک یہ رہے گا' پرنس کے معاملے میں میری دال نہیں گلنے دے گا۔'

ویسے جو منزل سیدھے راستے سے نہ ملے' وہ چور راستے سے مل جاتی ہے۔ وہ تھک جانے والی اور ہار مان جانے والی عورت نہیں تھی۔

اس کے دستِ راست رائٹ مین نے فون پر کہا۔ ''میڈم! حیرانی کی بات ہے۔ ریڈ الرٹ کے جیکی براؤن نے پرسنٹیج گرادیا ہے۔ اس نے سائمن گولڈی سے کہا ہے کہ صرف تیس پرسنٹ سونا لے گا۔ باقی ستر فیصد کی فوری پیمنٹ کرکے جہاز کا تمام سونا اپنے پورٹ میں ان لوڈ کرائے گا۔''

''میں جیکی سے ابھی بات کرتی ہوں۔''

اس نے جیکی براؤن کے پرسنل فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ ''میں شائلہ شانی بول رہی ہوں۔''

اس نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ ''مائی پلیژر میڈم۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آپ کروڑوں ڈالرز کا سونا ہارنا نہیں چاہیں گی۔ مجھ سے کوئی ڈیل کریں گی۔''

وہ بولی۔ ''اب سے پہلے تمہارے بحری قزاقوں نے ایک جہاز کو لوٹ لیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ اس بار لوٹ مار نہیں کررہے ہو۔ سونے کے مالک کو ستر فیصد کی پیمنٹ کررہے ہو۔''

''بے شک میں اس بار بھی جہاز کا تمام سونا لوٹ کر لے جاسکتا تھا لیکن عزت مآب محترم حماد علی کے حکم سے مجبور ہوکر اسے ستر فیصد مال کی پیمنٹ کررہا ہوں۔''

پھر ایک بار شائلہ کی کھوپڑی گھوم گئی۔ وہ شدید حیرانی سے بولی۔ ''تم حماد علی کے حکم سے مجبور ہوگئے؟ یہ حماد ہے کون؟''

''پلیز! ان کا نام ادب سے لو۔ وہ میرے پیرومرشد ہیں۔''

پھر ایک بار اس کا منہ حیرانی سے کھلا رہ گیا۔ رومانیہ میں وہی پیر' پیرس سے لے کر جنوبی افریقا کے شہر سن سٹی میں بھی وہی پیر' بحیرۂ روم کے جزیرے سسلی میں ریڈ الرٹ کا بھی وہی پیر......

جیکی براؤن نے آواز دی۔ ''ہیلو میڈم! چپ کیوں ہوگئیں؟ زندہ تو ہو نا؟''

وہ چونک کر اپنے فون کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آں...... ہاں۔ میں تمہارے پیرومرشد سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''وہ صرف اپنے مریدوں سے ملتے ہیں۔''

''میں ان کی مرید بننا چاہتی ہوں۔''

''نو پرابلم۔ اس کا فون نمبر نوٹ کرو اور خود ان سے باتیں کرو۔''

''میرے پاس ان کا نمبر ہے۔ میں باتیں کرچکی ہوں لیکن وہ میرے مزاج کے خلاف ایسی بات کہہ رہے ہیں جسے میں مان نہیں سکتی لیکن میں کسی بھی طرح ان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم جھوٹ بول کر کبھی دوستی نہیں کرسکو گی۔ سچ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کے مزاج کے خلاف نہیں بولتے ہیں۔ تم نے ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات کی ہوگی۔ تم کتنی مغرور اور بددماغ ہو، یہ سب ہی جانتے ہیں۔ ہمارے پیرومرشد بھی جان گئے ہیں۔ وہ تمہیں منہ نہیں لگائیں گے۔''

جیکی براؤن نے رابطہ ختم کردیا۔ شائلہ اپنے خاموش فون کو دیکھ کر ہونٹوں کو سختی سے بھینچنے لگی۔ وہ خود کو برتر سمجھتی تھی مگر حماد اسے کمتر بنا چکا تھا۔ وہ ہر کوشش کے بعد اپنے ہونے والے داماد پرنس عابی سے دور ہوتی جارہی تھی۔

وہ پرنس جیسے ناقابلِ شکست شہ زور داماد کی ساس بن کر اس زمین کی تمام قوتوں کو زیر کرسکتی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ بے چینی اور ناگواری تھی کہ حماد پیرومرشد بن کر عابی کو اپنے زیراثر لے آیا ہے اور پرنس پر ایسی مضبوط گرفت رکھی ہے کہ وہ حماد کی اجازت کے بغیر کسی سے بات بھی نہیں کرتا ہے۔

وہ سوچ رہی تھی پلاننگ کرنے سے مشکلات دور ہوتی ہیں۔ جو ناممکن ہے، وہ ممکن ہوجاتا ہے۔ اس دنیا میں بڑے بڑے کرشمے اور کرامات دکھانے والے عامل کامل ہیں۔ میں کسی ماہر گرو گھنٹال کو پکڑوں گی۔ وہ پرنس کو اپنے پُراسرار عمل سے میرا تابعدار بنا سکے گا۔

اس نے پی اے کو حکم دیا کہ دوسرے دن پیرس جانے کے لیے جہاز میں سیٹ او کے کرائے۔ اب وہ خم ٹھونک کر اس کے سامنے اس کے مقابلے پر آنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

انسان اپنی چالیں چلتا ہے۔ تقدیر اپنا کھیل کھیلتی ہے..... وہ پرنس کو ٹریپ کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں تلی تھی۔ بار بار ناکام ہو رہی تھی پھر اچانک کایا پلٹ ہو گئی۔ تقدیر نے اچانک ہی اس کے من کی مرادیں پوری کر دیں۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ پرنس عابی بھی اسی فلائٹ سے پیرس جا رہا ہے۔ جب وہ بورڈنگ کارڈ لینے گئی تو اسے دور سے پہچان گئی۔ وہ دو روز پہلے اسے ٹی وی چینلز کے ذریعے دیکھا تھا اس کے برعکس عابی نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ فی الحال اس کے لیے ایک عام سی اجنبی خاتون تھی۔

بورڈنگ کارڈز کے کاؤنٹر پر جو خاتون تھی، وہ شائلہ کی شناسا تھی۔ اس نے فوراً ہی فون کے ذریعے اسے کہا۔ ''روبینہ! میں شائلہ بول رہی ہوں۔ ایک خوبرو جوان عابد علی منگی اپنا کارڈ لینے آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ والی سیٹ میرے لیے رکھو۔''

اس نے کہا۔ ''او کے میڈم!''

عابی کے ساتھ کریگ ہوسٹن اور دوسرے یہودی اکابرین تھے لیکن اس سے فاصلہ رکھتے تھے۔ وہ برلاڈ شہر میں بھی ان سے دور تنہا ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ اس وقت بھی پیرس تک تنہا آزادی سے سفر کرنے والا تھا۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک گروپ ہنستا بولتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ''ہائے پرنس! کہاں جا رہے ہو؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میری منزل پیرس ہے۔''

ایک لڑکے نے کہا۔ ''ہم اسکیٹنگ کمپٹیشن میں حصہ لینے کے لیے سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں۔''

ایک لڑکی نے کہا۔ ''پرنس.....! ہم سب تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم سب محبت کرنے والوں سے میں بھی محبت کرتا ہوں لیکن پیرس جانا ضروری ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ جنیوا تک ہمارا ساتھ رہے گا۔''

جہاز کے اندر ان سب کی سیٹیں پرنس کے آگے پیچھے تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر شائلہ شانی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے اجنبی مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا پھر عابی نے کہا۔ ''خواتین کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سفر کو انجوائے کرتی ہیں۔ آپ چاہیں تو میری سیٹ پر آ سکتی ہیں۔''

وہ اس کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تھینک یو میرے بچے! تم خواتین کا بہت خیال رکھتے ہو۔''

عابی اس کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔ فون پر ہونے والی گفتگو، اس کی آواز اس کا لہجہ اس کے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو گیا تھا۔ وہ اس لیے بھی یاد رہ گئی تھی کہ محترمہ ساس بننے کی ضد کرتی آ رہی تھی۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگا۔ 'یہ عورت کیسی مکار اور تیز طرار ہے۔ میرے قریب آنے اور مجھ سے باتیں کرنے کا راستہ نکال ہی لیا۔ اب دیکھتا ہوں' یہ کیا گل کھلانے والی ہے؟'

نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی ٹولی عابی کے چاروں طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی زندہ دلی سے بول رہے تھے اور عابی کو بھی اپنے ہنسی مذاق میں شریک کر رہے تھے۔ ایک لڑکی عابی کے دوسری طرف والی سیٹ پر آ گئی تھی۔ اس کا بازو تھام کر بولی۔ ''میں تمہیں ایک جوک سناتی ہوں۔''

وہ اس کے ہاتھ کو اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''پلیز! مجھ سے فاصلہ رکھو۔''

اس بات پر اس کے آگے پیچھے قہقہے بلند ہوئے۔ ایک جوان نے کہا۔ 'میں نے سنا ہے ٹی وی پر کمنٹری کرنے والا کہہ رہا تھا کہ تم ابھی گیارہ برس کے ہو۔''

ایک لڑکی نے کہا۔ ''چھ فٹ کا باڈی بلڈر اور گیارہ برس کا بچہ؟ اٹ مسٹ بی اے جوک۔''

دوسری لڑکی نے کہا۔ ''دنیا میں جتنے بھی آنکھوں والے ہیں' وہ پرنس کو دیکھ کر کبھی ایک بچہ تسلیم نہیں کریں گے۔''

عابی نے مسکرا کر کہا۔ ''تسلیم نہ کریں۔ جو نہیں کریں گے' وہ دھوکا کھائیں گے۔''

وہ شائلہ کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پچیس برس کی ایک جوان لڑکی کی ماں بھی یہ نہیں مانتی کہ میں گیارہ برس کا ہوں۔ تم سب حساب لگاؤ کہ اس لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں جو مجھ سے چودہ برس بڑی ہے۔''

ایک جوان نے اپنی انگلیوں کو گنتے ہوئے کہا۔ ''اس حساب سے تمہیں پہلے جوان ہونا ہوگا۔''

''میں اس سے شادی کرنے کے لیے پچیس برس کا ہو جاؤں گا تو وہ لڑکی انتالیس برس کی ہو جائے گی۔ میں جوان ہوتا رہوں گا، وہ بوڑھی ہوتی جائے گی۔''

شائلہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ''واقعی اس لڑکی کی ماں کو عقل سے سوچنا چاہیے۔''

ایک اور لڑکی نے کہا۔ ''لیکن پرنس! تم تو پچیس برس

کے گبرو جوان لگتے ہیں۔''

شمائلہ نے کہا۔ ''لڑکیو سنو...... ! حقیقت یہ ہے کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

کئی لڑکیوں نے تائید کی۔ ایک نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ ''مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ آنٹی نے زبردست بات کہی ہے۔''

شمائلہ نے مسکرا کر چور نظروں سے عابی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی طرح مرد بچہ نہیں ہوتا۔ پرنس کی شادی بھی اس پچیس برس کی لڑکی سے ہو جائے تو میں دعوے سے کہتی ہوں، یہ پرنس دس ماہ بعد ایک بچے کے باپ بن جائیں گے۔''

اس بات پر تمام لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں۔ شمائلہ مسکرا رہی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ''پرنس! مجھ سے شادی کرلو۔''

دوسری لڑکی نے کہا۔ ''پرنس! میں بھی یہی دعویٰ کرتی ہوں' مجھ سے بھی شادی کرو۔''

شمائلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''پھر تو لڑکیوں کی قطاریں لگ جائیں گی۔ بچوں کی فوج بنتی چلی جائے گی۔''

عابی نے اونچی آواز میں کہا۔ ''اور میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ عمر کے بائیس برس گزارنے کے بعد شادی کے متعلق سوچوں گا۔''

اس نے سر گھما کر ان سب کو سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے الفاظ پر غور کرو کہ بائیس برس کی عمر میں صرف سوچوں گا۔ آگے کتنے برسوں کے بعد شادی کروں گا' یہ خدا ہی جانتا ہے۔ میں نہیں جانتا۔''

کئی لڑکیوں نے بیک وقت ''ہائے'' کی آواز نکالی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ ''ہائے! یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

اس بات پر پھر قہقہے بکھرنے لگے۔ شمائلہ کو کھل کر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ہنسی مذاق میں عابی سے کہہ دیا تھا کہ ایک پچیس برس کی لڑکی سے شادی کرلے گا تو گیارہ برس کا بچہ ہونے کے باوجود ایک بچے کا باپ بن جائے گا۔

شمائلہ نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ''میں ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔''

''مجھ سے ایک بڑی غلطی ہوگئی۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ سچ کہتی ہوں' آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی تو کیا میری اس بھول کو درگزر نہیں کرنا چاہیے؟''

''بے شک۔ معمولی غلطی ہو تو درگزر کردینا چاہیے لیکن غلطی ناقابلِ معافی ہو تو اس کی سزا ضرور دینا چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''جو ناقابلِ معافی ہے، اسے نیک دل فرشتہ بن کر معاف کیا جاسکتا ہے۔''

''معلوم تو ہو کہ غلطی کیا ہے؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''میں وہی خطاوار شمائلہ شانی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔ آگے بولیں۔''

اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا پھر کیسے جانتے ہو؟''

''یہ غیر ضروری سوال ہے۔ آپ غلطی بتائیں؟''

''کیا آپ کے استاد محترم حاجاصاحب نے نہیں بتایا ہے؟''

''میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آپ کے استاد محترم ہیں۔ میں نے انہیں ایک معمولی شخص سمجھ کر فون پر تھوک دیا تھا۔ قسم کھا کر کہتی ہوں، ان پر نہیں تھوکا تھا۔''

''آپ فون پر کس سے بول رہی تھیں؟ تھوک اسی کی طرف گیا تھا۔ جس سے بول رہی تھیں۔''

''ہاں مگر......''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''نو آرگیومنٹس۔ میرے استاد محترم کا فیصلہ اٹل ہے۔ تھوکا ہوا چاٹنا ہی ہوگا۔''

وہ توہین کے احساس سے تلملانے لگی۔ جسے داماد بنانا چاہتی تھی، اسے غصہ نہیں دکھا سکتی تھی اور اس کے پاس بیٹھ کر بات کرنے کا موقع پھر نہیں مل سکتا تھا۔ اس سفر کے اختتام تک اسے اپنی طرف مائل کرلینا چاہتی تھی۔

کم سے کم وقت میں ایک بڑی فتح حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''پرنس! میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ تمہیں اپنا بیٹا سمجھتی ہوں۔ میں دل کی گہرائیوں سے ہونے والے رشتے کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے استاد محترم کے سامنے جاؤں گی۔ تم بھی وہاں موجود ہوگے پھر......''

وہ بڑے ہی درد بھرے جذباتی لہجے میں بولی۔ ''پھر ایک ماں تمہاری موجودگی میں روتے روتے تھوک کر چاٹے گی۔''

''آپ ماں بن کر بیٹے کے جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ یہ صاف صاف کہہ دوں کہ میرے بزرگ استاد محترم پر تھوکنے والی میری ماں ہو ہی نہیں سکتی۔''

وہ صاف اور سیدھی باتیں کہہ رہا تھا۔ ''یوں بھی دنیا کی کسی عدالت میں جذبات سے مغلوب ہو کر فیصلے تبدیل نہیں کیے جاتے۔ حقیقت اٹل ہے۔ کوئی اسے ٹال نہیں سکتا،

نہ تبدیل کرسکتا ہے۔ سزا سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔''
''میں انکار نہیں کررہی ہوں۔ اپنی انا اور خودداری کو کچل کر سزا سے گزر جاؤں گی۔ اس کے بعد تو تم مجھے ماں کہو گے۔''
وہ بولا۔ ''ماں کا رشتہ تمام رشتوں سے افضل ہے۔ ایک ماں نے جان کی بازی لگا کر اپنی جان دے کر مجھے پیدا کیا تھا۔ میں اسے سلام کرنے اور ان کی یادوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے پیرس جارہا ہوں۔ مائیں ہوں تو ایسی کہ مرنے کے بعد بھی اولاد کے دلوں پر حکومت کرتی رہیں اور اولاد ان پر فخر کرتی رہے۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ اگر آپ قابلِ فخر ہوں گی تو میں آپ کو ماں کہہ کر دنیا والوں کے سامنے اپنا سر اونچا کرسکوں گا۔''
وہ بڑے فخر سے بولی۔ ''میں دنیا کے ٹاپ گولڈ مرچنٹس میں سے ایک ہوں۔ میرے پاس سونے کا بے حساب ذخیرہ ہے۔ میں ان تاجر برادری میں سے ہوں جن کی مرضی سے سونے کا بھاؤ چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ میں سونا پہنتی ہوں۔ سونے کی پلیٹوں میں کھاتی ہوں۔ سونے کے بستر پر سوتی ہوں۔''
عابی نے کہا۔ ''اور ایک دن اس بستر پر سوتی ہی رہ جائیں گی۔ یہ بتائیں کہ تجارت کیسے کرتی ہیں؟ کیا سونے کی کان کی مالکہ ہیں یا چور بازاری اور اسمگلنگ کے ذریعے سونا حاصل کرتی ہیں؟''
''حصول کا جو بھی راستہ ہوتا ہے، اسے اختیار کرتی ہوں۔''
''کھل کر بولیں کہ چور بازاری، ہیرا پھیری اور اسمگلنگ کا دھندا ہے۔ آپ کا تعلق نیک نامی سے نہیں ہے۔ اب تک بدنامی کی دنیا میں جی رہی ہیں۔''
وہ بولی۔ ''بدنامی سے بے انتہا دولت بھی حاصل ہوتی ہے اور دور تک شہرت بھی۔''
''مگر عزت حاصل نہیں ہوتی۔ کیا میں آپ کو ماں بنا کر عزت حاصل کرسکوں گا، یا رہی سہی نیک نامی بھی گنوا دوں گا؟ آپ اپنے ذخیروں کو جائز قرار دینے کے لیے درجنوں دلیلیں دیں گی لیکن کہاوت ہے کہ سو سنار کی ایک لوہار کی۔ میری ایک ہی دلیل ہے کہ میرا دین آپ کے دھندے پر لعنت بھیجتا ہے۔''
اسے چپ لگ گئی۔ سوچنے لگی کہ اب کیا کرے؟
کیا اسے داماد بنانے کے لیے برسوں سے جاری رہنے والی اسمگلنگ اور چور بازاری چھوڑ دے؟ کیا اپنی تمام کمائی ہوئی دولت راہِ خدا میں دے کر صوم و صلوٰۃ کی پابند ہوجائے؟ پھر اس کے پاس کیا رہ جائے گا؟

اس نے حقارت سے سوچا۔ صرف ایک داماد..... کیا کروں گی ایسے کو داماد بنا کر؟ کیا کنگال ہوکر ایک داماد کو لے کر اس کی آرتی اتاروں گی؟ اس کی پوجا کروں گی؟'
وہ جھنجلا گئی۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئی کہ پیار و محبت سے پیش آتی رہے گی تو وہ اور اس کا استاد حماد بات بات پر اس کی انسلٹ کرتے رہیں گے۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے بہت ڈھیل دی ہے۔ اب اپنی توہین کا انتقام لوں گی۔ جلد یا بدیر اس پرنس کے بچے کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کردوں گی۔ دشمن کو جھکانے کے لیے اس کی کمزوریوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق یہ غیر معمولی اور حیرت انگیز قوتوں کا حامل ہے۔ ہتھیاروں کے بغیر پوری فوج کو شکست دے دیتا ہے۔ اس کی کوئی کمزوری اب تک معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ لیکن انسان ہے۔ کوئی تو کمزوری ہوگی۔ نہیں ہوگی تو میں اس کی طاقت کو کم سے کم کروں گی۔ ایسی چالیں چلوں گی کہ یہ رفتہ رفتہ جسمانی طور پر کمزور ہوتا جائے گا۔ اس کے جسم میں کسی طرح اعصابی کمزوریوں کی دوائیں پہنچائی جاسکتی ہیں یا پھر بلیک میجک سے شیطانی عمل سے اس کے گوشت اور اس کی چربی کو گلایا جاسکتا ہے۔
وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ عابی نے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جارہی ہے۔ اس نے اسے جانے کا راستہ دیا۔ وہ جہاز کے پچھلے حصے میں آگئی۔ وہاں دو سیٹیں خالی تھیں۔ وہ ایک پر بیٹھ کر جھنجلاتی ہوئی سیفٹی بیلٹ باندھنے لگی۔ جہاز جنیوا کے ائرپورٹ پر اترنے والا تھا۔
پرواز خواہ کتنی ہی بلند ہو نیچے زمین پر آنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بلندی سے زمین کی پستی میں آگئی۔ وہ جہاز اب ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے جانے والا تھا۔ کئی مسافر اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے اور آزادی سے چلنے پھرنے کے لیے جہاز سے باہر آگئے۔
عابی اور شائلہ ایک دوسرے سے دور رہ کر ائرپورٹ کے کونفائنڈ ایریا میں آگئے۔ مسافروں کو ایسے محدود ایریا سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس نے عابی سے دور جاکر فون پر کسی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''پرنس اس فلائٹ سے آرہا ہے۔ اس کی نگرانی کرنے والوں کی ایسی ٹیم بناؤ کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوسکے۔''
وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولی۔ ''کئی یہودی اس کے ساتھ ہیں لیکن اس سے فاصلے پر رہتے ہیں۔ تم لوگ

ائرپورٹ سے اس کا تعاقب کریں گے۔ جہاں بھی موقع ملے اس پر گولیاں چلاؤ۔ خبردار..... ! جان سے نہ مارنا۔ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں گولیوں سے چھلنی کر دینا تاکہ وہ اپاہج بن کر زندہ رہے۔''

وہ ایک ذرا چپ رہ کر بولی۔ ''اگر وہ یہودیوں کی کسی پناہ گاہ میں پہنچ جائے گا تو پھر مشکل سے ہی ہاتھ آئے گا۔ پوری کوشش کرو کہ وہ ائرپورٹ سے اسپتال پہنچ جائے۔''

جوان لڑکیاں اور لڑکے عابی سے مصافحہ کرتے ہوئے رخصت ہو رہے تھے۔ شائلہ فون بند کرنے کے بعد دور کھڑی عابی کو غصے سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں فولاد کے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ مارتا ہے تو کسی کا سر پھٹ جاتا ہے، کسی کی گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ بدن کے جس حصے پر وہ حملہ کرتا ہے، وہاں کی ہڈیاں چیخ جاتی ہیں۔

اسی لیے اس نے حکم دیا تھا کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے پھر وہ لمبی چھلانگیں مار کر اور زمین سے اچھل کر بلند عمارتوں کی چھتوں پر نہیں پہنچ سکے گا۔ بے دست و پا ہو کر اسپتال کے بستر پر پڑا رہے گا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی اور اس کی بے پناہ قوتوں کی پوجا کرنے والے یہودی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

عابی کو اپاہج بنا کر وہیل چیئر پر بٹھائے رکھنے کا فی الحال یہی ایک راستہ تھا۔ بڑی خوش فہمی سے ایسے ہی سپنے دیکھے جا سکتے تھے۔ دوسروں کے لیے موت کا گڑھا کھودا جائے تو وہ گڑھا کبھی اپنی ہی قبر بن جاتا ہے۔ وہ اپنی حرام موت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتی تھی۔ اپنی دولت اور طاقت پر بڑا اعتماد تھا اور اس وقت تو وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ موت اس کا تعاقب کرتی ہوئی وہاں تک چلی آئی ہے۔

اس کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ناگواری سے اجنبی نمبروں کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''ہیلو کون؟''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''تمہاری موت۔ تم نے میرے بھائی کی لاش غائب کر دی۔ تمہاری لاش بھی جہاں دفن کی جائے گی میں وہاں سے اسے نکال کر تمہیں چیل کوؤں کی خوراک بنا دوں گا۔''

وہ حقارت سے بولی۔ ''تمہاری طرح مات کھانے والے مجھے اسی طرح تصور میں مارتے رہتے ہیں۔''

''میں خیالوں سے نہیں بہلتا۔ پوری انفارمیشن رکھتا ہوں۔ تم اس وقت ائرپورٹ کے کونفاسنڈ ایریا میں ہو اور ایک نہیں، کئی گولیاں تمہاری طرف آ رہی ہیں۔ جاؤ میرے بھائی کے پاس جاؤ۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ پھر کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ فون پر ملنے والی دھمکی دھماکا بن گئی۔ یکبارگی فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کونفاسنڈ ایریا کے گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے دو مسلح سپاہی مارے گئے۔ دو گولیاں آ کر شائلہ کو لگیں۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی فرش پر گر کر تڑپنے لگی۔

عابی نے سر گھما کر اسے دیکھا پھر لپک کر اس کے پاس آیا۔ پورے ائرپورٹ میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے فائرنگ سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

ایک گولی شائلہ کے سینے سے کچھ اوپر شانے کے نیچے آ کر پیوست ہو گئی تھی۔ اس کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ عابی نے ایک چٹکی میں پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔ ایک زبردست جھٹکا لگا۔ وہ تکلیف برداشت نہ کر سکی، بے ہوش ہو گئی۔

اس کے سینے سے لہو بہہ رہا تھا۔ اسے فوراً اسپتال پہنچانا تھا۔ وہ ہوش میں ہوتی تب بھی اٹھ کر چل نہیں سکتی تھی۔ دوسری گولی نے اس کے ایک گھٹنے کی ہڈی توڑ دی تھی۔ وہ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر دوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''اسپتال کہاں ہے؟ ایمبولینس لاؤ۔ اسے اسپتال پہنچاؤ۔''

لوگ سہمے ہوئے تھے۔ سب ہی کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ وہ عمارت سے باہر آ کر ایک کار کے ساتھ دوڑتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی روکو۔ اسے اسپتال لے چلو۔''

ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔ ''یہاں گولیاں چل رہی ہیں۔ دوسری گاڑی میں جاؤ۔''

وہ شائلہ جیسی بھاری بھرکم عورت کو اٹھائے تیز رفتار کار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس نے ایک شانے پر اسے لاد کر دوسرے ہاتھ سے ڈرائیو کرنے والے کی گردن دبوچ لی۔ ایسی آہنی گرفت تھی کہ شکنجے میں آتے ہی اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اس نے فوراً ہی بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''اسپتال قریب ہے۔ اسی ائرپورٹ روڈ پر ہے۔''

عابی نے پچھلا دروازہ کھول کر شائلہ کو سیٹ پر لٹا دیا پھر ڈرائیور کو دوسری سیٹ پر ہٹا کر کار ڈرائیو کرنے لگا۔ طوفانی رفتار سے اسپتال کی سمت جانے لگا۔

کریگ ہوسٹن اور دوسرے یہودی جان بچانے کے لیے چھپے ہوئے تھے۔ جب کئی مسلح سپاہی آ گئے اور مسافروں کو تسلیاں دینے لگے کہ خطرہ نہیں ہے، تب انہوں نے دیکھا۔ پرنس عابی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کچھ لوگ کہنے لگے کہ وہ، پرنس کو پہچانتے ہیں۔ انہوں نے اسے دیکھا ہے۔ وہ ایک خاتون کو بازوؤں میں اٹھائے دوڑتا جا رہا تھا اور اسپتال کا پتا پوچھ رہا تھا۔

عمارت کے باہر سے رپورٹ ملی کہ ایک جوان مرد ایک عورت کو بازوؤں میں اٹھائے تیز رفتار کار کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ کریگ ہوسٹن اور دوسرے یہودی ادھر جانا چاہتے تھے لیکن گیٹ کو لاک کر دیا گیا تھا۔ وہ عابی سے محروم ہو کر ایسے تڑپ رہے تھے جیسے ان کی سانسیں اُکھڑ رہی ہوں۔ جہاز کے مسافروں کو اس محصور ایریا سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی اور اب جہاز کی روانگی کا وقت بھی ہو رہا تھا۔

وہ یہودی چیخنے لگے۔ ''پرنس عابی اس ایریا سے باہر چلا گیا ہے۔ اسے واپس لاؤ۔''

کچھ لوگوں نے کہا۔ ''ایک مسافر خاتون بھی زخمی تھی۔ وہ بھی علاج کے لیے باہر گئی ہے۔ ان دونوں کو واپس لایا جائے۔''

ائرپورٹ کی انتظامیہ مشکل میں پڑ گئی تھی۔ باہر پولیس فورس ان مجرموں کے تعاقب میں گئی تھی جو فائرنگ کے بعد فرار ہو رہے تھے۔ وہ دو مسافر جو محصور ایریا سے باہر چلے گئے تھے، ان کی جان کو خطرہ تھا۔ اس خاتون کو گولیاں مارنے والے دشمن پھر اسے ہلاک کرنے کے لیے آسکتے تھے۔

اور بات بھی تھی۔ کرائے کے قاتلوں نے شائلہ کو جان سے مار ڈالنے کا معاوضہ لیا تھا۔ اب وہ دیکھ رہے تھے کہ پرنس اسے بچانے کے لیے اسپتال لے گیا ہے۔ اینڈی گارسن انہیں فون پر کہہ رہا تھا۔ ''خون کا بدلہ خون۔ میرے بھائی کو ہلاک کرنے والی زندہ نہ رہے۔ اگر وہ بچ جائے گی تو ان شوٹرز کی باقی پیمنٹ روک دی جائے گی۔''

وہ شوٹرز تعداد میں چار تھے۔ وہ باقی پانچ لاکھ ڈالرز کی پیمنٹ سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ان میں سے دو نے پولیس کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ باقی دو شوٹرز اسپتال کی طرف آ گئے تھے۔ معلوم کر رہے تھے کہ شائلہ مر گئی ہے یا اسے زندگی کی طرف لوٹایا جا رہا ہے؟

وہ پرنس سے خوف زدہ تھے۔ اس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ عابی انہیں جانتا نہیں تھا۔ وہ بڑی رازداری سے یکے بعد دیگرے آپریشن تھیٹر کی طرف جاتے تھے پھر ٹہلنے کے انداز میں واپس آ جاتے تھے۔

والدین توجہ فرمائیں

1۔ جس بچے کا مذاق اڑایا جاتا ہے، وہ بزدل بن جاتا ہے۔

2۔ جس بچے کو مار پیٹ کا سامنا ہوتا ہے، اس کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔

3۔ جس بچے پر اعتبار نہیں کیا جاتا وہ دھوکا دینا سیکھتا ہے۔

4۔ جس بچے پر تنقید کی جاتی ہے، وہ کوشش کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

5۔ جس بچے کی تعریف نہیں کی جاتی وہ اچھی چیزوں کو پسند نہیں کرتا۔

☆☆☆

انہوں نے فون کے ذریعے اینڈی گارسن سے کہا۔ ''باس! ہم نے شائلہ کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ ایک اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

گارسن نے کہا۔ ''اسے اسپتال سے زندہ نہ نکلنے دو۔''

''ہم اسے چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں لیکن راستے میں پہاڑ آگیا ہے۔ پرنس عابی اسے بچا رہا ہے۔ ہم اس کی موجودگی میں شائلہ پر اٹیک نہیں کر سکیں گے۔ اگر اس کی نظروں میں آ جائیں گے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''مائی گاڈ! یہ پرنس وہاں کیسے پہنچ گیا؟ ٹھہرو، میں تمہارا راستہ صاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اینڈی گارسن نے ریڈ الرٹ کے جیکی براؤن کو فون پر وہاں کی پچویشن بتائی پھر کہا۔ ''میں بھائی کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا ہوں لیکن پرنس عابی رکاوٹ بن گئے ہیں۔ ہم ان سے مقابلہ کر کے مراد صاحب کو ناراض کرنا نہیں چاہیں گے۔''

جیکی براؤن نے کہا۔ ''بے شک انہیں ناراض نہیں کرنا ہے۔ میں ابھی ان سے بات کرتا ہوں۔''

اس نے مراد کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''جناب! آپ جانتے ہیں۔ شائلہ کیسی مکار اور خطرناک چڑیل ہے۔ اس نے ہمارے اتحادی اینڈی گارسن کے بھائی کو ہلاک کر کے اس کی لاش غائب کر دی تھی۔ اب وہ اینڈی گارسن کے نشانے پر آ گئی ہے لیکن آپ کے صاحبزادے

اس کے سامنے ڈھال بن گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی پرنس کے خلاف ہتھیار استعمال نہیں کرے گا۔ ہمارے درمیان دوستی اور سلامتی کا معاہدہ ہے۔ تقریباً گیارہ برس گزر چکے ہیں۔ ریڈ الرٹ اور اس کے تمام اتحادی آپ سے وفاداری کا ثبوت دیتے آرہے ہیں۔ پلیز ہمارے اتحادی اینڈی گارسن کو اس چڑیل سے انتقام لینے دیں۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ اس وقت کس اسپتال میں ہے؟ وہاں کا فون نمبر کردو۔ میں بیٹے کو سمجھاؤں گا۔''

پندرہ منٹ کے بعد ہی بیٹے سے رابطہ ہوگیا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تمہیں شمائلہ سے اس وقت بات کرنی تھی جب وہ میری شرط پوری کرتی لیکن تم تو اس پر مہربان ہوگئے ہو۔ اس کے محافظ بن گئے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''بابا جانی! میں نے آپ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کیا ہے۔ وہ اچانک ہی پیرس جانے والی فلائٹ میں میرے قریب آگئی تھی۔ میرے سخت رویے کے باعث دور جاکر دوسری سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ دوستی کے قابل نہیں ہے لیکن دشمن بھی گولی کھا کر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو تو ازراہِ خدا اسے اسپتال پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ میں فرض ادا کررہا ہوں۔ جب وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گی اور اس کے اپنے آکر اسے سنبھال لیں گے تو میں اس سے دور ہوجاؤں گا۔ اسے کبھی دیکھنا بھی گوارا نہیں کروں گا۔''

''شاباش بیٹے! تم نفرت اور عداوت سے بالاتر ہوکر انسانی فرض ادا کررہے ہو۔ دشمنوں سے ہوشیار رہو اور جلد از جلد وہاں سے یہاں پیرس آؤ۔ میں انتظار کررہا ہوں۔''

''او کے بابا جانی! میری کوشش یہی ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو اگلی کسی فلائٹ سے آجاؤں گا۔''

مراد نے جیکی براؤن سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ ''میرا بیٹا محض انسانی ہمدردی کے تحت اس عورت کو اسپتال لے گیا ہے۔ اس چڑیل سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ جب اس کے اپنے لوگ اس کی تیمارداری کے لیے آجائیں گے تو عابی وہاں سے چلا آئے گا۔ اینڈی گارسن سے بولو کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ عابی کے وہاں سے جاتے ہی اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔''

جیکی نے یہ بات اینڈی گارسن سے کی۔ وہ بولا۔ ''ابھی اسپتال سے معلوم ہوا ہے وہ کتیا بچ گئی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں دیکھ سکتا۔ اسپتال سے اس کی لاش باہر جائے گی۔''

''ایزی گارسن ایزی......! تھوڑی دیر صبر کرو۔ پرنس وہاں سے چلے جائیں گے۔''

''کیسے صبر کروں؟ دوسری رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ پولیس نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے کیونکہ شمائلہ اور پرنس قانون کے خلاف ائرپورٹ کے کونفائنڈ ایریا سے باہر نکل کر شہر میں آگئے ہیں۔ وہ انہیں واپس ائرپورٹ لے جائیں گے۔''

وہاں یہی سچویشن پیدا ہوگئی تھی۔ وہ جہاز وہاں سے جاچکا تھا۔ ان دونوں کو اگلی کسی فلائٹ میں وہاں سے روانہ کرنا تھا۔ اگرچہ محصور ایریا سے باہر جانا جرم ہے لیکن ان دونوں کو مجرم نہیں سمجھا جارہا تھا۔ کیونکہ شمائلہ طبی امداد کی مستحق تھی اور عابی اس کی جان بچانے کے لیے ائرپورٹ سے باہر آگیا تھا۔

شمائلہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جاتا۔ وہ اپنی صحت یابی تک وہاں رہ سکتی تھی۔ ایک پولیس افسر نے عابی کے پاس آکر کہا۔ ''آنر ایبل پرنس! میں آپ کا فین ہوں۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے آپ کو ائرپورٹ کے محصور ایریا میں لے جاؤں گا لیکن کل صبح سے پہلے پیرس کے لیے کوئی فلائٹ نہیں ہے۔ آپ وہاں ایک قیدی بن کر بور ہوجائیں گے۔''

عابی نے کہا۔ ''ہاں، میں ایک نیکی کرکے پھنس گیا ہوں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ میری موجودگی میں آزاد ہیں۔ کل تک اس شہر میں رہ کر تفریح کرسکتے ہیں۔ میں ایک گائیڈ بن کر آپ کو یہاں کی سیر کراؤں گا۔''

عابی نے خوش ہوکر اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ ان کی تصویریں اتاری جائیں۔ وہ پرنس کے ساتھ ایک دن اور ایک رات کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔

وہ اسپتال سے باہر آکر عابی کے ساتھ اگلی سیٹوں پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھے آفیسر نہ کہیں۔ میرا نام راجر اسمتھ ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''اس شرط پر راجر کہوں گا کہ تم مجھے آپ نہیں کہوگے۔ ہم بے تکلف دوست بن کر وقت گزاریں گے۔''

وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''دوستی اور بے تکلفی کے آغاز میں کیوں نہ ایک ایک پیگ ہوجائے۔''

''سوری۔ میں شراب نہیں پیتا۔''

وہ کار آگے بڑھاتے ہوئے ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہزاروں مسلمان پیتے ہیں۔''

عابی نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور لاکھوں مسلمان نہیں پیتے۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔ بائی دا وے یہاں کہیں مسجد ہے؟ نماز کا وقت ہورہا ہے۔''

''ضرور ہے۔ ابھی چلو۔''

وہ کار کو دوسرے راستے پر موڑتے ہوئے بولا۔ ''پتا ہے' یہاں عیسائیوں کے بعد دوسری بڑی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ تم یہاں کئی عورتوں کو عبا اور نقاب میں دیکھو گے۔''

عالی نے ایک کمرشل علاقے سے گزرتے ہوئے دو خواتین کو عبا میں دیکھا۔ آگے اور تین خواتین نظر آئیں۔ وہ پورے حجاب میں نہیں تھیں۔ پھر بھی انہوں نے حیا کے تقاضے پورے کیے ہوئے تھے۔

راجر نے ایک عالی شان مسجد کے سامنے کار روک دی۔ عالی نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ ''سبحان اللہ! بہت خوب صورت مسجد ہے۔ مجھے ایک گھنٹے بعد لے لینا۔''

''او کے میں جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد اسی جگہ نظر آؤں گا۔ آرام سے عبادت کرو۔''

وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا چلا گیا۔ عالی نے سر اٹھا کر مینار کی بلندی کو دیکھا پھر دل کی گہرائیوں سے اللہ اکبر اللہ اکبر اور کلمہ پڑھتا ہوا مسجد میں داخل ہو گیا۔

ادھر یہودی اکابرین پریشان تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے پرنس ہاتھ سے نکل رہا ہے جبکہ وہ عارضی طور پر بچھڑ گیا تھا۔ وہ اسے حاصل کیے بغیر سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔

کریگ ہوسٹن اور اس کے ساتھیوں کو اسی فلائٹ سے جانا پڑا تھا۔ اس نے جنیوا کی یہودی تنظیم کے اکابرین کو فون پر کہا۔ ''پرنس عالی آپ کے شہر میں حادثاتی طور پر رک گیا ہے۔ پولیس والے اسے اپنی کسٹڈی میں لے سکتے ہیں جبکہ اسے ہماری پناہ سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔''

تنظیم کے ایک عہدیدار نے کہا۔ ''بے شک۔ اسے ہماری پناہ میں رہنا چاہیے۔''

ہوسٹن نے کہا۔ ''آپ حضرات فوراً اس سے رابطہ کریں اور اسے اپنی نگرانی میں رکھیں اور اپنی موجودگی میں اسے پیرس روانہ کریں۔ بہت محتاط اور ہوشیار رہیں۔ اسے انتہا پسند مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگنے دیں۔''

ان کے پیشوا اور ربی بھی پریشان ہو گئے تھے۔

جب ربی کے کارندے اسپتال پہنچے تو عالی وہاں سے جا چکا تھا۔ انہوں نے پولیس افسر راجر اسمتھ سے فون پر پوچھا۔ ''پرنس کہاں ہے؟ اس سے بات کرائیں۔''

راجر نے کہا۔ ''وہ ایک مسجد میں ہے۔ عبادت سے فارغ ہو کر ایک گھنٹے بعد مسجد سے باہر آئے گا۔ تب ہی اس سے باتیں ہو سکیں گی۔ آپ حضرات انتظار کریں۔''

وہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ پرنس ان سے دور ہو جائے گا۔ ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ ایک درجن یہودی مسجد کے سامنے آ کر بیٹھ گئے کہ اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔

اینڈی گارسن کے شوٹرز عالی کے جانے کے بعد بھی شائلہ شانی تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ راجر اسمتھ نے وہاں پولیس کا سخت پہرا لگا دیا تھا۔ انہیں تاکید کی تھی کہ دوسرے دن تک اسپتال سے چھٹی دی جائے تو اسے ائرپورٹ کے کونفائنڈ ایریا میں پہنچا دیا جائے۔

شائلہ کو ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ پرنس عالی نے اس کی جان بچائی ہے۔ اسے ائرپورٹ سے اٹھا کر اسپتال میں پہنچایا ہے۔ وہ پرنس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ اسے پولیس والوں کی نگرانی میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اس نے پولیس کے اعلیٰ افسر سے رابطہ کیا پھر اس سے کہا۔ ''میں اسپتال میں زخمی پڑی ہوں۔ میرے انجانے دشمنوں نے مجھ پر دو گولیاں چلائی ہیں۔ وہ اس اسپتال میں بھی مجھ پر حملہ کر سکتے ہیں۔''

اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''آپ کی حفاظت کے لیے پولیس اسپتال میں موجود ہے۔ آپ ائرپورٹ کی کونفائنڈ پسنجر ہیں۔ مکمل علاج کے بعد ہم آپ کو بحفاظت یہاں سے روانہ کریں گے۔''

''میں پولیس کے علاوہ پرسنل سیکیورٹی گارڈز بھی چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام اخراجات آن لائن بینکنگ کے ذریعے ادا کروں گی۔ پلیز میری یہ درخواست قبول فرمائیں۔ مسلح گارڈز کی تعداد زیادہ رکھیں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی کے مطابق آدھے گھنٹے میں چھ مسلح گارڈز یہاں پہنچ جائیں گے۔''

وہاں مارنے والے اور اپنا بچاؤ کرنے والے سب ہی اپنے اپنے طور پر مصروف تھے۔ ان میں اینڈی گارسن کے کارندے شائلہ تک پہنچنے میں ناکام ہو رہے تھے اور مسجد کے سامنے بیٹھی ہوئی یہودیوں کی ٹیم بھی مایوس ہونے والی تھی۔

عالی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس مسجد کی انتظامی خوبیوں کو اندر سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایک وسیع و عریض کانفرنس ہال تھا' جہاں دینی احکامات اور اسلامی تہذیب کے موضوعات پر تقریریں ہوتی تھیں۔ دینی کتب کی ایک بہت بڑی لائبریری بھی۔ ایک مدرسے میں عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔

پیش امام نے کہا۔ ''یہاں کے مسلمان بڑی محنت اور

لگتا ہے تحاریر اور تقاریر کے ذریعے دین کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے سروے کے مطابق یہاں کی مسلمان خواتین گمراہ نہیں ہیں۔ بہت فعال ہیں۔ یہاں ہر سال سر کیمپ لگاتی ہیں اور عیسائی خواتین کے ساتھ بہت ہی عالمانہ مہارت سے مذاکرات کرتی ہیں۔ کئی عیسائی خواتین کو مشرف بہ اسلام کرچکی ہیں۔''

عابی دینِ اسلام کی اشاعت اور پھیلاؤ کے حوالے سے بڑی ایمان افروز اور حوصلہ افزا باتیں سن رہا تھا۔ پھر ایک گھنٹے بعد مسجد سے باہر آگیا۔ راجر اپنی کار کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

یہودیوں نے عابی کو دیکھتے ہی اسے بڑے ادب سے گھیر لیا۔ ایک نے کہا۔ ''ہمارے ربی آپ کے لیے پریشان ہیں۔ یہ شہر آپ کے لیے انجانا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ اگلی فلائٹ تک آپ کے آرام و آسائش کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ وہاں آپ کی ہر ضرورت پوری ہوگی۔''

عابی نے کہا۔ ''محترم ربی سے کہہ دو میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں قانون کے ایک محافظ کے ساتھ ہوں کسی اور کی پناہ میں جانا چاہوں گا تو یہ قانون کے مطابق مجھے ائرپورٹ کے کونفائنڈ ایریا میں پہنچادیں گے۔ کیا مجھے وہاں قیدی بن کر رہنا چاہیے؟''

انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ عابی نے کہا۔ ''تو پھر مجھے آزادی سے ایک پولیس افسر کے ساتھ رہنے دیں۔ آپ حضرات جائیں۔ میری طرف سے مطمئن رہیں۔''

وہ سب مایوس ہوگئے۔ پولیس افسر راجر اسمتھ کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ عابی اس کے پاس اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا کار وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ راجر نے پوچھا۔ ''تمہارے کھانے کا وقت ہوگیا ہے؟ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''جہاں حلال پکوان ہو' وہاں کھاؤں گا۔''

سٹی سینٹرل ریلوے اسٹیشن سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پاکستانی ''شاہی ریسٹورنٹ'' ہے۔ راجر اسے وہاں لے آیا۔ وہاں انہوں نے نان' چکن کڑھائی اور رزگسی کوفتے کھائے۔ پہلی بار مرچ مسالے والے چٹخارے دار سالن کھاتے وقت عابی کی آنکھوں سے اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ وہ رومال سے آنکھ ناک کا پانی پونچھتا رہا۔ ایسا ذائقہ اور چٹخارا تھا کہ وہ آخری لقمے تک کھاتا رہا۔

پھر اس نے سوئٹ ڈش کھاتے ہوئے کہا۔ ''آج معلوم ہوا کہ بابا جانی کے ملک میں کس قدر تیز مسالے دار اور چٹخارے دار کھانے کھائے جاتے ہیں۔''

وہ کانوں کو چھو کر بولا۔ ''مزہ تو بہت آیا مگر دوبارہ یہاں آکر کھانے کا حوصلہ نہیں ہے۔''

راجر ہنسنے لگا پھر بولا۔ ''عابی! تم گیارہ برس کے بچے نہیں لگتے۔ تمہیں اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ پچیس برس کے بھرپور جوان دکھائی دے رہے ہو۔ تم سے مصافحہ کیا تو معلوم ہوا' فولاد کی طرح سخت ہو۔ لڑکیاں تو تم پر پٹا پٹ مرتی ہوں گی۔''

وہ بولا۔ ''میں نے بے شمار عورتوں کو آہیں بھرتے اور مرتے دیکھا ہے لیکن کسی کا جنازہ اٹھتے نہیں دیکھا۔ وہ آج بھی اپنے گھروں میں زندہ ہوں گی۔''

''ہم آپس میں بے تکلف ہیں۔ تم اپنے ذاتی احساسات بتاؤ۔ کیا حسین عورتیں اچھی لگتی ہیں؟''

وہ بولا۔ ''راجر! بچوں سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''نہتے ہوکر مسلح آرمی کو شکست دینے والے بچے! تم نے مجھے دوست کہا ہے لہٰذا دوست کو نہ ٹالو۔ بے تکلفی سے بولو۔ کیا حسین عورتیں اچھی لگتی ہیں؟''

''حسن عورتوں میں ہو' پھولوں میں ہو' صبح وشام کے نظاروں میں ہو...... وہ آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔''

''میں صرف عورتوں کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔''

''جو عورتیں مجھے اچھی لگتی ہیں' میں انہیں ماں اور بہن بنالیتا ہوں۔ محبت کی داستانوں والا عشق کسی سے نہیں ہوتا۔''

''سمجھ گیا۔ جسمانی طور پر فولادی روبوٹ ہو لیکن ذہنی طور پر نابالغ ہو۔ عورت کی اس کشش کو نہیں سمجھتے ہو جو فطری تقاضوں کو پکارتی ہے۔ یہی بات ہے نا؟''

''کوئی دوسری بات کرو۔ جنیوا کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

وہ پھر اپنی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ راجر نے کہا۔ ''یہ بین الاقوامی شہر ہے۔ انٹرنیشنل ائرپورٹ کے باعث یورپ کے تمام بڑے شہروں سے رابطہ رہتا ہے۔ یہاں ہر سو موٹروے اور ریل روڈ کا جال ملکی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ جنیوا کو بینکوں کا شہر کہنا چاہیے۔ یہاں سو سے زیادہ غیر ممالک کے بینک ہیں اور سیکڑوں ملکی اور غیر ملکی سیاستدانوں کے خفیہ اکاؤنٹس ہیں۔ حکمران اپنے ہی ملکوں سے چرائی ہوئی دولت یہاں لاکر جمع کرتے ہیں۔''

عابی نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے میں نے سنا ہے اور پڑھا ہے۔''

راجر نے کہا۔ ''ہمارا یہ شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔

یواین او (اقوام متحدہ) کا ہیڈ کوارٹر یہاں ہے اور یہاں مشہور زمانہ ریڈ کراس کا صدر دفتر بھی ہے۔''

وہ تن کر بولا۔ ''ہمیں فخر ہے پوری دنیا کے سیاسی جھگڑوں کا تصفیہ ہمارے شہر میں ہوتا ہے اور تمام دنیا کے بیماروں کے لیے دوائیں اور ڈاکٹر ہماری ریڈ کراس تنظیم کے ذریعے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک سو ساٹھ ممالک کے سفارت کار یہاں اپنی حکومتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

سڑکوں پر اچھی خاصی گاڑیاں چل رہی تھیں۔ ہر سو ایسی جگمگاتی ہوئی روشنیاں تھیں کہ رات گم ہوگئی تھی۔ دن کی طرح شہر روشن اور چمکیلا ہوگیا تھا۔ ان کے آگے جانے والی گاڑی کی رفتار سست ہورہی تھی۔ راجر اپنی کار کو ایک طرف سے آگے نکال کر لے جانا چاہتا تھا لیکن ادھر بھی دوسری گاڑی آگئی تھی۔ تیسری طرف بھی ایک گاڑی ان سے لگی ہوئی رک رہی تھی۔

بات سمجھ میں آگئی۔ سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق راجر کو گاڑی روکنے پر مجبور کردیا گیا پھر سامنے اور دائیں بائیں کی گاڑیوں سے تین شخص نکل کر دوڑتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک نے راجر کو اپنی گن کے نشانے پر رکھ کر کہا۔

''دروازے اَن لاک کرو۔''

راجر نے خاموشی سے ایک بٹن کو دبایا۔ پھر پچھلے دروازے مقفل نہ رہے۔ وہ تیزی سے اندر آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ راجر ان کے نشانے پر تھا۔ وہ عابی کو نہیں جانتے تھے۔ اسے اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ نظر انداز کررہے تھے۔

ایک نے کہا۔ ''کار اسٹارٹ کرو۔ آگے بڑھو۔ تمہارے آگے پیچھے ہماری گاڑیاں رہیں گی۔ کوئی چالاکی نہیں دکھا سکو گے۔ اپنا ریوالور اور فون ہمیں دو۔''

راجر نے کار کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنا ریوالور اور فون ان کے حوالے کیا۔ ان کی تین گاڑیاں آگے اور دائیں بائیں چل رہی تھیں۔ ایک نے عابی سے کہا۔ ''اے! اپنا فون نکالو۔''

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں فون نہیں رکھتا۔ میری تلاشی لے سکتے ہو۔''

ایک نے اگلی سیٹ کی طرف جھک کر اس پر سوار ہوکر اس کے لباس کو اوپر ہی اوپر سے ٹٹولا۔ عابی چاہتا تو اسے ایک ہاتھ سے دبوچ کر ان کے ساتھیوں پر اسے اچھال کر پھینک دیتا۔ اس طرح فوراً ہی گن چلانے کے لیے نشانہ نہیں لے پاتے۔ ان تینوں کو دبوچ لینا معمولی سی بات تھی۔

لیکن وہ کئی گاڑیوں کے حصار میں تھے۔ انہیں صبر و تحمل سے سوچنا سمجھنا اور آگے جاکر کچھ کر گزرنا تھا۔

ان میں سے ایک شخص نے راجر کو مستقل نشانے پر رکھا تھا۔ اس نے عابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

راجر نے کہا۔ ''یہ ہوا ہے جہاں سے گزرتا ہے وہاں سے کلیاں اڑ جاتی ہیں۔ یہ ہوا دوستوں کے لیے خوشبو ہے اور دشمنوں کے لیے طوفان ہے۔ یہ جسے چاہتا ہے ہوا کردیتا ہے۔''

''کیا ہوا ہوا کیے جارہے ہو؟ سیدھی طرح بولو۔ یہ کون ہے؟ ہم جہاں تمہیں لے جارہے ہیں وہاں سے یہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔''

راجر نے کہا۔ ''عجیب اتفاق ہے۔ یہ دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے جارہا تھا۔ میں نے اسے پکڑ کر گاڑی میں بٹھالیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ مرو۔ میں پولیس والا ہوں۔ موت میرے چاروں طرف منڈلاتی رہتی ہے۔ دیکھ لو کہ تمہاری صورت میں موت آخر آہی گئی۔''

دوسرے شخص نے کہا۔ ''تم خوب سمجھ رہے ہو کہ ہم تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔ اپنے باس کے قدموں میں پہنچائیں گے۔''

''میں جانتا ہوں۔ تمہارے باس کے پاس پہنچنے تک زندہ رہوں گا۔ اس لیے چپ چاپ تمہارے ساتھ جارہا ہوں۔''

عابی نے دشمنوں کو دیکھا پھر راجر سے اردو زبان میں پوچھا۔ ''کیا اس لینگویج میں بول سکتے ہو؟''

''ہاں۔ انڈین فلمیں شوق سے دیکھتا ہوں۔ یہ زبان سمجھنے اور بولنے لگا ہوں۔''

عابی نے پوچھا۔ ''یہ تمہارا دشمن کون ہے؟''

ایک گن مین نے ڈانٹ کر کہا۔ ''اے! تم لوگ کیا بول رہے ہو۔ ہماری لینگویج میں بولو۔ ورنہ......''

راجر نے کہا۔ ''ورنہ گولی نہیں مار سکو گے۔ اگر مجھے ذرا بھی خراش آئی تو باس تم سب کو جہنم میں پہنچادے گا۔''

انہیں چپ لگ گئی۔ اس نے عابی سے کہا۔ ''ابھی میں نے کہا تھا کہ ہمارا شہر امن کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں ایسی مجرمانہ وارداتیں نہیں ہوتیں جیسی ابھی ہورہی ہیں۔ یہ واردات کرنے والے آس پاس کے ملکوں سے آئے ہیں۔''

وہ عابی کو بتانے لگا۔ ''کارمن ڈی سورا اٹلی کا ایک بہت طاقتور ڈان ہے۔ وہ اپنے ملک سے باہر بھی واردات کرنے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے لگا ہے۔ اس کے

جوان بیٹے لیونل ڈی مورا نے ہمارے شہر میں آ کر قتل کی واردات کی تھی۔ ایک جوان عورت سے زیادتی کی تھی پھر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں سے فرار ہوتا میں نے اس کے شوٹرز کے ساتھ ایک خون ریز جنگ لڑنے کے بعد گرفتار کر لیا تھا۔ کارمن ڈی مورا نے یہاں آ کر حکم دیا کہ میں اسے رہا کر دوں لیکن میں نے اس کے حکم کو نظر انداز کر دیا۔ اس نے میری وائف کو اغوا کیا اور کہا...... میرے بیٹے کو واپس کرو اور اپنی بیوی کو لے جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری شامت آ گئی ہے۔ اگر میری وائف کو فوراً رہا نہیں کرو گے تو فون پر اپنے بیٹے کی چیخیں سنو گے۔ میں اسے ٹارچ سیل میں لے جاؤں گا۔''

وہ اپنے مطالبے پر اڑا رہا۔ میں نے ٹارچ سیل میں اس کے بیٹے کو اذیتیں پہنچائیں۔ فون کے ذریعے باپ کو بیٹے کی چیخیں سنائیں تو وہ درندہ پولیس اسٹیشن کے سامنے میری وائف کی لاش پھینک کر چلا گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری وائف یوں جان سے جائے گی۔

وہ فون پر بولا۔ ''میں کبھی نہ ٹلنے والی موت ہوں۔ اب بھی تم نے میرے بیٹے کو رہائی نہ دی تو تمہاری بیٹی کو اٹھوالوں گا۔ پھر اس کی بھی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔''

''میں نے اپنی بیٹی ماریہ کو سخت سیکیورٹی میں رکھا ہے۔ تمام پولیس فورس میرے ساتھ ہے۔ پھر بھی میں اسے گرفتار نہ کر سکا کیونکہ وہ ادھر نہیں آتا ہے۔ اٹلی میں بیٹھا اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے واردات کراتا رہتا ہے۔''

وہ عالی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب تم میرے ساتھ ہو تو حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ آسانی سے گرفتار ہو کر ان شوٹرز کے ساتھ جا رہا ہوں تاکہ اس شیطان کارمن ڈی مورا سے سامنا ہو ہی جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ مجھے اپنی حراست میں رکھ کر قانون کے محافظوں سے اپنے بیٹے کی رہائی کا مطالبہ کرے گا۔''

عالی نے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ اسی لیے یہ لوگ تمہیں گولی نہیں مار رہے ہیں۔ اپنے باس کے پاس لے جا رہے ہیں۔ ان کی پلاننگ سمجھ میں آ رہی ہے۔''

راجر نے کہا۔ ''میں سپاہی ہوں۔ موت سے نہیں ڈرتا لیکن بیٹی کی فکر مار رہی ہے۔ میں نہ رہا تو وہ اتنی بڑی دنیا میں بے یار و مددگار رہ جائے گی۔ ڈی مورا اسے بھی مار ڈالنے کے لیے تلاش کرتا رہے گا۔''

''فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے جیسے نیک اور فرض شناس بندوں کی مدد فرماتا ہے۔''

''میرا دل کہتا ہے۔ میرے گاڈ نے، تمہارے اللہ نے میری ماریہ کی حفاظت کے لیے تمہیں بھیجا ہے۔ وعدہ کرو' مجھے کچھ ہو گیا تو تم میری بیٹی کو اپنی سرپرستی میں رکھو گے۔''

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ تمہاری بیٹی کو صرف ہماری ریاست ارضِ اسلام میں تحفظ اور سلامتی ملے گی۔ کسی دشمن کی آواز بھی اسے چھو نہیں سکے گی۔''

راجر نے پوچھا۔ ''کیا ان لمحات میں مجھ سے ایک وعدہ کرو گے اور میرے بعد اسے پورا کرو گے؟''

''میں تمہارے اطمینان کے لیے ہر وہ وعدہ پورا کروں گا جو میرے دین کے مطابق ہوگا۔''

''تمہارے دینِ اسلام کے مطابق کہہ رہا ہوں۔ اسے اپنی بہن نہ بنانا۔ وہ تمہارے لیے نامحرم ہوگی۔ تم چاہو گے تو اسے اپنے نکاح میں لے آؤ گے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم میری عمر جانتے ہو۔''

''میں اپنی بیٹی کی عمر جانتا ہوں۔ وہ بھی گیارہ برس کی ہے۔ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ ہے۔ میں پریشان تھا کہ اسے دشمنوں سے کہاں چھپا کر رکھوں؟ ڈی مورا اپنے شکار تک پہنچنے کے لیے کئی بار پولیس کا نیٹ ورک توڑ چکا ہے۔ اس کے بہروپیے جاسوس ماریہ کو تلاش کرنے کے لیے پورے جنیوا میں بلکہ پورے سوئٹزرلینڈ میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کسی دن بھی ماریہ تک پہنچ سکتے ہیں لیکن میری بیٹی نے ایک دن بڑی ذہانت سے کہا...... پاپا! میں ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں گی جہاں انسان اپنی زندگی میں بھی نہیں جاتا ہے۔''

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا تم قبرستان میں جا کر چھپنا چاہتی ہو۔ دشمن نادان نہیں ہیں۔ وہ قبر کھود کر بھی دیکھنے آئیں گے کہ تم زندہ ہو یا مر چکی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میں مسلمانوں کے قبرستان میں رہوں گی۔''

''میں نے بیٹی کی پلاننگ کے مطابق مسلمانوں کے قبرستان میں جا کر دیکھا۔ وہاں مین گیٹ کے قریب دو رہائشی کوارٹرز ہیں۔ ایک کوارٹر میں قبرستان کا منتظم اور منشی رہتا ہے۔ دوسرے کوارٹر میں تین گورکن رہتے ہیں۔ میں نے منشی کو رازدار بنایا ہے۔ اب ماریہ لڑکوں کا لباس پہن کر بوائے کٹ ہیر اسٹائل بنا کر وہاں رہنے لگی ہے۔ اس کا قد تقریباً پانچ فٹ ہے۔ ایک کمسن لڑکا دکھائی دیتی ہے۔ وہاں کے منشی کو باپ کہتی ہے۔ تدفین کے لیے آنے والوں کا کھاتا لکھتی ہے۔ وہاں کے انتظامات کو پوری ذمے داریوں سے

سنبھالتی ہے۔ وہ بہت سمجھ دار ہے۔ اب تک کسی نے اس پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''سبحان اللہ۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ بہت ذہین ہے۔ اللہ کرے کوئی اس پر شبہ نہ کرے۔''

''وہ اپنی ہی ذہانت سے فی الحال محفوظ ہے۔ لیکن دشمنوں کے خوف سے پوری زندگی اسی طرح نہیں گزار سکے گی۔''

عابی نے کہا۔ ''تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں کیسے وعدہ کروں؟ میرے سامنے جو زندگی ہے، وہ قدم قدم پر مجھے چیلنج کر رہی ہے۔ میں دنیا گھومنے نکلا ہوں اور دنیا والے خطرات کی گھنٹیاں بجاتے جا رہے ہیں۔''

راجر نے کہا۔ ''شادی لازمی ہے۔ آج نہ سہی دس برس بعد دینی احکامات کے مطابق کسی کو اپنی منکوحہ بناؤ گے۔ وہی نکاح اب پڑھوا کر میری بیٹی کو ایک مجازی خدا کے رشتے کی قوت دے دو۔ اسے اپنی ریاست میں رہنے کے لیے بھیج دو۔''

''میں بابا جانی سے بات کروں گا۔''

ان کے آگے اور دائیں بائیں چلنے والی گاڑیاں انہیں شہر سے باہر لے آئی تھیں۔ وہ ہائی وے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر جا رہے تھے۔ پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ میدانی علاقے میں ہریالی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا، دور ایک کھلے میدان میں ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا تھا۔

گاڑیاں ادھر جانے لگیں۔ راجر نے پریشان ہو کر کہا۔ ''عابی......! میں سمجھ رہا تھا ڈی مورا ہمارے ملک میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ ہم اس کے خفیہ اڈے تک پہنچ سکیں گے لیکن یہ ہیلی کاپٹر ہمیں ملک سے باہر کہیں دور لے جائے گا۔''

عابی نے کہا۔ ''ہاں۔ پتا نہیں یہ لوگ ہمیں کہاں لے جائیں گے۔ وہاں سے ہم واپس آسکیں گے یا نہیں؟''

''نہ جانے وہ کیسی جگہ ہوگی؟ وہاں ڈی مورا ہمارے مقابلے میں طاقتور ہوگا۔ ہمارے فرار کے راستے مسدود کر دے گا۔''

گاڑیاں ہیلی کاپٹر کے پاس آ کر رک گئیں۔ وہ سب اپنی گاڑیوں سے اتر کر ان کی طرف آ رہے تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گن مین بھی باہر نکل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ عابی نے دیکھا، وہ تعداد میں بارہ تھے۔

ان میں سے ایک نے اپنی گن سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''باہر آؤ اور ہیلی کاپٹر میں بیٹھو۔''

راجر نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''پہلے فون دو اور کارمن ڈی مورا سے بات کراؤ۔''

وہ بولا۔ ''باس کے پاس پہنچ کر ہی باتیں کرو گے، ابھی چلو۔''

''اگر یہاں بات نہیں ہوگی تو میں آگے نہیں جاؤں گا۔''

وہ اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''فوراً باہر نہیں نکلو گے تو گولی مار دوں گا۔''

''گولی مارنے کے لیے بھی باس سے رابطہ کرنا ہوگا۔ وہ اجازت دے گا، تب ہی ٹریگر دبا سکو گے۔''

''باس نے ہمیں اجازت دی ہے کہ سیدھی طرح نہیں چلو گے تو تمہیں زخمی کر کے لایا جائے۔''

راجر نے کار بند نہیں کی تھی۔ انجن جاگ رہا تھا۔ عابی نے اردو میں کہا۔ ''دروازہ ایک جھٹکے سے کھولتے ہوئے اس کے منہ پر مارو اور سامنے والوں پر گاڑی چڑھاتے ہوئے دور نکل جاؤ۔ یہ اچھی طرح یاد رکھو یہاں میری خاطر واپس نہ آنا۔ آؤ گے تو تمہیں بچانے کے لیے مشکل میں پڑ جاؤں گا۔''

عابی کی طرف کھڑے ہوئے گن مین نے پوچھا۔ ''اے، کیا بول رہے ہو؟ باہر نکلو۔''

اچانک ہی دونوں طرف کے دروازے بیک وقت تیزی سے کھلے۔ وہاں کھڑے ہوئے گن مین ان سے ٹکرا کر پیچھے کی طرف لڑکھڑاتے چلے گئے۔ اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ عابی نے اپنی طرف کے دروازے سے باہر نکلتے ہی بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

''شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان ہے اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

اس سے پہلے کہ گن بردار سنبھلتے اور کچھ سمجھتے، وہ فضا میں چھلانگ لگاتا ہوا، قلابازی کھاتا ہوا ہیلی کاپٹر کے اوپر اس کے ایک پنکھے کے بلیڈ پر بیٹھ گیا۔ آہنی پنکھے کا وہ بلیڈ اس کے وزن سے نیچے کی طرف مڑ گیا۔

ان میں سے کچھ تو حیران ہو کر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ راجر کی کار سے ٹکرا کر ادھر ادھر گر پڑے تھے۔ زخمی ہونے کے باعث فوراً ہی اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

وہ کار کو تیزی سے دوڑاتا ہوا ان سے دور جا رہا تھا۔

تب انہوں نے فائرنگ کی لیکن وہ شوٹنگ رینج سے دور نکل گیا تھا۔ عابی ہیلی کاپٹر کی چھت پر تن کر کھڑا تھا اور سورۃ البقرہ کی آیتیں انگریزی زبان میں پڑھ رہا تھا تاکہ سننے والے سمجھ سکیں۔

ایسے وقت چھ شوٹرز نے اس پر گولیاں چلائیں۔ وہ تمام گولیاں ہوا میں گئیں۔ وہ ہیلی کاپٹر کی چھت سے ہوا ہوگیا تھا۔ وہاں سے چھلانگ لگا کر ان کی ایک گاڑی کے پیچھے آگیا تھا۔ باقی دو گاڑیوں میں چھ شوٹرز راجر کا پیچھا کر رہے تھے۔

عابی سے نمٹنے والوں نے سنا۔ تیسری گاڑی کے پیچھے سے تلاوت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ چھ شوٹرز اس گاڑی کی طرف دوڑتے آرہے تھے پھر یک بیک رک گئے۔ وہ گاڑی ان ہی کی طرف تیزی سے آرہی تھی۔ عابی ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ سب پلٹ کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ دو ٹکرا کر گرے۔ ایک بری طرح کچلا گیا۔ باقی چار شوٹرز گاڑی کی طرف فائر کرنے لگے۔ وہ ان سے دور ہوتی جارہی تھی۔

اب یہ منظر تھا کہ راجر دو گاڑیوں کو اپنے پیچھے دوڑا رہا تھا اور چار شوٹرز عابی کی گاڑی کے پیچھے فائرنگ کرتے ہوئے دوڑتے ہوئے جارہے تھے۔ دو شوٹرز ناکارہ ہوگئے تھے۔ ایک تو گاڑی کے نیچے آکر لہولہان ہوگیا تھا۔ دوسرا بھی زخمی تھا۔ اٹھ کر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

عابی گاڑی کو ایک لمبا ٹرن دے کر پھر ان زخمیوں کے پاس آیا۔ ان دونوں کو دوسری بار کچلتا ہوا گزر گیا۔ وہ چاروں شوٹرز لمبی دوڑ لگانے کے باعث ہانپ رہے تھے۔

عابی گاڑی روک کر دوڑتا ہوا زخمیوں کے پاس آیا۔ ان کے ریوالور اور بھرے ہوئے میگزین اٹھائے۔ ان کی جیبوں سے فون نکالے پھر دوڑتا ہوا آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا راجر کی طرف جانے لگا۔

وہ چاروں اس کی طرف دوڑتے آرہے تھے۔ اسے پھر دور جاتے دیکھ کر رک گئے۔ وہ تھک گئے تھے۔ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ وہ بلند آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔

راجر عابی کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اس کی طرف آرہا تھا۔ پیچھے دشمن لگے ہوئے تھے۔ عابی فائرنگ کے ذریعے انہیں دور ہونے پر مجبور کرسکتا تھا۔ اسے شوٹنگ میں بھی مہارت حاصل تھی لیکن اس نے کبھی کسی دشمن پر گولی نہیں چلائی تھی۔ وہ خود کو خالی ہاتھ لڑنے کا عادی بناتا جارہا تھا۔

اس نے راجر کے برابر کار دوڑاتے ہوئے اس کی گاڑی کے اندر دو ریوالور، بھرے ہوئے میگزین اور موبائل فون کو پھینکا۔ پھر گاڑی کو ٹرن دے کر ان دو گاڑیوں کی طرف رخ کیا۔ سیدھا ان کی سمت جانے لگا۔

وہ کھڑکیوں سے آدھے نکل آئے تھے اور اس پر گولیاں چلا رہے تھے۔ وہ آدھا سیٹ کے نیچے تھا۔ بڑی مہارت سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کار کو ان کی ایک گاڑی سے ٹکرایا اور باہر آگیا۔ زمین پر گر کر قلابازیاں کھاتا ہوا اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

دو گاڑیوں کے ٹکراتے ہی کھڑکیوں سے نکلے ہوئے آدھے لوگ باہر کی طرف الٹ گئے۔ زخمی ہو کر اٹھنے اور سنبھلنے میں وقت لگتا ہے۔ اٹھنے سے پہلے ہی عابی اچھل کر ایک زخمی کے پیٹ پر آکر کھڑا ہوا تو اس کے وزن سے پیٹ پھٹ گیا۔ دوسرے کو ٹھوکر ماری تو اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

پھر وہ اچھل کر فضا میں قلابازی کھاتا ہوا گاڑی کے دوسری طرف گرنے والے شوٹروں کے اوپر آگیا۔ پتا نہیں وہ کس قدر بھاری بھرکم تھا۔ وزن بتانے والی مشین کا کانٹا آخری گنتی پر پہنچ کر رک جاتا تھا۔ ادھر دو شوٹرز جہنم میں چلے گئے تھے۔

دوسری گاڑی والے راجر کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ وہ بھی جوابی فائر کر رہا تھا۔ کار کے اندر محفوظ تھا۔ ایسے وقت ایک ہاتھ سے فون کو کان سے لگا کر پولیس کے اعلیٰ افسر کو موجودہ حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔

اس نے بھی غلطی کی۔ اسے دور جا کر فون پر بولنا چاہیے تھا یا پھر دشمنوں پر پوری توجہ دینی چاہیے تھی۔ اس کا ذہن صرف چند ساعتوں کے لیے بھٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صحیح سمت فائر کرتا' ایک گولی اس کے سر میں آکر گھس گئی۔ اس کے دیدے پھیل کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگئے۔

عابی اس سے بے خبر تھا۔ اپنے طور پر دشمنوں سے نمٹ رہا تھا۔ ان چار شوٹرز کی پٹائی کر رہا تھا جو اس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک کر ہانپنے لگے تھے۔ ان میں سے دو پہلے ہی ناکارہ ہوگئے تھے۔ وہ فضا میں جمناسٹک کے کرتب دکھاتے ہوئے باقی دو کے پیچھے پہنچ گیا۔ ان کے پلٹنے سے پہلے ہی گردنوں کو دبوچ لیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ دونوں نے پھڑ پھڑا کر دم توڑ دیا۔

موت دشمنوں کو ہی نہیں آتی دوستوں کو بھی آتی ہے۔

راجر نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ صرف چار دشمن رہ گئے تھے۔ وہ راجر کی طرف سے جوابی فائرنگ کا انتظار کر رہے تھے۔

انہوں نے دو گولیاں اس کی طرف چلائیں پھر ایک نے کہا۔ ''شاید وہ مر گیا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے' چال بازی دکھا رہا ہو۔ ہمیں سوچ سمجھ کر اس کے قریب جانا ہوگا۔''

تیسرے نے چونک کر پوچھا۔ ''ارے وہ چھلانگیں لگانے والا بازی گر کہاں ہے؟''

یاد کرتے ہی شامت آگئی۔ وہ جس کار کے پیچھے چھپے ہوئے گولیاں چلا رہے تھے' وہ کار دوسری طرف سے اٹھ کر بڑی تیزی سے ان کے اوپر آگئی۔ عابی نے اسے ایک طرف سے اٹھا کر ان کے اوپر پھینکا تھا۔ ان میں سے تین فوراً ہی بھاگ نہ سکے، اس کے نیچے دب گئے۔ چوتھا اور آخری دشمن بھاگ رہا تھا۔ عابی چھلانگیں لگاتا ہوا آرہا تھا۔ پھر اس کی پیٹھ پر ایک لات پڑی۔ وہ اچھل کر اوندھے منہ گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ ایک ہی لات نے اس کی کمر کی ہڈی توڑ دی تھی۔

پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ شاید ہر ملک کی پولیس کا یہی دستور ہے۔ قصہ تمام ہونے کے بعد پہنچتی ہے۔ عابی دوڑتا ہوا راجر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''باہر نکلو۔ تمہاری پولیس والے آرہے ہیں۔''

وہ قریب پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ کار تابوت بن گئی تھی۔ اندر اس کی میت رکھی ہوئی تھی۔ اس کا سر جھک گیا۔ وہ بڑے صدمے سے زیرلب پڑھنے لگا۔ ''ہر ذی روح کو اللہ کی طرف جانا ہے۔''

تھوڑی دیر پہلے راجر سے دوستی ہوئی تھی بلکہ رشتے داری ہوگئی تھی۔ عابی نے اس کے لیے جنگ لڑی تھی اور فتح یاب ہوا تھا لیکن دوست کو ہار گیا تھا۔

سائرن بجاتی ہوئی گاڑیاں وہاں آکر رک گئی تھیں۔ مسلح سپاہی گاڑیوں سے نکل کر دوڑتے ہوئے ادھر ادھر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف جارہے تھے۔ ان میں سے دو چار زندہ تھے لیکن زمین سے اٹھنے اور حرکت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

دو پولیس افسر اور چند سپاہی عابی کے پاس آئے۔ انہوں نے اپنے افسر راجر کی لاش دیکھی تو ان کے سر جھک گئے۔

پھر ایک افسر نے عابی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''راجر نے آدھا گھنٹا پہلے فون پر یہاں کے حالات بتائے تھے۔ یہ آپ کے ممنون تھے۔ ہم بھی آپ کے شکرگزار ہیں۔ آپ نے آخر وقت تک راجر کا ساتھ دیا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''میرا یہ ساتھ آخری نہیں ہے۔ جنگ تو اب شروع ہوگی۔ راجر مجھے بہت بڑی ذمے داری سونپ گیا ہے۔ اس کی بیٹی ماریہ کی حفاظت کا فرض ادا کرنا ہے۔ میں کارمن ڈی سورا کو جہنم میں پہنچاؤں گا، تب ہی ماریہ محفوظ رہ سکے گی۔''

افسر نے کہا۔ ''اسے باپ کی ہلاکت کی اطلاع دینی ہوگی۔ پتا نہیں، وہ کہاں روپوش ہے؟''

عابی نے کہا۔ ''ان دشمنوں میں سے ایک نے راجر سے فون اور ریوالور لے لیا تھا۔ اس فون میں ماریہ کا کانٹیکٹ نمبر ہوگا۔''

وہ مردہ اور زخمی دشمنوں کی طرف جاتے ہوئے فون چھیننے والے کو پہچاننے لگا۔ وہ دو سپاہیوں کے قریب زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ عابی نے اس کے لباس کی تلاشی لے کر اس کا فون نکالا۔ پھر اسے آن کر کے ڈائلنگ لسٹ میں ماریہ کا نام پڑھا۔ دل میں یہ صدمہ تھا کہ ایک بیٹی کو صدمہ پہنچانے والی اطلاع دینی ہے۔ اس نے دل پر جبر کر کے نمبر پنچ کیے تو دوسری طرف بیل جانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ایک میٹھی سی پیاری سی آواز سنائی دی۔ ''ہائے پاپا! میں آپ کو مس کال دینے والی تھی۔ مجھے پتا ہے' آپ میرے لیے فکرمند ہوں گے اور میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ آپ ایک ذرا فکر نہ کریں۔ میں یہاں پوری طرح محفوظ ہوں۔''

وہ اپنی سلامتی کے سلسلے میں باپ کو مطمئن کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''ویسے بھی ایک سپاہی باپ کی بیٹی ہوں۔ حالات سے لڑنا جانتی ہوں۔ بائی دا وے، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں ہی بولتی جا رہی ہوں۔ آپ بھی تو کچھ بولیں۔ ابھی آپ کہاں ہیں؟''

عابی نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''تم کون ہو؟ پاپا کہاں ہیں؟''

''میں پرنس عابد علی منگی بول رہا ہوں۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''کیا واقعی...... تم سچ بول رہے ہو؟ تم پرنس عابی ہو؟ پاپا کو فون دو۔ وہ بولیں گے تو تمہیں پرنس مان لوں گی۔''

"تمہارے پاپا اب کبھی نہیں بولیں گے۔ پورے حوصلے سے یقین کرلو کہ وہ تمہیں ہمیشہ کے لیے تنہا چھوڑ کر جاچکے ہیں۔"

وہ چیخ پڑی۔ "نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے پاپا کا فون تمہارے پاس کیسے ہے؟ پاپا......!"

وہ پکارنے لگی۔ "پاپا! تم کہاں ہو؟ یہ کوئی دشمن ہے۔"

عابی نے فون افسر کو دیتے ہوئے کہا۔ "وہ یقین نہیں کررہی ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔"

افسر نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "بیٹی ماریہ! میں شیرون بول رہا ہوں۔ میری آواز پہچان رہی ہو نا؟ بیٹی! حوصلہ کرو۔ وہ بہادر افسر دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا ہے۔"

اسے چپ لگ گئی۔ فون ذرا دیر تک خاموش رہا۔ شیرون نے اسے آواز دی۔ "بیٹی ماریہ......!"

وہ آنسو بھری آواز میں بولی۔ "ایم آل رائٹ انکل! میں آنسو نہیں بہاؤں گی اور اب روپوش نہیں رہوں گی۔ بائی گاڈ اپنے باپ کے قاتلوں سے فائٹ کروں گی۔ ابھی پاپا کے آخری دیدار کے لیے آؤں گی۔"

"تم سمجھ دار ہو نادانی کی باتیں نہ کرو۔ جوڈو کراٹے کی ٹریننگ حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی پہاڑ سے ٹکرا جاؤ گی۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟"

"آپ نصیحت نہ کریں۔ مجھے بتائیں' پاپا کو پوسٹ مارٹم کے لیے کہاں لایا گیا ہے؟ میں ابھی اس ہاسپٹل میں آؤں گی۔"

"ابھی اسے یہاں سے لے جانے والے ہیں۔ میں ہاسپٹل پہنچنے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔ تب تک ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ تم جہاں بھی روپوش ہو وہاں سے تمہیں باہر نہیں آنا چاہیے۔"

وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔ "یہ لڑکی بہت ضدی ہے۔ خواہ مخواہ دشمنوں کو للکارنے کے لیے اپنی پناہ گاہ سے نکلنا چاہتی ہے۔"

عابی نے کہا۔ "میں اسے سمجھاؤں گا۔"

شیرون نے پوچھا۔ "ہم نہیں جانتے وہ کہاں ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں' وہ کہاں چھپی ہوگی؟"

"جانتا ہوں۔ میں کارسن ڈی مورا تک پہنچنے کے لیے آپ سے تعاون چاہتا ہوں۔"

"آپ اس خبیث تک پہنچنا چاہیں گے تو گویا قانون کی مدد کریں گے۔ آپ جو سہولتیں چاہیں گے' وہ حاصل ہوتی

رہیں گی۔''

''میں چاہتا ہوں مجھے کسی بھی بہانے سے یہاں روک لیں۔ آگے پیرس نہ جانے دیں۔''

''ہم بیان دیں گے کہ آپ پولیس آفیسر راجر کے مرڈر کے چشم دید گواہ ہیں۔ اس لیے آپ کو اس ملک میں روکا جارہا ہے۔ آپ جب تک چاہیں گے یہاں رہ سکیں گے۔ بائی دا وے، کیا یہاں رہ کر کارمن ڈی مورا تک پہنچ سکیں گے؟''

وہ بولا۔ ''وہ قاتل یہاں نہیں آئے گا۔ مجھے اُدھر جانا ہوگا۔ آپ میرے اٹلی جانے کے انتظامات کریں۔''

''ہمارے ماہر شوٹرز' فائٹرز اور سراغ رسانوں کی ٹیم آپ کے ساتھ جائے گی۔''

''بے شک جائے لیکن وہ ٹیم مجھ سے دور رہا کرے گی۔ میں اپنی عادت کے مطابق اپنی جنگ آپ لڑوں گا۔''

''آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔''

''ابھی مجھے ایک گاڑی دیں۔ میں تنہا ماریہ کے پاس جاؤں گا۔ اس سے ملنے کے بعد آپ کے پاس آؤں گا۔''

''آپ واپسی کا وقت مقرر کریں۔ میں اس وقت تمام اعلیٰ افسران کو کال کروں گا۔ سب ہی آپ سے مل کر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کریں گے۔''

''میں فون پر اطلاع دے دوں گا۔''

''سنا ہے آپ فون، ہتھیار' گھڑی اور انگوٹھی جیسی چیزیں اپنے پاس نہیں رکھتے ہیں۔''

''میں یہ بوجھ نہیں اٹھاتا۔ آپ کو کہیں سے بھی فون پر اطلاع دوں گا۔ آپ نمبر بتائیں۔''

افسر نے نمبر بتا کر کہا۔ ''اسے لکھ لیں۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ یہ میرے دماغ میں نقش ہو چکا ہے۔''

انہوں نے وہاں سے ہیڈ کوارٹر میں آکر اسے ایک گاڑی دی۔ وہ اسے ڈرائیو کرتا ہوا اس قبرستان کی طرف جانے لگا جہاں ماریہ روپوش رہتی تھی۔ اس نے پولیس والوں سے قبرستان کی سمت جانے کا راستہ نہیں پوچھا تھا۔ اگر پوچھتا تو وہ سمجھ لیتے کہ ماریہ وہیں چھپ کر رہتی ہے۔

پولیس والے دشمن نہیں تھے لیکن ان میں کوئی دشمن کا مخبر ہوسکتا تھا۔ اس لیے ہیڈ کوارٹر سے دور نکلنے کے بعد اس نے ایک راہ گیر سے پوچھا۔ اسے معلوم ہوا کہ کن راستوں سے گزر کر وہاں تک پہنچ سکے گا۔ آگے جا کر الجھن ہوتی تو وہ پھر کسی سے پوچھ لیتا۔

اسے ڈرائیو کرنے کے دوران معلوم ہوا کہ ایک گاڑی بہت دیر سے اس کے پیچھے چلی آرہی ہے۔ اس نے سڑک کے کنارے اپنی گاڑی روک دی۔ وہ کسی کو قبرستان تک اپنے پیچھے لگانا نہیں چاہتا تھا۔ وہیں ان سے نمٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ دشمن نہیں لیکن دردِ سر تھے۔ ان کی گاڑی قریب آکر رک گئی۔ ان کے دروازے کھلے پھر وہ چار یہودی نظر آئے جو مسجد کے سامنے اس سے ملنے آئے تھے۔ وہ کار سے نکل کر تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئے پھر انہوں نے بڑے ادب سے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے سر جھکا لیے۔

عابی نے پوچھا۔ ''میرے پیچھے کیوں آرہے ہو؟''

ایک نے کہا۔ ''یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہم آپ کو ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ دور سے آپ کا خیال رکھیں گے۔''

''کیوں خیال رکھیں گے؟ کیا میں نادان بچہ ہوں؟''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''سر! یہ انجانا شہر ہے۔ آپ کو کہیں بھی ہماری ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''فار گاڈ سیک۔ آپ ہمارے فرائض سے ہمیں نہ روکیں۔''

عابی نے انہیں سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ''فون نکالو۔ مسٹر ہوسٹن سے بات کراؤ۔''

اس نے فوراً ہی جیب سے فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ''مسٹر ہوسٹن! آنر ایبل پرنس سے بات کریں۔''

اس نے فون کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑے ادب سے پیش کیا۔ عابی نے اسے لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ''مسٹر ہوسٹن! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ لوگ میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟ کیا میں قیدی ہوں؟ کیوں میری نگرانی کی جارہی ہے؟''

وہ بولا۔ ''آنر ایبل پرنس! آپ ناراض نہ ہوں۔ ہم سب ایک ساتھ پیرس پہنچنے والے تھے۔ ہم تو پہنچ گئے۔ آپ پیچھے رہ گئے۔ ہم تشویش میں مبتلا ہیں کہ آپ خلافِ قانون وہاں رک گئے ہیں۔ قانونی گرفت میں نہ آگئے ہوں یا آپ کے نئے دشمن پیدا نہ ہوگئے ہوں۔ طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ ہماری محبت کو اور ذمے داریوں کو سمجھیں۔ پلیز.....''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں ایک پولیس افسر کا مرڈر ہوا ہے۔ میں اس قتل کا چشم

وید گواہ ہوں اس لیے مجھے روک لیا گیا ہے۔ پولیس والوں کا رویہ دوستانہ ہے۔ میں دو چار دنوں میں آپ کے پاس آجاؤں گا۔''

''آنر ایبل پرنس! ہمارے بے شمار انجانے دشمن ہیں۔ وہ چھپ کر حملہ کریں گے تو آپ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔''

عالی نے کہا۔ ''دشمن موت کی طرح ہوتے ہیں۔ کہیں سے بھی کسی بھی وقت چھپ کر دھاوا بول دیتے ہیں۔ کیا آپ میری موت سے مجھے اور اپنی موت سے خود کو بچا سکتے ہیں؟''

''نہیں مگر آپ ہمارے درمیان رہیں گے تو ہمیں......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے درمیان رہ کر بھی موت آئے گی۔ پلیز میری فکر نہ کریں۔ میں اپنی مام کے اپارٹمنٹ میں رہنے کے لیے پیرس ضرور آؤں گا۔ آپ انتظار کریں اور ابھی ان لوگوں کو سمجھا دیں کہ میرے پیچھے نہ آئیں۔ آئندہ ان میں سے کوئی بھی نظر آئے گا اور مجھے غصہ آئے گا تو ان میں سے کوئی اپنی جان سے جائے گا۔''

اس نے فون واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''لو، بات کرو۔''

وہ فون لے کر بولا۔ ''یس مسٹر ہوسٹن!''

کریک ہوسٹن نے کہا۔ ''وہ سر پھرا ہے۔ آئندہ اس کی نظروں میں نہ آنا۔ مارے جاؤ گے۔''

''پھر تو ہم نگرانی نہیں کریں گے۔''

''کریں گے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اس کی نگرانی کا کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جائے گا۔''

وہ فون بند کر کے عالی سے بولا۔ ''ہم جا رہے ہیں پھر کبھی آپ کے پیچھے نہیں آئیں گے۔ آپ جائیں۔ ہم یہاں آدھے گھنٹے تک رکے رہیں گے۔''

وہ چاروں اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ عالی نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی پھر کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگا۔ ان چاروں کو اپنی زندگی عزیز تھی۔ وہ وہیں بیٹھے رہے۔ عالی نے قبرستان پہنچنے تک پھر کسی گاڑی کو اپنے تعاقب میں نہیں دیکھا۔

وہ کار سے اتر کر قبرستان کے احاطے کے اندر آیا پھر ٹہلنے کے انداز میں ان رہائشی کوارٹروں کے سامنے پہنچا جہاں انتظامیہ کے کارکن رہتے تھے۔ ماریہ ایک کوارٹر کے برآمدے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس دو گورکن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گیارہ برس کی لڑکی تھی۔ لڑکوں کے لباس میں رہتی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق صرف قبرستان کا منشی ہی اس کی حقیقت جانتا تھا۔ باقی سب ہی اسے لڑکا سمجھتے تھے۔

عالی نے ایک درخت کی آڑ سے دیکھا۔ لڑکا بن کر رہنے کے باوجود اس کے چہرے پر گلاب کھل رہا تھا۔ وہ بہت ہی جاذب نظر تھی۔ اسے لڑکیوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے پہلی بار ایک لڑکی کو اس خیال سے دیکھا کہ وہ شادی کی عمر کو پہنچ کر اس کی دلہن بنے گی۔

اس کے دل میں شاعرانہ جذبات نہیں تھے اور نہ ہی اس کی فطرت میں عشق اور دیوانگی تھی۔ پھر بھی پہلی بار اسے وہ لڑکی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس سے دوستی کر سکتا تھا۔

ایک گورکن نے ماریہ سے کہا۔ ''یار دکی! تم صبح سے خوب بول رہے تھے اور ہنس رہے تھے پھر اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری صورت دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی رو پڑو گے۔''

پھر ہزار ضبط کے باوجود ماریہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ فوراً ہی رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں کیوں آج پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔''

وہ پھر بے اختیار روتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو پھر آنسو نکل رہے ہیں۔ پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تھوڑی دیر رونے کے بعد میرا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں ابھی تم لوگوں کے پاس آ کر خوب باتیں کروں گا۔''

وہ دونوں اپنے رہائشی حصے کی طرف جانے لگے۔ وہ رو رہی تھی اور رومال سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ باپ کے قتل ہونے کے بعد دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ یہ صدمہ بھی رلا رہا تھا کہ ایک لڑکی ہے پہاڑ جیسے دشمن سے انتقام نہیں لے سکے گی۔

عالی کے احساسات پہلی بار کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ وہ روتی ہوئی لڑکی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا اس کے شانے پر ہاتھ رکھے۔ اسے تھپک کر تسلی دے جبکہ وہ کسی کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

وہ درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ ماریہ نے آہٹ سن کر سر اٹھایا پھر ایک اجنبی کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ یہ دھڑکا سا لگا کہ دشمن کا کوئی جاسوس اسے تلاش کرتا ہوا آ گیا ہے۔

پھر چند لمحوں کے بعد عقل نے سمجھایا۔ یہ تو پرنس عالی ہے جسے ٹی وی اسکرین پر دیکھ چکی ہے اور جس کا چرچا سنتی آ رہی ہے۔ دور کھڑے ہوئے گورکنوں نے بھی اسے حیرانی سے دیکھا پھر تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ ایک نے کہا۔ ''آپ...... جناب...... آپ پرنس عالی ہیں؟''

ماریہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔

''تم پرنس ہو۔ اس شہرِ خموشاں میں آئے ہو۔ کیوں آئے ہو؟ اور میرے پاس آکر رک گئے ہو۔''

اس گیارہ برس کی لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''اوہ گاڈ! میرا دل دھڑک رہا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج کی دنیا کا سب سے شہ زور آدمی میرے اتنے قریب آجائے گا۔ اس کے انداز سے پتا چل رہا ہے کہ یہ مجھ سے کچھ کہنے والا ہے۔''

عابی نے گورکنوں کو دیکھا پھر اس سے کہا۔ ''میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

ماریہ حیران رہ گئی۔ ''اوہ گاڈ! میں ابھی یہی چاہتی تھی۔ یہ جواب دے رہا ہے۔ کیا میرے دل کی باتیں سن رہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں تمہارے دل کا حال جانتا ہوں۔ تم پر جو گزر رہی ہے' اسے سمجھ رہا ہوں۔''

پھر اس نے گورکنوں سے کہا۔ ''پلیز ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔''

وہ دونوں وہاں سے جانے لگے۔ ماریہ نے پوچھا۔ ''آپ دلوں کا حال کیسے جانتے ہیں؟ کیا ٹیلی پیتھی جانتے ہیں؟''

عابی نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''آپ نے ابھی ابھی کہا ہے کہ میرے دل کا حال جانتے ہیں۔ مجھ پر جو گزر رہی ہے' اسے سمجھ رہے ہیں۔''

''میں تمہارے حالات سے واقف ہوں۔ میں تمہارے پاپا کے آخری وقت میں ان کے ساتھ تھا۔ افسوس انہیں دشمنوں سے نہ بچاسکا۔ حقیقت یہی ہے' کوئی کسی کو موت سے بچا نہیں سکتا۔''

اس نے پوچھا۔ ''پاپا کو پوسٹ مارٹم کے لیے کس ہاسپٹل میں لے گئے ہیں۔''

عابی نے کہا۔ ''پولیس افسر گیری کو پھر کال کرو۔ ابھی معلوم ہوجائے گا۔''

''وہ افسران مجھے نہیں بتائیں گے۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں خفیہ پناہ گاہ سے باہر دشمنوں کی نظروں میں آؤں۔''

''تم کال کرو اور مجھ سے بات کراؤ۔ میں ان سے معلوم کروں گا پھر تم اپنے پاپا کا آخری دیدار کرسکو گی۔''

''تھینک یو پرنس! میں ابھی کال کرتی ہوں۔''

وہ کوارٹر کے اندر جاکر اپنا فون لے آئی۔ مطلوبہ نمبر پنچ کرنے کے بعد اسے کان سے لگایا پھر رابطہ ہونے پر بولی۔ ''انکل! میں ماریہ بول رہی ہوں۔''

''ہاں بیٹی! تمہارے پاپا کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ان کی آخری رسومات ادا کی جائیں گی۔ میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں، تمہیں نہ ہاسپٹل آنا چاہیے۔ نہ میت کے ساتھ قبرستان جانا چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر میں پرنس عابی تم سے ملنے آرہے ہیں۔ وہ بھی تمہیں یہی سمجھائیں گے۔''

''پرنس میرے سامنے موجود ہیں۔ ان سے بات کریں۔''

عابی نے فون لے کر کہا۔ ''یس آفیسر! میرا خیال ہے ایک بیٹی کو باپ کے آخری دیدار سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ اگرچہ یہ بات محض جذباتی ہے۔ عقل سمجھاتی ہے کہ سلامتی کی خاطر دشمنوں سے چھپ کر رہا جائے۔''

''پلیز، آپ ماریہ کو سمجھائیں۔''

''میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ ہم بیٹی کو باپ سے دور نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ راز کی بات بتادوں کہ ماریہ قبرستان میں روپوش رہتی ہے۔ اب اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔''

''دشمن اس کی تاک میں ہوں گے۔ اسے پہچان لیں گے۔''

''میں اسے عبا اور نقاب میں لاؤں گا۔ دشمن پھر بھی دیکھ لیں گے تو ان سے نمٹ لوں گا۔''

''اوکے۔ آپ ماریہ کی ذمے داری لے رہے ہیں تو ہمیں اعتراض نہیں ہے۔''

''ابھی فوراً ایک عبا اور نقاب کی ضرورت ہوگی۔''

ماریہ نے فون کے قریب جھک کر کہا۔ ''میرے پاس ہے۔ میں عبا میں چھپ کر یہاں آئی تھی۔ بس ہم آرہے ہیں۔''

اس نے عابی سے فون لے کر بند کیا پھر کہا۔ ''مائی گاڈ! آپ کتنے اچھے ہیں۔ میری مشکل آسان کرنے آئے ہیں۔ میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں؟ بس ابھی آتی ہوں۔''

وہ اندر گئی پھر جلد ہی عبا اور نقاب میں چھپ کر آگئی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''ابھی آپ نے کہا تھا کہ میرے پاپا کے آخری وقت ان کے ساتھ تھے۔ آپ ہمارے ملک میں کب سے ہیں؟ پاپا آپ کو کب سے جانتے ہیں؟''

''صرف پانچ گھنٹے پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایسے زندہ دل تھے' اتنے اچھے انسان تھے کہ انہوں نے چند منٹوں میں مجھے اپنا دوست بنالیا تھا۔''

وہ قبرستان سے باہر آکر کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاپا بہت گریٹ تھے۔ دشمنوں کو بھی دوست بنالیتے تھے۔ لعنت ہے کارمن ڈی مورا پر کہ اس نے ایک فرشتے کو ہلاک کیا ہے۔''

وہ کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بھی دن پورے ہوچکے ہیں۔ میں اسے جہنم میں

پہنچانے کے لیے اٹلی جارہا ہوں۔''

وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بڑے جذبے سے اس کی طرف گھوم کر بولی۔ ''کیا واقعی؟ آپ میرے پاپا کا انتقام لینے اس خبیث کے ملک میں جائیں گے؟''

وہ صدمات کے باوجود خوش ہورہی تھی۔ ''اوہ مائی گاڈ! تو نے ایک فرشتے کو میرے ملک کی زمین پر اتارا ہے۔ میں تیرا جتنا بھی شکر ادا کرتی رہوں' کم ہے۔ میں آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتائیں آپ کیا کرنے والے ہیں؟ اس دشمن سے کب نمٹنے والے ہیں؟''

''پہلی بات تو یہ کہ یور آنر اور آپ جیسے الفاظ ادا نہ کرو۔ میں بزرگ نہیں ہوں۔ تمہارا ہم عمر ہوں۔ یقین کرو کہ میں بھی گیارہ برس کا ہوں۔''

''ہاں۔ میں نے سنا ہے۔ دیکھ کر یقین نہیں ہوتا۔ آپ پچیس تیس برس کے گبرو جوان دکھائی دے رہے ہیں۔''

''پھر آپ......!''

وہ جلدی سے بولی۔ ''تم...... میں تم کہوں گی۔ تم مجھے بھرپور اپنایت دے رہے ہو۔ پاپا کی موت نے مجھے بدنصیب بنایا ہے۔ تم آتے ہی خوش نصیب بنا رہے ہو۔''

وہ کہہ نہ سکا کہ وہ اس کے نصیب میں لکھی جارہی ہے۔ ایسی بات بڑے جذبے سے کی جاتی ہے لیکن اسے کہتے ہوئے جھجک سی ہورہی تھی۔ پہلی بار ایک لڑکی کے لیے چور جذبات اچھے لگ رہے تھے۔ وہ اچانک ہی اس کی بہت کچھ لگ رہی تھی۔

وہ ہاسپٹل میں آئے۔ راجر ایک فرض شناس افسر تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے تمام افسران وہاں موجود تھے۔ وہ سب اس لیے بھی آئے تھے کہ پرنس عابی سے روبرو ملاقات کر کے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کریں گے۔

تمام افسران .... محبت اور ہمدردی سے ماریہ کے ساتھ پیش آئے۔ اس نے روتے ہوئے باپ کا آخری دیدار کیا۔ پھر عابی ان افسران کے ساتھ ایک سیل میں آگیا۔ کارمن ڈی مورا کے تین کارندے زندہ تھے۔ بری طرح زخمی تھے۔ اب الگ الگ سیل میں لاتیں اور جوتے کھا رہے تھے۔ ان سے ڈی مورا کے بارے میں اہم سوالات پوچھے جارہے تھے۔

کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہورہی تھی۔ وہ تینوں کرائے کے قاتل تھے۔ ڈی مورا کے متعلق قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ اس کی ذاتی زندگی اور درپردہ مصروفیات کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں جانتے ہیں۔

ان میں سے ایک شوٹر کا نام ڈینی تھا۔ اس نے عابی سے کہا۔ ''میں آپ کا فین ہوں۔ میرا گاڈ جانتا ہے۔ میں نے آپ کی طرف گولیاں چلائیں لیکن آپ پر نہیں چلائیں۔ اب بھی آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کارمن ڈی مورا کی پرسنل لائف کو میں دور تک جانتا ہوں۔''

عابی نے کہا۔ ''اس کے خلاف میرے کام آؤ گے تو تمہاری سزائیں معاف کرادوں گا۔ تم زندہ رہو گے۔ بولو اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ تمہاری معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟''

''میں ڈی مورا کا سالا ہوں۔ میری بہن نائرن مورا اس کی بیوی ہے۔ اس لورل ڈی مورا کی ماں ہے جو آپ کی قید میں اذیتیں برداشت کر رہا ہے۔''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''نائرن اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے پاگل ہورہی ہے...... سنا ہے یہاں بیٹے کی حالت نازک ہے۔ وہ اذیتیں برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ اگر وہ مرے گا تو ماں کا بھی دم نکل جائے گا۔''

وہ مایوسی سے بولا۔ ''میں بہن کو جھوٹی تسلیاں دے کر آیا ہوں کہ اسے کسی طرح رہائی دلا کر لے آؤں گا۔ لیکن رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ میں ہر طرح آپ کے کام آتا رہوں گا۔ کیا آپ میرے بھانجے اورل ڈی مورا کی سزائے موت کو بدل سکیں گے؟''

عابی نے کہا۔ ''میں کسی ملک کے قوانین اور عدالتی فیصلے نہیں بدل سکتا۔ کسی اور طرح تمہارے کام آؤں گا۔ تمہاری بہن کو سمجھاؤں گا کہ بیٹے کے لیے صبر کرے۔ جو مجرمانہ زندگی گزارتے ہیں وہ ایک دن حرام موت مارے جاتے ہیں۔ تم اپنی جان کی امان چاہو۔ میں تمہاری سزا معاف کراؤں گا۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ گے، جہاں ڈی مورا ہوگا۔''

ایک افسر نے پوچھا۔ ''کیا ڈی مورا اٹلی میں ہے؟''

''نہیں، پیرس میں ہے۔ وہاں شاید دو چار روز رہے گا۔''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''مسٹر عابی! یہ ہمارے اور آپ کے لیے آسانی ہوگئی۔ آپ اپنے ہی پاسپورٹ پر کل صبح کی فلائٹ سے پیرس جاسکیں گے۔''

ڈینی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''فار گاڈ سیک۔ مجھے ساتھ لے چلیں۔ میں بہت کام آؤں گا۔''

اعلیٰ افسر نے حکم دیا کہ ڈینی کا علاج توجہ سے کیا جائے تاکہ وہ عابی کے ساتھ جانے کے قابل ہوجائے۔

ماریہ نے ڈینی کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی صورت دیکھ کر غصہ آرہا ہے۔ اس کے بہنوئی نے پہلے میری ممی کو پھر پاپا کو ہلاک کیا ہے۔ جی چاہتا ہے اس کے پورے خاندان کو لہو میں ڈبو دوں۔''

عابی نے کہا۔ ''دشمنوں سے نفرت کرو۔ غصہ نہ کرو۔ غصہ ہماری ذہانت اور حکمتِ عملی کو کمزور بنا دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھو کہ وہ دنیا کا سب سے طاقتور آدمی کہلاتا ہے جو غصے کے وقت نارمل رہتا ہے۔''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''تم نے بہت اچھی بات سمجھائی ہے۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

وہ دونوں سپاہیوں کے ساتھ ایک سیل میں آئے۔ وہاں لورل ڈی مورا نیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ اسے آئے دن تھرڈ ڈگری کے تشدد سے گزارا جاتا تھا۔ فون کے ذریعے اس کی ماں ٹائرن مورا اور اس کے باپ کارٹن ڈی مورا کو اس کی روتی گڑگڑاتی اور زندگی کی بھیک مانگتی صدائیں سنائی جاتی تھیں۔

ماریہ اور عابی نے دیکھا۔ وہ اذیتیں برداشت کرتے کرتے ہڈیوں کا ڈھانچا بن رہا تھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہوگئی تھی۔ اسے دیکھ کر دل یہی کہتا تھا کہ اسے مر جانا چاہیے یہ اور تکالیف برداشت نہیں کر سکے گا۔

ایک افسر نے اس سے کہا۔ ''یو باسٹرڈ لورل ڈی مورا..... ! دیکھو۔ یہ اس فرض شناس پولیس افسر کی بیٹی ہے، جس کی ماں کو اور باپ کو تمہارے خبیث باپ نے ہلاک کرایا ہے۔ تھو ہے تم پر۔''

لورل نے مردہ نظروں سے ماریہ کو دیکھا پھر کمزور سی لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم بھی مجھ پر تھوک دو۔ دنیا سے جانے والے کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مجرم ہے یا نہیں ہے۔ مجھے تو اب جانا ہی جانا ہے۔ سچ کیا ہے؟ گاڈ جانتا ہے۔ میں نے ڈان کارٹن ڈی مورا کا بیٹا ہو کر بھی کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں اٹلی سے یہاں اپنی ایلسی سے ملنے آیا تھا۔ اسے کسی نے ہلاک کر دیا۔ میں آخری سانس تک یہی کہوں گا کہ میں نے ایلسی کی عزت نہیں لوٹی، اسے ہلاک نہیں کیا ہے۔ میں نہیں جانتا میرے خلاف کس نے سازش کی ہے اور کیوں کی ہے؟ میں دن میں کئی بار بس اتنا ہی بولتا ہوں۔ آگے میری بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ چپ ہو جاتا ہوں۔

''خدا ہے تو خود انصاف کرے گا۔ کوئی معجزہ دکھائے گا۔ کوئی مسیحا آئے گا اور میری موت سے پہلے مجھے الزامات سے پاک کرے گا۔ کاش ایسا ہو جائے.....''

عابی اسے گہری سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں دل کو چھو رہی تھیں۔ اس نے بولتے بولتے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس پر نقاہت طاری ہوگئی تھی۔

عابی نے اعلیٰ افسر سے پوچھا۔ ''کیا یہ ثابت ہوا تھا کہ اس نے ایلسی سے زیادتی کرنے کے بعد اسے ہلاک کیا تھا؟''

افسر نے کہا۔ ''ایک لڑکی اس کے اپارٹمنٹ میں مردہ پائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ مرڈر سے پہلے اس کی عزت سے کھیلا گیا تھا۔ لڑکی کی شناخت نہ ہو سکی کہ وہ ایلسی تھی یا کوئی اور تھی۔''

''کیا لورل کو جائے واردات سے گرفتار کیا گیا تھا؟''

''نہیں۔ وہ ایک نائٹ کلب میں تھا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ وہ مرڈر کے وقت نائٹ کلب میں اپنی موجودگی ثابت کرنے گیا تھا۔''

عابی نے کہا۔ ''یہ محض قیاس آرائی ہے۔''

افسر نے کہا۔ ''ایسے ہی وقت اس کے باپ کارٹن ڈی مورا نے پولیس افسر راجر کی وائف کو قتل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بیٹا بھی قاتل ہے۔ اسے رہائی دلانے کے لیے وہ قانون سے کھیل رہا ہے۔ وہ بار بار مطالبہ کر رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو رہا کیا جائے ورنہ وہ پولیس افسران کی لاشیں گراتا رہے گا پھر اس کے شوٹرز نے راجر کو بھی ہلاک کر دیا۔ پولیس والے اور تو کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ باپ کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے اس لیے بیٹے پر ظلم و تشدد کی انتہا کر رہے تھے۔''

عابی نے تمام افسران کی موجودگی میں کہا۔ ''آپ حضرات کا اصل مجرم کارٹن ڈی مورا ہے۔ اس کا بیٹا ملزم ہے اس پر جرم ثابت نہیں ہوا ہے۔ میں اس کے لیے رعایت اور سہولتیں چاہتا ہوں۔''

ایک اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''یہ کہ اس پر اور ظلم نہ کیا جائے۔ جرم ثابت ہونے تک میری خاطر اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ ماہر ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا جائے۔''

''ہم آپ کی خاطر اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیں گے۔ یہ تو قوی امید ہے کہ آپ کارٹن کو عبرت ناک انجام تک پہنچائیں گے۔ کل صبح کی فلائٹ میں ڈی مورا کا سالا ڈینی بھی آپ کے ساتھ جائے گا۔ ہمارے آدمی دور سے نگرانی کرتے رہیں گے۔''

عابی نے ماریہ کو دیکھ کر کہا۔ ''ماریہ تنہا رہ گئی ہے۔ آپ حضرات مائنڈ نہ کریں۔ اس کی ممی اور پاپا کی ہلاکت

سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ پولیس کی سیکیورٹی میں محفوظ نہیں رہ سکے گی۔''

''یہ حقیقت ہے۔ ہم مائنڈ نہیں کر رہے ہیں۔ پھر ماریہ کے لیے کیا کیا جائے؟''

عابی نے ماریہ سے پوچھا۔''کیا میرے ساتھ چلو گی؟ میرے ساتھ رہو گی؟''

یہ سنتے ہی وہ جیسے اچھل پڑی۔ حیرانی سے اس کی طرف گھوم کر بولی۔''میں تمہارے ساتھ چلوں؟ تمہارے ساتھ رہوں؟ او گاڈ! تم تو میری تقدیر بدل رہے ہو۔''

وہ کرسی سے کھسک کر اس کے سامنے فرش پر دوزانو ہو گئی۔ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔''میں ساری عمر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ کیا یہ ممکن ہے؟''

وہ اسے تھپک کر بولا۔''ممکن ہے۔ واپس کرسی پر جاؤ۔ آئندہ یوں گھٹنوں کو ہاتھ نہ لگانا۔''

وہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔ شام تک راجر کی تدفین ہو گئی۔ عابی نے کہا۔''ساتھ رہنے میں کچھ رکاوٹیں ہیں۔ اگرچہ ہم عمر کے حوالے سے بالغ نہیں ہوئے ہیں لیکن ذہنی طور پر باشعور ہیں۔ ہمیں کسی رشتے کے بغیر ایک چھت کے نیچے نہیں رہنا چاہیے۔''

وہ سر ہلا کر بولی۔''ہاں۔ ہم دیکھنے میں بالغ نوجوان دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔''

''ایک ہی راستہ ہے۔ میں تمہیں پروپوز کرتا ہوں۔''

یہ ایک نئی زندگی کا پیغام تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک اتنی بڑی بات کہہ دے گا۔ وہ خوشی کے مارے لہرا گئی۔ آنکھیں مسرتوں سے بھیگنے لگیں۔ اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر دونوں ہاتھوں کی قینچی بنا کر کہا۔''میں تو نہال ہو گئی۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ مانگنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ اپنے گاڈ سے صرف آپ کی سلامتی چاہتی ہوں۔''

''ماریہ! میں مسلمان ہوں اور تم عیسائی۔''

''جیسے ہی تم نے پروپوز کیا میں تمہارے سانچے میں ڈھل گئی۔ ان لمحات سے تمہارا خدا میرا خدا' تمہارا دین میرا دین ہے۔ بولو میں کیسے ایمان لاؤں؟''

وہ دونوں پولیس گیسٹ ہاؤس میں تھے۔ عابی نے کہا۔''غسل کرو۔ لباس تبدیل کرو پھر مسجد میں چلو۔ وہاں پیش امام صاحب تمہیں مشرف بہ اسلام کریں گے۔''

ماریہ واش روم میں چلی گئی۔ عابی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے ماریہ کے فون سے مراد کو مخاطب کیا۔''بابا جانی! میں آپ کا بیٹا بول رہا ہوں۔ یہ ماریہ کا فون ہے۔''

وہ ماریہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ مراد نے اس کی تمام روداد سن کر کہا۔''اگرچہ شادی خانہ آبادی کی عمر نہیں ہے۔ تاہم موجودہ حالات میں نکاح پڑھوا لینا چاہیے۔ یوں بھی تمہاری زندگی کا ہر کام اپنی عمر سے آگے جا کر ہو رہا ہے۔ عقل' دانائی' علوم و فنون اور جسمانی قوتیں جو جوانی میں حاصل ہوتی ہیں' وہ تمہیں کمسنی میں حاصل ہو گئی ہیں۔ اب کمسنی میں ایک دلہن بھی آ رہی ہے۔ تمہارے ساتھ عجیب حالات پیش آ رہے ہیں' آنے دو۔ کل یہاں آ رہے ہو۔ میری بہو ہم دونوں کی نگرانی میں دینی تعلیم حاصل کرتی رہے گی۔ جاؤ بیٹے! ایک نئی زندگی کی ابتدا کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

پھر اس نے ہمزاد سے رابطہ کیا۔ اسے بھی ماریہ کے حالات بتائے۔ اس نے مسرتوں کا اظہار کیا اور کہا۔''تم بہت ہی سنگین حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہو۔ تمہارے بابا جانی بھی کسی پیچیدہ معاملے میں الجھ جایا کرتے ہیں۔ ایسی کوئی سچویشن پیدا ہو تو یاد رکھو' ماریہ کو فوراً ارضِ اسلام روانہ کر دینا۔ میری بہو کو میرے پاس بھی رہنا چاہیے۔''

یہ عابی کی سعادت مندی اور فرمانبرداری تھی۔ اس نے دونوں بزرگوں کو پہلے اہمیت دی تھی اور ان کی رضا مندی حاصل کر لی تھی۔ پھر ایک گھنٹے بعد ہی وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہت بڑے بہت اہم فیصلے پر عمل کیا تھا۔

ماریہ کار میں آ کر بیٹھی پھر عابی کے شانے پر سر رکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اسے اچانک ایک ہی دن میں اس قدر تحفظ' سلامتی اور مسرتیں حاصل ہو رہی تھیں کہ اندر سے پھٹ پڑی تھی۔ خوشیوں کے آنسو دریا بن گئے تھے۔

وہ شانے سے لگ کر آنسوؤں کے موتی لٹانے والی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ عابی بے اختیار قریب ہو گیا۔ پہلی بار صنفِ نازک کی نزاکت کھینچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بے اختیار اس کی پشت پر آ گئے۔ اس نے اپنی طرف اسے کھینچ لیا۔

ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔ کوئی ہوس نہیں تھی۔ معصوم سی قربت میں دوستی تھی۔ لالچ نہیں تھا۔ وہ بے اختیار بولا۔''پتا نہیں کیوں...... کیوں اچھی لگ رہی ہو؟ دل کہہ رہا ہے کبھی الگ نہ ہونا۔''

''میرا بھی دل یہی کہہ رہا ہے۔ میں کبھی الگ نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے اپنے اندر چھپا کر رکھ لو۔''

وہ اچانک ہی اس سے الگ ہو کر بولا۔''ہم سڑک کے کنارے ہیں۔ لوگ آتے جاتے دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں

چار دیواری میں رہنا چاہیے۔''

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ خوشیاں تو بہت مل رہی تھیں لیکن ماتمی حالات بھی تھے۔ اس کے پاپا کی ہلاکت اور تدفین ہوئی تھی۔ عابی نے رہائش گاہ میں پہنچ کر کہا۔ ''ہم حالات کے مطابق ایک دوسرے سے دور رہ کر یہ رات گزاریں گے۔ کل صبح پھر ایک ہو کر ائرپورٹ جائیں گے پھر کبھی اپنے درمیان فاصلہ نہیں رکھیں گے۔''

اس رہائش گاہ میں ماریہ کے لیے سخت سیکیورٹی کے انتظامات کیے گئے تھے۔ وہ مطمئن ہو کر لورل ڈی مورا سے ملنے آیا۔ اسے جیل کی چار دیواری سے نکال کر ایک بنگلے میں لایا گیا تھا۔ عابی کی فرمائش کے مطابق اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جارہا تھا۔ وہاں اسے نظر بند رکھ کر اس کا علاج کیا جارہا تھا۔

اس کے ماموں ڈینی کو اس سے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ لورل عابی کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ میں ہر روز اپنے گاڈ سے بولتا تھا کہ میرے اندر ایمان ہے۔ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ اے ساری دنیا کے خدا...... ! مجھ سے انصاف کر۔ بائی گاڈ ! ماننا پڑتا ہے کہ خدا ہے۔ وہ دیر سے ہی سہی پر انصاف کرتا ہے۔ اس معبود نے آپ کو منصف بنا کر بھیجا ہے۔''

عابی نے پوچھا۔ ''تم یہاں جینوا آئے تھے۔ اپنی محبوبہ ایلسی سے ملنے۔ کیا اس سے پہلے بھی مل چکے تھے؟ کیا وہ اس اپارٹمنٹ میں ملنے آئی تھی جہاں اسے ہلاک کیا گیا تھا؟''

''ہماری انٹرنیٹ کے ذریعے دوستی ہوئی تھی۔ ہم نے اسکائپ کے ذریعے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ روبرو کبھی مل نہ سکے۔ اس نے فون پر کہا تھا' کمیونٹی سینٹر میں ملے گی لیکن وہاں کسی مجبوری سے نہ آسکی۔ پھر کہا' رات کو نائٹ کلب میں ضرور ملے گی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شامت آنے والی ہے۔ نائٹ کلب میں پولیس نے آکر مرڈر کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ الزام یہ تھا کہ میں نے ایلسی یا کسی بھی لڑکی کو اپنے اپارٹمنٹ میں بلا کر اس کی آبرو سے کھیل کر اسے ہلاک کیا ہے۔''

''کیا تم نے ایلسی کی لاش دیکھی تھی؟''

''جی ہاں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایلسی تھی۔ میں نے ایک ہی بار اسکائپ کے ذریعے اسے دیکھا تھا۔ ہلاکت کے بعد اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ زرد پڑ گیا تھا۔ دیدے پھیل کر کچھ ڈراؤنے سے ہوگئے تھے۔ وہ ایلسی جیسی لگی لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ زندہ ہے۔ کہیں گم ہوگئی ہے۔''

عابی نے اس کے ماموں ڈینی سے پوچھا۔ ''وہ کون تھی؟ تمہاری معلومات کیا ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نہ میں ایلسی کے بارے میں جانتا ہوں نہ ہی وہ میرے متعلق کچھ جانتی تھی۔''

عابی نے کہا۔ ''ایلسی فراڈ ہوگی۔ کوئی لورل سے دشمنی کررہا ہے۔ کسی فراڈ لڑکی کے ذریعے اسے جینوا میں بلا کر مرڈر کیس میں پھنسا دیا ہے۔ سوچو اور سمجھو کون اس سے دشمنی کررہا ہوگا؟''

ڈینی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو پڑھ کر عابی سے کہا۔ ''میرا بہنوئی کارمن ڈی مورا ہے۔''

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ویل برادر کارمن...... بولو۔''

کارمن نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ زخمی ہوگئے تھے گرفتار ہوگئے تھے لیکن پرنس عابی کی سفارش پر تمہیں رہا کیا جارہا ہے۔''

وہ غصے سے بول رہا تھا۔ ''ابھی نائرن اس پرنس کو دعائیں دے رہی ہے۔ کہتی ہے پرنس ہمارے بیٹے لورل پر بھی مہربان ہوگیا ہے۔ کیوں ہوگیا ہے؟ اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جارہا ہے۔ کیوں اس پر مہربانی کی جارہی ہے؟ میں سب جانتا ہوں' وہ پرنس مجھے گرفتار کرکے یا قتل کرکے میرے بیٹے کو رہائی دلائے گا۔ میں حیران ہوں کہ یہ پرنس ہمارے معاملات میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ کیسا گیم کھیل رہا ہے کہ بیٹے سے دوستی اور باپ سے دشمنی کررہا ہے؟''

ڈینی نے کہا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ آخر ایبل پرنس ہی جانتے ہیں کہ ایسا کیوں کررہے ہیں؟''

''کیا اس سے رابطہ کراسکتے ہو؟''

ڈینی نے عابی کو دیکھا پھر اس سے پوچھا۔ ''جناب! آپ بات کرنا پسند کریں گے؟''

عابی نے سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''کارمن ! پرنس سے رابطہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تم لکی ہو۔ یہ ابھی موجود ہیں۔ لو بات کرو۔''

عابی نے اس سے فون لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ''میں پرنس عابد علی منگی بول رہا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''ہائے پرنس! تم نے تو پوری دنیا میں دھوم

بچاری ہے۔ دن میں آرمی کہلا رہے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ تنہا پوری فوج کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہو۔"

اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "کام کی بات کرو۔"

اس نے پوچھا۔ "تم میرے دشمن کیوں ہو؟"

"تم نے میری وائف کی مما اور پاپا کو قتل کیا ہے۔"

"کیا؟" اس نے حیرانی سے کہا۔ "میں تمہاری وائف کو جانتا تک نہیں ہوں۔ کون ہے وہ؟"

"پولیس افسر راجر کی بیٹی ماریہ۔"

"تعجب ہے، یہ شادی کب ہوگئی؟"

"جب بھی ہوئی' ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی تمہاری موت بھی اٹل ہوگئی۔"

وہ حقارت سے بولا۔ "کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ گیارہ برس کے بچے! تمہارے دودھ کے دانت میں ہی توڑوں گا۔ میں پیرس میں ہوں۔ آؤ مرنے کے لیے......"

ادھر سے فون بند ہوگیا۔ عابی نے ڈینی سے کہا۔ "وہ پیرس میں کہاں رہتا ہے۔ اس کا پتا ٹھکانا اور اس کے خفیہ اڈوں کے متعلق جو جانتے ہو، تفصیل سے بتاؤ۔"

پھر اس نے مراد کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ "بابا جانی! کارمن ڈی مورا کا پتا ٹھکانا نوٹ کریں۔"

اس نے فون ڈینی کو دیا۔ وہ اپنے بہنوئی کا موجودہ رہائشی پتا اور اس کے خفیہ اڈوں کے متعلق پوری تفصیل سے بتانے لگا۔ اس کے بعد وہ فون پھر عابی کے حوالے کیا۔ مراد نے کہا۔ "ٹھیک ہے بیٹے! آرام کرو۔ ابھی اس کی نیند اڑ جائے گی۔"

کارمن ڈی مورا فکر میں مبتلا ہوگیا تھا۔ وہ پرنس عابی کی شہ زوری کے چرچے سنتا آرہا تھا۔ عابی جن ملکوں سے گزرتا آرہا تھا، ان تمام ممالک کی فوجی قوتیں تسلیم کررہی تھیں کہ وہ ناقابلِ شکست ہے۔ جدید اسلحے سے لیس رہنے والی فوجیں بھی اسے مات دینے میں ناکام رہی ہیں۔ وہ بچاؤ کے راستے سوچ رہا تھا اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وی ماسٹرز اور ریڈ الرٹ جیسی طاقتور تنظیمیں بھی پرنس کے خلاف کبھی اس کا ساتھ نہ دیتیں۔ وہ اٹلی کا ڈان پہلی بار خود کو تنہا اور بے یارو مددگار دیکھ رہا تھا۔ فی الحال اس کی سمجھ میں یہی آرہا تھا کہ روپوش ہوجائے۔ اپنی بیوی، بیٹے اور سالے کو بھی نظر نہ آئے۔

مراد نے اس کی وائف تارین ڈی مورا کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ خوش ہوکر بولی۔ "گاڈ تمہیں سلامتی عطا فرمائے' میرے بھائی ڈینی نے کہا تھا کہ تم کسی وقت مجھ سے باتیں کرنے والے ہو۔ میرے بھائی! آپ کے صاحبزادے میرے بیٹے کی سلامتی اور رہائی کے لیے جیسی نیکیاں کررہے ہیں' ایسی کسی نے اس ماں کے ساتھ نہیں کیں۔ میرا شوہر لورل کا باپ بھی کچھ کر نہیں پا رہا ہے۔ الٹا کیس کو بگاڑ رہا ہے۔ میرے بھائی! آپ کسی طرح کارمن ڈی مورا کو قانون کے خلاف حرکتیں کرنے سے باز رکھیں۔"

مراد نے کہا۔ "وہ قانون کے خلاف سنگین واردات کا مرتکب ہوتا آرہا ہے.... راجر کے علاوہ جینوا میں اور کئی پولیس والوں کو ہلاک کرچکا ہے۔ وہ آج یا کل کسی دن بھی حرام موت مارا جائے گا۔ میں اسے کہیں چھپنے نہیں دوں گا۔"

وہ چپ رہی۔ مراد نے کہا۔ "اس کی موت کا صدمہ نہیں ہونا چاہیے۔ جرائم کی دنیا میں جو بے تاج بادشاہ بن کر رہتے ہیں' وہ ہمیشہ حرام موت مارے جاتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا بلکہ اطمینان ہوگا۔ میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

وہ ذرا چپ رہی۔ مراد نے کہا۔ "ہاں بولو؟"

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ باپ بیٹے سے دشمنی کررہا ہے۔"

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ کارمن اپنے ہی بیٹے لورل سے دشمنی کررہا ہے؟ ابھی تم کہہ چکی ہو کہ وہ بیٹے کا کیس بگاڑ رہا ہے۔"

"بگاڑ چکا ہے۔ وہ میرے بیٹے کو ایلسی نامی کسی لڑکی کے مرڈر کیس میں الجھا کر اسے سزائے موت تک پہنچا رہا ہے۔"

"تعجب ہے۔ ایک باپ ایسا کیوں کررہا ہے؟"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "وہ پورے یقین سے جانتا ہے کہ لورل اس کی اولاد نہیں ہے۔"

یہ ایک نئی بات سامنے آئی تھی۔ مراد نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "میں چار برسوں تک انتظار کرتی رہی جب اس سے اولاد نہیں ہوئی اور ایک وارث بہت ضروری ہوگیا تو میں نے بڑی رازداری سے کارمن کے بھائی والٹر ڈی مورا کو موقع دیا۔ چند ماہ کے بعد ہی میری مراد برآئی۔ کارمن ڈی مورا کو شبہ ہوا۔ اس نے غصے سے پوچھا...... یہ بچہ کہاں سے آرہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "تمہارا ہے۔"

اس نے میری پٹائی کی۔ میں اپنی بات پر قائم

رہی۔ لورل کو اس کا جائز وارث کہتی رہی۔ اس نے کہا۔
''تم سے پہلے چھ عورتیں میری زندگی میں آئیں۔ انہوں نے اولاد نہیں دی۔ میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ تم بہت مکار ہو۔ اس سے پہلے کہ تمہیں چھوڑتا' تم چور دروازے سے اسے لا رہی ہو۔''

''اس کی میڈیکل رپورٹ یہ تھی کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا۔ اس نے کہا...... جرائم کی دنیا میں دوست اور دشمن سب ہی مجھے باپ بننے کی مبارکباد دے رہے ہیں۔ میں نے کڑوا گھونٹ پی کر یہ بات پھیلائی ہے تاکہ باپ بننے والا مرد کہلا سکوں۔

''کیا کیا جائے؟ سینہ تان کر چلنے کے لیے جھوٹی مردانگی لازمی ہو جاتی ہے اس لیے میں تمہارے بچے کا باپ بن کر رہوں گا۔ یہ میرا وارث بن کر زندہ رہے گا۔ میں دھوکا دینے والوں کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ تم زندہ رہو گی لیکن کبھی کسی وقت ایسی سزا دوں گا کہ تم تڑپ کر خود ہی اپنی جان سے گزر جاؤ گی۔''

''اس نے اپنے بھائی والٹرڈی مورا کو یعنی میرے بیٹے کے اصل باپ کو گولی ماردی۔ اس نے عجیب سا رویہ اختیار کیا ہے۔ مجھے ایک شوہر کی محبت اور لورل کو ایک باپ کی توجہ دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے فراڈ کو بھلا چکا ہے۔ اس کی اور تو کوئی اولاد بھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا لورل کو ہی اپنا جانشین کہتا ہے۔ شاید دنیا والوں کو دکھانے کے لیے کہتا ہے کہ اس کے بعد لورل ہی گاڈ فادر کی ذمے داریاں سنبھالے گا۔''

مراد فون پر سن رہا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''کہاں کا جانشین؟ کہاں کا گاڈ فادر؟ وہ کوئی اور ہی کھیل کھیل رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس نے میرے بیٹے کو ایلسی نامی لڑکی کے مرڈر کیس میں جان کر الجھایا ہے۔ وہ چاہتا تو کہیں بھی کسی وقت بھی لورل کو گولی ماردیتا لیکن اس نے جنیوا کے ٹارچر سیل میں اسے پہنچا دیا ہے۔ تاکہ اسے آسانی سے موت نہ ملے اور ایک ماں دن رات اس کے لیے تڑپتی رہے۔ میرے بھائی! تمہارا بیٹا میرے بیٹے کے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا ہے۔ اس نے ٹارچر سیل سے اسے نجات دلائی ہے۔ فار گاڈ سیک، میرے بچے کو کسی طرح میری آغوش میں لے آؤ۔ یہ ماں ساری زندگی تمہاری احسان مند رہے گی۔''

مراد نے پوچھا۔ ''ابھی کہاں ہو؟ کیا تم اپنی رہائش گاہ میں اس کے ساتھ ہو؟''

''نہیں وہ ایک گھنٹا پہلے کہیں گیا ہے۔ میں دوسرے فون سے معلوم کرتی ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کب تک واپس آئے گا۔''

ٹائرن نے دوسرے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ ٹیپ سنائی دیا کہ فی الحال رابطہ نہیں ہوگا۔ اس نے کہا۔ ''بھائی! تھوڑی دیر بعد پھر اسے کال کروں گی۔''

مراد نے کہا۔ ''آل رائٹ۔ معلوم کرو کہ وہ کہاں ہے؟ میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ اسے اپنے بیٹے کی فکر میں نیند نہیں آسکتی تھی۔ اس نے دوسری بار کارمن کو کال کی تو معلوم ہوا کہ اس نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکے گا۔ اس نے سم بدل دی تھی۔ ٹائرن نے پریشان ہو کر اس کے قابلِ اعتماد دستِ راست سے پوچھا۔ ''کارمن کہاں ہے؟ مجھ سے بات کراؤ۔''

اس نے کہا۔ ''سوری میڈم! ان کے کسی نمبر پر رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں کئی بار کوششیں کر چکا ہوں۔''

رات کے ایک بجے کارمن نے اسے کال کی اور کہا۔ ''میرا انتظار نہ کرو۔ تمہارے آس پاس موت کے... ہرکارے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ ڈھونڈتے ہی رہیں گے۔ میں ان سے نمٹ لوں پھر میری صورت دکھائی دے گی۔ وہ گیارہ برس کا بچہ تم ماں بیٹے کے ذریعے میرے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔''

''کارمن! بچے کا باپ آگیا ہے۔ مراد علی منگی کا نام سن کر بڑے بڑے سورما راستہ بدل دیتے ہیں۔ تمہاری کوئی بھی پناہ گاہ تمہیں چھپا نہیں سکے گی۔''

''تم میری نہیں، اپنے بیٹے کی فکر کرو۔ میں نے لورل کو بیٹا مان کر ایسے ہی دنوں کے لیے اس کی پرورش کی ہے۔ اگر وہ بچپن میں مرجاتا تو تم رو دھو کر صبر کر لیتیں۔ لیکن نہیں، یہ موقع ہوتا ہے، جب جوان بیٹے کی موت سے ماں کا کلیجا پھٹ جاتا ہے۔ جو سزا دینا چاہتا تھا' دے رہا ہوں۔ جس اذیت ناک انجام تک پہنچانا چاہتا تھا' وہاں تک ماں بیٹے پہنچ رہے ہیں۔ اس لمحے سے میں بیوی اور بیٹے کے رشتے پر تھوک رہا ہوں۔''

اس نے آخ تھو کہہ کر فون بند کر دیا۔ ٹائرن نے اس فون کو نفرت سے دیکھتے ہوئے اسے ایک طرف پھینک دیا اور زیر لب کہا۔ ''میں بھی تم پر تھوکتی ہوں۔''

اس ماں کو مراد اور عالی کا مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ اس نے سوچا، رات کا ایک بج گیا ہے۔ بھائی مراد گہری نیند میں ہوں گے۔ ان سے صبح باتیں کرنا مناسب ہوگا۔ ابھی مجھے معلوم

کرنا چاہیے کہ کارسن کس خفیہ پناہ گاہ میں رات گزار رہا ہوگا۔
اس نے اپنے بھائی ڈینی سے پوچھا تو اس نے کہا۔
''اٹلی میں کارسن کی کئی خفیہ پناہ گاہیں ہیں۔ پیرس میں دو ہیں۔ میں فون پر دونوں پناہ گاہوں کے ایڈریس بھیج رہا ہوں۔ ویسے سسٹر! وہ نادان نہیں ہے۔ اب مجھ پر بھروسا نہیں کرے گا۔ جن پناہ گاہوں کا علم مجھے ہے وہاں کبھی چھپنے نہیں جائے گا۔ پھر بھی تم اپنے خاص جاں نثاروں کے ذریعے معلوم کرو کہ وہ اس شہر میں ہے یا نہیں؟''
کارسن ایسی کسی جگہ نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ دادا کے ملک اٹلی میں ہی مطمئن سے رہ سکتا تھا۔ اس وقت رینٹڈ ہیلی کاپٹر کے ذریعے فرانس اور اٹلی کے ایک سرحدی شہر کی طرف جارہا تھا۔ وہاں سے سرحد پار کرکے اپنے ملک میں جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی پلاننگ کے مطابق اس کا قابلِ اعتماد دست راست والٹو گریز اس کے ذاتی ہیلی کاپٹر کے ساتھ سرحدی شہر میں پہنچنے والا تھا۔
☆☆☆
ہم زاد نے اپنے لہو سے کیا خوب گل کھلایا تھا۔ عابد علی منگی جیسا عجوبہ پیدا ہوا تھا۔ اسی کے لہو سے دوسرا گل بھی کھلنے والا تھا۔ اس بار بیٹی پیدا ہونے والی تھی۔ میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح عجیب و غریب ہوگی۔ فکر و پریشانی یہ تھی کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ یہی کہ ہم زاد کی وہ بیٹی بھی عابی کی طرح جارحانہ انداز میں پیدا ہوگی۔ اپنی جسامت اور وزن میں عابی کی طرح بھاری بھرکم ہوگی۔ جینی حمل کے دوران تکالیف سے گزرتی رہی تھی۔ زچگی کے لمحات میں ناقابلِ برداشت عذاب سہتی رہی تھی پھر اسے جنم دیتے وقت ماں کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔
یہ سوال سب ہی کے اندر چیخ رہا تھا، کیا زیب النساء کے ساتھ بھی یہی ظلم ہوگا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے اس بیچاری کو، اس بے گناہ کو سزائے موت سنادی گئی ہو۔
ادھر یہودیوں کے پیشوائے اعظم اور ربیوں کے بیان کے مطابق دجال کی آمد کی نشانی یہ ہوگی کہ دنیا میں عجیب و غریب بچے پیدا ہوں گے۔ ان میں سے ایک بچہ دجال کا معجزہ ہوگا اور وہ کسی باپ کے بغیر دنیا میں آئے گا۔
یہ ایک اتفاق تھا کہ ان دنوں مراد اور ہم زاد نادیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ کبھی جینی نے بھی ہم زاد کا ٹھوس جسمانی وجود نہیں دیکھا تھا۔ یہودی کہہ رہے تھے کہ جب ایک ماں بننے والی نے اپنے بچے کے باپ کو نہیں دیکھا ہے تو پھر عابی کا کوئی باپ نہیں ہے۔ صرف یہودی ماں ہے۔
بہرحال مراد نے ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کردیا تھا کہ وہ عابی کا باپ ہے۔ یہودیوں کے پیشوائے اعظم اور ربیوں نے اس بچی کے متعلق کسی طرح کی پیش گوئی نہیں کی تھی جبکہ وہ پیدا ہونے سے پہلے عجیب و غریب ثابت ہو رہی تھی۔
عابی اور ماردی ایک ہی باپ کی اولاد تھے لیکن یہودیوں کی دلچسپی صرف عابی سے تھی۔ وہ اسے ماں کے حوالے سے پیدائشی یہودی کہتے آرہے تھے۔ ماردی کو ایک مسلمان ماں جنم دینے والی تھی۔ وہ مسلمان لڑکی پیدا ہونے سے پہلے ہی یہودیوں کو کھٹک رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آئندہ وہ لڑکی عابی کی طرح ناقابلِ شکست فائٹر اور غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہو۔
عابی کی یادداشت غیر معمولی تھی، وہ دو سو پچاس کے جی کا وزن دونوں ہاتھوں سے اٹھالیا کرتا تھا اور ابھی پیدا ہونے والی بچی سے توقع کی جارہی تھی۔ فی الحال بچی کے لیے نہیں، زیب النساء عرف زیبی کی سلامتی کے لیے سب ہی تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے۔
ہم زاد نے عابی سے کہا۔ ''بیٹے! زچگی کے وقت جو تمہاری ماں جینی کے ساتھ ہوا، وہی زیب النساء کے ساتھ ہوگا تو وہ بے چاری اپنی زندگی ہار جائے گی۔''
عابی نے سر جھکا کر کہا۔ ''جب میں سوچتا ہوں کہ کیسے پیدا ہوا تھا تو میرا سر جھک جاتا ہے۔ میں نے اپنی ماں پر بڑا ظلم کیا ہے۔''
''نہیں بیٹے! تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ سب قدرت کا تماشا ہے۔ جو عجیب و غریب ہوتے ہیں، وہ عجیب طرح سے دنیا میں آتے ہیں۔ تمہاری بہن نہیں جانتی ہے کہ وہ پیدائش کے لمحات میں کس طرح جنم لے گی۔ قدرت کے ہاتھوں میں تم بھی کھلونا تھے، وہ بھی کھلونا ہوگی۔''
مراد اور ہم زاد پوری کوششیں کررہے تھے کہ زیب النساء ہر قیمت پر سلامت رہے۔ جینی کی طرح ناقابلِ برداشت تکالیف سے گزر کر جان سے نہ جائے۔ وہ اپنی سی تدابیر کررہے تھے۔
انہوں نے انتہائی تجربہ کار ڈاکٹروں کی ٹیم بنائی تھی۔ اس ٹیم میں ایک ننانوے برس کا بزرگ تجربہ کار ڈاکٹر بھی تھا۔ وہ نبض تھام کر، چہرہ دیکھ کر، آنکھوں میں جھانک کر معلوم کرلیتا تھا کہ مریض اپنے اندر کیسے مسائل سے دوچار ہو رہا ہے۔ وہ تمام ڈاکٹر فرض شناس تھے۔ اپنی ڈیوٹی کے مطابق

زیب النساء کو دن رات آبزرویشن میں رکھتے تھے۔

دوائیں اور دعائیں دونوں جاری تھیں۔ مراد نے فون پر ہم زاد سے دیر تک باتیں کیں۔ اسے سمجھایا۔ ''آئندہ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقہ کار پر عمل کرو۔ پھر کبھی تمہاری شریکِ حیات کو حاملہ نہیں ہونا چاہیے۔''

ہم زاد نے اپنے ایک کان کو پکڑ کر کہا۔ ''ان دو بچوں سے ظاہر ہے کہ آئندہ بھی عجوبے پیدا ہوں گے۔ میں توبہ کرتا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرو تو مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ میں نہیں جانتا یہ کہاں تک درست ہے۔ یونہی میرے دل میں بات آرہی ہے۔ لوک داستان کی ماروی ایک عقیدہ ہے۔ صداقت اور پاک دامنی کی علامت ہے۔

''اب میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہی ماروی زیب النساء کو سلامتی اور حیاتِ نو دے گی۔''

ہم زاد نے پوچھا۔ ''ماروی کیسے سلامتی دے گی؟''

مراد نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ''ہم اپنی ہونے والی بیٹی کا نام ماروی رکھیں گے۔''

وہ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ ''ایسا کہتے وقت مجھے یوں لگ رہا ہے، وہ آگ سے محفوظ رہنے والی ماروی، زیب النساء کے دل میں اور اس کی روح میں سما رہی ہے۔''

وہ بڑے جذبے سے اپنے اندر ڈوب کر بول رہا تھا۔ ''اس کا نام ایک ماں کے لہو میں دوڑ رہا ہے۔ اس نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ وہ زیب النساء کی بھلائی چاہے گی۔ عالی جینی کے وجود کی دیوار توڑ کر آیا تھا۔ وہ ایسا نہیں کرے گی۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''اللہ پاک آپ کی زبان مبارک کرے۔''

پھر جیسے عقیدہ روبہ عمل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اطلاع ملی کہ ماروی نے وفات پائی ہے۔ یہ ان سب کے لیے بہت ہی المناک خبر تھی۔ مراد کسی بھی پہلی فلائٹ سے وہاں جانے والا تھا۔ ویسے موجودہ حالات کے مطابق یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ایک روح دو اجسام میں نہیں رہتی۔ وہ جس بدن کے لیے ہوتی ہے، اسی میں رہتی ہے۔ تو اب کیا ہو رہا تھا؟

کیا وہ ماروی اپنی وفات کے پردے میں اُدھر سے اِدھر پیدا ہونے والی کے اندر آگئی تھی......؟

مراد کا جذبہ اور عقیدہ یہی تھا کہ ماروی نے وفات پائی ہے تو پیدا ہونے والی بچی سے ضرور کسی طرح کا روحانی تعلق ہے۔ جیسا کہ فون کے ذریعے معلوم ہوا تھا، ماروی بیمار نہیں تھی۔ وہ شاپنگ کے لیے محبوب کے ساتھ باہر گھومتی پھرتی رہی تھی۔ اس نے واپس آکر عصر کی نماز پڑھی تھی۔ پھر سجدے کی حالت میں ہی اپنے رب سے جاملی تھی۔

ٹھیک اسی وقت زیب النساء کی حالت بگڑی تھی۔ ڈاکٹرز اسے اٹینڈ کررہے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہورہا تھا کہ تین ماہ میں ہی وہ بچی پیٹ میں متحرک ہوگئی ہے۔ مشیتِ ایزدی کو کون سمجھ پاتا ہے؟ یہ دل نے مان لیا تھا کہ زیب النساء کی کوکھ میں ماروی کا نام زندہ ہوگیا ہے۔

زیب النساء نے کبھی ماروی کو روبرو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی تصویریں دیکھی تھیں اور اس کا ذکر سنتی رہی تھی۔ پھر ہم زاد نے اس کی بڑی بڑی تصویریں محل کے مختلف حصوں میں لگوائیں تاکہ وہ اسے دیکھتی رہے اور ماروی اس کے ذہن میں نقش ہوتی رہے۔

زیبی دین دار اور عبادت گزار تھی۔ دل سے ماروی کی قدر کرتی تھی۔ اس کی خواب گاہ کی دیواروں پر ماروی کی تصویریں آویزاں تھیں۔ وہ اسے دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں کہتی تھی۔ ''ماروی! میری ہونے والی بیٹی کو جب سے ماروی کہا جارہا ہے تب سے مجھے انجانا سا حوصلہ مل رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے، میں زندہ رہوں گی۔ زچگی کے مرحلے سے گزر جاؤں گی۔''

ایک رات زیبی نے خواب میں دیکھا۔ اس نے چاند جیسی بیٹی کو جنم دیا تھا پھر وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ''میری بیٹی...... میری ماروی! مجھے ماما بولو......''

اسے دھیمی سی معصوم سی آواز سنائی دی۔ ''ماما......!''

زیب النساء کی آنکھ پٹ سے کھل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ پھولے ہوئے پیٹ پر تھے۔ اس نے صاف سنا تھا۔ کہیں دور سے یا کوکھ کی تاریکی سے آواز آئی تھی۔ ''ماما......!''

یہ ناممکن ہے۔ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے سوچ میں پڑگئی کہ خواب میں سنا تھا یا سچ مچ بیٹی نے پکارا ہے؟ پھر عقل نے کہا۔ ''یہ سراسر بچکانا خیال ہے۔ بیٹی کے لیے جو جذبات ہیں، وہ خواب میں دکھائی دیے ہیں۔ یا میرے اللہ......! کیا یہ خواب تھا؟''

اس نے سوچا۔ ''یہ میرا بچکانا خیال ہی سہی لیکن خواب سچے ہوتے ہیں۔ اس خواب سے یہ حوصلہ ملا کہ تعبیر وہی ہوگی۔ یعنی زچگی تشویش ناک نہیں ہوگی۔''

اس نے ہم زاد سے کہا۔ ''مجھے یقین تو نہیں آتا لیکن میں نے صاف طور سے اپنی بیٹی کی آواز سنی ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''تم نے آواز کہاں سے سن لی؟ یہ

کیسے معلوم ہوا کہ وہ تمہاری بیٹی کی آواز ہے؟''
''وہ ننھی سی معصوم سی آواز میرے اندر سے ابھری تھی .. میں نہیں جانتی کہ نیند میں تھی یا بچی کی محبت میں گم تھی۔ ایسا ہوتا ہے۔ بعض اوقات پتا نہیں چلتا کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں یا خیالات کے ہجوم میں جاگ رہے ہیں۔''
''ہاں، ایسا ہوتا ہے .. میں تمہارے اندر چھپے ہوئے اندیشوں کو سمجھ رہا ہوں۔ یا تو تم نے خواب دیکھا ہے یا خیالوں کی بھیڑ میں ممتا کی شدت نے تمہیں ایک بچی کی آواز سنا کر بہلایا ہے۔''
''خدا بہتر جانتا ہے .. ویسے مجھے حوصلہ مل رہا ہے۔ میں اپنی بچی کو سینے سے لگائے رکھنے کے لیے زندہ رہوں گی۔''
''انشاء اللہ...... ہم سب دعائیں مانگ رہے ہیں .. تمہاری زچگی نارمل ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو تم سلامت رہوگی۔''
وہ دن رات ڈاکٹروں کی نگرانی میں رہتی تھی۔ میڈیکل رپورٹ حوصلہ افزا تھی۔ جینی کی طرح تشویش ناک نہیں تھی۔ زیب النساء عبادت کے دوران کچھ زیادہ ہی روحانی سکون و اطمینان محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ ایک رات تہجد کی نماز کے بعد پھر بستر پر آکر لیٹ گئی۔ فجر کی اذان تک نیند لینا چاہتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے پھر آنکھیں بند کرلیں۔
رات کا پچھلا پہر تھا۔ پورے محل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ سونے سے پہلے ہمیشہ ایک مختصری آیت پڑھتی تھی۔ اس نے زیرلب کہا۔ ''بسم اللہ......''
یکلخت ایک ننھی سی معصوم سی گنگناہٹ سنائی دی .. اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر آگئے۔ اس گنگناہٹ کی وائبریشن وہیں محسوس ہوئی تھی۔
ایک ذرا شبہ ہوا کہ فریب سماعت ہے۔ کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ اس نے دوبارہ زیرلب کہا۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''
اس کے ساتھ ہی پیٹ میں وائبریشن ہوئی۔ بہت ہی دھیمی سی گن گن کرتی ہوئی آواز ابھری۔
اس نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر حیرانی سے سنا۔ حروف نہیں تھے لیکن صدا تھی، یکبارگی اس پر ایمانی جذبات کی یلغار ہوئی۔ وہ خوشی سے لرزنے لگی۔ اس کا دل اور دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''میری بچی بسم اللہ پڑھ رہی ہے .. جو کبھی نہیں ہوا۔ جو کبھی نہیں ہوسکتا۔ وہ اللہ کے نام سے ہو رہا ہے ..''
ہم زاد ہم ذمے داریاں نبھانے میں کہیں مصروف تھا۔

زیب النساء نے فجر کی نماز کے بعد اسے بتایا۔ ''آج ایک انہونی بات ہوئی ہے کہ آپ سن کر یقین نہیں کریں گے۔''
''تم کہوگی تو کرلوں گا۔''
''آج میں نے پھر اپنی بیٹی کی آواز سنی ہے۔ پرسوں میں نے اسے ''ماما'' کہتے سنا تھا اور یہی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ خواب ہوگا لیکن آج میری بچی نے بسم اللہ پڑھی ہے۔''
اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی؟''
وہ بتانے لگی ہم زاد نے کہا۔ ''اللہ بڑی شان والا ہے۔ اس کی قدرت سے کچھ بھی ہوسکتا ہے .. ہمارا ایمان کہتا ہے کہ ہماری بیٹی، ہماری ماروی بہت ہی ایمان والی اور بہت ہی عبادت گزار ہوگی اور اس کے طفیل تمہیں سلامتی ملے گی۔''
اس نے فون پر مراد کو یہ ایمان افروز بات بتائی .. وہ جذبوں سے سرشار ہوکر بولا۔ ''سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ ہماری بیٹی کو دنیا میں لانے سے پہلے دین کے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے یہ بچی دین اسلام کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو دشمنانِ دین کی حائل کردہ رکاوٹوں کو مسمار کرتی رہے گی۔''
ہم زاد نے کہا۔ ''میرے اندر بے چینی بھر گئی ہے۔ کسی بھی طرح بابا صلاح الدین اجمیری سے رابطہ ہوجائے تو وہ ہماری بیٹی کے بارے میں کچھ راہنما مشورے ضرور دیں گے۔''
آہ! بابا اجمیری کہاں ہیں؟ کیا اس دنیا میں ہیں یا پردہ کرچکے ہیں؟ کسی سے ملاقات نہ ہو، اس کی آواز بھی سنائی نہ دے، گم ہونے والے کی کوئی سن گن نہ ملے تو خیال گزرتا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔
بابا اجمیری کے بارے میں ایسا پہلے بھی خیال آیا تھا کہ وہ اپنے رب کی طرف جاچکے ہیں پھر بھی دل کہتا تھا کہ وہ ہیں اور کبھی کسی مشکل وقت میں راہنمائی کے لیے ضرور آئیں گے ..
مراد، زیب النساء اور ہم زاد انہیں شدت سے یاد کرنے لگے۔ ہر نماز کے بعد ان سے ملاقات کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ یہ امید قوی تھی کہ ان سے کبھی رابطہ ہوگا یا کسی طرح ان سے راہنمائی حاصل ہوگی۔ جو اس دنیا میں اب تک نہیں ہوا وہ ہو رہا تھا تو آئندہ بھی کوئی اور انہونی ہوسکتی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

رئیس نے ایک بار پھر مہمان خانے کی کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرے میں جھانکا۔ گہری تاریکی میں اسے دور تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ آسمان پر شب کی تیرگی اور زمین پر سناٹے کا راج تھا۔ کہیں روشنی تھی نہ کوئی آواز۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی اداس آنکھیں ناامید ہو کر کلائی پر بندھی گھڑی پہ ٹک گئیں۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔

''جانو ابھی تک نہیں لوٹا...... پہلے تو اس نے کبھی اتنی دیر نہیں کی۔ کہیں وہ......'' رئیس بڑبڑایا۔ اندیشوں کی یلغار نے اسے پریشان کر دیا تھا لیکن نہیں، جانو کی دونالی والی بندوق، فولادی جسم اور عقابی نگاہوں پر اسے ہمیشہ فخر رہتا تھا۔ علاقے کے عام اور غریب لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، اچھے بھلے زمیندار بھی اس سے ڈرتے تھے۔ گزشتہ انتخابات میں اس نے ہنیوں کو سیدھا کر دیا تھا۔ کھیا روپ لل نے آنا کانی کی تو جانو نے اسے بھرے بازار میں برہنہ کر کے گھسیٹتے ہوئے جیپ میں ڈالا اور رئیس کے سامنے حاضر کر دیا تھا۔ جب مولوی واحد بخش نے رئیس کے کتوں کی رکھوالی کرنے والے خمیسو کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا تو اس وقت بھی جانو نے رئیس کی عزت قائم رکھنے کی خاطر لڑکی اٹھا کر خمیسو کے گھر ڈال دی تھی۔

ایک سر پھرے طالب علم نے زمیندار کے خلاف بولنا شروع کیا اور اس کے مزارعوں کو بھڑکانا چاہا تو اس کے گھر کو آگ بھی جانو ہی نے لگائی تھی۔ جانو دراصل رئیس کی جان تھا۔ وہ سائے کی طرح پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ رئیس کے دشمنوں کے لیے

خودساختہ سفاکانہ رسم و رواج کا خونی پس منظر

سوال کوئی بھی ہو، دماغ جواب کی تلاش میں ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور یہی تحریک انسان میں جستجو پیدا کرتی ہے۔ بہرحال یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا جس کا آغاز بہت رنگین اور انجام... انتہائی سنگین تھا... مگر اس رنگینی اور سنگینی کے درمیان کسی کا شملہ اونچا ہوا اور کوئی زندگی ہی ہار گیا۔

عزت کا سوال

ابراہیم جمالی



جانو فرشتۂ اجل ثابت ہوتا تھا۔

لیکن آج...... جب رئیس کا بھرم رکھنے کا امتحان درپیش تھا...... اور اس کی طاقت کی دھاک بیٹھنے والی تھی تو جانو نے زندگی میں پہلی بار دیر کر دی تھی۔

اس نے کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر لیٹے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ وہ تھکاوٹ اور نشے سے چور بے سدھ پڑا تھا۔ اس کا ایک پاؤں جس میں کالا بوٹ چمک رہا تھا، صوفے سے لڑھک کر نیچے قالین تک جا پہنچا تھا۔ جہاں سگریٹ کے لاتعداد ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ بایاں بازو جس پر رولیکس گھڑی چمک رہی تھی، قریبی میز پر رکھی ولایتی شراب کی نصف خالی بوتل کو چھو رہا تھا۔

رئیس آہستگی سے آگے بڑھا۔ اس نے تھانیدار کا ڈھلکا ہوا پاؤں نہایت فرماں برداری سے سیدھا کر کے صوفے پر رکھ دیا۔ سر کے نیچے سے اس کا بازو ہٹا کر نرم تکیہ رکھ دیا۔ سلگتا ہوا سگریٹ انگلیوں سے الگ کر کے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر وہ تپائی جس پر دو گلاس، بوتل اور سگریٹ کا پیکٹ رکھا تھا، سرکا کر دیوار کے ساتھ لگا دی۔

یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اسے چین نہ آیا۔ وہ پھر کھڑکی کی طرف پلٹا۔ اس نے کھڑکی سے باہر اندھیرے میں جھانکا اور مایوس ہو کر کرسی پر گر گیا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں اور اس کے اندر گویا لاوا سا کھول رہا تھا۔ وقت گزارنے...... انتظار کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والی بے چینی کو کم کرنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھائی اور گلاس میں شراب انڈیلی۔ پھر آتشیں سیال کو حلق میں اتار دیا۔ تلخی اس کے وجود میں اتر کر رگوں میں دوڑنے لگی اور فضا میں الکحل کی بو پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں موندے اس تلخی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو سامنے تھانیدار اسی حالت میں پڑا نظر آیا۔ اس کی نگاہیں تھانیدار صاحب کے سر کے سفید ہوتے ہوئے بالوں سے ہوتی ہوئی اس کے پھولے ہوئے نتھنوں تک پہنچیں۔ پھر تھوڑی کی لٹکی ہوئی کھال کو پھلانگتی ہوئی بے ڈول توند پر آ کر ٹھہر گئیں۔

'صاحب اب بوڑھا ہو گیا ہے۔' اس نے سوچا۔ 'بالوں میں سفیدی آ گئی ہے لیکن دبدبہ وہی ہے جو دس سال پہلے تھا۔ نرا افسر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آج کے لونڈے، افسر بنے پھرتے ہیں جو اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ بزدل......! وہ بہادروں کی قدر کیا جانیں۔'

دس سال پہلے جب وہ چھوٹا تھانیدار بن کر آیا تھا تو سب سے پہلے رئیس ہی نے اس کی دعوت کی تھی۔ شراب اور شباب، دونوں پیش کیے تھے۔ رخصت ہونے کے وقت دس بڑے نوٹ بھی نذرانے میں دیے تھے۔ یہ رئیسوں کی روایت تھی۔ کوئی بھی افسر تبدیل ہو کر آتا تو علاقے کے زمیندار اس کی دعوت اور آؤ بھگت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں تاخیر ہو جاتی تو صاحب سمجھا جاتا کہ وڈیرا ست ہے۔ رئیس اس بات کا قائل تھا کہ پہلا تاثر پائیدار ہوتا ہے۔ اس لیے وہ پہل کر کے اپنے ٹھاٹ باٹ کا اظہار بھرپور طریقے سے کرتا تھا۔ بس، اس دن کے بعد رئیس اور چھوٹے تھانیدار کی دوستی مشہور ہو گئی۔ رئیس کا حکم ٹالنے کی ہمت کس میں تھی؟ دوسری صورت میں دفعہ 109 اور 110 تو گویا بنی ہی اس کے لیے تھیں۔

جلد ہی چھوٹے تھانیدار کا تبادلہ ہو گیا لیکن رئیس کی دھاک ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی۔ یہاں تک کہ چھوٹے تھانیدار نے عیسیٰ شیخ کے قتل کیس میں رئیس کی کھل کر مدد کی۔ یہ بات رئیس کے دل پر آج بھی نقش تھی۔

''جوان وہ جو مشکل وقت میں کام آئے۔'' رئیس نے جانو سے کہا تھا۔ ''باقی لوٹ مار تو سب افسر کرتے ہیں لیکن جانو! میں اس یار کے احسانات کا بدلہ کبھی نہ اتار سکوں گا۔ کبھی ایسا موقع آیا تو میں اپنا سر کاٹ کر پیش کر دوں گا۔''

دس سال بعد وہ لوٹا تو بڑا تھانیدار بن کر آیا۔ رئیس پھر ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ اوطاق میں محفلیں جاگ اٹھیں۔ الماریاں بوتلوں سے سج گئیں۔ راگ روپ کی رم جھم، کبھی حمیدہ سکرنڈ والی، کبھی سارہ سکھر والی، شکارپور اور روہڑی تو گویا چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ جیپ جاتی اور حسن و شباب سے لد کر آ جاتی۔ دعوتوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ چھوٹے بڑے افسر صبح شام حاضر ہونے لگے۔

پورے علاقے میں رئیس کا نام گونجنے لگا۔ جگہ جگہ اس کے اثر رسوخ کا چرچا ہونے لگا۔ وہ اپنے چھوٹے موٹے کام تو افسروں سے کروا ہی لیتا تھا مگر اب دوستوں کا بھی بھلا ہونے لگا تھا۔ رئیس کی ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔

آج تھانیدار صاحب بغیر کسی پروگرام کے غیر متوقع طور پر رئیس کے پاس پہنچا تو اسے دور ہی سے اندازہ ہو گیا کہ آج صاحب پریشان معلوم ہوتا ہے۔

رئیس نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، خیر و عافیت دریافت کی لیکن صاحب کی پریشانی کی لکیریں بتاتی تھیں کہ معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔ رئیس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''صاحب! مرد کی دہلیز پر آئے ہو۔ تم نے بھی مشکل گھڑی میں میری مدد کی تھی۔ اب خادم کو بھی خدمت کا موقع دو۔''

صاحب نے خود کو صوفے پر گرا لیا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔

'پہلے تو کبھی اتنا ملول نظر نہیں آیا۔' رئیس نے سوچا۔ 'جوہری کے گھر موتیوں کی کیا کمی؟ جس کے سامنے میر اور سردار ادب سے جھک کر سلام کرتے ہوں، وہ کسی کے آگے آسانی سے تو ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ ضرور کوئی اہم معاملہ ہے۔'

پھر جب بوتل کھلی اور برف کی بوندیں پسینے کی طرح گلاس پر چمکنے لگیں تب صاحب نے دل کا حال کہا۔ دراصل خاکو کی بیٹی زینا نے اس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ وہ ایک دن کسی تفتیش کے لیے اس طرف چلا گیا تھا۔ لڑکی کھیتوں میں کام کر رہی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں للچاتا وجود دیکھ کر تھانیدار کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ شکار تو روز کرتا تھا۔ بھانت بھانت کی کلیوں کا رس چکھ چکا تھا لیکن ایسا قیامت خیز حسن اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جیپ سے اتر کر معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ وہ ایک غریب کسان کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے دل کو سنبھالتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ غریب کسان کی بیٹی آسان نوالہ ثابت ہوگی۔ لڑکی کے باپ کو دو راتیں لاک اپ میں بند کر دوں گا تو وہ خود اپنی بیٹی کو لا کر میری خدمت میں پیش کر دے گا۔ جو کام آسانی سے ہو سکتا تھا اس کے لیے کسی خاص انتظام اور منصوبہ بندی کی کیا ضرورت تھی۔

اس نے پیغام بھجوائے، سپاہی بھیجے، جھوٹے کیس، جھوٹی تفتیش..... پورا محلہ مصیبت میں پڑ گیا۔ جو بھی ہاتھ لگا، اسے لاک اپ میں بند کر دیا۔ نوٹوں کے ڈھیر لگ گئے مگر مچھلی کانٹے میں نہیں پھنسی۔ تھانیدار کا سکون رخصت ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ 'یہ سندری نہ ملی تو میری تھانیداری کس کام کی؟'

علاقے میں ڈاکوؤں نے لوٹ مار مچا دی تھی۔ جگہ جگہ ڈاکے پڑنے لگے۔ ہر روز خون ہوتے۔ چور اچکوں کو گویا کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا تھا۔ ادھر تھانیدار صاحب کے دل و دماغ پر تو زینا چھائی ہوئی تھی۔ کوئی خوش خبری ملے تو بے قراری کو قرار آئے۔ آخرکار وہ ہر طرف سے ناامید ہو کر رئیس کے پاس چلا آیا۔

"تم کچھ کر سکتے ہو تو کرو رئیس!" آخر میں تھانیدار نے کہا۔ "ورنہ یقین مانو لوگوں کے طعنے مجھے مار دیں گے۔"

رئیس نے ایک بڑا گھونٹ لیا اور سوچنے لگا۔ 'خاکو کی بیٹی زینا!'

اسے یاد آیا کہ چند سال پہلے جب خاکو خدمت گار تھا اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا تو اس وقت یہ لڑکی حویلی میں چھوٹے موٹے کام کاج کیا کرتی تھی۔ کم عمر تھی لیکن انتہائی غضب کی تھی۔ رئیس کی نظرِ کرم سے اس لیے بھی محفوظ رہی کہ وہ اس کی لاڈلی بہن سکینہ کی سہیلی بن گئی تھی۔ وہ دن بھر گھر کا کام کرتی اور فرصت ملتے ہی سکینہ کے پاس پہنچ جاتی۔ اس کا جسم دباتی اور باتوں سے دل بہلاتی۔ سکینہ کو اکثر دورے پڑتے تھے۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتی، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے، منہ سے جھاگ بہنے لگتے اور آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو جاتی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سکینہ پر سایہ ہے۔ ایسے مواقع پر زینا اس کا خیال رکھتی اور اس عمدگی سے سنبھالتی کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو پاتا کہ وڈیرانی کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ بات بات پر ہنستی رہتی۔ بجلی کی طرح آنگن میں دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی دودھ گرم کر کے سکینہ کو پلاتی اور کبھی اس کے سر پر تیل کی مالش کرنے لگتی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ لڑکی کیا تھی، بس بجلی تھی۔ رئیس کو کیا معلوم تھا کہ یہ جوان ہو کر ایسی قیامت ڈھائے گی۔ اگر اسے یہ اندازہ ہوتا تو وہ زینا کو آسانی سے حویلی سے باہر نکلنے نہ دیتا۔ سکینہ تو اس کے جانے کے بعد بھی کئی دن تک اسے یاد کرتی رہی تھی۔

رئیس نے آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور گلاس میز پر پٹخ دیا۔ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سوچ میں گم ہو گیا۔

'سکینہ۔' اس نے سوچا۔ اس کی اکلوتی بہن بجھ سی گئی تھی۔ شادی کے لیے کوئی ہم پلہ رشتہ نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ وہ بہت پہلے اپنے گھر کی ہو چکی ہوتی۔ چچا نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے رشتے کا پیغام بھجوایا تھا لیکن رئیس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا تھا۔ "عیسیٰ شیخ کے قتل والے مقدمے میں یہی میرا چچا میرے خلاف لڑا تھا۔ پولیس اور مجسٹریٹ کے سامنے میرے خلاف بیان دیے۔ اگر تھانیدار صاحب نے معاملہ نہ سنبھالا ہوتا تو یہ شخص مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا کر دم لیتا۔ اس نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر گزشتہ الیکشن میں بھی میری مخالفت کی تھی۔ میرے ووٹروں کو ورغلایا اور مخالف پارٹی کو ووٹ دلوائے۔ انتخابی عملے کے ساتھ سازش کر کے میرے ووٹ غائب کرائے۔ اگر میں چار لاکھ روپے خرچ کر کے ایک بڑی برادری کے ووٹ نہ خریدتا تو آج دنیا مجھ پر ہنستی۔ میری عزت دو کوڑی کی نہ رہتی۔ پچھلے سال سپے والی زمین سے زبردستی فصل اٹھوا کر لے گئے۔ معاملہ پھر کورٹ کچہری میں جا پہنچا۔ ڈپٹی کو نئے ماڈل کی جیپ تحفتاً پیش کی تو جا کر عزت بچی۔ اب وہ رشتے کے لیے پیغام بھیج رہا ہے۔ جا کر کہہ دو اس سے کہ رئیس بے غیرت نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے سکینہ کا گلا دبا دوں۔"

سکینہ اس دن بہت روئی تھی۔ اسے اپنے خاندان کی ضد

کا پتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ رئیس برادری میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا۔ اس لیے اب یہیں، اسی حویلی میں جینا مرنا ہے۔ یہی ایک راہ تھی جہاں رشتہ ہونا ممکن تھا۔ وہاں نہیں ہوا تو اب کہیں نہیں ہوگا۔ اس دن اسے پہلی مرتبہ دورہ پڑا تھا۔

رئیس کو اپنی بہن کا دکھ تو بہت تھا لیکن وہ بھی مجبور تھا۔ برادری میں کوئی برابر کا رشتہ بھی تو نہیں تھا۔ اس لیے اس نے تلخی سے کہا کہ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ بیٹھی کھاتی رہے۔ خاندان میں کئی لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں اور کتنی عزت و آبرو کے ساتھ اپنا وقت گزار گئیں۔ سکینہ بھی اس چار دیواری میں عزت سے اپنا وقت گزار لے گی۔

سکینہ کی امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ بجھی بجھی سی رہنے لگی۔ اسے ہر طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔

تھانیدار نے مدہوشی میں کروٹ بدلی۔ رئیس اچھل کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا لیکن اسے بے سدھ پا کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دوبارہ کھڑکی کے سامنے جا ٹھہرا۔ باہر وہی تاریکی کا راج تھا، ہر سو ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

''جانو! تم کہاں رہ گئے؟'' رئیس بے قراری سے بڑبڑایا۔

جانو دراصل ڈاکو تھا۔ اردگرد کے زمینداروں سے نمٹنے کے لیے رئیس نے کافی عرصے سے اس ہتھیار کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ مشہور تھا کہ جانو، عالمو کے گروہ کا ڈاکو تھا۔ عالمو کے مارے جانے کے بعد رئیس کا خاص کارندہ بن کر اس کے پاس رہنے لگا۔

کندھے پر دونالی بندوق، کمر کے گرد کارتوسوں کی بیلٹ، ہلکی بھوری ڈاڑھی، اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں، آنکھوں میں سرخی، گبرو جوان۔ جب وہ اونچی آواز میں للکارتا تو سننے والے دہل کر رہ جاتے۔ ہر مہم پر مسکراتا ہوا جاتا اور کامیاب لوٹتا۔ رئیس اس پر بھرپور اعتماد کرتا تھا اور وہ بھی جان کی پروانہ کرتے ہوئے رئیس کی خاطر ہر خطرہ مول لینے پر تیار رہتا تھا۔

مگر آج، جب رئیس کی عزت کا سوال تھا...... جب دس سال پرانا احسان چکانے کا وقت آیا تو اتنی دیر......؟ ایک کمزور کسان کے گھر سے ایک ناتواں سی لڑکی کو اٹھالانے میں اس قدر تاخیر؟ تھانیدار کی آنکھ کھل گئی تو اس سے کس طرح آنکھ ملاپاؤں گا؟ پشیمانی سے پانی پانی نہ ہوجاؤں گا؟

اس نے اپنا سر کھڑکی کے فریم کے ساتھ ٹکا دیا اور خلا میں گھورنے لگا۔ تب اچانک اس کے کانوں میں دور سے آتی ہوئی جیپ کی مدھم آواز سنائی دی۔ یکایک رئیس کا سینہ پھول گیا۔ ناامید آنکھوں میں امید کی کرنیں جھلملانے لگیں۔ وہ دروازے کی طرف دوڑا۔ برآمدے سے ہوتا ہوا اوطاق کے بیرونی دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ روشنی رفتہ رفتہ قریب آرہی تھی۔ جیپ کے انجن کی آواز بڑھتی گئی اور پھر اس نے گردوغبار کے پہاڑ میں سے جانو کا قہقہہ سنا۔

''کیا خبر ہے جانو؟'' رئیس بے تابی سے چیخا۔

''کامیاب لوٹا ہوں سائیں!''

رئیس کو جیسے نئی زندگی مل گئی۔ خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ چیخ کر بولا۔ ''خوش رہو پیارے، گھسیٹ کر لے آؤ لڑکی کو۔''

جیپ کی دھول میں سے ایک دراز قد جوان اچھل کر باہر آگیا۔ ہلکی بھوری ڈاڑھی، کاندھے پر دونالی والی بندوق، کمر کے گرد کارتوسوں کی بیلٹ۔ اس کے ساتھی بھی جیپ سے اتر آئے۔ سب کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ انہوں نے رسیوں سے بندھی ایک گٹھری نیچے اتار لی۔

رئیس نے جانو کی پیٹھ تھپکی۔ ''خوش رہو جانو، میری جان۔ تم نے آج میری عزت رکھ لی...... ارے جلدی کرو۔ اسے لے جا کر اوطاق میں پٹخ دو۔ کوئی جا کر تھانیدار کو خبر کرے۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ رئیس بھی کوئی چیز ہے۔''

کافی دیر بعد، جب زینا کی سسکیاں سو گئیں، تب جانو اوطاق کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اس نے اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑی۔ اجرک سے چہرہ صاف کیا اور مونچھوں کو بل دیتا ہوا چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر وہ حویلی کے پچھلے حصے میں واقع حوض کی طرف چل دیا۔

گھنے درختوں کی ٹہنیوں کو ہاتھ سے ہٹاتا ہوا ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جانو چونک کر اچھل پڑا۔ اس نے بندوق پر گرفت مضبوط کرلی اور بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔

''کون ہے؟'' وہ دہاڑا۔

جواب میں ایک ہاتھ اس کے ہونٹوں پر آکر جم گیا۔ پودوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ جانو نے سائے کو غور سے دیکھا۔ بندوق پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور رکی ہوئی سانس متوازن چلنے لگی۔

سائے نے دھیرے سے کہا۔ ''آج تم نے بہت انتظار کرایا جانو! میں تو مایوس ہوکر واپس جانے والی تھی۔''

جانو نے جواب دیا۔ ''آج رئیس کی عزت کا سوال تھا سکینہ! آئندہ دیر نہیں ہوگی میری جان!''



گم شدہ

ثمر عباس

بعض اوقات بہت سامنے کا منظر بھی صاف نظر نہیں آتا مگر، ، کبھی کبھی کسی مشکل پس منظر کو سمجھنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی… ایسا اس وقت ہوتا ہے جب جائزہ لینے والا تفتیش کی پہلی کڑی نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے میں تیزی دکھاتا ہے… مگر افسوس اسے واقعات کے حقائق کے لیے ایک بار پھر پلٹنا پڑتا ہے جیسے کہ اسے… اس کی تیز رفتاری بھی کسی کام کی نہیں رہی تھی…

زندگی کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرنے والے کی چالاکی

فیلسیا پارکر کی گمشدگی ایک معما بن گئی تھی۔ آخری بار اسے جس عورت نے دیکھا، وہ سڑک کے کنارے سبزیوں کا اسٹال لگاتی تھی اور فیلسیا پارکر کو ٹماٹر دینے آئی تھی جو اس کا شوہر میک پارکر صبح کام پر جاتے ہوئے خرید کر گیا تھا اور اس عورت کو تاکید کی تھی کہ یہ ٹماٹر اس کے گھر پہنچا دے۔ گو کہ وہ عورت ان دونوں کے لیے اجنبی تھی لیکن پارکر کا پتا سمجھنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی اور وہ پارکر کے گھر سامان پہنچانے

چلی آئی۔ پولیس نے حسبِ روایت فیلسیا کے شوہر میک پارکر پر شک کیا۔ عام خیال یہی تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر کے لاش دریا میں پھینک دی ہے یا جنگل میں کہیں گاڑ آیا ہے۔ عدالت میں مقدمے کی کارروائی کے دوران اس عورت نے بیان دیتے ہوئے کہا۔

''جب وہ ٹماٹر لینے باہر آئی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے رات بھر روتی رہی ہو۔ اس نے مجھ سے ان ٹماٹروں کو بند ڈبے میں محفوظ کرنے کا طریقہ پوچھا کیونکہ اس نے اس سے پہلے یہ کام نہیں کیا تھا۔ اس کے شوہر کا اصرار تھا کہ وہ بھی ٹماٹروں کا سوپ اسی طرح بنائے جیسا کہ اس کی ماں بناتی ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی ساس کو فون کر کے سوپ بنانے کی ترکیب پوچھ لے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا شوہر یہ بات پسند نہیں کرے گا کیونکہ وہ اپنے گھر والوں سے کسی قسم کا تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ان لوگوں سے ناراض تھا۔''

استغاثہ کا دوسرا گواہ رینڈی پارکر تھا۔ وکیلِ صفائی نے اس پر جرح کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ شادی سے پہلے فیلسیا پارکر تمہارے ساتھ ڈیٹنگ کرتی رہی ہے اور تم اسی لیے ناراض تھے کہ اس نے تمہیں چھوڑ کر تمہارے بھائی سے شادی کر لی تھی؟''

''یہ سچ نہیں ہے۔'' رینڈی پارکر نے کہا۔ ''میں اور فیلسیا ایک دو مرتبہ گھومنے گئے تھے لیکن میں کسی میکسیکن لڑکی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، خواہ وہ کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو۔''

''تمہارے گھر والوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا لیکن تم اس کے بعد بھی اپنے بھائی کے گھر جاتے رہے؟''

''میں اور میک ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے سے بہت قریب رہے ہیں اور ہمارے درمیان بہت محبت ہے۔ میں اپنے بھائی کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

''اس کے باوجود کہ اس نے اس ہفتے کے شروع میں تمہاری ناک پر گھونسا مارا تھا جب تم نے اس کی بیوی سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔''

''اس کا مقصد مجھے نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی غصے کا تیز ہے اور صرف فیلسیا ہی جانتی ہے کہ اسے کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔''

''کیا اس بدسلوکی پر تم نے فلیسیا سے اظہارِ ناراضگی کیا تھا؟''

''یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ میں اسے مسئلہ بنالیتا۔''

''سچ سچ بتاؤ مسٹر پارکر! فیلسیا کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' وکیلِ صفائی نے جھنجلاہٹ میں براہِ راست سوال کر ڈالا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

استغاثہ کی دوسری گواہ ایک نرس تھی جس نے عدالت کو بتایا۔ ''چھ ماہ قبل جب وہ اسپتال لائی گئی تو اس کے جسم سے بہت زیادہ خون بہہ رہا تھا۔ اس کے پیٹ پر ضرب کا نشان تھا، ہم کوشش کے باوجود بچے کو نہ بچا سکے۔''

''کیا اس نے اس چوٹ کی کوئی وجہ بتائی تھی؟''

''نہیں بلکہ ہم نے اس سے پوچھا کہ کہیں شوہر نے تم پر تشدد تو نہیں کیا لیکن اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گر گئی تھی جبکہ گرنے کی صورت میں اس طرح کا زخم نہیں آتا۔ ایسا تبھی ہوتا ہے جب اسے مارا گیا ہو۔''

☆☆☆

ایک اور گواہ نے بھی تصدیق کی کہ میک پارکر غصے کا تیز تھا۔ یہ آدمی اس کے ساتھ ہی ہارڈ ویئر اسٹور میں کام کرتا تھا۔ اس نے عدالت کو بتایا۔ ''وہ بہت جلد غصے میں آجاتا تھا۔ خاص کر فیلسیا کے ساتھ تو اس کا سلوک بہت ہی خراب تھا۔ اگر وہ اس کی کسی بات کا جواب دے دیتی تو وہ اس پر چڑھ دوڑتا حالانکہ وہ میرے خیال میں بہت ہی معقول عورت تھی لیکن میک کا کہنا تھا کہ وہ اس سے تنگ آچکا ہے اور اگر اپنے گھر والوں کے سامنے شرمندہ ہونے کا خیال نہ ہوتا تو وہ اسے چھوڑ چکا ہوتا کیونکہ اس نے ان کی مخالفت کے باوجود فیلسیا سے شادی کی تھی۔''

''کیا اس نے کبھی طلاق کی بات کی تھی؟'' سرکاری وکیل نے پوچھا۔

''نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا مطلب اپنی غلطی تسلیم کرنا ہوگا۔''

''کیا اس نے کبھی بچہ ضائع ہونے کا ذکر کیا؟''

''بس اتنا بتایا تھا کہ اس واقعے نے فیلسیا کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے۔''

☆☆☆

سب سے اہم گواہی پارکر کے پڑوسی کی تھی۔ اس نے عدالت کو بتایا۔ ''ہم اپنے پورچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے گھر کی بتیاں روشن تھیں۔ ہم نے اسے کچن کی کھڑکی کے پاس سے گزرتے دیکھا پھر ہمیں شیشہ ٹوٹنے،

چلانے اور تھپڑ مارنے کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا جیسے فیلسیا رو رہی ہو تب میں نے پولیس کو فون کر دیا۔''

☆☆☆

''ان کا گھر کسی مذبحہ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔'' موقع پر پہنچنے والے پولیس آفیسر نے بیان دیتے ہوئے کہا۔''اس کا ہونٹ پھٹ چکا تھا جبکہ بازوؤں اور ٹانگوں پر بھی زخموں کے نشانات تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ فرش اور دیواروں پر ٹماٹر کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے جبکہ مجھے وہاں شیشے کے ٹکڑے بھی نظر آئے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ خون کے دھبے ہیں تاہم فیلسیا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس پر کوئی تشدد نہیں ہوا بلکہ وہ بے دھیانی میں شیشے کے جار سے ٹکرا گئی۔ اس کے ٹکرانے سے جار زمین پر گر کر ٹوٹ گیا اور فرش پر ٹماٹر کے ٹکڑے بکھر گئے جس کی وجہ سے وہ پھسل گئی۔ اسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور وہ ایک دوسرے پر چلانے لگے۔''

''اور تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا؟'' وکیل نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب! لیکن فون پر شکایت اس نے نہیں کی تھی۔ اس لیے میں اس کے شوہر کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔''

☆☆☆

''جب مسٹر پارکر نے اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تو ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس واقعے میں وہ خود بھی ملوث ہو سکتا ہے۔'' شیرف کے دفتر میں تعینات پولیس سراغ رساں نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا۔''لیکن اس طرح کے معاملات میں سب سے پہلا شک شوہر پر ہی کیا جاتا ہے۔ پھر ہم نے کچن میں خون کے دھبے دیکھے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی کار کی ڈکی پر بھی خون کے نشانات تھے۔ ان کے بارے میں اس نے بھی وہی کہانی سنائی جو فیلسیا نے ایک رات قبل پولیس کو سنائی تھی۔ یعنی شیشے کا جار ٹوٹ جانے سے وہ پھسل کر گری اور زمین پر گرے ہوئے شیشے سے زخمی ہو گئی لیکن وہ یہ وضاحت پیش نہ کر سکا کہ اس کی کار کی ڈکی میں خون کہاں سے آیا۔''

''کیا گھر کی کوئی چیز غائب ہے؟'' سرکاری وکیل نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ایک چھ ضرب آٹھ فٹ قالین کا ٹکڑا جو گھر کے داخلی دروازے پر پڑا ہوا تھا۔''

''تمہارے خیال میں فیلسیا پارکر کی جسامت کیا

ہو گی؟"

"میری معلومات کے مطابق اس کا قد پانچ فٹ تین انچ تھا اور وہ دبلی پتلی عورت تھی۔"

"کیا اسے اس قالین میں لپیٹا جاسکتا ہے؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی چلّایا۔

☆☆☆

"مسٹر پارکر! تمہیں اعتراف ہے کہ کبھی کبھی بیوی کے ساتھ تمہارا رویہ سخت ہوجاتا تھا لیکن اب تم اپنے آپ کو معصوم ظاہر کررہے ہو۔ آخر کیوں؟" وکیلِ صفائی نے رسمی جرح کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ میں نے اپنی بیوی کو نہیں مارا۔ جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ سونے سے پہلے کچن کی اچھی طرح صفائی کردے لیکن اس نے میری بات سنی ان سنی کردی۔ یقیناً وہ گھر سے باہر چلی گئی ہوگی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ خالی ہاتھ چلی گئی ہو؟ کم از کم اپنے کپڑے تو ساتھ لے کر جاتی۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ وہ ڈیوڑھی میں پڑا ہوا قالین اور میرے پیسے لے گئی۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنا بڑا قالین لے کر کس طرح گئی ہوگی اور اس کا کیا کرے گی؟" وکیلِ استغاثہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک پیسوں کا تعلق ہے تو تم نے اس سے پہلے ان دو ہزار ڈالرز کا تذکرہ نہیں کیا جو بقول تمہارے وہ ساتھ لے گئی تھی۔ اگر تمہارے بیان پر یقین کرلیا جائے تب بھی وہ اپنے نازک کندھوں پر وہ بھاری قالین ہی لے کر گئی ہوگی۔ اس نے اپنے کپڑے، ٹوتھ برش، پرس، کچھ بھی ساتھ لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور جاتے جاتے تمہاری کار کی ڈکی میں خون کے دھبے چھوڑ گئی۔ سچ سچ بتاؤ مسٹر پارکر! تم نے اس کی لاش کہاں دفن کی ہے؟"

وکیلِ صفائی کا خیال تھا کہ لاش برآمد ہونے سے پہلے جیوری اس کے مؤکل کو قتل کا مرتکب قرار نہیں دے سکتی لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ پارکر کے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا جبکہ حالات و واقعات اور گواہوں کے بیانات صریحاً اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ جیوری نے اسے سیکنڈ ڈگری قتل قرار دیتے ہوئے اسے مجرم ٹھہرا دیا۔

☆☆☆

تین ماہ بعد اس کا وکیل ملنے کے لیے سینٹرل جیل آیا اور اسے یہ افسوس ناک خبر سنائی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہاری اپیل مسترد ہوگئی ہے۔ جج کا کہنا ہے کہ اسے ماتحت عدالت کی کارروائی میں کوئی سقم نظر نہیں آیا لہٰذا اس کی سنائی ہوئی سزا بحال رکھی گئی ہے۔ اگر جیل میں تمہارا رویہ بہتر رہا تو دس سال بعد پیرول پر رہا ہوسکو گے۔"

☆☆☆

اس مقدمے کی کارروائی میں اس شخص کا ذکر بھی آیا ہے جو کبھی پارکر کے ساتھ ہارڈ ویئر اسٹور میں کام کرتا تھا۔ وہ نیو میکسیکو منتقل ہوچکا تھا اور چھ سال میں ترقی کرتے کرتے ایک دوسری ہارڈ ویئر کمپنی میں منیجر کے طور پر کام کررہا تھا۔ دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد جب وہ شام کو گھر آیا تو اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو اس قالین پر کھلونا ٹرک چلاتے ہوئے دیکھا جو اس کی بیوی ضد کرکے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ اس خاندانی یادگار کو خود سے کس طرح جدا کرسکتی تھی جس کی بدولت وہ ایک ظالم شخص سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قالین کو یہاں تک لانے کے لیے اسے ایک بس کے ٹکٹ کے مساوی اضافی کرایہ ادا کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں بس سے سفر کرنے کا آئیڈیا اسی شخص کا تھا جبکہ فیلیا نے بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے کام لیتے ہوئے اپنی انگلیاں زخموں سے رستے ہوئے خون میں ڈبو کر گاڑی کی ڈکی کے اوپری حصے اور اندرونی فرش پر پھیر دی تھیں کیونکہ اس کے جسم سے خون کافی مقدار میں بہہ رہا تھا اس لیے اسے یہ کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ قالین لے کر نکلنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ پولیس یہی سمجھے کہ پارکر نے اسے قتل کرکے لاش قالین میں لپیٹی اور ڈکی میں رکھ کر کہیں دور لے گیا۔

"مما! ڈیڈی آگئے۔" ان کے بیٹے نے آواز لگائی۔

لیکن وہ اس سے پہلے ہی اپنے شوہر کے استقبال کے لیے نیچے آچکی تھی۔ اس نے اپنی گود میں چھوٹی بیٹی کو اٹھا رکھا تھا اور اس کے خوب صورت گداز ہونٹوں پر ایک پیار بھری مسکراہٹ نمایاں تھی۔



فضل رحمٰن

ضیا تسنیم بلگرامی

اتباع رسولؐ اور خدا کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے کے لیے کسی بھی انسان کو اپنے نفسؔ کی قربانی دینا پڑتی ہے اور جو نفس پر اپنی بادشاہت قائم کرلیتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ فاتح قرار پاتا ہے مگر اس معراج پر پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی... اور جو اسے پالیتے ہیں وہ یقیناً اللہ کے مقرب بندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی اسی قافلے سے تھا جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں اور دنیاداروں کو آخرت کا احساس دلاتے ہیں۔

سنت رسولؐ اور احادیث کے قدردان ایک ولی کا ماجرا

یوپی (بھارت) کے قصبہ سندیلہ میں 1209ء میں اہل اللہ نامی بزرگ کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ خاندان صدیقی تھا اور یہ لوگ فیروز شاہ کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے۔ یہ اللہ والے اپنی بزرگ اور علمیت میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ جب یہ بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام تاریخ سے نکالا گیا۔ فضل رحمٰن...... معلوم نہیں کہ نام رکھنے والوں کو یہ خیال کیوں آیا کہ مستقبل کی عظیم اور تاریخی شخصیت کا نام تاریخ سے نکالا جائے۔

فضل رحمٰن جب اس لائق ہوئے کہ باہر نکل کر بچوں میں کھیلیں تو لڑکوں نے انہیں بڑی عزت دی۔ یہ عزت انہیں اپنے بزرگوں سے پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ بزرگ بچوں کی عزت کریں تو یہ غیر معمولی بات ہے۔

بچوں کے ساتھ کھیلتے تو اس میں بھی رکھ رکھاؤ رہتا۔ سنجیدگی اور مستقل سوچ۔ بچے شور وغل کرتے، یہ شور وغل سے پرہیز کرتے۔ لڑکے اپنے ساتھیوں کو مارتے پیٹتے مگر فضل رحمٰن مار پیٹ میں کوئی حصہ نہ لیتے۔ دوسرے بچوں میں غضب کی دنیاداری پائی جاتی تھی مگر ان میں دنیاداری کا جوش وخروش نہیں ملتا تھا۔

بچے سڑک پر کھیل رہے تھے۔ ایک بھاگتا تھا اور دس اس سے بچتے پھرتے تھے۔ اسی عالم میں فضل رحمٰن بھی اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ میں مشغول تھے۔ سارے بچے اِدھر اُدھر روپوش ہو چکے تھے اور اس بات کو بھی جان چکے تھے کہ صرف فضل رحمٰن ہی چھپنے والے بچوں کو تلاش کریں گے۔ آپ بچوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں مشغول تھے۔ اس وقت وہ سڑک پر تھے انہیں سواریوں کی آمدورفت کا کچھ خیال نہ تھا۔ اچانک ایک بیل گاڑی دوڑتی ہوئی آتی نظر آئی۔ فضل رحمٰن کسی اور ہی دُھن میں تھے۔ انہوں نے بیل گاڑی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ گاڑی کی ٹکر نے فضل رحمٰن کو گرا دیا اور جب تک وہ سنبھلتے گاڑی کا پہیہ ان کے جسم پر سے گزر گیا۔ کان کا کچھ حصہ کٹ کر خاک میں مل گیا۔ بچوں نے اس حادثے کی بابت جانا تو شور کر دیا۔ ہر طرف سے لوگ دوڑے، بزرگوں نے انہیں گود میں اٹھا لیا اور گھبرا کر پوچھنے لگے۔ ”فضل رحمٰن ٹھیک تو ہو، کچھ ہوا! تو، پہیہ کہاں پر سے گزر گیا؟“

فضل رحمٰن کے ہوش وحواس بالکل بجا تھے۔ انہوں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں سے گزر گئی تھی گاڑی۔“

ایک بزرگ نے سر کو چاروں طرف سے دیکھا، سر پر مٹی کے نشانات موجود تھے اور ایک کان کٹ چکا تھا، وہاں سے خون جاری تھا۔ گھر والے زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کے دل میں موجود یہ اندیشہ انہیں پریشان اور مایوس کر رہا تھا کہ اگر گاڑی کا پورا پہیہ سر پر سے گزر چکا ہے تو بچہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں لیکن بچہ اپنے ہوش وحواس میں تھا اور سوال کرنے والوں کو نہایت سکون واطمینان سے جواب دے رہا تھا۔ ان میں جو اہلِ نظر تھے انہوں نے بچے کی حیثیت اور مرتبے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ گھریلو دواؤں سے خون روکا گیا اور فضل رحمٰن کو آرام کی خاطر بستر پر لٹا دیا گیا۔ اب کھیل کود بند، ہر وقت ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بزرگ ضرور رہتا تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں آپ ہردوئی کے قصبہ ملّاواں سے کہیں جا رہے تھے، والد... ان کے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ تھا۔ دونوں پیدل سفر کر رہے تھے۔ ان کے دونوں طرف کھیت تھے۔ کاکن کے درخت لہلہا رہے تھے۔ طوطے نے کاکن کے خوشے جو دیکھے تو ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ والد صاحب نے ہنس کر طوطے کو تسلی دی۔ ”میں سمجھ گیا تو کیوں بول رہا ہے؟ چالاک پرندے! شاید تو کاکن مانگ رہا ہے۔“

اس کے بعد ان کے والد نے کاکن کے خوشوں کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن توڑنے سے پہلے آٹھ سالہ فضل رحمٰن نے باپ کو ٹوک دیا۔ ”باوا جان! خوشے مالک کی مرضی اور اجازت کے بغیر ہرگز نہ توڑیے گا۔“

شاید باپ نے ان کی بات سنی نہیں کیونکہ وہ کسی اور ہی دھن میں تھے۔ کاکن کے خوشے توڑتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔ ”یہ پرند بھی کتنا چالاک ہوتا ہے اگر آزاد ہوتا تو کتنے ہی خوشوں کو برباد کر دیتا۔“

فضل رحمٰن نے ایک بار پھر باپ کو منع کیا۔ ”باوا جان! میں کیا کہہ رہا ہوں، میری بات تو سنیے۔“

اتنی دیر میں باپ نے کئی خوشے توڑ کر پنجرے میں ڈال دیے تھے۔ بے خیالی میں بیٹے سے پوچھا۔ ”ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں نے کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں کیا۔“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ”آپ کو کھیت کے مالک کی مرضی کے بغیر یہ خوشے نہیں توڑنے چاہیے تھے۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”تم پریشان مت ہو، کھیت کا مالک اس وقت یہاں کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی دن اس سے اجازت بھی لے لیں گے۔“

فضل رحمٰن نے کہا۔ ''کسی دن کیا، آپ کو ابھی اسی وقت آج ہی اس کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔''

باپ نے کہا۔ ''فضل رحمٰن! ضد مت کر، جب میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ میں کھیت کے مالک سے کل یا پرسوں تک اس کی اجازت لے لوں گا تو تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟''

لیکن فضل رحمٰن اپنی بات پر اڑے رہے، کہا۔ ''باواجان! آپ نے سب سے بڑی غلطی کی ہے، اس لیے غلطی کو فوراً ہی معافی اور اجازت مانگ کر پاک وصاف کر لیجیے کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ معلوم نہیں کب موت آ جائے اور یہ گناہ ساتھ ہی چلا جائے۔''

باپ کو جانے کی جلدی تھی اور بیٹے کو اجازت اور معافی مانگنے کی جلدی تھی۔ باپ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بیٹے! کیا تم مجھ سے واقف نہیں ہو؟ جو اس قسم کی نصیحتیں کر رہے ہو۔''

فضل رحمٰن نے عرض کیا۔ ''باواجان! میں یہ بات بالکل نہیں پسند کرتا کہ کسی کی املاک کو......''

باپ نے اپنی بزرگی اور بڑے پن کی انا میں فضل رحمٰن کی بات نہیں مانی اور وہاں سے چل پڑے، کافی دور چلنے کے بعد باپ کو احساس ہوا کہ وہ اکیلے چل رہے ہیں۔ پلٹ کر جو دیکھا تو پتا چلا کہ فضل رحمٰن کا کن کے کھیت کے پاس چپ چاپ کھڑے ہیں۔ باپ نے چیخ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے فضل رحمٰن! وہاں کیوں کھڑے ہو؟''

فضل رحمٰن نے جواب دیا۔ ''باواجان! میں اس وقت تک یہیں کھڑا رہوں گا جب تک کھیت کا مالک آ نہیں جاتا۔ میں اس سے آپ کی طرف سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

باپ کو غصہ آ گیا۔ ''تو میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہا؟''

فضل رحمٰن نے جواب دیا۔ ''باواجان! بات یقین کی نہیں، وقت اور اس کی نزاکت کی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا اور کس ملک میں وصال پائے گا۔''

باپ نے پوچھا۔ ''تو گویا تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟''

فضل رحمٰن نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ سے جو کہہ دیا ہے، میں اس پر ثابت قدمی سے عمل کروں گا۔''

باپ سے بھی نہیں چلا گیا، بیٹے کے پاس واپس چلے آئے، کہا۔ ''تم بلاوجہ ضد کر رہے ہو۔ کھیت کا مالک معلوم نہیں کب آئے گا۔ ہم یہاں اس کا کب تک انتظار کریں گے۔''

فضل رحمٰن نے کہا۔ ''تب پھر آپ ایسا کیجیے کہ ان خوشوں کو پنجرے سے نکال کر کھیتوں میں ڈال دیں۔''

باپ نے یہ تجویز پسند کی اور کاکن کے خوشوں کو پنجرے سے نکال کر کھیت میں پھینک دیا۔ اس کے بعد آپ اپنے والد کے ساتھ آگے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو بڑی پریشانی لاحق ہو گئی۔ گھر کا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ پھر اسی دوران ملک میں قحط پڑ گیا اور ہر طرف بھوک نے عبرتناک منظر پیش کرنے شروع کر دیے۔ ماں نے بیٹے سے پوچھا۔ ''بیٹے! ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگوں سے اجتناب، عزیزوں اور رشتے داروں سے پرہیز۔''

ماں اس جواب سے بہت خوش ہوئیں، پوچھا۔ ''کیوں؟ تُو نے یہ مشورہ کیوں دیا آخر؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ماں! رشتے داروں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو قحط سالی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر اس سے ہماری قناعت اور خودداری کو بڑا نقصان پہنچے گا۔''

ماں نے پوچھا۔ ''پر گزر اوقات کس طرح ہو گی؟''

گھر میں ایک درخت لگا ہوا تھا۔ آپ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اس درخت کے پتے اور چھال کو ابال ابال کر کھایا جا سکتا ہے۔''

ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا، بولیں۔ ''مجھ کو تجھ سے اسی جواب کی امید تھی۔ خدا تجھے جزائے خیر دے۔ تو نے بھی غریبی کی شرم رکھ لی۔''

اس کے بعد آپ کی ماں نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ درخت کی چھال اور پتے ابال ابال کر خود کھائے اور بیٹے کو بھی کھلائے۔

آپ نے تعلیم حاصل کی اور دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل شروع کر دی۔ ان دنوں شاہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور یہ ایک دن میں دو دو جزو بخاری کے پڑھا کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''برخوردار! یہاں کتنے عرصے قیام کا ارادہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''صرف ایک ماہ۔''

شاہ عبدالعزیز نے فرمایا۔ ''صرف ایک ماہ! لیکن صرف ایک ماہ میں کیا پڑھو گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں مجبور ہوں کیونکہ میری والدہ نے مجھے ایک ماہ دہلی میں ٹھہرنے کی اجازت دی ہے، میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''افسوس کہ اگر تم صرف چار ماہ میرے پاس رہ جاتے تو میں تمہیں کچھ سے کچھ بنا دیتا۔'' اس کے بعد فرمایا۔ ''اب تم مولوی اسحاق سے پڑھ لیا کرو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بہتر ہے، میں انہی سے پڑھ لیا کروں گا۔''

اور انہوں نے مولوی اسحاق سے پڑھنا شروع کر دیا اور ٹھیک ایک ماہ بعد اپنے گھر واپس چلے گئے۔

جب آپ دوبارہ دہلی تشریف لے گئے تو معلوم ہوا شاہ عبدالعزیز محدث وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے اس بار بھی مولوی اسحاق سے علم حدیث حاصل کیا۔

دہلی میں حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں شاہ محمد آفاق کو بڑی شہرت حاصل تھی اور عشق الٰہی کے مارے ہوئے یہاں حاضریاں دیتے تھے اور اپنے عشق میں اور آگ لگا لیتے تھے۔ آپ بھی شاہ محمد آفاق کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ شاہ صاحب ان سے بے حد التفات فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی خواتین کا پردہ تک ختم کرا دیا تھا۔

آپ نے جو کچھ پڑھا تھا، استعداد اس سے کہیں زیادہ تھی، یہاں تک کہ اس عہد کے لوگ متفقہ طور پر انہیں شبلی و جنید کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ آپ نے پہلی شادی کی مگر دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران آپ نے ایک مسجد میں سکونت اختیار کی۔ اس مسجد میں ایک موذن کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ موذن بھی اذان دے کر چلا جاتا تھا۔ آپ نے اس مسجد کو آباد کیا اور نماز پڑھانے لگے۔ اس مسجد میں ایک تعزیہ رکھا ہوا تھا، آپ نے فرمایا۔ ''مسجد میں تعزیہ کا کیا کام، اس کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔''

گنج مراد آباد کے خواتین کو تعزیوں سے عقیدت تھی، انہیں یہ بات گراں گزری اور انہوں نے مزاحمت کی۔

ایک خان نے لکھنؤ کے نواب کو خفیہ خط لکھا، اس میں اس نے لکھا۔ ''حضور نواب کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں فضل رحمٰن نامی ایک نوجوان تعزیوں کی بے حرمتی کیا کرتا ہے اگر اس نوجوان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی تو حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے۔''

لکھنؤ کے نواب نے اپنی فوج کو بھیجا اور حکم دیا کہ فضل رحمٰن نامی نوجوان کو فوراً گرفتار کر کے یہاں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ فوج کا ایک دستہ گنج مراد آباد پہنچا اور مولانا کو گرفتار کر کے ان کے پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور مراد آباد سے لیح آباد لے گئے۔ آپ کی گرفتاری کی خبر دور دور تک پہنچ گئی۔ ان دنوں ریاست گوالیار میں محمد جعفر خاں نامی ایک معزز شخص میر منشی تھے اور ان کا تعلق سندیلہ سے تھا۔ انہوں نے جب یہ خبر سنی تو نواب صاحب کو ایک خط لکھا، اس میں انہوں نے اس نوجوان کے مقام اور مرتبے سے نواب صاحب کو مطلع کیا تھا اور بتایا تھا کہ مولانا فضل رحمٰن کے نانا ہم سب کے استاد تھے اور آپ کے بھی۔ کیا آپ اپنے استاد کے نواسے پر ظلم کر کے خوش ہوں گے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ مولانا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ غلط ہے۔

اس خط نے بڑا کام کیا۔ نواب نے ان کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا۔ آپ کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں اور آپ یہاں سے گنج مراد آباد واپس تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی مرحوم بیوی کے چچا رہتے تھے، وہ مولانا کے مقام سے آگاہ تھے۔ ان

کی ایک بھتیجی کنواری بیٹھی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی بھتیجی کا عقد مولانا سے کر دیں مگر لڑکی کے بھائی مخالفت کرنے لگے، بولے۔ ''ہم اپنی بہن کی شادی اس فقیر سے نہیں ہونے دیں گے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

لیکن چچا نے یہ شادی کرا دی۔ شادی کے بعد پریشانی کا دور شروع ہوا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مہینوں اروی ابال ابال کر کھاتے رہے۔ آپ سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر سختی سے عمل کرتے تھے، یہاں تک کہ جب آپ نے محنتِ شاقہ اور ریاضت مسلسل سے نمایاں ترین مقام حاصل کر لیا تو کسی نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ بلند مقام آپ نے کس طرح حاصل کیا؟''

فرمایا۔ ''سنتِ نبویہ پر عمل پیرا ہونے سے۔'' پھر مزید فرمایا۔ ''غوث ہو یا قطب، اگر وہ خلافِ شرع زندگی گزارتا ہے تو وہ کچھ بھی نہیں۔''

آپ کو سنت کا بے حد خیال رہتا تھا۔ آپ سے کسی نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ یہ فرمائیں کہ آپ کے وصال کے بعد چہلم و چہارم ہونا چاہیے یا نہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں ہونا چاہیے۔''

سوال کیا گیا۔ ''کیوں؟ ایسا تو ہوتا چلا آیا ہے پھر ہم کیوں نہ کریں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''صحابہؓ کا یہ فعل نہ تھا۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے ایسا اس لیے نہیں کیا تھا کہ رسول اللہؐ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات نمونہ ہے کسی اور کی نہیں۔''

کسی نے سوال کیا۔ ''حضور والا! انتقال کے بعد مزار پر عرس ہونا چاہیے یا نہیں؟''

جواب دیا۔ ''نہیں کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہونا چاہیے کہ جب سنو کہ فضل رحمٰن کا انتقال ہو گیا تو چار قل پڑھ کر بخش دینا، بس اتنا ہی کافی ہے، عرس وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔''

ایک ارادت مند نے کہا۔ ''دوسرے بزرگوں کا عرس تو ہوتا ہے پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بس کہہ جو دیا کہ میری قبر پر میلا نہیں لگنا چاہیے۔''

آپ حدیث بڑی عقیدت اور محبت سے پڑھا کرتے تھے۔

آپ کے حالات یک بیک بدل گئے اور ہر طرف سے مال و زر آنے لگا لیکن آپ کو اس سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔

ایک بار کساد بازاری کی وجہ سے چاروں طرف مالی پریشانیاں لاحق ہو گئیں، آپ نے اپلے خریدنے شروع کر دیے۔

لوگوں نے پوچھا۔ ''آپ اپلوں کا کیا کریں گے؟''

جواب دیا۔ ''آس پاس والوں کو آگ کی ضرورت رہتی ہے۔ میں نے ان کے لیے مزید سامان یہ کر دیا کہ جب وہ یہاں سے آگ لے کر جاتے ہیں تو اس آگ کے لیے یہ اپلے بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اس طرح ان کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔''

ایک بار کسی کی طرف سے آپ کی خدمت میں پانچ سو روپے نذر میں آئے۔ آپ نے اسی وقت اعلان کر دیا کہ میرے حجرے کی دیوار گرنے والی ہے اس لیے بستی کے لوگوں میں اعلان کر دو کہ جسے مزدوری کرنا ہو، وہ پھاوڑا اور کدال لے کر میرے پاس آجائے۔

پاس پڑوس کے شرفاء کدال پھاوڑے لے کر پہنچ گئے۔ وہاں تو ہر چیز مضبوط تھی۔ کسی کو ذرا سا ہاتھ بھی نہیں لگانا پڑا اور چشم زدن میں سارا روپیا تقسیم کر دیا اور ہاتھ جھاڑ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

آپ کے پاس ارادت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ انگریز حکومت کو تشویش رہنے لگی۔ حکومت نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کو اس کام پر مقرر کیا۔ اس نے ایک تحقیقاتی افسر آپ کے پاس بھیج دیا۔ یہ افسر انگریز تھا۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچا، اس وقت حیدر آباد دکن کے نواب خورشید جاہ بھی آپ کے پاس آئے ہوئے تھے۔ انگریز تحقیقاتی افسر نے آپ کے حالات کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کے بعد آپ سے پوچھا۔ ''جناب! کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کے پاس اس قدر لوگ کیوں آتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''توبہ کرنے۔ یہ سارے لوگ میرے سامنے مجھے گواہ بنا کر توبہ کرتے ہیں، اگر تم چاہو تو تم بھی شرک سے توبہ کر کے مجھے گواہ بنالو۔ میں تمہیں بھی مسلمان بنانے کو تیار ہوں۔''

آپ نے جس نرم لہجے میں بات کی تھی، اس نے انگریز افسر کو بہت متاثر کیا، بولا۔ ''بابا صاحب! آپ درویش آدمی ہیں اگر آپ پسند کرو تو ہم آپ کا کچھ مدد کرنے کو تیار ہے۔ یعنی آپ اپنی خانقاہ کو بہت بڑا بنالیں۔''

آپ نے انگریز افسر کا شکریہ ادا کیا، فرمایا۔ ''میرے لیے میرا حجرہ اور اس میں اللہ کا ذکر کافی ہے۔''

انگریز تحقیقاتی افسر یہاں سے بہت خوش ہو کر گیا۔

لکھنؤ کے مطبع مصطفائی میں آپ دورانِ سفر قیام فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک بار آپ نے اسی مذکورہ پریس میں قیام کیا اور اس طرح کئی دن تک قیام فرمار ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں میر صاحب علی نامی ایک ہم وطن بھی مصطفائی پریس میں ٹھہرے۔ آپ سے بھی ملاقات کی۔ آپ ایک ایک شخص کا نام لیتے اور پوچھتے۔ ''بھائی وہ شخص ابھی زندہ ہے؟''

دوسری طرف سے جواب ملتا۔ ''جی حضرت! وہ زندہ ہے۔''

آپ پھر کسی کا نام لیتے اور پوچھتے۔ ''کیا وہ شخص ابھی زندہ ہے؟''

ادھر سے جواب ملتا۔ ''ہاں زندہ ہے۔''

آپ نے کئی ناموں کے بعد ارشاد فرمایا۔ ''اللہ انہیں سلامت رکھے۔ معلوم نہیں کس کی دعاؤں کا اثر ہے کہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہیں۔''

میر صاحب نے ایک صاحب سے کہا۔ ''آپ ذرا میاں جی سے فرماد یجیے کہ گھر میں پیسوں کی سخت ضرورت ہے، خرچ منگوایا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''توبہ واستغفار! کتنے فضول ہیں یہ لوگ کہ ان کا خرچ ہی پورا نہیں ہو رہا۔''

کسی نے پوچھا۔ ''اس میں قابلِ اعتراض کیا بات ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں گھر والوں کو سولہ سیر باجرہ اور سولہ سیر جوار دے آیا ہوں پھر اتنی جلدی ختم ہو جانے کا سبب؟''

انہی دنوں شرف الدولہ نے انہیں کئی ہزار روپے دیے تھے۔ آپ ان روپوں کو حاجت مندوں اور ضرورت مندوں میں کئی دن تک تقسیم فرماتے رہے۔ آخر میں ڈیڑھ سو روپے بچ گئے، خیال تھا یہ رقم دے دیں گے لیکن آپ نے یہ رقم بھی نہیں دی۔ ضرورت مندوں کے لیے بچائے رکھی۔ آخر میں اس رقم سے آپ نے احادیثِ نبویؐ کے چند نسخے خرید لیے اور ان نسخوں کو حاجت مندوں میں مفت تقسیم کر دیا۔

ایک دن کسی نے آپ سے عرض کیا۔ ''حضرت! اودھ کے ایک بزرگ کو کیمیا کا شوق ہے۔ آپ دعا فرماد یجیے وہ اس میں کامیاب ہو جائیں۔''

آپ نے دعا کی۔ ''خدا انہیں اس میں ناکام کرے۔''

عرض کرنے والے نے کہا۔ ''حضرت! یہ کیا دعا فرمائی آپ نے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ اس کے حق میں میری دعا ہے کیونکہ جس دل میں کیمیا کا شوق ہوگا اس میں نسبتِ الٰہی قرار پذیر نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اپنے دل میں اللہ کو رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دل سے شوقِ کیمیا جاتا رہے۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''اور حضرت! دستِ غیب کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ کسی نبی، فقیر اور درویش کامل نے ایسے امور کی تمنا نہیں کی۔''

☆☆☆

امر وہے کے مولوی محب اللہ خاں صاحب کا رامپور کے دربار سے تعلق تھا اور نواب رامپور سے ان کے مراسم تھے۔ ایک دن ان سے نواب کلب علی خاں نے یہ کہا۔ ''ہمیں بڑی تمنا ہے کہ مولوی فضل رحمٰن محدث ہمارے ہاں

تشریف لائیں۔"

مولوی محب اللہ خاں نے پوچھا۔"ان کی کیا ضرورت پیش آ گئی نواب صاحب؟"

نواب صاحب نے فرمایا۔"میرے پاس سب اہلِ علم اور ہر فن کے استاد جمع ہو چکے ہیں، اگر ان میں مولانا فضل رحمٰن بھی شامل ہو جائیں تو خوب ہو کیونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے صحبت یافتہ بھی ہیں۔"

مولوی محب اللہ خاں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔"میں کوشش کروں گا کہ انہیں یہاں لے آؤں اگر میں انہیں لے آؤں تو آپ ان کی خدمت میں نذرانہ کیا پیش کریں گے؟"

نواب صاحب نے جواب دیا۔"ایک لاکھ روپئے یہ حقیر سا نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

مولوی محب اللہ خاں صاحب مراد آباد روانہ ہو گئے اور وہاں مولانا سے ملاقات کی۔ مولانا نے توحید پر گفتگو شروع کر دی۔ محب اللہ خاں نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا، بولے۔"مولانا! اگر آپ رامپور تشریف لے چلیں تو کیسا رہے؟" مولانا بدستور توحید ہی پر بولتے رہے۔

آخر ایک بار پھر مولوی محب اللہ خاں نے کہا۔"حضرت! میں کب تک آپ کو نواب کلب علی خاں کی پیشکش سناتا رہوں گا، کوئی جواب تو دیجیے خدارا۔"

آپ نے نہایت بے نیازی سے فرمایا۔"محب اللہ خاں صاحب! میاں لاکھ پر ڈالو خاک۔ مجھے کہاں درباروں میں لے جا کر خوار کراؤ گے۔ اس قسم کی باتوں میں نواب کلب علی خاں کا دماغ خوب لگتا ہے، اللہ اس کو خوش و خرم رکھے۔"

ایک دن خبر گرم ہوئی کہ لیفٹیننٹ گورنر آپ کے پاس یہ دیکھنے جائے گا کہ زیارت کے لیے آنے والوں کے ہجومِ شوق کو اپنی نظروں سے دیکھے۔

لیفٹیننٹ گورنر آپ کے پاس بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ لیفٹیننٹ گورنر کی بیوی اس کے ساتھ تھی، وہ کھڑی ہوئی تھی کیونکہ مولانا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

لیفٹیننٹ گورنر نے کہا۔"مولانا! میں نے آپ کے پاس کئی بار آنا چاہا لیکن محض اس لیے رک گیا کہ میں آپ کی اجازت اور خواہش کے بغیر یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔"

آپ نے جواب میں فرمایا۔"میں فقیر آدمی ہوں، سامانِ دنیا بالکل نہیں رکھتا۔ اسی لیے دنیاداروں سے ملتے ہوئے شرم سی محسوس کرتا ہوں۔ اب اسی کو دیکھ لو، تم اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آئے، مگر کرسی نہ ہونے کی وجہ سے میں بٹھا نہیں سکتا۔"

مولانا کی نظر اپنے کمرے میں رکھے ہوئے ایک خالی گھڑے پر پڑ گئی، آپ نے اس کو الٹا کر کے بچھوا دیا اور عورت سے کہا۔"نیک بخت! تو اس پر بیٹھ جا۔"

وہ اس گھڑے پر بیٹھ گئی۔ لیفٹیننٹ گورنر نے کہا۔"حضرت! کچھ تبرک بھی عطا فرمایئے۔"

آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا۔"بھائی دیکھ میری ہنڈیا میں کچھ ہے یا نہیں۔ اس میں جو کچھ بھی ہو... انہیں دے دے۔"

خادم نے ہنڈیا کو الٹا، اس میں مٹھائی کا چورا پڑا تھا۔ آپ نے اس چورے کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کروا دیا۔

کچھ دیر بعد جب لیفٹیننٹ گورنر نے اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دے دی۔ لیفٹیننٹ گورنر نے کہا۔"حضرت! مجھے کوئی نصیحت؟"

آپ نے جواب دیا۔"کسی پر ظلم نہ کرنا۔"

☆☆☆

آپ لکھنؤ تشریف لے گئے تو آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان میں ایک صاحب مولوی علی حیدر خاں بھی تھے۔ ان کے سر میں درد رہا کرتا تھا۔ اس درد نے علی حیدر خاں صاحب کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔ انہوں نے مولانا فضل رحمٰن سے عرض کیا۔"کافی علاج کرایا گیا مگر سر کا درد نہیں گیا، کچھ آپ ہی کیجیے۔"

مولانا نے ان کے سر کے اس حصے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جہاں مستقل درد رہتا تھا اور ایک شعر پڑھا۔

باد نسیم آج یہ کیوں مشک بار ہے

شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''اب کیا حال ہے؟''

مولوی علی حیدر خاں نے محسوس کیا کہ درد جاچکا ہے۔ بولے۔ ''اب تو نہیں لگ رہا۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''اللہ نے چاہا یہ درد اب کبھی بھی نہیں ستائے گا۔''

مولوی علی حیدر خاں آپ سے بیعت ہوگئے اور ان پر آٹھ دن تک گریہ طاری رہا۔

☆☆☆

ایک دن آپ نے فرمایا۔ ''ہماری ایک ماما تھی۔ اس کا انتقال ہوگیا۔ ہمیں یہ فکر ہوئی کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ لیکن پھر یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اللہ نے اسے معاف کردیا۔ بخش دیا۔'' پھر آپ نے قدرے سکوت اختیار کیا اور فرمایا۔ ''جانتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیماری میں حضرت عائشہؓ کو بہت یاد کیا کرتے تھے اور یہی چاہتے تھے کہ میری تیمارداری ان کے گھر میں ہو کیا تم جانتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیوں کیا؟'' پھر خود ہی فرمایا۔ ''پیغمبر کے پاس بوقتِ انتقال جو شخص ہوتا ہے علم نبوت کا ایک حصہ اس کو مل جاتا ہے اور یہ جتنا قریب ہوتا ہے اس حصے میں اتنی ہی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ اس بار کا کوئی اور متحمل نہیں ہوسکتا، بجز حضرت عائشہؓ کے چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ آپ کے بالکل قریب ہی موجود تھیں۔

☆☆☆

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے صحیح بخاری چھپوائی اور اس کا ایک نسخہ لے کر مولانا کی خدمت میں پہنچے اور اس نسخے کو نہایت ہی ادب سے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''مولانا! میں نے اس کی تصحیح میں بڑی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود اگر اس میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو نشاندہی فرمادیں۔''

مولانا نے صحیح بخاری کا ایک صفحہ کھولا اور اس کی ایک سطر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں پر غلطی ہوگئی، ذرا غور سے دیکھ لینا۔''

مولانا احمد علی نے دیکھا، وہاں پر واقعی غلطی موجود تھی۔ اس کے بعد تین ورق اور الٹے اور ایک سطر پر انگلی رکھ دی، فرمایا۔ ''یہاں بھی غلطی ہوگئی۔''

مولانا احمد علی نے دیکھا، یہاں بھی غلطی موجود تھی۔

اسی طرح آپ صفحات الٹتے رہے اور غلطیوں والی سطروں پر انگلی رکھ رکھ کر اغلاط کی نشاندہی فرماتے رہے۔

آخر میں مولانا احمد علی نے بہ نظرِ استحسان آپ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ''مولانا! یہ جو کچھ آپ مجھے بتارہے ہیں، اس کا تعلق اکتساب سے نہیں، وہب سے ہے۔''

فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی عبدالحیٔ صاحب لکھنؤ سے گنج مرادآباد ایک ایسے راستے سے گئے جس سے نمازِ قصر واجب ہوجاتی ہے لیکن انہوں نے مولانا فضل رحمٰن کو یہ بات نہیں بتائی۔ گنج مرادآباد اور لکھنؤ میں اتنا فاصلہ نہیں ہے کہ نمازِ قصر کی جائے۔ لیکن جب مولوی عبدالحیٔ نے پوری نماز پڑھی تو مولانا نے انہیں روکا اور کہا۔ ''تم حالتِ سفر میں ہو اس لیے نمازِ قصر کرو۔''

مولوی عبدالحیٔ نے جواب دیا۔ ''لیکن مولانا لکھنؤ سے گنج مراد کا فاصلہ اتنا نہیں ہے کہ نمازِ قصر کی جائے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن تم جس راستے سے چل کر یہاں تک پہنچے ہو اس میں نمازِ قصر جائز ہے۔''

مولوی عبدالحیٔ نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر یہ بات آپ کو کس نے بتائی کہ میں کسی دوسرے راستے سے یہاں تک پہنچا ہوں؟''

مولانا خاموش ہوگئے۔ بات ختم ہوگئی۔ بعد میں مولوی عبدالحیٔ نے کہا۔ ''بیشک آپ کو خدا نے کوئی اور ہی علم عطا فرمایا ہے مگر اس بات کی آپ کو کیا خبر کہ میں کس لمبے راستے سے یہاں تک آیا ہوں۔''

مولانا اشرف علی تھانوی (مولف: بہشتی زیور) کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا، گنج مرادآباد پہنچے اور آپ کے در پر

حاضری دی۔ رات کا وقت تھا۔ عشا کی نماز ہو چکی تھی۔ مولانا مسجد سے حجرے میں تشریف لے جا چکے تھے۔ مولانا تھانوی نے وہاں پہنچ کر آپ کے خادم سے کہا۔ ''میں مولانا سے ملنا چاہتا ہوں، براہِ کرم میری ملاقات کرا دیں۔''

خادم واپس آیا تو یہ پیغام لایا۔ ''مولانا نے اسی وقت یاد فرمایا ہے۔''

مولانا تھانوی اسی وقت اندر چلے گئے۔ وہاں ایک چارپائی پر آپ تشریف فرما تھے۔ مولانا تھانوی سامنے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ مولانا فضل رحمٰن نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟''

مولانا تھانوی نے جواب دیا۔ ''طالب علم ہوں، کانپور سے آیا ہوں اور زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔''

مولانا فضل رحمٰن نے فرمایا۔ ''یہ کون سا وقت ہے زیارت کا؟ آدمی کو چاہیے کہ ذرا سویرے آئے تا کہ دوسرا کچھ روٹی وغیرہ کا تو انتظام کر سکے۔ تم ہی بتاؤ میں اس وقت کھانا کہاں سے لاؤں؟ تمہیں خدا کا خوف نہ آیا؟'' مولانا تھانوی چپ چاپ سنتے رہے، کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا فضل رحمٰن نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، ہیں تو سہی۔''

مولانا فضل رحمٰن نے فرمایا۔ ''تب پھر بازار سے کچھ لا کر کھا لو اور صبح واپس چلے جاؤ۔''

مولانا تھانوی نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے۔''

مولانا فضل رحمٰن نے خادم کو آواز دی اور فرمایا۔ ''انہیں سہ دری میں ٹھہرا دو۔''

مولانا تھانوی کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی تھا اور ٹٹو بھی۔ اس سہ دری میں تینوں کا انتظام ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں پھر خادم حاضر ہوا اور کہا۔ ''آپ کو حضرت مولانا یاد فرما رہے ہیں۔''

مولانا تھانوی سمجھے کہ شاید اور ڈانٹ پڑے گی۔ چپ چاپ ان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں ایک تخت بھی بچھا تھا اور تخت کے پاس ایک چٹائی بچھی تھی۔ مولانا تھانوی اس چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مولانا فضل رحمٰن نے فرمایا۔ ''وہاں کہاں بیٹھ گئے؟ تخت پر کیوں نہیں بیٹھے؟'' مولانا تھانوی تخت پر بیٹھ گئے۔

مولانا فضل رحمٰن نے خادم کو حکم دیا۔ ''جا ان کے لیے ہماری بیٹی کے یہاں سے کھانا لے آ۔''

چنانچہ خادم گیا اور ایک پیالے میں سالن اور ارہر کی دال اس طرح لایا کہ روٹیاں بھی اسی پر رکھی تھیں۔ اندر چراغ روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی میں صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مولانا فضل رحمٰن نے خادم کو ڈانٹ دیا۔ ''ارے بدتمیز کہیں کے۔ کہیں اس طرح کھانا لایا جاتا ہے مہمانوں کے لیے۔ روٹی الگ طباق میں لانا تھی، یہ کیا طریقہ ہے روٹیاں لانے کا۔ پیالے پر رکھ کر لا رہا ہے۔''

خادم نے جواب دیا۔ ''طباق کو تلاش کیا جب نہیں ملا تو میں اس طرح لے آیا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو جھوٹ بولتا ہے، فلاں طاق میں دیکھ۔''

خادم بھاگا بھاگا گیا اور اس طاق سے طباق اٹھا لایا اور اس میں کھانا سجا کر پیش کر دیا۔

جب مولانا تھانوی کھانا کھانے لگے تو پوچھا۔ ''کیا ہے کھانے میں؟''

جواب دیا۔ ''روٹیاں اور ارہر کی دال اور سالن۔''

مولانا مسکرائے، فرمایا۔ ''خوب! اچھا ہے کھانا۔'' پھر کچھ دیر بعد فرمایا۔ ''ماشاء اللہ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔''

مولانا تھانوی حیران تھے کہ انہیں کیا معلوم کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔

آپ نے مزید فرمایا۔ ''تم نے مولانا محمد یعقوب سے پڑھا ہے، بہت اچھے آدمی تھے۔''

اب مولانا تھانوی کی حیرت میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ حیران ہوئے کہ انہیں یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں نے مولانا محمد یعقوب سے درس لیا ہے۔

مولانا فضل رحمٰن نے پھر فرمایا۔ ''تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو، یہ جو کچھ تم کھا رہے ہو، بہت اچھا کھانا ہے۔ ذرا صحابہ کے حالات پر تو غور کرو۔ وہ ایک ایک کھجور کھا کر روزے رکھتے تھے اور جہاد بھی کرتے تھے۔'' اس کے بعد صحابہ کی تعریف اتنے جوش و خروش سے کی کہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

اور جوش کے عالم میں صحابہؓ کے فضائل بیان فرماتے رہے۔
مولانا تھانوی کھانا کھا چکے تو آپ نے فرمایا۔ ''اب جاؤ اور عشا پڑھ کر سو رہو۔''
وہ چلے گئے اور صبح فجر کے وقت پھر حاضر ہوئے۔ فجر کی نماز مولانا فضل رحمٰن کے پیچھے پڑھی پھر اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ آفتاب اوپر اٹھا تو آپ نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا۔ ''تم کب جاؤ گے؟''
یہ صاحب اپنی وضع قطع سے کہیں کے رئیس معلوم ہوتے تھے، جواب دیا۔ ''جمعے کی نماز پڑھ کر چلا جاؤں گا۔''
مولانا نے فرمایا۔ ''یہاں جمعہ پڑھ کر کیا کرو گے؟''
ان صاحب نے جواب میں کہا۔ ''پھر میں جمعہ کہاں پڑھوں گا؟''
مولانا نے گرم ہو کر فرمایا۔ ''ہمیں کیا خبر کہ تم جمعہ کہاں پڑھو گے۔ ہم کوئی ٹھیکیدار ہیں تمہارے جمعہ کے۔ لوگوں کو شرم نہیں آتی، منہ پر ڈاڑھی لگا کر پرائے ٹکڑوں پر پڑے رہتے ہیں۔''
وہ صاحب بھی خاصے بے تکلف تھے، انہوں نے کہا۔ ''حضرت! میں نہیں جاتا۔''
مولانا نے کھڑے ہو کر ان صاحب کا شانہ پکڑ لیا اور دھکا دینے کے انداز میں کہا۔ ''نکلو یہاں سے۔'' اور پھر دھکیلتے ہوئے دور تک لے گئے۔
مولانا تھانوی نے دل میں سوچا۔ شاید اب میری باری ہے، انہوں نے کہا۔ ''اچھا مولانا میں چلوں پھر۔''
مولانا فضل رحمٰن نے کہا۔ ''اتنی جلدی؟''
مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ''پھر حاضری دوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''بہتر ہے۔''
اور مولانا فضل رحمٰن مشایعت میں انہیں دور تک چھوڑنے گئے یہاں تک کہ سروری آگئی۔
مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ''مولانا! میرے حق میں دعا کیجیے۔''
جواب دیا۔ ''میں نے تیرے لیے بہت سی دعا کر دی ہے۔''
مولانا تھانوی نے مزید عرض کیا۔ ''کچھ پڑھنے کو بتا دیجیے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''قل ھو اللہ شریف اور سبحان اللہ وبحمدہٖ اور درود سو بار پڑھ لیا کرو۔''
اس کے بعد مولانا فضل رحمٰن، مولانا تھانوی کو دوسروں کے ذریعے سلام کہلا بھیجتے تھے۔
مولانا تھانوی دوسری بار ملاقات کو گئے تو کانپور کے پیڑے اور شربت انار کی بوتل بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ پیڑے اس زمانے میں بنگالی پیڑے کہلاتے تھے۔
مولانا تھانوی نے سوچا کہ مولانا فضل رحمٰن کے دربار میں حاضری دینا اور ٹٹو پر سفر کر کے جانا بے ادبی ہے۔ انہوں نے راستے میں پاپیادہ سفر شروع کر دیا۔ راستے میں ایک بزرگ مل گئے۔ یہ بھی پیدل سفر کر رہے تھے۔ مولانا تھانوی نے پوچھا۔ ''آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟''
ان بزرگ نے جواب دیا۔ ''حضرت مولانا فضل رحمٰن کی خدمت میں۔''
دونوں صاحبان ایک ساتھ گنج مراد آباد میں داخل ہوئے۔ یہ رمضان کا مہینا تھا۔ مولانا نے پہلے ان بزرگ کو طلب کیا اور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''روزہ ہے؟''
ان بزرگ نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، روزہ ہے۔''
آپ نے انہیں ڈانٹ دیا۔ ''تم سے کس نے کہا تھا کہ سفر میں روزہ رکھو۔'' اس کے بعد انہیں اسی وقت رخصت کر دیا گیا۔ اب مولانا تھانوی کی باری تھی۔ آمنا سامنا ہوتے ہی سوال کیا۔ ''روزہ ہے؟''
مولانا تھانوی نے جی کڑا کر کے عرض کیا۔ ''جی ہاں روزہ تو ہے۔''
آپ نے نہایت شفقت سے فرمایا۔ ''خوب! جوان آدمی ہو روزہ ضرور رکھنا چاہیے۔''
کچھ دیر ملاقات رہی، اس کے بعد یہ باہر آگئے اور دوسروں کو حاضری دینے کا موقع ملا۔ باہر آنے والوں کی چیزیں

دیکھ کر مولانا تھانوی کو اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی کیونکہ انہیں نہیں معلوم تھا کہ مولانا فضل رحمٰن کو تسبا کو اور صابن سے بڑی رغبت تھی اور مولانا تھانوی پیڑے اور شربتِ انار لے کر آئے تھے۔

دوسروں نے مولانا فضل رحمٰن کی خدمت میں صابن اور تسبا کو کا ہدیہ پیش کیا تو آپ خاموش رہے اور زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا لیکن جب مولانا تھانوی نے ان کی خدمت میں پیڑے پیش کیے تو آپ نے خوش ہو کر فرمایا۔ ''تم تو بہت ہی اچھی چیز لائے۔ میں تو اس کا شربت پیا کرتا ہوں۔'' پھر خادم سے کہا۔ ''انہیں حفاظت سے رکھ دو۔''

مولانا تھانوی خوش تھے کہ ان کا ہدیہ قبول فرمایا گیا تھا، اس وقت تک مولانا کی خدمت میں شربتِ انار نہیں پیش کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد مولانا فضل رحمٰن نے پوچھا۔ ''تم اپنے ساتھ کوئی دوا بھی لائے ہو؟''

مولانا تھانوی کی سمجھ میں نہ آیا۔ دوسرے وہ شربتِ انار لے تو آئے تھے مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ وہ اس کو خود پئیں گے یا مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ''میں دوا تو کوئی بھی نہیں لایا اپنے ساتھ۔''

کسی نے چپکے سے آپ کے کان میں کہا۔ ''شربتِ انار کی طرف اشارہ ہے آپ کا۔''

مولانا تھانوی نے کہا۔ ''شربتِ انار لایا ہوں اپنے ساتھ۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن وہ تو تم اپنے لیے لائے ہو۔''

مولانا نے جواب دیا۔ ''لیکن اب میں اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔''

مولانا نے اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد مولانا فضل رحمٰن نے مولانا تھانوی پر خصوصی توجہ دی اور انہیں حدیث کا درس بھی دیا۔

ایک دن پوچھا۔ ''تم شوق کا کیا ترجمہ کرو گے؟''

مولانا تھانوی نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں کیا ترجمہ کروں گا، ترجمہ تو آپ ہی خوب کریں گے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''شوق کا ترجمہ ہے، تڑپ۔''

مولانا تھانوی کو اس بار روک لیا گیا اور وہ کئی دن رہ کر واپس گئے۔

☆☆☆

اودھ کا وزیر زیرِ عتاب آ گیا۔ ان دنوں آپ لکھنؤ میں قیام فرما تھے۔ شرف الدولہ نے وزیر سے کہا۔ ''دیکھو، اگر چاہتے ہو کہ کام بن جائے تو مولانا فضل رحمٰن کے پاس چلے جاؤ اور ان سے دعا کے طالب ہو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔''

وزیر نے شرف الدولہ کا سہارا پکڑا اور آپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے مراقبے میں جا کر جو کچھ دیکھا، صاف صاف کہہ دیا، فرمایا۔ ''اودھ کا نواب تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ وہ تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔''

وزیر نے عرض کیا۔ ''حضرت! کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ میں نواب کے پاس جانے میں خوف محسوس کرتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مت ڈرو، اس کے پاس ضرور جاؤ۔''

وزیر ڈرتے ڈرتے نواب کے پاس گیا۔ نواب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے، میں تو تمہارا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ اگر آج بھی نہ آتے تو میں تمہیں بلوا بھیجتا۔'' وزیر کو حیرت تھی کہ یہ کیسا انقلاب ہے۔

اس کے بعد وزیر نے آپ کی خدمت میں دو ہزار روپے پیش کیے، آپ نے فرمایا۔ ''میں یہ روپے لے کر کیا کروں گا؟''

وزیر نے عرض کیا۔ ''پھر جیسا آپ کا حکم ہو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اس رقم کے قرآن پاک چھپوا دو۔'' اور آپ جب دوسری بار لکھنؤ تشریف لے گئے تو انہیں قرآن پاک تیار ملے۔ وزیر نے اونٹ پر رکھوا کر بھیجے۔ ایک گھوڑا ساز و یراق آپ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ انہیں سند یلے کے لیے لے کر روانہ ہو گئے اور راستے بھر انہیں تقسیم فرماتے رہے یہاں تک کہ آخر میں اونٹ اور گھوڑے کی بھی باری آ گئی،

انہیں بھی تقسیم کردیا گیا۔

آپ اتباعِ سنت میں ایک عرصہ گزار کر جب اپنے رب سے ملاقات کے لیے تیار ہوئے تو کسی کو بھی اس کا پتا نہ تھا کہ آپ ان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ مولانا کو زکام اور بخار کا عارضہ لاحق ہوا اس کا علاج شروع کیا گیا مگر مرض میں افاقے کے بجائے شدت پیدا ہوتی رہی۔ پیاس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا، غذا بہت کم ہو گئی تھی۔

7 ربیع الاول کو نمازِ عصر کے بعد آپ نے فرمایا۔ ''کتاب لاؤ۔''

حکیم عظمت حسین کتاب لے آئے اور سبق شروع کر دیا۔ اس کے بعد مولوی عبدالغفار کی باری آئی اور انہوں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریباً تیرہ صفحات پڑھے تھے کہ آپ نے فرمایا۔ ''اچھا بند کرو۔ جاؤ کتاب بند کر کے مسجد میں رکھ آؤ۔''

آپ کے لفظ ''بند کر کے'' پر کسی نے غور نہیں کیا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ یہ سلسلہ آپ موقوف فرما رہے تھے۔ اس کے بعد آپ کی حالت بگڑتی ہی رہی۔

21 ربیع الاول کو تقریباً دو بجے فرمایا۔ ''ہم مر گئے۔ ہمارے جنازے کی نماز پڑھا دو اور اگر کوئی نہ پڑھے تو میں خود پڑھ لیتا ہوں تمام مقتدی کھڑے ہیں۔'' یہ کہہ کر آپ نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے۔

ہر شخص یہ باتیں سن کر گھبرا رہا تھا۔ تقریباً سوا دو بجے فرمایا۔ ''میں حدیث سننا چاہتا ہوں تاکہ حدیث سنتے سنتے میرا دم نکلے۔''

22 ربیع الاول بروز جمعہ تین بجے حاضرین کا مجمع تھا۔ آپ نے آنکھیں کھول کر حاضرین کو دیکھا اور اپنے بیٹے احمد میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے رہے۔

سوا چار بجے نفس میں فرق آ گیا۔ حکیم عظمت حسین نے چہل حدیث پڑھنا شروع کر دی۔ اس کے بعد کتاب الایمان کو بہ آوازِ بلند پڑھا گیا۔ ایک صفحہ بہ مشکل پڑھا گیا اور پھر آخری حدیث پڑھ کر کتاب بند کر دی۔

سوا پانچ بجے ساری تدبیریں چھوڑ دیں۔ مغرب کے بعد اتنی طاقت بھی آپ میں نہیں رہی کہ ہونٹوں کو حرکت ہی دے سکتے۔

آخر لوگوں نے محسوس کیا کہ آپ نے سانس کھینچی ہے۔ یہ اوپر کھینچی جانے والی سانس پھر کبھی نیچے نہیں آئی اور آپ وصال فرما گئے۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ کوئی ورود پڑھنے لگا، کوئی کلمہ۔ رونے کی آواز کہیں سے بھی نہیں آتی تھی کیونکہ آپ نے بہ آوازِ بلند رونے سے منع فرما دیا تھا۔ ہر کسی کے رخسار تر تھے اور آنکھیں تربتر تھیں۔

آپ کو ان کی اپنی مسجد کے چبوترے پر لایا گیا۔ بیرونِ مسجد قبر تیار کی گئی۔ وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ احمد میاں نے پڑھائی۔ ساڑھے نو بجے قبر درست کی گئی اور آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

کئی دن تک آنے والوں نے اہلِ خانہ اور پسماندگان سے تعزیت کی اور دلاسے دیتے رہے۔ غلہ اور کھانا تقسیم کیا جاتا رہا۔

27 ربیع الاول کو راجا محمد ممتاز علی خاں صاحب بہادر والی ریاست اتر ولہ گنج مراد آباد پہنچے اور اعلان کر دیا کہ جس جس کا جس قدر روپیا قرض ہو ہم ادا کریں گے۔ اس اعلان کے بعد دس ہزار چار سو روپیا یکمشت ادا کیا گیا۔

اس دوران کسی نے راجا صاحب سے کہا۔ ''حساب کتاب دیکھ کر قرض ادا کیا جائے تو بہتر ہے۔''

راجا صاحب نے فرمایا۔ ''ہمارے حضرت حساب کتاب کر کے نہ لیتے تھے پس ہم بھی اس طرح نہ دیں گے۔ ہم روپیا مزار شریف پر رکھ دیتے ہیں جس کا جتنا ہو اٹھا لے جائے۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دامے درمے ایک ایک کوڑی تک باقی نہ رہی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

ماخذات

ارشادِ رحمانی، سید محمد علی مونگیری۔ فضلِ رحمانی، سید تجمل حسین۔

ہدیۂ عشاق، مولوی عبدالغنام۔ مولانا فضل رحمٰن، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

میں اس وقت اپنے دوست انسپکٹر انور خان کے ساتھ تھانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دو پولیس والے ایک آدمی کو تقریباً دھکے دیتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔

وہ آدمی تیس یا پینتیس کے درمیان کا اکہرے جسم کا تھا۔ جس کے چہرے ہی سے مظلومیت ظاہر ہو رہی تھی۔

''صاحب جی، اس بندے نے ایک بیکری سے ڈبل روٹی چرائی ہے۔'' ایک پولیس والے نے بتایا۔

''کس نے پکڑا ہے اس کو؟''

''صاحب جی اس کو بیکری والا پکڑ کر لایا ہے اور اس کے ساتھ دو بندے بھی ہیں۔''

''ان کو بھی اندر بلالو۔'' ایک پولیس والا ان بندوں کو بلانے چلا گیا۔

کچھ دیر میں وہ ان تینوں کو لے کر آ گیا۔ بیکری کا مالک ایک ابھری ہوئی ناک اور نکلی ہوئی توند کا مالک تھا۔

''ہاں جی، کیا واقعہ ہوا تھا؟'' انور خان نے پوچھا۔

''صاحب یہ بندہ دکان میں داخل ہوا۔'' بیکری والا تفصیل بتانے لگا۔ ''اس وقت میں کسی اور طرف متوجہ تھا۔ اس نے جھٹ سے ڈبل روٹی بغل میں دبائی اور باہر بھاگنے لگا پھر میں نے اپنے آدمی دوڑائے۔ انہوں نے اسے فوراً پکڑ لیا اور ہم اسے آپ کے پاس لے آئے ہیں۔''

''دیکھا تم نے۔'' انور خان مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم اسے چھوٹا جرم مت سمجھو، یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ سمجھو کہ یہ

بے حسی کے سمندر میں احساسات کا کنکر پھینکنے والے شخص کی کاوش

داستان گونگوں کی

منظر امام

فرقوں اور طبقوں میں بٹنے والی قومیں کبھی مرکزی اتحاد ویگانگت کی لذتوں سے آشنا نہیں ہوسکتیں۔ یہی بات ایک بے زبان انسان سمجھانے کی کوشش میں تمام عمر مصروف رہا مگر کوئی اس کے گونگے راز کو نہ سمجھ سکا۔



اس جرم کی ابتدا ہے۔ جو شخص ایک دفعہ قانون توڑتا ہے تو تم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ اور کیا کچھ نہیں کرتا ہوگا۔''

''صاحب جی! یہ تو کچھ بولتا ہی نہیں ہے۔'' بیکری کے مالک نے کہا۔

''تم فکر نہ کرو پولیس پتھر کو بھی بولنا سکھا دیتی ہے۔'' انور خان اس آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اوئے کیا نام ہے تیرا۔ سچ سچ بتانا ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا۔''

''آں...... اوں......'' اس آدمی نے اپنا منہ کھول کر غوں غاں شروع کر دی۔

''صاحب جی، یہ تو گونگا ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''تو کیا ہوا، کیا گونگوں کے لیے چوری کرنا جائز ہے؟''

''نہیں جرم تو پھر جرم ہے چاہے کوئی بھی کرے۔'' اس وقت ایک پولیس والے نے مداخلت کی۔ ''صاحب جی یہ اپنے ایس ایس پی صاحب کا خاص ملازم ہے۔ میں نے اس کو کئی بار وہاں دیکھا ہے۔''

''اچھا۔'' انور خان بوکھلا سا گیا اور صورتِ حال... مکمل طور پر تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے بیکری کے مالک کو دیکھا۔ ''اوئے شرم نہیں آتی۔ ایک بے چارے گونگے کو پکڑ کر لے آئے ہو۔ اس نے صرف ڈبل روٹی ہی چرائی ہے تمہاری دولت پر تو ہاتھ صاف نہیں کیا ہے۔ خود تو کھا کھا کر توند باہر نکال لی ہے اور دوسرے کو ایک ڈبل روٹی سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہو۔''

بیکری والا اس ناگہانی افتاد سے بوکھلا گیا۔ ''صاحب مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کون ہے؟''

''ابھی لاک اپ میں بند کروا دوں گا تو سب پتا چل جائے گا۔''

''مجھے معاف کر دیں۔ میں نے غلطی سے اس پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔''

''یہ غلطی نہیں، جرم ہے۔'' انور خان غرایا۔ ''ایک معصوم پر الزام لگاتے ہو۔'' پھر اس گونگے کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

گونگا جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ انور خان نے ایک سپاہی کی طرف دیکھا۔ ''اوئے سوچ کیا رہے ہو؟ جاؤ جلدی سے بے چارے کے لیے چائے اور بسکٹ لے آؤ اور بسکٹ خستہ ہونے چاہئیں۔''

''جی صاحب۔''

اچانک ہی ایک سپاہی بول پڑا۔ ''نہ جی نہ...... یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

''اوئے کیا نہیں ہو سکتا؟''

''یہ بندہ ایس ایس پی صاحب کا خاص ملازم نہیں ہے جی۔ اس کو تو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ تو کوئی اٹھائی گیرا لگتا ہے۔''

انور خان کے تاثرات پھر تبدیل ہو گئے۔ اس نے ہنکارا ابھرا۔ ''تب ہی میں کہوں کہ یہ کم بخت صورت سے چور کیوں دکھائی دے رہا ہے، اوئے کھڑا ہو جا۔'' اس نے گونگے سے کہا۔ گونگا اس کا اشارہ سمجھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ''اوئے یہ لوگ اسی طرح دھوکا دیتے ہیں۔'' انور خان نے کہا۔ ''میں نے تو پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ یہ چور ہے اور چوری کرنا سیکھ رہا ہے۔ ابھی ایک شریف آدمی کی ڈبل روٹی چرائی ہے کل کچھ اور چرا لے گا۔ عادی مجرم اسی طرح تو بنتے ہیں۔ بھائی تم تو بیٹھ جاؤ، تم کیوں کھڑے ہو؟'' یہ جملہ اس نے بیکری والے سے کہا تھا۔ بیکری والا جلدی سے اس کرسی پر بیٹھ گیا جس کو گونگے نے خالی کیا تھا۔ میں انور خان کے بدلتے ہوئے پینترے دیکھ رہا تھا۔

''انور خان۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''اس بے چارے نے تو خود کو کسی ایس ایس پی کا ملازم ظاہر نہیں کیا تھا۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی شکل و صورت سے ہمارے بندوں کو دھوکا تو دیا ہے نا؟'' اس دوران میں چائے اور بسکٹ آ گئے تھے۔ انور خان نے دونوں چیزیں بیکری والے کی طرف بڑھا دیں۔ ''یہ لیں جی، آپ شریف آدمی ہیں۔ آپ کو بہت پریشانی ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' بیکری والے نے جلدی سے بسکٹوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

''صاحب میں شرط لگا سکتا ہوں۔'' پہلے والے سپاہی نے کہا۔ ''یہ وہی ہے، ایس ایس پی صاحب کا ملازم۔''

''ذرا دھیان سے بتاؤ۔''

''دھیان سے ہی بتا رہا ہوں صاحب۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں جو اتنی بڑی بات بغیر کسی دعوے کے کہہ دوں۔''

''اچھا۔'' انور خان ایک بار پھر شپٹا گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ پھر اس نے بیکری والے کی طرف دیکھا جو بسکٹ ختم کر چکا تھا اور کپ کی چائے بھی آدھی ہو گئی تھی۔

''دیکھو بھائی۔'' اس نے بیکری والے سے کہا۔ ''ایک تو تم لوگ الٹے سیدھے کیس لے کر ہمارے پاس آ جاتے ہو کہ ڈبل روٹی چرا لی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کھانے کی چیز تھی

اٹھا کر لے گیا۔ بعد میں وہ پیسے لا کر دے دیتا کوئی بھاگا تو نہیں جا رہا تھا۔ اتنے بڑے صاحب کا ملازم ایسی حرکت تو نہیں کرے گا نا۔"

بیکری والے نے جلدی سے چائے نیچے رکھ دی۔ انور خان نے گونگے کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی ساتھ والی کرسی پر بٹھالیا۔ پھر اس نے سپاہی کو آرڈر دیا۔ "جاؤ جلدی سے ان کے لیے دوسری چائے لے کر آؤ پہلی والی چائے تو یہ پی گئے۔ ان لوگوں کے تو پیٹ ہی نہیں بھرتے۔ غریبوں کا خون چوس چوس کر یہ حال ہوگیا ہے۔"

"دیکھیں جناب، یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" بیکری والے نے بوکھلا کر احتجاج کیا۔

"زیادتی تو اب ہوگی۔" انور خان غرایا۔ "الزام لگانے سے پہلے سامنے والے کی حیثیت دیکھ لینی چاہیے۔"

"صاحب......" ایک دوسرے سپاہی نے مداخلت کی۔ "جس طرح فتح محمد شرط لگا رہا ہے تو اسی طرح میں بھی لگاتا ہوں کہ اس بندے کا ایس ایس پی صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو صورت ہی سے چور دکھائی دے رہا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" انور خان نے اپنی گردن ہلائی۔ "لگتا تو چور ہی ہے۔"

"بس کرو انور خان۔" اب میں بول پڑا۔ "مجھ سے اب مزید برداشت نہیں ہوگا۔ کب تک یہ ڈراما چلتا رہے گا۔ یہ ایس ایس پی صاحب کا ملازم ہو یا نہ ہو اس نے چوری ضرور کی ہے اور دوسری بات یہ کہ اس نے کیا چرایا ہے۔ صرف ایک ڈبل روٹی...... ہوسکتا ہے کہ اس کے بچے بھوکے ہوں۔ تم لوگ لاکھوں کروڑوں چرانے والوں کو تو چھوڑ دیتے ہو لیکن ایک غریب کو ڈبل روٹی کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ چلو ٹھیک ہے...... اب اس بدنصیب کو لاک اپ میں ڈال دو اور کیس کردو اس پر۔"

"نہیں یار۔ اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔" میری تقریر سن کر انور خان کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔ "اب ہم لوگ اتنے بھی بے رحم نہیں ہوتے۔" پھر اس نے بیکری والے کی طرف دیکھا۔ "تمہیں ڈبل روٹی تو واپس مل گئی ہے نا۔"

"جی صاحب، وہ تو اسی وقت مل گئی تھی۔"

"تو پھر جانے دو اس کو۔"

"جی صاحب، جانے دیں بے چارے کو۔" بیکری والے نے اپنی جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر گونگے کی طرف بڑھایا۔ "او یہ رکھ لو اور میری طرف سے گھر والوں کے لیے کچھ لے جانا۔"

گونگے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے سو کا نوٹ بیکری والے سے لے لیا۔ پھر انور خان نے بھی پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ میری طرف سے لے جا۔"

گونگا بہت حیران ہو رہا تھا کہ انور خان نے اسے جانے کی اجازت جو دے دی تھی۔ وہ انور خان اور کمرے میں موجود لوگوں کو ادب سے سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کمرے کی فضا پر ایک سوگوار سی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔

"یہ سب آخر کب تک ہوتا رہے گا؟" انور خان نے کہا۔ "دن بھر میں اس قسم کے نہ جانے کتنے لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ کسی کے ساتھ سختی کرتا ہوں تو کسی کے ساتھ نرمی لیکن دل بھی روتا رہتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ مجرم بنتے جا رہے ہیں۔"

"یہ پوری قوم کا المیہ ہے یار۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پورے ماحول میں سوگواریت سی چھا گئی تھی۔

ہم بہت دیر تک اس صورتِ حال پر باتیں کرتے رہے پھر میں تھانے سے نکل آیا۔

میرا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا کہ اچانک وہی گونگا کسی طرف سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ "جناب، میری بات سنیں۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"کیا......!" میں بری طرح چونک گیا تھا۔ "تم تو بول سکتے ہو۔"

"جی جناب، میں بول سکتا ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں گونگا نہیں ہوں۔ وہ تو میں اپنی جان بچانے کے لیے گونگا بن گیا تھا۔"

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔" مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ "تو تم چور ہونے کے ساتھ ساتھ دھوکے باز بھی ہو۔"

"نہ تو میں چور ہوں اور نہ ہی دھوکے باز۔" اس نے کہا۔ "میں تو ایک علامت ہوں۔"

"کیسی علامت!"

"تمہارے معاشرتی رویّے کی جو بے حس ہوچکی ہے جہاں ایس ایس پی صاحب کے ملازم کی تو آؤ بھگت کی جاتی ہے لیکن اسی قسم کے دوسرے مجرم کو سزا دی جاتی ہے۔ جہاں لوگ ایک روٹی کے لیے چوری کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔"

ایک لمحے میں اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا اب وہ کسی دل جلے دانش ور کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

"یار تم تو پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں پڑھا لکھا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "اور میں بی ایس ایس پی صاحب کا ملازم ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟"

"میں بے روزگار تھا۔ ہر جگہ سفارش اور رشوت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا ہے اور یہ میرے بس کی بات نہیں تھی اسی لیے میں نے سوچا کہ میں خودکشی کر لوں۔ تم نے اس قسم کی خبریں تو پڑھی ہوں گی کہ فلاں بے روزگار نے خودکشی کر لی یا فلاں نے غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر جرائم کی راہ اختیار کر لی۔ میں نے بھی یہی سوچا کہ میں جرم تو نہیں کر سکتا...... کیوں نہ خودکشی کر لی جائے۔"

"میں تمہاری پوری کہانی سننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ہم کسی ہوٹل میں بیٹھ کر سکون سے بات کریں گے۔"

پھر ہم ایک ہوٹل میں آ گئے جہاں اس نے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔ "وہ عام سا ہوٹل تھا۔ ایک آدمی میرے سامنے بیٹھا ہوا بہت غور سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ 'خیر تو ہے بھائی تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو؟'

زندگی میں پہلی بار کسی نے میری پریشانی کا اندازہ کر کے مجھ سے خیریت معلوم کی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے کہا کہ میں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے۔

"نہیں تم خودکشی نہ کرو۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے صاحب کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ انہیں ایک ملازم کی ضرورت ہے جو بے ضرر قسم کا ہو اور زبان نہ چلائے۔"

"اگر ایسا ہے تو یہ سمجھ لو کہ میں ایک گونگا انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج کے بعد سے میں ایک لفظ بھی نہیں بولوں گا۔"

"تو یہ ہے تمہارے گونگے ہونے کی کہانی؟"

"ہاں، مجھے ایس ایس پی صاحب کے یہاں نوکری مل گئی۔" اس نے بتایا۔ "تم میری صورت تو دیکھ ہی رہے ہو۔ میں دیکھنے سے ہی مظلوم معلوم ہوتا ہوں۔ گونگے ہونے کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ میں ان لوگوں کے الٹے سیدھے سوالوں سے بچ گیا۔ اپنا کام پوری محنت کے ساتھ کرتا رہا لیکن کچھ دن بعد میں نے اس گھر میں ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ یہ ایک شرمناک سی بات تھی کہ بیگم صاحبہ صاحب کے ایک دوست کے ساتھ مصروف تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر سب کو بتا دوں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے لیکن میں تو گونگا تھا۔

"پھر جب اس آدمی سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے اس گھر میں بھیجا تھا تو میں نے اسے ساری صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا۔ 'یار ایسی باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ ہماری کچھ قدریں ہیں اس لیے جی چاہتا ہے کہ صاحب کو سب کچھ بتا دوں۔'

'نہیں ایسا مت کرنا۔' اس آدمی نے کہا۔ 'جانتے ہو یہی سب کچھ میں نے بھی دیکھا تھا اور خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا اور میں نے صاحب کو جا کر بتایا تو مجھے مار پیٹ کر اس گھر سے نکال دیا گیا۔ تم اس بات پر شکر ادا کرو کہ تم گونگے ہو ورنہ تمہارا بھی وہی حال ہوتا جو میرا ہوا تھا۔ اس لیے...... گونگے ہونے میں بڑی عافیت ہے۔'

"بس بھائی اس دن کے بعد سے میں مستقل گونگا ہو گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو۔ میں کون ہوتا ہوں آواز اٹھانے والا۔ جب یہ معاشرہ ہی گونگا ہے اور اس سے کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"لیکن اس کے بعد میں نے وہاں سے جاب چھوڑ دی کیونکہ وہ خطرے کی جاب تھی لیکن گونگا پن نہیں چھوڑا اور آج بھوک سے بے قابو ہو کر میں نے ڈبل روٹی چرا لی۔ پولیس والے تو مجھے بہت مارتے لیکن میرے گونگے پن نے مجھے بچا لیا۔"

"عجیب کہانی ہے تمہاری...... ویسے کب تک گونگا رہنے کا ارادہ ہے؟"

"جب تک اس معاشرے کو زبان نہیں مل جاتی۔" اس نے کہا۔ "یہاں انور خان جیسے لوگ ذرا ذرا سی دیر میں اپنا رویہ بدل لیتے ہیں۔ اس لیے شاید میں ہمیشہ گونگا ہی رہوں کیونکہ اس میں ہی عافیت ہے۔"

وہ مرد دانا مجھے ایک راستہ بتا کر چلا گیا۔

میں اب اس کے مشورے پر عمل کرنے لگا ہوں۔ میں خود بھی گونگا ہوں اور یقین مانیں جب سے گونگا ہوا ہوں، بہت عافیت سے ہوں۔ اپنے اردگرد بہت کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں لیکن خاموش رہتا ہوں۔ مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اسی گونگے پن نے ایک دفعہ میری جان بھی بچائی تھی۔ ایک دفعہ راستے میں کچھ لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سب مجھے مارنے کے چکر میں تھے۔ جن کا تعلق مختلف فرقوں سے تھا اور ہر فرقہ مجھے دوسرے سے وابستہ کر رہا تھا اور اسی لسانی نفرت کی بنیاد پر ہر شخص میری جان کا دشمن بنا ہوا تھا پھر مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کون ہوں اور میرا تعلق کس فرقے سے ہے مگر...... میں تو گونگا تھا، میری کوئی زبان نہیں تھی کیونکہ اس ملک میں جس کی کوئی زبان نہ ہو اسے چھوڑ دیا جاتا ہے...... اسی لیے مجھے بھی چھوڑ دیا گیا۔

ہاٹ

سلیم انور

جرم کی دنیا میں اکثر حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔ شاید جتنی ذہانت لوگوں نے مجرمانہ فعل پر صرف کی ہے اگر مثبت پہلو پر صرف کی جاتی تو یقیناً یہ دنیا جنت کا نمونہ ضرور بن جاتی... اس ذہانت کی پوٹلی پر بنی یہ انکشاف تو ہوا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

مختصری دولت کے حصول کی خاطر قیمتی جان دینے والے لٹیرے کا قصہ

کارل پولیس والوں کو پسند نہیں کرتا تھا اسی لیے وہ اس کمرے میں بیٹھا نروس ہو رہا تھا جو پولیس والوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک کہ اسٹوریج لاکر کی چابی اسے واپس نہیں مل جاتی۔ وہ ہر قیمت پر اسٹوریج لاکر کی چابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنی نشست پر بے چینی سے پہلو بدلا اور اپنی توجہ ان آئٹمز کی فہرست پر مرکوز کر دی جو نیلام ہونے



تھے۔ وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ کئی نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں لیکن وہ کسی صورت فہرست پر سے نظریں ہٹا کر ان درجن بھر پولیس والوں میں سے کسی ایک سے بھی نظریں نہیں ملانا چاہتا تھا جو اس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

یقیناً اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ خلافِ عقل یہ سب کچھ سوچ رہا ہے۔ اس لیے کہ بوسٹن کی پولیس کو اس کے بارے میں معلومات ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یقیناً وہاں نیویارک کی پولیس اس کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی لیکن وہ کئی ماہ قبل وہاں پر ایک بکتر بند گاڑی کو لوٹنے کے بعد نیویارک چھوڑ چکا تھا۔ اس واردات میں اس کا ساتھی شیفرڈ بھی شامل تھا اور کاروباری لحاظ سے اسے امید افزا کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

ڈکیتی کی اس واردات میں ان کے ہاتھ تیس لاکھ ڈالرز کی رقم لگی تھی جو کہ ان کی توقع سے دگنی رقم تھی اور اب یہ رقم ایزی ریٹلو کے اسٹوریج لاکر میں محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ پروگرام کے مطابق معاملہ سرد ہوجانے تک یہ رقم اسٹوریج لاکر میں مزید چند ماہ تک رکھی رہنی تھی۔

لیکن شیفرڈ نے ان کے سارے منصوبے کا ستیاناس کر دیا تھا۔ کارل نے دل ہی دل میں شیفرڈ، اس کے ماں باپ اور اس کے ان تمام رشتے داروں کو کوسنا شروع کر دیا جن کے بارے میں وہ سوچ سکتا تھا۔ لاکر میں تیس لاکھ ڈالرز کی رقم ان کی منتظر تھی اور اس شیفرڈ کے بچے نے آدھا پاؤنڈ ہیروئن کی لالچ میں خود کو گرفتار کروالیا تھا۔ اور اب شیفرڈ جیل میں بند اپنے مقدمے کی سماعت کا انتظار کر رہا تھا۔ میساچیوسٹس کے ڈرگ قانون کے مطابق اس کی تمام جائداد ضبط ہوگئی تھی۔ شیفرڈ کے پاس اپنی جائداد کے بچاؤ کی جنگ لڑنے کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس اس بات کی وضاحت کا کوئی راستہ تھا کہ آرٹ کے وہ قیمتی نمونے اس کے اپارٹمنٹ میں کیوں موجود تھے۔

گزشتہ کئی برسوں کے دوران میں وہ دونوں نیویارک اور نیوجرسی میں مل کر درجن بھر سے زائد کامیاب وارداتیں کر چکے تھے۔ پھر شیفرڈ بوسٹن منتقل ہوگیا تھا۔ شیفرڈ اپنے حصے کی رقم کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ آرٹ کے قیمتی نمونوں کی خریداری میں لگا دیا کرتا تھا۔ وہ کارل سے کہا کرتا تھا کہ اسٹاکس کی خریداری کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر سرمایہ کاری ہے۔ اس کے علاوہ اس کاروباری لین دین میں ٹیکس والوں یا کسی اور ادارے کی نگرانی کا ڈر بھی نہیں ہوتا۔

شاید یہ ایک بہتر سرمایہ کاری ہوتی اگر آپ نے کوئی احمقانہ حرکت نہ کی ہوتی اور منشیات بانٹتے ہوئے پکڑے نہ جاتے۔ لیکن جب آپ پکڑ لیے جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ آپ کے آرٹ کے قیمتی کلیکشن کی نیلامی ہو رہی ہے۔ جیسا کہ اس وقت شیفرڈ کے آرٹ کے قیمتی کلیکشن کی نیلامی ہونے جا رہی تھی۔

ایزی ریٹلو کے جس اسٹوریج لاکر میں ڈکیتی کی تیس لاکھ ڈالرز کی رقم رکھی ہوئی تھی، اس کی چابی ہنگری کے آرٹسٹ زولوسکی کی مشہور پینٹنگز میں سے ایک پینٹنگ کے فریم کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس پینٹنگ کا عنوان ''دی سانگ برڈ'' تھا۔

کارل کی نگاہ میں اس پینٹنگ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ جیسے کسی پانچ سال کے بچے نے کریون کی مدد سے چڑیا بنانے کی کوشش کی ہو۔ وہ پینٹنگ جزائر کیریبی میں پائی جانے والی زرد رنگ کی چھوٹی چہچہاتی چڑیا کی تھی جسے اس کے وطن کے حوالے سے کیری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

نیلامی کی فہرست کے مطابق اس پینٹنگ کی قیمت دو ہزار ڈالرز رکھی گئی تھی۔ عام حالات میں وہ اس پینٹنگ کے پچاس سینٹ بھی دینا گوارا نہ کرتا۔ لیکن اس وقت وہ اپنی جیب میں پانچ ہزار ڈالرز کی نقد رقم لیے نیلامی کی بولی دینے کے لیے یہاں موجود تھا اور اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اگر اسے یہ تمام کی تمام رقم ادا کرنے کی ضرورت بھی پیش آئی تو وہ کسی قسم کی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گا۔

جب زولوسکی کی دیگر پینٹنگز نیلام ہونا شروع ہوئیں تو کارل نے قدرے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ اپنی سرکاری بولی سے کم قیمت پر فروخت ہو رہی تھیں۔

کمرے میں درجن بھر پولیس والوں کے علاوہ لگ بھگ چالیس دیگر افراد موجود تھے۔ وہ تمام کے تمام کم سے کم قیمت میں ان پینٹنگز کو خریدنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کارل دل ہی دل میں یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ اگر شیفرڈ یہاں موجود ہوتا تو یہ دیکھ کر کتنا آگ بگولا ہوتا کہ اس کی مستقبل کے لیے پس انداز کی ہوئی پونجی کس معمولی قیمت پر جا رہی ہے۔ وہ دونوں خود کو چھکے باز تصور کرتے تھے اور یہاں ڈالرز کے عوض انہیں چینی ہی مل رہی تھی۔

جب ''دی سانگ برڈ'' نامی پینٹنگ کی بولی کا آغاز ہوا تو کارل نے یہ سوچتے ہوئے کہ اتنی بولی تو کوئی نہیں لگائے گا، فوراً ہی دو ہزار ڈالرز کی آواز بلند کردی جو اس پینٹنگ کی سرکاری بولی تھی۔ ابھی تک کسی نے بھی کسی بھی

پینٹنگ کی اتنی بولی نہیں لگائی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب کوئی بھی اس سے بڑھ کر بولی کی آواز بلند نہیں کرے گا اور یہ پینٹنگ اس کی ہوجائے گی۔

وہ پینٹنگ کی قیمت ادا کرنے کے ارادے سے ابھی اٹھنا چاہ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں اپنے عقب کی جانب سے ڈھائی ہزار ڈالرز بولی کی آواز سنائی دی۔

کارل نے فوراً ہی پلٹ کر بولی لگانے والے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص تھا جس کی ڈاڑھی چگی نما اور مونچھیں باریک پنسل کی لکیر کے مانند تھیں۔ اس کی ٹھوڑی کی نوک چگی ڈاڑھی میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر ایک سستا سا سوٹ دکھائی دے رہا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں چھپانے کے لیے چھوٹی بیضوی دھوپ کے شیشوں والی عینک پہنی ہوئی تھی۔

کارل کو وہ شخص انتہائی ناپسندیدہ لگا۔ کارل نے گلا کھنکھارتے ہوئے بولی بڑھا دی۔ ''چھبیس سو ڈالرز!''

''تین ہزار!'' اس دراز قامت نے فوراً ہی آواز لگا دی۔

کارل کو اس شخص کی آواز میں اس چڑیا کی چہچہاہٹ سی محسوس ہوئی جس کی پینٹنگ پر وہ دونوں بولی لگا رہے تھے۔

کارل پلٹ کر اس شخص کو گھورنے لگا۔ یہ کوئی پاگل شخص ہے جو اسے بولی میں مات دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کارل نے سوچا۔

''چار ہزار نو سو ڈالرز۔'' کارل نے پورا زور لگانا چاہا تو اس کے حلق سے ایک بھونڈی سی آواز بلند ہو کر رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کی زیادہ بولی پر یہ کھیل ختم ہوجائے گا اور وہ اس شخص کو اس مقابلے میں ناک آؤٹ کرکے اس پینٹنگ کو حاصل کرلے گا۔ اس کے علاوہ کمرے میں موجود ان تمام پولیس والوں کی وجہ سے وہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔

کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی۔ کارل نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''دس ہزار ڈالرز۔'' اس کے عقب سے وہی چہچہاہٹ بلند ہوئی۔

کارل کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے احساس ہوگیا کہ اس شخص کو یقیناً لاکر کی چابی کی خبرگیری کی جاچکی ہے۔ ورنہ کوئی اور وجہ نہیں ہوسکتی کہ وہ شخص اس فضول سی پینٹنگ کی غیرضروری اتنی اونچی بولی لگائے۔

بہرحال ''دی سانگ برڈ'' کی بولی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ نیلامی میں ادائیگی کی شرط نقد کی صورت میں تھی۔ یوں بھی کارل پانچ ہزار ڈالرز سے زیادہ بولی نہیں لگا سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس اس سے زیادہ نقد رقم موجود نہیں تھی۔

کارل تیزی سے عمارت کے خارجی دروازے کی جانب چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس کم بخت چڑیا کی پینٹنگ کو فریب کے بغیر حاصل نہ کرسکا تو پھر اسے کسی اور طریقے سے حاصل کرکے رہے گا۔

عمارت سے باہر نکلتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے عقبی پارکنگ لاٹ کی جانب چل دیا۔ روزمرہ پیزا کے ساتھ چھ پیک بیئر نے اس کے جسم کو کسی غبارے کے مانند پھلا دیا تھا۔ اس کا قد صرف پانچ فٹ سات انچ تھا اور وزن بھاری بھرکم۔ اس کے جسم کا گوشت سخت کمپریسڈ ربر سے مطابقت رکھتا تھا جس کی بنا پر اسے ''باؤلنگ بال'' کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ اسے اپنے اس نک نیم سے چڑ تھی۔

جب وہ اپنی کار تک پہنچا تو اس کی قمیص پسینے میں تر

ہو رہی تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی سانسوں کی رفتار پر قابو پالیا اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار کے گلوو کمپارٹمنٹ میں سے فورٹی فائیو کیلیبر کا پستول اٹھایا، ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے میگزین کو باہر نکالا اور اسے چیک کرنے لگا۔

میگزین لوڈ تھا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ میگزین کو واپس اپنی جگہ پر فٹ کر دیا اور ایک راؤنڈ کو چیمبر کرلیا۔ پھر اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور اس کا رخ اس طرح پھیر لیا کہ پارکنگ لاٹ اس کی نگاہ میں رہے۔

اس چگی ڈاڑھی والے دبلے پتلے دراز قامت کو باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ پارکنگ لاٹ میں داخل ہوا تو پینٹنگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ کارل غور سے دیکھتا رہا کہ وہ کس کار میں سوار ہو رہا ہے۔ پھر جب وہ کار پارکنگ لاٹ سے نکلی تو کارل نے محتاط فاصلے سے اس کا پیچھا شروع کر دیا تاکہ اس شخص کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

کارل سورج کی تیز روشنی میں بار بار آنکھیں میچ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے جس سے اس کے چہرے کے نقوش بگڑ سے گئے تھے۔ اسے یہ سیٹ اپ پسند نہیں آرہا تھا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ تعاقب کے اختتام پر وہ شخص لازمی طور پر اسے پہچان لے گا۔ لیکن اس کے علاوہ اس کے پاس اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو رقم ہاتھ آتے ہی وہ جتنی تیزی سے ممکن ہو اس شہر سے نکل جائے یا اس شخص کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔ وہ آج تک بھی اپنی دوسری چوائس کی حد تک نہیں گیا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس نے اگلی کار کو ایک اپارٹمنٹ کمپلیکس میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی اس کار کے پیچھے اس کمپلیکس میں داخل ہو گیا اور اپنی کار اس شخص کی کار کے برابر میں لے جا کر روک دی۔ اس وقت وہ شخص اپنی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

کارل نے پھرتی دکھائی اور اچھل کر اپنی کار سے باہر آگیا۔ ساتھ ہی اپنے پستول کی نال اس شخص کی پیٹھ میں گاڑ دی۔

''میں یہ چڑیا کی پینٹنگ لے رہا ہوں اور تم پلٹ کر دیکھنے کی کوشش مت کرنا۔''

اس شخص نے پینٹنگ دینے میں قدرے مزاحمت کی لیکن کارل نے اس کے ہاتھ سے پینٹنگ چھین لی۔

''کسی نے تمہیں مخبری کر دی تھی، ہے نا؟'' کارل نے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''کسی نے تمہیں چابی کے بارے میں بتا دیا تھا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی جو تم نے اس فضول ناکارہ شے کے لیے دس ہزار ڈالرز کی بولی لگا دی۔''

''نہیں۔ یہ زولوسکی کی نادر پینٹنگ ہے۔ درحقیقت یہ اس کے جنگی قیدی کے دور کی نایاب پینٹنگ ہے اور اس سے میرا زولوسکی کی پینٹنگز کا کلیکشن مکمل ہو جائے گا۔''

''شٹ اپ!'' کارل نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس کا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا اس لیے وہ ہچکچا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس نے سوچا کہ رقم ہاتھ میں آتے ہی یہاں سے بھاگ نکلنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

''اب زمین پر لیٹ جاؤ اور اپنا سر فٹ پاتھ کی سطح سے لگا دو۔ اگر تم نے سر اٹھا کر دیکھا تو پھر تم ایک لاش ہو گے۔''

چگی ڈاڑھی والے شخص نے خود کو محتاط انداز میں فٹ پاتھ پر جھکا دیا اور اپنا سر فٹ پاتھ کے ہم سطح کر دیا۔

کارل لپک کر اپنی کار میں سوار ہو گیا اور تیزی کے ساتھ کار ڈرائیو کرتے ہوئے کمپلیکس سے نکل آیا۔ اس کا پسینا فراوانی سے بہہ رہا تھا اور اسٹیئرنگ وہیل کو مضبوطی سے تھامنے کے باوجود اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے جسم میں ایک ہیجانی سی کیفیت طاری تھی۔ ''جھوٹا، کتیا کا بچہ!'' وہ خود سے شکایتی لہجے میں بڑبڑایا۔ ''وہ کمبخت رقم کے بارے میں باخبر تھا۔ ورنہ کوئی صورت نہیں کہ وہ اس مکروہ چڑیا کی تصویر کے لیے دس ہزار ڈالرز ادا کرتا۔ مجھے اس کی کھوپڑی میں گولی اتار دینی چاہیے تھی۔''

کارل نے ایک شارپ ٹرن لیا اور کار کو اس عمارت کے راستے پر ڈال دیا جہاں انہوں نے وہ لاکر کرائے پر حاصل کیا تھا جس میں تیس لاکھ ڈالرز کی رقم چھپائی تھی۔

اس کی شکایتی خود کلامی اب بھی جاری تھی۔ ''شیفرڈ نے یقیناً اس احمق کے ساتھ کوئی ڈیل کی ہوگی۔ بلاشبہ وہ کتیا کا بچہ مجھے نظرانداز کر دینا چاہتا تھا۔'' یہ سوچتے ہوئے کارل کی برافروختگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ''ہم نے واردات مل کر کی تھی اور وہ مجھے چکما دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اسے

کسی صورت اس رقم میں سے ایک دھیلا بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔''

کارل نے ایزی ریٹیل بلڈنگ سے ایک بلاک کے فاصلے پر کار ایک پارکنگ اسپاٹ پر روک دی۔ اس نے ایک جیبی چاقو کی مدد سے پینٹنگ کے عقبی کینوس کو چاک کر دیا۔ اسے وہاں چابی کی موجودگی کی توقع تھی لیکن چابی کے بجائے وہاں اسے دو چھوٹے الیکٹرانک آبجیکٹ دکھائی دیے۔

پہلے آبجیکٹ کو اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ آواز ریکارڈ کرنے کا خفیہ آلہ تھا۔ دوسرے آبجیکٹ کے بارے میں اسے بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک جی پی ایس ٹریکنگ ڈیوائس تھی۔ وہ دیدے پھاڑے حیرت سے ان ننھی آلات کو دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ آلات یہاں کیوں موجود ہیں کہ اسی دوران اس کے کانوں میں سائرن کی آوازیں، بریک لگنے پر ٹائروں کی چرچراہٹ اور آخر میں کار کے دروازوں کے کھلنے اور تیزی سے بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں تو اس پر انکشاف ہوا کہ کیا کچھ ہو گیا ہے۔

وہ نگاہیں اٹھائے بغیر سمجھ گیا کہ پولیس والوں نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اسٹیئرنگ وھیل پر سے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے تاکہ وہ صاف طور پر پولیس کی نگاہوں میں آ جائیں کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔

''اب کار سے باہر نکل آؤ!''

کارل نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسے سستے سے سوٹ میں ملبوس ایک دراز قامت و بلا پتلا شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ایک سروس ریوالور تھا جس کی نال کارل کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ اس شخص کے چہرے پر سے دھوپ کی عینک، مونچھیں اور چگی ڈاڑھی غائب ہو چکی تھی اور اس کی آواز میں وہ چہچہاہٹ بھی نہیں تھی جو کارل پہلے سن چکا تھا۔ اس مرتبہ یہ آواز سریلی تھی۔

لیکن اس کے باوجود یہ وہی شخص تھا جس نے نیلامی کے دوران اس سے بڑھ کر بولی لگائی تھی اور زرد چھوٹی چڑیا کی پینٹنگ خریدنے میں اسے مات دے دی تھی۔

اس دراز قامت کے عقب میں درجن بھر باوردی پولیس مین موجود تھے۔ ان سب نے بھی اپنے اپنے ہتھیار نکالے ہوئے تھے اور وہ سب کارل کو اپنی زد میں لیے ہوئے تھے۔

کارل حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کار سے باہر نکل آیا۔

وہ ذہنی طور پر خود کو بے حد ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے فوری

کمزور اور طاقتور

انسان اتنا کمزور ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈر جاتا ہے اور طاقتور اتنا ہے کہ اپنے اللہ سے نہیں ڈرتا۔

☆☆☆

یہ کیسا دور ہے؟ یہاں کوئی اپنے دکھ سے اتنا دکھی نہیں جتنا دوسروں کے سکھ سے دکھی ہے۔

مرسلہ۔ ماریہ چودھری، پاک پتن شریف

☆☆☆

جج۔ ''جب میں وکیل تھا تو تم نے مرغی چرائی تھی۔ جب میں سرکاری وکیل بنا تو تم نے بکری چرائی اور آج جبکہ میں جج ہوں تو تم نے گائے چرائی۔''

ملزم۔ ''حضور! اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساتھ ساتھ میں بھی ترقی کر رہا ہوں۔''

طور پر زمین پر دھکیل دیا گیا اور اس کے ہاتھ پشت پر لے جا کر ان میں ہتھکڑی پہنا دی گئی۔

''شیفرڈ نے میرے ساتھ دغا بازی کی...... ہے نا؟'' کارل نے اس وقت پوچھا جب اسے قدموں پر کھڑا کر کے ایک پولیس کار کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔

سستے عام سے سوٹ میں ملبوس دبلے پتلے دراز قامت شخص نے جو درحقیقت ایک سراغ رساں تھا نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں۔ ہم نے لاکر کی چابی ایک میٹل ڈیٹیکٹر کی مدد سے ڈھونڈ نکالی تھی۔ شیفرڈ تو بے حد گھنا ثابت ہوا۔ اس نے چپ سادھ رکھی ہے۔ ہم اس سے ایک لفظ بھی نہیں اگلوا سکے جبکہ دوسری طرف تم نے ہمیں وہ سب کچھ بتا دیا جو ہم جاننا چاہتے تھے۔''

یہ سن کر کارل نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ اس کے منہ سے قل قل کی آوازیں سن کر سراغ رساں کو یوں محسوس ہوا جیسے کارل کو ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے۔

ادھر کارل پر ہسٹریائی کیفیت طاری تھی۔ وہ کینری چڑیا کی پینٹنگ کے بارے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی خود کی چہچہاہٹ کس طرح اسے پنجرے میں لے آئی ہے تو اس کے قہقہے اس پر بھاری پڑنے لگے۔

اور پھر تیس لاکھ ڈالرز کی رقم ہاتھ سے نکلنے کے غم میں اور حراست میں لیے جانے کی جھنجلاہٹ پر اسے حقیقت میں دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ سینہ تھامے پولیس پیٹرول کار کی عقبی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔

نیلی کار گروسری مارکیٹ کی طرف آنے والی نیم دائروی سڑک کے دونوں پہلوؤں میں ایستادہ گھنے درختوں تلے گزرتی مارکیٹ کی جانب آرہی تھی اور چھوٹی سی مارکیٹ میں پہلو بہ پہلو واقع پانچوں دکانوں کے دکاندار چوکنا ہوگئے تھے۔

''اوئے بشیرا! سیف صاحب آرہے ہیں۔ ذرا ہوشیاری سے میرا پتر۔'' ایوب گروسری شاپ کے مالک نے اپنی نگاہ نیلی کار پر مرکوز رکھتے ہوئے ملازم لڑکے کو ہدایت کی۔

سوونی اسٹور کا مالک اپنی باسی سبزیاں الٹنے پلٹنے لگا۔ فاروق چکن اینڈ گروسری کے چابک دست لڑکے نے نیلی کار کو دیکھ کر دکان کے باہر رکھے آہنی جنگلوں میں مرغیاں خوامخواہ ہی ادھر سے ادھر کرنا شروع کردیں۔ مرغیوں کا شور کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

کشمیر کریانہ کا ملازم لڑکا نیلی کار کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے آوازیں لگانے لگا۔ ''مولی ہے، پالک ہے

انسان جب کوئی کاروبار کرتا ہے تو اس کے نفع ونقصان، اتار چڑھاؤ غرض ہر پہلو پر غور کرلیتا ہے اور ایک مخصوص مدت گزار کر سودوزیاں کا حساب کتاب بھی کرنے بیٹھ جاتا ہے مگر... جب زندگی سے متعلق سوچنے کی باری آتی ہے تو جانے کیوں نشیب وفراز پر نظر رکھنے کے بجائے تمام پہلوؤں کو نظرانداز کرنا اچھا لگتا ہے اور نشان بے نیازی سے یہ کہنا بھی اچھا لگتا ہے کہ زندگی تو بس آج کی ہے... کل کی کل دیکھی جائے گی... اسی نقطۂ نظر کے تحت اس نے بھی اپنوں کو اپنا بنائے رکھنے کے لیے تمام زندگی صرف کردی... لیکن آخر میں ادراک ہوا کہ وہ انسان کس قدر بے بس ہوتا ہے جس کی نہ زندگی اپنی ہے اور نہ ہی زندگی سے وابستہ کوئی رشتہ... یہ کیسا ظلم ہے کہ اس نے رشتوں کو ہی اپنی کل متاع سمجھا مگر... ان رشتوں کے لیے دولت ہی متاع حیات نکلی۔ لہٰذا اس نے آخر میں جب زندگی کا گوشوارہ کھنگالا تو سود کا خانہ خالی نکلا... البتہ اس کے چاروں جانب زیست کے اوراق پر زیاں ہی زیاں لکھا نظر آرہا تھا... ایسے میں شاید دل کی حکایت ایک اور ہی داستان رقم کررہی تھی... کہ غرض کی اس دنیا میں غرض سے بے نیازی اچھی نہیں... رشتہ کوئی بھی ہو... تھوڑا سا مفاد عزیز رکھنا پڑتا ہے لہٰذا پہلے اپنے پیروں کو چادر میں چھپایا جائے پھر کسی کے سر کی فکر کی جائے مگر... ایسا سوچنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا لہٰذا ایسا تو ہونا ہی تھا۔

محبت اور ضرورت کو ساتھ لے کر چلنے والے ایک مسافر کی بے سروسامانی کا منظر

حکایتِ سودوزیاں

ناہید سلطانہ اختر





شلجم ہیں، گاجر ہے، مٹر ہے..... آج تو کس سبزی ہوجائے۔''

چائنا اسٹور کے کاؤنٹر پر کھڑی ادھیڑ عمر چینی مالکہ باہر نکل آئی اور اس نے اسٹور کے باہر کھڑی سوزوکی بولان سے سبزیوں کے بھاری بھرکم تھیلے اتارتے ملازم کو اونچی آواز میں ہدایت کی۔ ''ہری اپ بوائے..... فریش ویجی ٹیبل زلدی اتارو زلدی لگاؤ۔'' گو پاکستان میں برسہا برس کے قیام نے اسے اردو بھی سکھادی تھی مگر پھر بھی بعض الفاظ کا تلفظ وہ درست ادا کرنے سے قاصر رہتی تھی جیسے جلدی کو وہ ہمیشہ ''زلدی'' کہتی تھی۔

''اوکے میڈم!'' ملازم نے جواب دیا۔

نیلی کار مارکیٹ کے سامنے آن رکی تھی۔

''آج دیر کرو یا مستان کھان۔'' چینی عورت بولان کے ڈرائیور کو ڈانٹ رہی تھی۔ ''ام اپنا شاپ پر فریش ویجی ٹیبل زلدی مانگتا ہے۔''

سیف الدین گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے۔ بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں جو اکثر ہی ان کے ساتھ اس مارکیٹ میں آتی تھیں۔ پانچوں دکاندار کن انکھیوں سے انہیں اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آج قرعۂ فال کس کے نام نکلتا ہے۔ سیف الدین اپنی بیگم کے ہمراہ مارکیٹ کی طرف بڑھے اور دکانوں میں سجی سبزی ترکاری کا طائرانہ جائزہ لینے کو ٹھٹک گئے۔ بیگم نے ان کا بازو پکڑ کر کچھ کہنا چاہا اور انہوں نے بیگم کی بات سننے کے لیے اپنا سر دائیں طرف جھکا دیا۔

''ادھر تازہ سبزی ہے۔'' بیگم کی نظریں فاروق کی دکان پر تھیں۔

سیف الدین بیگم کے ہمراہ فاروق چکن اینڈ گروسری کے سامنے جارکے۔ باقی دکاندار مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ سیف الدین کوئی آسمان سے اتری مخلوق نہیں تھے مگر مارکیٹ کے تمام دکاندار جانتے تھے کہ سیف الدین جن کا ہفتے میں دو تین مرتبہ اس مارکیٹ کا ضرور چکر لگتا تھا جس دکان پر جا کھڑے ہوتے، اس کی اچھی خاصی بکری کروا کے ہی ہٹتے تھے۔

''سلام علیکم سر..... سلام بیگم صاحب۔'' دکان کا مالک فاروق قرعۂ فال اپنے نام کھلنے پر نہال دکھائی دیتا تھا۔

''وعلیکم السلام..... کیا حال ہے فاروق میاں؟''

''شکر ہے پروردگار کا..... کرم ہے سرکار کا۔''

''آج تازہ سبزی آگئی ہے؟''

''ہاں جی..... کوشش تو پوری ہوتی ہے کہ صاحب لوگوں کے آنے سے پہلے سبزی پہنچ جائے مگر پھر بھی کبھی کبھار دیر ہو ہی جاتی ہے..... گاڑی پرانی ہے نا سرکار۔'' فاروق نے ایک نظر دکان کے سامنے کھڑی پرانی ڈاٹسن کو دیکھا۔

''اپنی تو ہے یار..... کرایہ نہیں دینا پڑتا۔'' سیف الدین بولے۔

''شکر ہے۔'' فاروق نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا پھر گرمجوشی سے بولا۔ ''حکم سرکار..... ساگ ایک دم تازہ ہے..... مجھے پتا ہے آپ ساگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔''

''بھئی تمہیں کیوں نہ پتا ہوگا بھلا..... بھیدی جو ٹھہرے۔'' سیف الدین مسکرائے۔

''سرکار! بس اس ایوب سے ذرا احتیاط رکھا کریں۔'' فاروق نے رازدارانہ پوزیشن اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے خفیہ والوں کا آدمی ہے۔ رپورٹیں دیتا ہے کہ کس کے گھر میں کتنی سبزی گئی، کتنا فروٹ اور کتنی چکن۔''

''ہاں..... مجھے کسی اور نے بھی بتائی تھی یہ بات لیکن ہمیں کیا فاروق میاں..... ہم تو جتنا کماتے ہیں، اتنا ہی خرچ بھی کرتے ہیں..... کوئی اضافی آمدنی نہیں..... کیا سمجھے۔''

''جی سر۔''

''ڈرے وہ جس کے ہاتھ کالے ہوں۔''

''بالکل جناب!'' فاروق نے تائید میں گردن ہلائی۔

''اچھا پہلے تو تم ساگ نکالو۔''

''تاکہ یہ لوگوں کو ساگ کھلانے کو بلائیں۔'' بیگم بولیں۔ فاروق مسکرایا۔

''ارے بھئی جو مزہ لوگوں کو کھلانے میں ہے وہ اکیلے کھانے میں کہاں..... کیوں فاروق میاں؟ اور ہاں، گاؤں سے اصلی گھی لانے کو کہا تم نے کسی سے؟''

''کہہ دیا سر۔'' فاروق ساگ کی اوپر تلے چنی گڈیوں میں سے سیف الدین کے لیے خود بہترین گڈیاں چھانٹنے لگا۔ ''سر! کتنی نکال دوں؟''

سیف الدین نے کچھ سوچا پھر بولے۔ ''ایسا کرو تین گڈیاں ساگ کی نکال دو تین پالک کی۔''

''آئی میری شامت!'' بیگم زیر لب بڑبڑائیں۔

فاروق کے دونوں ملازم باقی گاہکوں کو نمٹانے میں مصروف تھے۔

''سر! چکن بھی؟'' فاروق نے پوچھا۔

''ہاں ہاں چکن بھلا کیوں نہیں..... ہمارے بچے تو چکن کے بغیر کھانا ہی نہیں کھاتے۔''

"بتا دیں سرکار کتنی بنوا دوں جب تک آپ سبزی فروٹ لیں گے، چکن بن جائے گی۔"

"ایسا کرو پانچ نکلوا دو۔" سیف الدین نے کہا۔

"پانچ کا کیا کریں گے، دو فریج میں رکھی ہیں نا۔" بیگم نے ٹوکا۔

"بھئی کام آ جائیں گی...... مہمانوں کا آنا جانا بھی تو لگا ہی رہتا ہے۔" سیف الدین بولے۔

"پانچ سر؟" فاروق حکم کا اکا بنا کھڑا تھا۔

"ہاں پانچ بنوا دو...... تین کڑاہی دو بارہ بارہ پیس۔"

"سلیم! صاحب کی تین کڑاہی دو بارہ بارہ۔" فاروق نے گردن گھما کر دکان کی عقبی حصے میں مرغ مذبح خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔

"ٹھیک ہے باجی۔" مذبح خانے میں متعین نوجوان نے ایک ذبح شدہ مرغی کے سینے کو چیرا لگاتے ہوئے کہا۔

سیف الدین باقی سبزیاں نکلوانے لگے۔ "دھڑی پیاز کر دو...... دھڑی آلو......"

"دھڑی آلو کی کیا ضرورت ہے...... ابھی پڑے بھی ہیں گھر میں۔" بیگم نے پھر ٹوکا۔

"بھئی بچے چپس شوق سے کھاتے ہیں۔" سیف الدین بولے۔

"انہیں تو اگر میں اجازت دوں تو سارا دن چپس ہی کھاتے رہیں...... پچھلے مہینے ڈھائی کلو کیچپ کی بوتل اڑا گئے سب مل کر۔" بیگم نے کہا۔

آس پاس کھڑے دوسرے گاہک جنہیں فاروق کے مددگار نمٹا رہے تھے، سیف الدین اور ان کی بیگم کے مکالمات سن رہے تھے۔

مولی، شلجم، گاجر، گوبھی، سیم کی پھلیاں، ٹنڈے، مٹر، ہری پیاز، شملہ مرچ، سبز مرچ، دھنیا، پودینہ، لہسن، ادرک...... سیف الدین نے سبھی کچھ وزن کرالیا۔ بیگم بار بار انہیں ٹوکتی رہیں...... اتنا لے کر کیا کریں گے...... گھر میں رکھی تو ہے...... خراب ہو کر جائے گی...... مگر سیف الدین نے ہر طرح کی سبزی خرید ڈالی۔

سبزی کے بعد فروٹ کا سیشن شروع ہوا۔ فاروق بڑی چرب زبانی اور چابک دستی سے انہیں مائل کرنے لگا۔

"سر! ایسا لذیذ کالا کلو سیب پورے سیزن میں نہیں آیا۔"

"اچھا! تو پھر چار کلو تول دو۔"

"ریٹ تو پوچھ لیں۔" بیگم نے کہا۔

"ریٹ ہو جائے گا بیگم صاحب...... انشاء اللہ زیادہ نہیں لوں گا آپ سے۔" فاروق نے انہیں اطمینان دلایا۔

"اور چار کلو کیوں، بس دو کلو کافی ہیں۔" بیگم نے کفایت شعاری دکھانی چاہی۔

"ارے بھئی بچے کھائیں گے...... این ایپل اے ڈے کیپس ڈاکٹر اوے۔" سیف الدین نے سیب کی بابت انگریزی کہاوت دہرائی۔

"سرکار! کیلا تو دیکھیں۔" فاروق نے کیلوں کا ایک گچھا اٹھا کر انہیں للچایا۔

"عمدہ ہے۔"

"باہر کا ہے سر۔"

"تین درجن کر دو۔"

بیگم نے کچھ کہنا چاہا مگر سیف الدین ان کے بولنے سے پیشتر ہی گویا ہوئے۔ "ذوہیب کو رات کو کیلے کا شیک بنا کر دیا کرو...... دبلا پن دور کرنے کے لیے بنانا شیک بہترین ہے...... اور ہاں بھئی، فاروق مالٹوں کا کیا حال ہے؟"

"سر! ریڈ نہ نکلے تو گھر سے واپس بھجوا دیں...... چھ درجن کا پیک ہے، رکھوا دوں گاڑی میں؟"

"کیوں بھئی؟" سیف الدین نے بیگم کو دیکھا۔

"آپ کی مرضی ہے۔" بیگم کا انداز پسپائی کا تھا۔

"رکھوا دو۔" سیف الدین نے فاروق سے کہا۔

"سر! تازہ ناریل بھی ہے...... پانی سے بھرا۔" فاروق بولا۔

"بھئی واہ! کیا یاد دلایا ہے تم نے فاروق میاں۔" سیف الدین پھڑک کر بولے۔ "دو ناریل بھی نکال دو۔" پھر انہوں نے بیگم کی طرف دیکھا اور حاضرین پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر بولے۔ "ناریل کا پانی پیٹ کے لیے آبِ شفا ہے۔"

"آپ کے لیے تو سب کچھ شفا ہی شفا ہے۔" بیگم ناگواری سے بولیں اور سیف الدین کھسیانے ہو کر ہنس دیے۔

مرغیاں بن کر آ گئی تھیں۔ سبزی اور فروٹ کا کھاتہ مکمل ہو چکا تھا۔ فاروق حساب کتاب لگا رہا تھا۔ ایک ملازم اس کی معاونت کے لیے آ گیا تھا۔ بل بنا کر فاروق نے سیف الدین کی طرف بڑھایا اور ملازم کو سودا سیف الدین کی گاڑی کی ڈکی میں رکھنے کی ہدایت کی۔

سیف الدین نے اپنے کوٹ کی جیب سے چرمی بٹوا نکالا اور فاروق کو ادائیگی کی۔ فاروق خوش تھا اور آس پاس دکانوں والے اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مارکیٹ میں سیف الدین جیسے گاہک کم کم ہی آتے تھے۔ زیادہ تر روز کا روز سودا سلف لینے والے ہی

آتے..... سیف الدین ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ تو ضرور خریداری کے لیے آتے تھے۔

تمام سودا سلف ڈکی میں رکھے جانے کا اطمینان کرنے کے بعد سیف الدین نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بیگم سے کہا۔ ''ساگ پکاؤ گی تو منی کو بھی بلا لینا۔''

''ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے۔'' بیگم نے پہلو بدلتے ہوئے قدرے ناگواری سے کہا۔ ''منی کو ساگ پسند ہے۔ کڑاہی گوشت چٹنی شوق سے کھاتی ہے۔ گڑیا کو سندھی بریانی بھاتی ہے۔ کیف نہاری پانے کا شوقین ہے اور طیف کو بھنڈی قیمہ سے عشق تھا.....'' بیگم نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر جلے بھنے لہجے میں بولیں۔ ''کہیے تو آپ کے بھانجے بھانجیوں، بھتیجے، بھتیجیوں اور دوسرے رشتے داروں کی پسند بھی گنوا دوں۔''

''بھئی تم تو بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔'' سیف الدین نے واپسی کے لیے گاڑی موڑ لی۔ ''میں نے تو صرف منی کو بلانے کی بات کی تھی۔''

منی سیف الدین کی منجھلی بہن کا پیار کا نام تھا۔ ویسے اس کا اصل نام شہلا تھا۔ نائلہ جو سیف الدین سے چھوٹی اور بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھی، دادی بن کر بھی چنی کہلاتی تھی سب سے چھوٹی بہن عائلہ کو پیار سے گڑیا کہا جاتا تھا۔ کیف، ان کے منجھلے اور طیف چھوٹے بھائی کا نام تھا جو انگلستان جا بسا تھا۔

''بات کا بتنگڑ بنانے کی کیا بات..... میں تو جب سے بیاہ کر آئی ہوں، آپ کو اپنے بہن بھائیوں کے عشق میں ڈوبے ہی دیکھ رہی ہوں۔''

سیف الدین قہقہہ مار کر ہنس دیے اور گردن گھما کر ذرا کی ذرا بیگم کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''تم سے عشق نہیں ہے کیا بیگم؟''

''رہنے دیں بس۔'' بیگم گردن موڑ کر گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔

''اچھا بھئی اچھا..... ناراض مت ہو..... نہیں بلانا چاہتیں منی کو تو نہ سہی، میں کسی دن اسے فوڈ پارک سے تیار ساگ اور مکی کی روٹی خرید کر پہنچا دوں گا۔''

''جتنے پیسوں میں گھر میں سارے لوگوں کے لیے ساگ پک جائے، اتنے پیسوں میں مشکل سے ایک دو کے لیے ملے گا۔'' بیگم معترض ہوئیں۔

''بھئی اب کسی کل سانس بھی لو..... نہ منی کو ساگ کی دعوت پر گھر بلانا چاہتی ہو، نہ یہ چاہتی ہو کہ میں اسے پکا پکایا ساگ باہر سے خرید کر پہنچا دوں۔'' سیف الدین بولے۔

بیگم نے گردن موڑی، شوہر کو خشونت سے دیکھا اور شاکی لہجے میں بولیں۔ ''آپ کو تو بس پیسا لٹانے کا بہانہ چاہیے..... جب گھر میں سبزی، گوشت موجود تھا تو کیا ضرورت تھی پھر اتنا سامان خریدنے کی۔''

''گھر میں کسی چیز کی تنگی نہیں ہونی چاہیے۔''

''کچھ آئندہ کی بھی سوچیں۔''

''اللہ مالک ہے..... کتنی دفعہ سمجھایا ہے تمہیں کہ آج اچھا گزارنے کی فکر کیا کرو، کل کا اللہ مالک ہے۔''

''آج کا بھی اللہ ہی مالک ہے اور اللہ نے اسراف کرنے والوں کو.....'' بیگم نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''رک کیوں گئیں..... کہہ دو..... میں شیطان کا بھائی ہوں.....'' ہمیشہ کے انتہائی متحمل مزاج سیف الدین کے لہجے میں گرمی نہیں ٹھنڈک تھی۔ گھر نزدیک تھا، سیف الدین نے اسٹیئرنگ وہیل پر سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور بیگم کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولے۔ ''انسان کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ نے یہ بھی تو کہا ہے کہ جو اسباب میں نے تمہیں دیا ہے، اسے اپنے بال بچوں اور احباب و اقارب پر خرچ کرنے میں دل چھوٹا مت کیا کرو۔''

گاڑی گھر کے باہر آن رکی تھی۔ بیگم معترض نگاہوں سے سیف الدین کو دیکھ رہی تھیں اور وہ ملازم کو گاڑی سے سامان اتارنے کے لیے بلانے کو ہارن بجا رہے تھے۔ سامان اور بیگم کو اتار کر انہیں دفتر بھی جانا تھا۔

☆☆☆

جی ٹائپ سرکاری بنگلے کے چھوٹے دروازے اور بڑے گیٹ کے درمیان چوڑے ستون پر نصب پیتل کی تختی پر جلی انگریزی حروف میں سیف الدین احمد کا نام اور سرکاری عہدہ لکھا ہوا تھا۔ یہ تختی دن بھر اس اسٹریٹ سے گزرنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائے رکھتی تھی۔ اسٹریٹ میں آمنے سامنے بنے جی ٹائپ سرکاری بنگلوں میں سے اکثر کے دروازوں پر اسی نوعیت کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی چوبی، کوئی پلاسٹک کی۔ اس گھر میں شفٹ ہونے کے بعد جب سیف الدین نے گھر کے دروازے پر اپنے نام اور عہدے کی تختی لگوانی چاہی تو ان کی بیگم، شاہانہ نے انہیں لکڑی یا پلاسٹک کی تختی لگوانے کا مشورہ دیا تھا مگر سیف الدین نے سستا نسخہ آزمانے کے بجائے پیتل کی مہنگی تختی پر اپنا نام اور عہدہ کندہ کرا کے گیٹ پر نصب کرانا پسند کیا تھا۔ بچت کی پروا کیے بغیر غیر ضروری

چیزوں پر بھی کھلے ہاتھ سے خرچ کرنا سیف الدین کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

بیگم اکثر کہتیں۔ ''نام شاہانہ میرا ہے اور خرچ شاہانہ انداز میں آپ کرتے ہیں۔''

''یہی تو ہماری پہچان ہے۔'' سیف الدین سینہ پھلا کر کہتے۔

سیف الدین کوئی پیدائشی رئیس نہیں تھے، نہ ہی ایک جست میں گریڈ بیس کے افسر بن کر جی ٹائپ سرکاری بنگلے کے مکین بن گئے تھے۔ اَن پڑھ اور مزدور پیشہ باپ کے بیٹے تھے اور تیس سالہ سرکاری ملازمت میں بتدریج ترقی کرتے بارہ سے بیس گریڈ اور دو کمروں کے ڈی ٹائپ مکان سے جی ٹائپ سرکاری بنگلے تک پہنچے تھے۔ بہت لمبا سفر تھا..... اَن گنت سرد و گرم دن..... اور بے شمار اچھی بری یادیں۔

سیف الدین اپنے والدین کے آٹھ بچوں میں جن میں سے دو عالمِ شیر خوارگی میں ہی انتقال کر گئے تھے، سب سے بڑے تھے۔ ان سمیت تین بھائی حیات تھے اور تین بہنیں۔ باپ معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ کوئی مستقل روزگار نہیں تھا ان کا جو کام مل جاتا کر لیتے اور اس کام سے ملنے والی اجرت سے گھر کا چولہا جلتا تھا۔ کبھی کوئی کام نہیں بھی ملتا تھا ایسے میں گھر کا چولہا ٹھنڈا ہو جاتا اور سیف الدین کی والدہ مجسم حسرت و یاس بنی منتظر رہتیں کہ کب ان کے خاوند کو کام ملے، دو پیسے آئیں اور گھر کا ٹھنڈا چولہا گرم ہو۔

سیف الدین کی والدہ دور اندیش عورت تھیں۔ شوہر کی آئے دن کی بیروزگاری اور عسرت کی زندگی سے انہوں نے یہ سبق سیکھا تھا کہ انسان کو تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ تعلیم آدمی کو انسان بناتی ہے اور اچھے برے وقت کام بھی آتی ہے۔ پڑھا لکھا انسان کسی مستقل روزگار پر تو لگ جاتا ہے۔ ان کے اپنے ہی محلے میں کتنے لوگ تھے ایسے۔ کوئی دفتر میں چپڑاسی، کوئی اسکول میں ٹیچر، کوئی بینک میں کلرک، کوئی کسی افسر کا پکا ڈرائیور۔ ان دنوں نوکری ملنا آج جتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ ایف اے، بی اے تو چھوڑو میٹرک پاس بھی کوشش کر کرا کے کہیں نہ کہیں بھرتی ہو ہی جاتا تھا۔ لکھنا پڑھنا بھی سہل اور سستا تھا۔ ماں باپ بچے کا ہاتھ پکڑ کر جاتے اور کسی نہ کسی اسکول میں داخل کرا ہی آتے۔ کتابیں سستی، کاپیاں گنی چنی جنہیں اکثر بچے کسی بیگ میں نہیں اپنے سینے سے لگا کر اسکول کالج جاتے اور کسی نہ کسی طرح میٹرک، انٹر، بی اے، بی کام تک پہنچ ہی جاتے۔ نہ لنچ بکسوں اور پانی کی بوتلوں کی منت تھی، نہ اسکول، کالج بسوں کے نخرے..... بچے پیدل ہی اسکول، کالج آتے جاتے۔ بہت کم ہوتے تھے جنہیں اسکول، کالج جانے کے لیے بس میں سفر کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔

سیف الدین اور ان کے بہن بھائی بھی سرکاری اسکولوں، کالجوں میں اپنے اپنے مقدر اور مقدور کے مطابق لکھ پڑھ ہی گئے۔ سیف الدین کے بعد اوپر تلے دو بہنیں تھیں، نائلہ اور شہلا پھر ایک بھائی کیف الدین، اس سے چھوٹی بہن عائلہ اور آخر میں بھائی لطیف الدین۔

گھر کے حالات اور بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے سبب سیف الدین کو اپنی ذمے داریوں کا احساس بہت چھوٹی عمر ہی سے تھا۔ انہیں اپنی ماں کی پریشانیوں کا بھی خیال رہتا تھا۔ ذمے داری کے اس احساس نے انہیں بچپن ہی سے ماں اور بہن بھائیوں کے لیے کچھ کرنے اور باپ کا ہاتھ بٹانے پر مائل رکھا۔ اسکول سے آنے کے بعد جب ان کے ہم عمر لڑکے محلے کے گلی کوچوں میں آوارہ پھر رہے ہوتے یا کھیل کود میں لگے ہوتے، وہ اپنی والدہ کی توڑی ہوئی مونگ اور مسور کی دال کی بڑیاں بازار میں جا کر دکان در دکان سپلائی کرتے پھرتے۔ کبھی تولیا فیکٹری سے تولیوں کے کناروں کی سلائی کے لیے اپنے سر پر تولیوں کا گٹھا اٹھا کر لاتے اور ان کی والدہ ایک پرانی سلائی مشین پر رات گئے تک لالٹین کی مدھم روشنی میں تولیوں کے کنارے موڑ کر انہیں مشین کی سلائی لگاتی جاتیں۔ بہن بھائی سب سو جاتے مگر سیف الدین ماں کے پاس بیٹھے لالٹین کی مدقوق روشنی میں اپنی کتابیں اور کاپیاں کھولے لکھتے پڑھتے رہتے اور ساتھ ہی سلے تولیوں کی تہ لگا کر اوپر تلے جمانے میں اپنی ماں کا ہاتھ بھی بٹاتے جاتے۔ اپنی ماں سے سیف الدین کو محبت نہیں عشق تھا اور یہ عشق تمام زندگی ان کی قوت بنا رہا۔

آٹھویں جماعت میں سیف الدین نے اسکول سے آنے کے بعد سہ پہر تا رات پرچون کی ایک دکان پر گاہکوں کے لیے سودا سلف تولنے کا کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی بڑیوں کی سپلائی اور تولیوں کے بجائے اب بنیانوں کی سلائی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

دسویں کا امتحان دیتے ہی سیف الدین نے اپنے ایک محلے دار کی منت سماجت کر کے ایک پرائیویٹ دفتر میں چپڑاسی کی ملازمت حاصل کر لی اور ماں کے بڑیاں توڑنے اور سلائی کرنے پر پابندی لگا دی۔ انہیں پچاس روپیا ماہانہ تنخواہ ملتی۔ کچھ والد کما لیتے اور گھر کا دال دلیا چل جاتا۔ مزید

تعلیم کے لیے سیف الدین نے ایک کالج کی شام کی شفٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ بہن بھائی بھی سب پڑھ رہے تھے۔

دن میں ملازمت اور شام کو تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے سیف الدین نے بالآخر بی اے کرلیا۔ بی اے کے بعد انہوں نے ایک سرکاری محکمے میں بارھویں گریڈ کی ملازمت حاصل کرلی۔ چودہ گریڈ میں ترقی ہوئی تو انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے سرکاری مکان بھی الاٹ کرالیا۔ ان دنوں سرکاری مکان کی الاٹمنٹ آج کل کی طرح جوئے شیر لانے کے مترادف نہیں ہوتی تھی۔ چھوٹے مکانوں کی الاٹمنٹ کے لیے چھوٹی موٹی سفارش سے بھی کام بن جاتا تھا۔

سیف الدین کو الاٹ کیا جانے والا سرکاری مکان تھا تو معمولی مگر اس کوارٹر سے کہیں اچھا تھا جہاں سیف الدین اور ان کے گھر والے اس سے قبل رہتے رہے تھے۔ مکان کا محل وقوع نہایت عمدہ تھا۔ ستارہ مارکیٹ نزدیک، میلوڈی مارکیٹ قریب، آبپارہ بھی زیادہ دور نہیں۔ صبح سے رات تک پبلک ٹرانسپورٹ دستیاب ہوتی۔ آس پاس کھیل کے میدان تھے۔ سرکاری اسپتال کے ساتھ ڈسپنسریاں تھیں۔ اسکول تھے، کالج بھی دور نہ تھے۔ مکان میں کمرے تو دو تھے مگر سابقہ الاٹی نے گھر کی داخلہ گاہ کے ساتھ ہی ایک بیٹھک بھی تعمیر کرا رکھی تھی۔ باورچی خانہ، غسل خانہ اور برآمدہ بھی تھا مگر صحن بہت کشادہ تھا۔ اتنا کہ آس پاس ایسے ہی مکانوں میں بسے سرکاری ملازمین نے اپنے صحن میں پورے پورے رہائشی یونٹ تعمیر کروا کے یا تو اپنے ذاتی استعمال میں رکھے ہوئے تھے یا اس یونٹ کو کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ سیف الدین اور ان کے گھر والوں نے بھی گھر کے خرچ میں کفایت کر کے جلد ہی صحن میں دو اضافی کمرے تعمیر کروا لیے۔ ایک کمرے میں کیف اور طیف رہتے، دوسرے میں سیف الدین۔ گھر کے اندر دو کمروں میں سے ایک تینوں بہنوں کے لیے وقف تھا، دوسرا سیف الدین کی والدہ اور والد کے لیے۔ گھر میں کوئی ایسا مہمان آجاتا جسے شب گزاری کو ٹھہرانا ہوتا تو سیف الدین نہایت خاموشی سے بیٹھک میں اپنا بستر ڈال لیتے۔

☆☆☆

ایم اے کا امتحان دیتے ہی سیف الدین نے شام کے وقت ایک پرائیویٹ دفتر میں جزوقتی ملازمت کرلی۔ دن میں سرکاری ملازمت تو چل ہی رہی تھی کہ بقول ان کی والدہ سرکار کی نوکری تو کھڑے بھی چلتی ہے بیٹھے بھی چلتی ہے۔ جزوقتی ملازمت کی ضرورت سیف الدین کو اس لیے پیش آئی کہ گھر میں تین بہنیں بیٹھی تھیں۔ انہیں بیاہنا تھا۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم جاری تھی۔ کیف یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ طیف ایف ایس سی کر رہا تھا۔ بہنوں میں بڑی نائلہ گریجویشن کے بعد بی ایڈ کر کے ایک اسکول میں ملازمت کر رہی تھی مگر اپنی تنخواہ وہ سیف الدین کی طرح والدہ کے ہاتھ میں نہ دیتی بلکہ اپنے پاس ہی رکھتی۔ البتہ گھر میں کوئی اتفاقی ضرورت آپڑنے پر وہ والدہ کو پیسے دے دیتی تھی۔ اپنے کپڑوں، جوتوں اور کاسمیٹکس پر اچھا بھلا خرچ کرتی۔ کبھی چھوٹی بہنوں اور والدین کے لیے بھی کپڑے، جوتے وغیرہ خرید لاتی۔ شہلا ایم ایس سی کر رہی تھی اور تعلیم مکمل کرنے پر لیکچررشپ حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔ عائلہ کالج کے پہلے سال میں تھی۔

سیف الدین نے تہیہ کر رکھا تھا کہ بہنوں کی شادی ہونے تک خود شادی نہیں کریں گے۔ والدہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ پہلے کم از کم دو بہنوں کی شادی ہو جائے پھر سیف الدین کا گھر بسایا جائے ورنہ اپنے بال بچوں کے چکر میں پڑ کر بھائی اپنی بہنوں کی فکر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ والدہ ایسا نہ بھی سوچتیں تو سیف الدین ایسے نہیں تھے۔ خدا نے انہیں ایثار پسند فطرت سے نوازا تھا۔ وہ اوائل عمر ہی سے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لیے زیادہ سوچتے تھے، اپنے لیے کم۔ ان کے لیے وہ اکثر اپنے جائز اور ناگزیر حق سے بھی دستبردار ہو جاتے۔ بازار سے کھانے پینے کی کوئی چیز خرید کر لاتے تو جب تک دوسروں کے منہ میں نہ ڈال لیتے خود کھانا حرام سمجھتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا کہ وہ بازار سے اپنی ضرورت کی کوئی چیز خرید کر لاتے اور گھر میں کسی کو پسند آجانے پر وہ چیز زبردستی اسی کو دے دیتے۔ ''میں اپنے لیے پھر لے آؤں گا، یہ تم رکھو۔'' وہ بہ اصرار کہتے۔

''بھائی...... اس لیے تھوڑی کہا تھا ہم نے کہ اچھی ہے۔'' ان کی لائی ہوئی چیز پسند کرنے والا شرمندہ ہو جاتا۔

''میں یہ کوئی کہہ رہا ہوں تم سے کہ تم نے اس لیے کہا تھا...... شاباش رکھو۔'' سیف الدین چمکار کر کہتے۔

والدین کی ضرورتوں کا سیف الدین کو بے حد خیال رہتا۔ انہیں کسی چیز کی تنگی نہ ہونے دیتے۔ ان میں سے کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو اپنی حیثیت سے بڑھ کر اچھے معالج کے پاس لے جاتے۔ والدین کو سرکاری اسپتالوں میں مریضوں کی قطاروں میں کھڑا کرنا انہیں معیوب لگتا۔ شام کو جزوقتی ملازمت وہ اسی لیے تو کرتے تھے کہ گھر میں فراوانی رہے۔ والدین اور بہن بھائیوں کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔

عید کے خوشنما رنگ جولائی 2016ء کے رنگا رنگ پاکیزہ کے سنگ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

نگہت سیما نے **اعتبارِ وفا** کا دکھایا دل پزیر اختتام

انجم انصار اور **دُرِثمن بلال** کے ناولوں کی نئی اقساط

مدیحہ شاہد کے قلم کا جادو **پتھر کا دیس** بنا

نایاب جیلانی نے وا کیے وفا کے انوکھے باب

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی روح پرور کاوش...... **یادوں کی مالا**

معروف مصنفہ اور دلنواز شاعرہ

ناہید فاطمہ حسنین

سے ایک شعری نشست

خالدہ نسیم کے قلم سے ایک سچا مکمل ناول

رضوانہ پرنس اور **عالیہ حرا** کی خوب صورت تحریریں

عید نمبر کے لیے بطورِ خاص

سیما بنت عاصم، نزہت جبیں ضیا، سحرش فاطمہ،

غزالہ فرح و دیگر قابلِ فخر لکھاریوں کی حسین کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و حکایات لیے دل خوش کن سلسلے صرف آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے

"امی نے بہت تنگی دیکھی ہے۔ اب انہیں آرام ملنا چاہیے۔" وہ دل ہی دل میں سوچتے۔ اسی لیے انہیں گھر میں اپنی دونوں ملازمتوں کی آمدنی ساری کی ساری خرچ ہوجانے کا ذرا ملال نہ ہوتا۔

نائلہ کا رشتہ آیا اور شادی کی بات چیت طے ہوئی تو والدہ نے نہایت فکرمندی سے کہا۔ "نائلہ کی بات تو طے کر دی ہم نے۔ شادی کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا؟"

"آپ فکر نہ کریں، اللہ مالک ہے۔" سیف الدین نے والدہ کو تسلی دی۔

"فکر کیسے نہ کروں بیٹا۔ کھینچ تان کر نائلہ اور شہلا کے لیے زیور کا بس ایک ایک سیٹ ہی بنا رکھا ہے یا کبھی چادر تکیوں کا سیٹ کبھی برتنوں کا کوئی سیٹ خرید کر رکھتی رہی ہوں۔ شادی میں تو سو خرچے ہوتے ہیں...... نائلہ سے کہتے شرم آتی ہے...... وہ کیا سوچے گی، میری شادی کے لیے مجھ ہی سے پیسے مانگے جارہے ہیں۔"

"آپ اس سے مانگیے گا بھی مت۔" سیف الدین نے کہا۔

"تو بیٹا پھر کیا ہوگا؟"

"اللہ مالک ہے..... ہو جائے گا۔" سیف الدین نے والدہ کو تسلی دی۔

سیف الدین نے دفتر میں ساتھیوں کو آمادہ کر کے ایک کمیٹی ڈال لی۔ ان کی ضرورت دیکھتے ہوئے ساتھیوں نے پہلی کمیٹی انہی کو دے دی۔ کچھ رقم انہوں نے اپنی دوسری ملازمت کے باس سے ادھار لی۔ نائلہ کی شادی ہوگئی۔

شادی کے بعد نائلہ نے سسرال سے علیحدہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ سرکاری اسکول میں ٹیچر تو وہ تھی ہی۔ ادھر ادھر کہہ سن کر اور وزارتِ ہاؤسنگ کے چکر لگا لگا کر بالآخر اس نے اپنے نام ایک سرکاری مکان اپنے میکے کے نزدیک ہی الاٹ کروا لیا۔ دوپہر کو اسکول سے واپسی پر وہ ماں کے گھر ہی آجاتی اور دوپہر کا کھانا وہیں سے کھا کر بلکہ کچھ ساتھ لے کر بھی سہ پہر کو اپنے گھر جاتی۔ وہ خوش تھی کہ فیملی میں اضافہ ہونے کی صورت میں اسے اپنی دوسری ساتھیوں کی طرح بچے کی دیکھ بھال کے لیے کسی قابلِ بھروسا ملازمہ کی تلاش میں خوار نہیں ہونا پڑے گا، اس کا میکا پڑوس میں تھا، اس کے مسائل شیئر کرنے کو ہر دم تیار۔

نائلہ کے اندازے غلط نہیں لگے۔ اس کے پہلے ہی نہیں ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو سال کے وقفے سے پیدا ہونے والے تینوں بچوں نانی کے میکے میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نائلہ کو پتا ہی نہ چلا کہ کب، کیسے اس کے تینوں بچے ننھیال کے محفوظ اور مشفق ہاتھوں میں بڑے بھی ہو گئے۔ سیف الدین کو نائلہ کا بیٹا اور دونوں بیٹیاں بہت عزیز رہیں۔ تینوں بچے بھی نانا، نانی، ماموؤں اور خالاؤں سے بہت پیار کرتے اور بمشکل ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر جانے کو تیار ہوتے تھے۔

شہلا کی شادی نائلہ کی شادی کے تقریباً ڈھائی سال بعد ہوئی۔ اس کی سسرال پنڈی میں تھی۔ کاروباری گھرانا تھا۔ مالی طور پر خوشحال۔ شہلا کا شوہر ہر ہفتے اپنی ذاتی کار میں شہلا کو اس کے میکے والوں سے ملوانے کے لیے اسلام آباد لاتا۔ کبھی کبھی وہ اور شہلا ایک آدھ دن کو رک بھی جاتے۔ سیف الدین اور ان کے گھر والے دونوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے بلکہ ان کے رکنے پر نائلہ اور اس کے شوہر کو شکایت کا موقع نہ دینے کے لیے سیف الدین کی والدہ ان دونوں کو بھی اپنے ہاں بلالیتیں۔ گھر میں رونق ہوجاتی۔ سیف الدین اپنا کمرا نہایت خاموشی سے مہمانوں کے لیے چھوڑ کر بیٹھک میں اپنا بستر لگا لیتے۔ انہیں والدہ اور گھر والوں کی خوشی نہایت عزیز تھی۔

عائلہ تعلیم مکمل ہونے سے پہلے شادی کرنے کے حق میں نہ تھی اور سیف الدین چاہتے تھے کہ آخری بہن بھی اپنے گھر کی ہوجائے تو پھر خود اپنا گھر بسائیں۔ والدہ اور دونوں شادی شدہ بہنیں بھی یہی بہتر سمجھتی تھیں کہ سیف الدین کی شادی عائلہ کی شادی کے بعد ہو۔ خدشہ یہ تھا کہ سیف الدین کی بیوی خدا جانے کس مزاج کی ہو۔ عائلہ کی شادی پر انہیں کچھ خرچ ہی نہ کرنے دے۔

مگر ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ نائلہ کی نظریں بہت دنوں سے اپنے شوہر کی ایک سیکنڈ کزن پر کیف کے لیے تھیں۔ لڑکی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ خوش حال گھرانا تھا۔ جی سکس میں لڑکی کے باپ کا دس مرلے پر دو منزلہ مکان تھا جس کا ایک حصہ انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا، دوسرے میں خود رہتے تھے۔ لڑکی کے باپ کا قسطوں پر موٹر سائیکل فروخت کرنے کا کاروبار بھی تھا۔ اکلوتی بیٹی کی شادی وہ ایسے نوجوان سے کرنا چاہتے تھے جو گھر داماد بن کر رہے۔

کیف کو سیف الدین نے ایک سرکاری محکمے ہی میں ملازم کرا دیا تھا اور کیف نے سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست بھی جمع کرا دی تھی لیکن اب پہلے والی بات نہ رہی تھی۔ سرکاری مکان کی الاٹمنٹ ملنا ہنوز دلی دور است والا معاملہ بن چکا تھا۔ برسوں انتظار کرنا پڑتا پھر بھی سرکاری

مکان بننے کی ضمانت نہ ہوتی۔ سیف الدین نے عائلہ کی شادی کے بعد اپنا گھر بسانے کا عندیہ ملنے پر نائلہ نے والدہ سے کہا۔ ''امی پھر تو وہ رشتہ ہاتھ سے گیا۔ کب سیف بھائی کی شادی ہوگی اور کب کیف کا نمبر آئے گا۔''

''ارے تو پھر پہلے کیف ہی کی کردو۔'' والدہ بولیں۔

''سیف بھائی کیا سوچیں گے؟'' نائلہ نے کہا۔

''اوہ... اس نے کیا سوچنا ہے۔ وہ خود ہی تو عائلہ کے بعد شادی کرنے کی ضد لگا کر بیٹھ گیا ہے۔''

''ضد نہیں امی، بھائی ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ آنے والی تو آتے ہی میاں کی جیب پر قابو کرتی ہے۔ اچھا ہے پہلے عائلہ ہی کی ہو مگر مجھے ڈر ہے کہ پہلے عائلہ پھر سیف بھائی کے چکر میں اس لڑکی کا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔''

''میں سیف سے بات کرتی ہوں۔''

''کیا کہیں گی ان سے؟''

''یہی کہ اچھا رشتہ ہے، کیف کو نمٹا دو...... آخر بھائیوں کو بھی تو سیف ہی نے نمٹانا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ بات کریں۔''

''تم بھی بیٹھنا، تمہارے سامنے کروں گی میں اس سے بات۔''

سیف الدین نے سنا تو کچھ فکرمند سے دکھائی دینے لگے۔ ''آپ دیکھ لیں، امی سوچ لیں، کیف کے بغیر رہ لیں گی آپ۔''

والدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''مشکل تو ہوگا میرے لیے اس کے بغیر رہنا۔'' والدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ارے امی کیف، کون سا کوئی سمندر پار جائے گا۔ اسی شہر میں رہے گا۔ جب آپ کا جی چاہے آپ چلی جایا کیجیے گا اس کے گھر اور وہ تو خیر سے روز ہی آسکے گا آپ سے ملنے...... یہ تو دیکھیں اس کا مستقبل بن جائے گا۔ یہاں اسلام آباد میں تو جس کے پاس اپنا ذاتی گھر ہے، سمجھیں اس کا تو مستقبل محفوظ ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے اپنے والدین کی...... گھر اول و آخر اسی کو ملے گا۔''

''کیا کہتے ہو بیٹے؟'' والدہ نے سیف الدین کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیف سے پوچھیے...... ہوسکتا ہے وہ گھر داماد بننا پسند نہ کرے۔''

نائلہ مسکرائی۔ ''ارے بھائی ایسے پرکشش رشتے سے کوئی بے وقوف ہی انکار کرے گا۔''

''اتنی بات نہیں ہے نائلہ...... عزت نفس اور انا کی بھی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ لوگ بیٹیوں کو گھر سے رخصت کیا کرتے ہیں کیا ہم کیف کو رخصت کریں گے؟''

''سوری بھائی...... مائنڈ نہ کیجیے گا...... کیف کو ایک نہ ایک دن تو رخصت ہونا ہی پڑے گا...... جب آپ کی اپنی بیوی، اپنے بچوں ہوں گے تو پھر کیف کیا شاید سبھی کو آپ کے گھر سے جانا پڑے گا...... ویسے بھی یہ سرکاری مکان ہے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو بھی چھوڑنا پڑے گا...... کیف بے چارہ چھوٹی سی تنخواہ میں کیونکر بنائے گا اپنا گھر...... ایسا رشتہ قسمت سے ملتا ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے اپنے ماں باپ کی...... کیف سے اس کا رشتہ ہوجائے تو سمجھیں کیف کی تو لاٹری نکل آئی...... سیف بھائی! آپ آخر کب تک سپورٹ کریں گے چھوٹے بھائیوں کو...... آخر آپ کی اپنی بھی تو زندگی ہے۔'' آخری جملہ نائلہ نے انتہائی دل سوزی سے ادا کیا۔

نائلہ کا جذباتی مکالمہ کام دکھا گیا۔

''کیف سے بات کرو...... اگر وہ راضی ہے تو ٹھیک ہے۔'' سیف الدین نے نیم دلی سے کہا۔

کیف سے بات کی گئی تو اس کے دل میں تو لڈو پھوٹ پڑے لیکن گھر والوں پر اپنی سعادت مندی ظاہر کرنے کو اس نے کہا۔ ''سیف بھائی سے پہلے؟''

''ارے تو کیا ہوا...... ان کی بھی ہوجائے گی...... کس صحیفے میں لکھا ہے کہ بڑے بھائی سے پہلے چھوٹے کی نہیں ہوسکتی...... آخر سیف بھائی بھی تو پہلے چھوٹی بہن کی شادی کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔'' دلیل دی گئی۔

دلیل نہ بھی دی گئی ہوتی تو کیف اس نادر موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو چشم تصور سے خود کو لڑکی کے باپ کے موٹر سائیکلوں کے شوروم میں منیجر کی کرسی پر جھولتے دیکھ رہا تھا۔

نائلہ نے لڑکی والوں سے بات چیت کی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کی شادی شریف اور قابل اعتبار گھرانے میں ہو۔ نائلہ کا گھرانا ان کے نزدیک شریف بھی تھا اور قابل اعتبار بھی۔ جھٹ پٹ معاملات طے پاگئے۔ نائلہ کی سسرال میں اپنے گھرانے کا اعتبار مزید بڑھانے اور کیف کی شادی پر اپنے گھر والوں کے ارمان پورے کرنے کی خاطر سیف الدین نے بھاگ دوڑ کر کے اپنے جی پی فنڈ سے قرضہ لیا اور کیف کی شادی دھوم دھام سے کی۔ دلہن رخصت ہوکر سسرال آئی، چند دن سسرال اور میکے میں آمدورفت جاری رہی پھر کیف مستقل طور پر اپنی بیوی کے میکے میں شفٹ ہوگیا۔ والدہ اور والد دونوں ہی بیٹے کو

رخصت کر کے بہت دل گرفتہ رہے۔ ان کا رنج بٹانے کو نائلہ ایک دو دن نہیں، کئی ماہ تک اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ میکے میں رہی۔ سیف الدین نے ان کی مہمان داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کے ہونے سے والدہ اور والد دونوں ہی کا دل بہلا رہتا تھا۔ شروع شروع میں کیف روزانہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر والوں سے ملنے کے لیے آتا رہا پھر ایک آدھ دن کا وقفہ دینے لگا اور یہ وقفہ بتدریج بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کی اور اس کی بیوی کی خاطر مدارات سوا ہوتی رہی۔

☆☆☆

سیف الدین اپنی صلاحیت سے ایف پی ایس سی کے ذریعے اٹھارھویں گریڈ میں پہنچ گئے تھے۔ تنخواہ کے ساتھ مراعات میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اب وہ ایف ٹائپ مکان کی الاٹمنٹ کا استحقاق رکھتے تھے بلکہ الاٹمنٹ دینے والے ارباب اختیار کی نظر کرم انہیں دو درجہ اوپر تک کی سرکاری رہائش گاہ بھی دلوا سکتی تھی مگر اپنی اور گھر والوں کی سہولت کے پیش نظر سیف الدین نے بڑے مکان کی الاٹمنٹ کے لیے کوشش نہیں کی۔ جس مکان میں وہ رہ رہے تھے وہاں انہیں بہت فائدے تھے۔ اس کا محل وقوع مثالی تھا۔ بس اسٹاپ گھر کے دروازے سے بمشکل بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ بازار، اسکول، کالج، بینک، ڈاکخانہ، اسپتال، کمیونٹی سینٹر، سینما ہاؤس، نائلہ کا گھر بھی کچھ نزدیک تھا۔ نائلہ کے بچے تو سیف الدین کی والدہ اور والد دونوں کی جان تھے۔ اسکول سے اپنے گھر جانے کے بجائے انہی کے گھر آتے اور اپنی ماں کے بھی وہیں آنے کے بعد سب دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے گھر جاتے۔ چھٹی کا دن تو تینوں بچے سارا وہیں گزارتے۔ نائلہ اور اس کا شوہر چھٹی کا دن کنوارے عاشقوں کی طرح انجوائے کرتے اور شام کو آ کر بچوں کو لے جاتے۔ بچے بمشکل جانے کو آمادہ ہوتے جو آزادی، پیار اور دیکھ بھال انہیں نانی ماموں کے گھر میں میسر تھی وہ اپنے گھر میں کب ملتی۔ وہاں تو ماں اور باپ دونوں ہی انہیں سختی میں رکھتے تھے۔

عائلہ کا آخری سمسٹر تھا اور سردیوں کے دن۔ بارش ہوئی اور سیف الدین کے والد کو ٹھنڈ لگ گئی۔ ایک دو دن کھانسی رہی پھر سینہ جکڑ گیا۔ سانس لینا بھی مشکل ہوگیا۔ گھریلو ٹوٹکوں سے طبیعت بہتر نہ ہوئی تو پہلے ڈاکٹر کے ہاں پھر اس کے مشورے پر اسپتال لے جانا پڑا۔ نمونیا تشخیص ہوا۔ چند دن اسپتال میں رہے پھر چل بسے۔ صدمہ تو تمام متعلقین کو تھا مگر والدہ کو جو صدمہ پہنچا وہ ناقابل بیان تھا۔ انہیں جذباتی سہارا دینے کو ساری اولاد ان کے اردگرد بیٹھ گئی۔ چہلم تک شہلا کا شوہر جو اسے کم ہی میکے میں لاتا لے جاتا تھا نہایت باقاعدگی سے اسے پنڈی سے اسلام آباد لاتا لے جاتا رہا۔ کیف اور اس کی بیوی شام کو بلاناغہ آ جاتے اور رات کا کھانا کھا کر جاتے۔ نائلہ کا گھر پچھلی گلی میں ہونے کی وجہ سے اسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ والدہ کا دل بہلانے کو اس نے بچے میکے میں چھوڑ رکھے تھے۔ اسکول سے واپسی پر خود بھی آ جاتی۔ رات کو والدہ کے سونے کے بعد دونوں میاں بیوی اپنے گھر جاتے۔ احباب و اقارب میں نائلہ کے شوہر کی اپنائیت اور سعادت مندی کے گن گائے جاتے۔ ''داماد ہو تو ایسا..... بیٹوں سے بڑھ کر ساس کا خیال رکھتا ہے۔''

والد کی علالت سے تکفین و تدفین اور بعد کے ہوش ربا اخراجات تک سیف الدین کے بہن بھائیوں میں سے کسی نے ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ جھوٹوں بھی کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ والد کی موت کے بعد اضافی اخراجات سے وہ کیونکر عہدہ برآ ہوئے تھے۔ یہ بات وہ صرف خود ہی جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے رقم ادھار لی تھی۔ کیف کی شادی کے موقع پر سرکاری خزانے سے جی پی فنڈ ایڈوانس قرض کی ماہانہ اقساط کی ادائیگی بھی جاری تھی۔ سیف الدین کو سرکاری قرضے کی واپسی کے ساتھ اب دوست سے لیا گیا قرض بھی ادا کرنا تھا۔ والدہ کو فکر میں نہ ڈالنے کی خاطر انہوں نے دوست سے قرضہ لینے والی رقم کا تذکرہ گھر میں کسی سے نہیں کیا تھا اور نہ کسی نے ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ وہ اضافی اخراجات کیونکر پورے کر رہے تھے۔

عائلہ کی شادی کے لیے سیف الدین نے سرکاری خزانے میں دو ڈول ابھی سے لٹکا دیے تھے۔ ہاؤس بلڈنگ ایڈوانس اور کار ایڈوانس اور ان دونوں قسم کے قرضوں کے لیے انہوں نے محکمے کے ان افسران تک ابھی سے سفارش پہنچانی شروع کر دی تھی جو ان قرضوں کے حصول کے لیے منتظر افراد کی باری آگے پیچھے کر دینے میں کمال رکھتے تھے۔

انسان کچھ سوچتا ہے، خدا کو کچھ اور منظور ہوتا ہے۔ والد کے انتقال کو سال بھی نہ ہوا تھا کہ والدہ کا ہارٹ فیل ہونے سے انتقال ہوگیا۔ والدہ کے جانے سے گھر کا سارا نظام ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ ان کی اصل اہمیت ان کے جانے کے بعد کھلی۔ ان کے ہونے سے کیسی ترتیب اور نظم و ضبط تھا گھر

میں۔ وہ کیا گئیں سارے معاملات ہی الٹ پلٹ گئے۔ سیف الدین کو تو یوں لگتا جیسے ان کی حیات کا مقصد ہی گم ہو گیا تھا۔ والدہ کو خوش اور مطمئن دیکھنا ان کی سب سے بڑی چاہ ہوا کرتی تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد دل جیسے خالی ہو گیا تھا۔ اجڑ گیا تھا، ویران ہو گیا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو تسلی دینے کے بجائے انہیں خود تسلی پانے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔

بہت دن گھر میں اداسی اور دکھ نے ڈیرے جمائے رکھے۔ نائلہ کے بچے بھی بجھ سے گئے تھے۔ عائلہ چھپ چھپ کر روتی۔ طیف والدہ کی یاد میں شاعری کرنے لگا تھا۔ والدہ کی موت نے اپنی اپنی جگہ ان سبھی کو دکھی کر رکھا تھا۔ بالآخر سیف الدین ہی کو حوصلہ کرنا پڑا۔ انہوں نے چھوٹے بہن بھائیوں کو دلاسا دیا، گلے لگایا۔ سر پر ہاتھ رکھا اور انہیں اپنے بڑے پن کا احساس دلایا۔

''میں ہوں نا تم لوگوں کے لیے...... تم میں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ امی ابو کے جانے سے اس گھر میں تمہاری حیثیت میں خدانخواستہ کوئی فرق آ گیا ہے...... تم لوگ مجھے اپنے اور بھی نزدیک محسوس ہونے لگے ہو...... میں امی اور ابو کی جگہ تو نہیں لے سکتا تم لوگوں کی زندگی میں مگر انشاء اللہ العزیز میں تمہیں ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔'' شادی شدہ بہنوں کو انہوں نے دلاسا دیا کہ وہ، ان کے شوہر اور بچے اس گھر میں اتنے ہی اہم اور چہیتے رہیں گے جتنے والدہ کی زندگی میں ہوا کرتے تھے۔

شادی کے لیے عائلہ کا معیار بہت اونچا ثابت ہوا۔ جو رشتہ آتا، وہ اس میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر اسے مسترد کر دیتی۔ کسی کی اسے شکل پسند نہ آتی، کسی کا قد چھوٹا لگتا۔ کسی کا کنبہ بڑا ہونے پر اعتراض کر دیتی تو کسی کی تنخواہ سن کر ہنس پڑتی۔ خدا کی مہربانی سے مل جانے والی ایک اچھی ملازمت نے اس کا دماغ عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتی، نتیجتاً بہن بھائیوں کی لاکھ کوشش کے باوجود سیف الدین کی خواہش کے مطابق خود ان سے پہلے عائلہ کی شادی نہ ہو سکی اور بہن بھائیوں نے سیف الدین سے کہا۔''عائلہ کی شادی کے انتظار میں آپ اپنا وقت کیوں گنواتے ہیں۔ بس اب آپ اپنی شادی کر لیجیے۔''

سیف الدین بیالیس سال کے ہو چکے تھے۔ انہیں سرکاری ملازمت کرتے اکیس سال ہو گئے تھے۔ سرکاری مکان کے مکین تھے۔ پبلک ٹرانسپورٹ سے سفر کرتے تھے۔ ملازمت میں ایمانداری اور گھریلو ذمے داریوں نے انہیں

اب تک چھوٹی موٹی پرانی گاڑی خریدنے کی استطاعت بھی نہ ہونے دی تھی جبکہ دفتر میں ان سے کم گریڈوں والے ساتھیوں کے پاس بھی گاڑیاں تھیں بلکہ بعض کے پاس تو نکور زیرو میٹر گاڑیاں۔ ان کے اپنے بہن بھائیوں میں نائلہ اور شہلا اپنے شوہروں کی گاڑیوں میں نہایت ٹھسے سے سفر کرتی تھیں۔ کیف اپنے سسر کی دو گاڑیوں میں سے ایک کا مالک بن بیٹھا تھا۔ عائلہ نے ڈرائیونگ سیکھ کر ایک پرانی مہران خرید لی تھی۔ طیف کو کیف نے اپنے سسر کے شوروم سے ماہانہ قسط پر ایک نئی موٹر سائیکل دلوا دی تھی۔ سب کے پاس اپنی اپنی ٹرانسپورٹ تھی سوائے سیف الدین کے اور انہیں اپنے دوستوں اور دفتر کے ساتھیوں سے اکثر یہ مشورے ملتے رہتے تھے کہ اٹھارہ گریڈ کے افسر ہو کر وہ پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے اچھے نہیں لگتے۔ انہیں گاڑی خرید لینی چاہیے۔

کار ایڈوانس اور ہاؤس بلڈنگ لون کے لیے متعلقہ ارباب اختیار تک سفارشیں پہنچوانے کے باوجود سیف الدین کو کار ایڈوانس کے لیے دو سال اور ہاؤس بلڈنگ لون کے لیے تین سال انتظار کرنا پڑا۔ کار ایڈوانس ملا تو ان کے ساتھیوں نے کہا۔''سیف الدین صاحب! پہلے تو ایڈوانس ملنے کی مٹھائی کھلائیے پھر گاڑی خریدنے کا پروگرام بنائیے...... بہت ہو گئی کنجوسی۔ پیٹرول اور گاڑی کی مینٹی نینس کے پیسے بچانے کے لیے آخر کب تک بسوں اور ویگنوں میں سفر کریں گے آپ۔'' سیف الدین مسکرا دیے۔ کچھ بولنے سے گریز کیا۔ ان کے ساتھیوں کو کیا معلوم کہ کار ایڈوانس کے لیے انہوں نے اپنی کس متوقع ضرورت کے لیے درخواست دی تھی۔ خدانخواستہ عائلہ کی شادی کار ایڈوانس کی منظوری سے پہلے ہو گئی ہوتی تو وہ اپنی ضرورت کہاں سے پوری کرتے...... کیا پھر کسی سے قرض! خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔

طیف تعلیم کے بہانے بیرونِ ملک جانے اور وہیں سیٹل ہو جانے کے چکر میں تھا۔ ایجنٹ نے لندن میں واقع ایک یونیورسٹی سے جس کا کرتا دھرتا ایک پاکستانی نژاد برطانوی شہری تھا اور مذکورہ ایجنٹ پاکستان میں اس کے لیے کمیشن پر کام کرتا تھا، طیف کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ اور جعلی بینک اسٹیٹمنٹ اور دیگر دستاویزات پر برطانیہ کے تعلیمی ویزے کی درخواست جمع کرا رکھی تھی۔ حسنِ اتفاق ادھر سیف الدین کو کار ایڈوانس ملا، ادھر طیف کے پاسپورٹ پر ویزا لگ کر آ گیا۔ سیف الدین کو گاڑی کی

خریداری کے لیے اپنے بنگلے سے ملنے والا ترشنہ طیف کے کام آ گیا۔ طیف خوش خوش برطانیہ چلا گیا۔ بہنیں فخر سے اپنے حلقۂ احباب میں بہانے بہانے طیف کے لندن مقیم ہونے کا تذکرہ کرتیں۔ انہیں یقین تھا کہ طیف اب برطانوی شہری بن کر ہی پاکستان واپس لوٹے گا اور اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتے کی لائن لگ جائے گی۔

☆☆☆

سیف الدین کے دوست، احباب اور دفتر کے ساتھی ایک عرصے سے ان سے ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔

''شادی کب کریں گے؟'' چونکہ شادی میں تاخیر ان کی اپنی رضا سے ہو رہی تھی بلکہ ان کی اپنی رضا بھی کیا، اللہ نے ان کے دل میں ڈالی تھی کہ وہ بہن بھائیوں سے نمٹ کر اپنا گھر بسانے کی سوچیں اس لیے دوست احباب اور کولیگز کا مسلسل یہ سوال انہیں زچ کرنے کے بجائے ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا۔ ''کرلیں گے جناب...... جلدی کیا ہے؟''

''جلدی!'' سوال کرنے والا انہیں تعجب سے دیکھتا۔

''سیف الدین صاحب! بہت دیر ہو چکی ہے۔ آپ کی عمر کے لوگوں کے بچے تو کالج، یونیورسٹی میں پہنچے ہوئے ہیں۔''

''ہو جائے گی...... ہو جائے گی صاحب...... شادی بھی ہو جائے گی۔'' سیف الدین اپنی شادی کے بارے میں متفکر احباب کو تسلی دیتے۔

''بچے چھوٹے رہ جائیں گے سیف الدین صاحب۔'' بہی خواہوں کے لہجے میں دل سوزی ہوتی۔

''اللہ مالک ہے۔''

اللہ پر سیف الدین کا یقین اور ایمان بہت پکا تھا اور یہ اللہ کی مہربانی کے بعد ان کی ان پڑھ ماں کی عطا تھی۔ اللہ سے محبت کو یوں تو انہوں نے اپنی تمام اولاد کے دل میں راسخ کرنے کی کوشش کی تھی مگر پہلی اولاد ہونے کے ناتے سیف الدین کے دل میں اللہ کی محبت راسخ کرنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ان کے بچپن میں وہ انہیں اٹھتے بیٹھتے اللہ کی وحدانیت، اس کی عظمت، قدرت اور ہیبت کا درس دیتی رہتی تھیں۔ اعمال کے نتیجے میں جنت اور دوزخ کا تصور اس بے پڑھی لکھی ماں نے سیف الدین کے ذہن میں ایسا سمو دیا تھا کہ ساری زندگی وہ دامن بچا بچا کر چلنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بھی خطا کا پتلا ہونے کے ناتے چھوٹی چھوٹی ان گنت غلطیاں ہوئی تھیں، ہوتی رہتی تھیں جن پر وہ خود احتسابی کی منزل سے گزرتے ہوئے اپنے رب کے حضور شرمندہ بھی ہو جاتے تھے۔ اب یہ اور بات تھی کہ ان کی سادہ دلی، مروت، والدین کی انتہائی فرماں برداری اور بہن بھائیوں سے ان کے حسن سلوک کے باعث لوگ انہیں فرشتہ کہتے تھے اور وہ اس پر بھی شرمندہ ہوتے تھے۔

سیف الدین کے مقدر میں شاہانہ محبوب لکھی تھیں۔

شاہانہ ان کے ایک کولیگ کی ہمشیرہ تھیں۔ ایم اے پاس تھیں اور ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کر رہی تھیں۔ ان کی شادی میں خاصی تاخیر ہو چکی تھی اور اس تاخیر کی وجہ یہ بھی کہ ان سے چھوٹی تین بہنیں رنگ روپ میں اپنی کشمیری ماں پر گئی تھیں جبکہ شاہانہ اپنے ساؤتھ انڈین باپ کا نقشِ ثانی تھیں۔ پکی رنگت اور پھیلے پھیلے نقوش مگر تھیں بہت سگھڑ اور بااخلاق۔ ان کے بھائی نے جو سیف الدین کے کولیگ تھے اور ایک عرصے سے ان پر اپنی بہن کے لیے نظریں رکھے ہوئے تھے، یہ سن کر کہ سیف الدین کا گھر بسانے کے لیے ان کے گھر والے لڑکی تلاش کر رہے تھے۔ ایک روز موقع دیکھ کر سیف الدین کے سامنے اپنی بہن کا ذکر چھیڑ دیا اور انتہائی دل گرفتگی سے کہا۔ ''چھوٹی تینوں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں سیف صاحب...... سب سے بڑی ابھی گھر میں بیٹھی ہیں کیونکہ وہ چھوٹی بہنوں کی طرح خوب صورت نہیں تھیں مگر کمال کا کھانا پکاتی ہیں۔ ہماری والدہ کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو گیا، ان کے بعد اسی بہن نے ہماری ماں کی جگہ لی۔ ملازمت بھی کرتی ہیں۔ خاندان میں ان کے اخلاق کی مثالیں دی جاتی ہیں۔'' موصوف کی تان اس پر ٹوٹی۔ ''کوئی مناسب رشتہ نظر میں آئے تو بتائیے گا سیف الدین صاحب...... نیکی کا کام ہے۔''

سیف الدین کی بہنیں ان کے لیے کوئی خوب صورت، خاندانی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ترجیحاً انہی کی ہم پلہ افسر لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ سیف الدین نے انہیں اپنے کولیگ کی ہمشیرہ کے لیے رشتہ لے جانے کی راہ دکھائی۔ سب خوش خوش گئے کہ بھائی نے اپنے لیے خود ہی رشتہ ڈھونڈ لیا تھا مگر منہ بسورتے واپس لوٹے۔ ہر ایک اپنی اپنی مایوسی کا برملا اظہار کر رہا تھا۔

''بھائی! وہ لوگ آپ کے معیار کے نہیں تھے۔'' شہلا نے کہا۔

''کیوں بھئی!''

''آپ ماشاء اللہ انیس گریڈ میں جانے والے ہیں۔ لڑکی کے ابا ریٹائرڈ کلرک اور بھائی آپ ہی کے دفتر میں سترہ گریڈ میں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''لڑکی آپ کو کیسی لگی؟'' سیف الدین سے پوچھا گیا۔

''اللہ کی بندی ہے۔''

''ہمارا مطلب ہے صورت شکل؟''

''ٹھیک ہے۔''

''اور عمر...... عمر کا اندازہ لگایا آپ نے؟'' نائلہ نے کہا۔

''چھوٹی تین بہنوں کی شادی ہو چکی ہے، ظاہر ہے نوجوان تو ہو نہیں سکتی تھی، میری عمر معلوم ہے نا تمہیں۔''

نائلہ نے پہلو بدلتے ہوئے شہلا اور عائلہ کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے...... شریف لوگ ہیں...... بہن کی شادی نہ ہونے سے پریشان ہیں۔ ہم کسی کی پریشانی گھٹائیں گے تو اللہ ہمیں بھی آسانیاں دے گا۔'' سیف الدین کے دل میں عائلہ کی فکر مچل رہی تھی۔

''اچھی طرح سوچ لیں سیف بھائی...... بعد میں یہ نہ کہیے گا کہ تم لوگوں نے مجھے سمجھایا بجھایا نہیں۔''

سیف الدین کے لبوں پر بڑی مدبرانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ارے بھئی سوچا گیا ہے...... شادی سے انسان کو زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔ گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔''

''آپ کو ان سے بہتر لوگ مل سکتے ہیں بھائی۔''

''میرے لیے یہی ٹھیک ہیں۔''

سیف الدین کی شادی شاہانہ محبوب سے ہو گئی۔ محبوب ان کے والد کا نام تھا، شادی کے بعد وہ شاہانہ سیف ہو گئیں۔ شاہانہ متوسط گھرانے سے آئی تھیں۔ رشتوں کا احترام کرنا جانتی تھیں۔ شب عروسی سیف الدین نے ان سے ایک ہی مطالبہ کیا تھا۔ ''میرے بہن بھائیوں کا اسی طرح خیال رکھنا جیسے میں رکھتا ہوں۔'' شاہانہ سمجھدار تھیں، اپنے بوڑھے باپ کی یہ نصیحت پلو میں باندھ کر بابل کے گھر سے چلی تھیں کہ شوہر کو اپنا بنانا ہو تو چپ کر کے اس کی ہر بات مانتی جاؤ...... دو سال تم اس کی بات سنو اور مانو پھر باقی ساری زندگی وہ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔

چنانچہ سیف الدین کی شادی کے بعد بھی ان کے گھر میں شادی شدہ بہنوں، ان کے شوہروں اور بچوں کو وہی اہمیت حاصل رہی جو ان کی شادی سے قبل تھی۔ کیف اور اس کی بیوی تو شاہی جنڈی کی طرح اپنے بچوں کے ساتھ آتے۔ عائلہ کے نخرے اسی طرح برقرار رہے۔ گھر کے کام کاج سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد اس کا زیادہ وقت موبائل اور سوشل میڈیا پر گزرتا۔ چھٹی والے دن وہ لمبی تان کر سوتی اور ظہر سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ نہ کھولتی۔ نائلہ اور اس کے بچوں کا تو خیر روزانہ ہی چکر لگ جاتا تھا پھر بھی سیف الدین چھٹی والے دن کبھی نائلہ، کبھی شہلا اور کبھی کیف اور اس کے بال بچوں کو باقاعدہ دعوت دے کر اپنے ہاں مدعو کر لیتے۔ کبھی سب کو اکٹھا بھی بلا لیتے۔ ویسے سیف الدین تھے انصاف پسند اور فراخ دل۔ اپنے بہن بھائیوں کی طرح بیگم کے میکے والوں کو بھی نہایت احترام اور اہمیت دیتے، بہانے بہانے انہیں بھی اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے۔ کبھی حلیم کی دعوت پر، کبھی سری پائے کھانے کے لیے، کبھی اپنی شادی کی سالگرہ منانے تو کبھی کسی اور بہانے۔ بیگم کی ملازمت انہوں نے شادی کے بعد چھڑوا دی تھی۔

شاہانہ کیسی ہی سمجھدار سہی، تھیں تو عمومی فطرت سے متصف۔ اپنے گھر والوں کا آنا تو انہیں بہت اچھا لگتا۔ سیف الدین کے بہن بھائیوں کا آنا کچھ کھلتا۔ ایک حد ہوتی ہے آنے جانے کی بھی۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ آج شہلا تو کل کیف! نائلہ اور اس کے بچوں کا ظہور تو صبح شام رہتا تھا۔ سیف الدین بازار سے پھل، مٹھائی، کیک، نمکو، ڈرائی فروٹ غرض اس قسم کی جو چیز بھی لاتے، بیگم کو ان کی پہلی ہدایت یہی ہوتی۔ ''نائلہ کے ہاں بھی بھجوا دینا۔'' اور شاہانہ دل ہی دل میں اس وقت کو برا بھلا کہہ رہی ہوتی جب نائلہ کو سیف الدین کے گھر کے نزدیک سرکاری مکان الاٹ ہوا تھا۔ سیف الدین رات کو کھانے کے بعد بیگم کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلتے تو ان کی واک نائلہ کے گھر کے دروازے پر جا کر تھمتی۔ ''آؤ کھڑے کھڑے ہو لیتے ہیں۔'' بیگم کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑتا اور نائلہ کو بھائی کو دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا۔

''بھائی! ہمارے باتھ روم کی فلش ٹنکی کام نہیں کر رہی ہے، آپ ذرا انکوائری والوں سے کہہ تو دیجیے گا پلمبر بھیجیں گے۔''

''ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو، کل آفس جاتے ہوئے کہہ دوں گا۔''

شاہانہ دل ہی دل میں تلملانے لگتیں۔ ''جب آؤ یہ عورت بھائی کے ذمے کوئی نہ کوئی کام لگا دیتی ہے۔ اس کا شوہر آخر کس مرض کی دوا ہے۔''

☆☆☆

شادی کے دوسرے سال سیف الدین پہلے بیٹے کے باپ بنے تو انہوں نے بیگم کی زچگی اور بچے کی ابتدائی ضرورتوں پر اپنی استطاعت سے بڑھ کر کھلا خرچہ کیا۔ ان کے ایک دوست نے انہیں مبارکباد اس انداز سے دی

جیسے خدانخواستہ پرسہ دے رہے ہوں۔ ''بہت مبارک ہو سیف الدین صاحب مگر...... آپ نے دیر بہت کردی۔ آپ کی ریٹائرمنٹ کے وقت صاحبزادے حد سے حد کالج میں ہی ہوں گے...... دیر سے شادی کرکے آپ گھاٹے میں رہ گئے۔''

''اللہ کی مرضی جناب۔'' سیف الدین نے مسکراتے ہوئے متوکل سے انداز میں کہا۔

''ہاں!'' مبارکباد دینے والے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''مرضی تو اسی کی ہوتی ہے مگر اس نے بندے کو بھی تو کچھ اختیار دے رکھا ہے نا صاحب...... شادی وقت پر ہی اچھی۔''

''جناب! اب وقت کا پہیا الٹا تو نہیں گھما سکتا میں۔'' سیف الدین بنا کسی ملال کے بولے اور ملال نہ ہونے کا سبب وہ طمانیت تھی جس نے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ان کے بے لوث، بے غرض سلوک نے ان کے دل میں گھر کر رکھا تھا۔

''درست فرماتے ہیں آپ۔'' سیف الدین کے دوست نے اپنا ہاتھ ان کے شانے پر رکھ دیا۔ ''وقت کا پہیا تو کوئی بھی الٹا نہیں گھما سکا آج تک...... اصل میں آپ نے اپنے شانوں پر ذمے داریوں کا بوجھ بھی تو بہت اٹھا رکھا تھا نا۔''

سیف الدین ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے متعلقین کے ساتھ اپنے حسنِ سلوک کا نہ اپنی زبان سے چرچا کرتے ہیں، نہ ہی دوسروں کی زبان سے اس کا ذکر سن کر خوش ہوتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے دخل در معقولات سمجھتے ہیں۔

چنانچہ اپنے دوست کی بات پر سیف الدین نے بڑے تحمل سے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔'' سیف الدین کے دوست پسپائی کے موڈ میں نہ تھے۔ ''آپ کہیں یا نہ کہیں، سب جانتے ہیں کہ آپ نے اپنے بہن بھائیوں کے لیے بڑی قربانی دی ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا جناب۔'' سیف الدین کو ان کا دخل در معقولات ایک آنکھ نہ بھایا۔ ''میرے بہن بھائی اپنی صلاحیتوں اور کوشش سے اپنی اپنی منزل تک پہنچے ہیں۔''

''خیر۔'' سیف الدین کے دوست ان کے تاثرات دیکھ کر کچھ جھینپ سے گئے اور مقطع ادا کیا۔ ''ہم نے تو زندگی سے یہ سیکھا ہے جناب کہ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو پچاس فیصد خود غرض ضرور ہونا چاہیے۔''

سیف الدین ان کا منہ دیکھنے لگے۔ حیرانی سے نہیں، رشک سے نہیں اور قائل ہو کر بھی نہیں بلکہ ترس کھا کر...... سبحان اللہ! کیا سیکھا تھا انہوں نے زندگی سے۔

سیف الدین کی نظروں کی کاٹ ایسی تھی کہ ان کے دوست تاب نہ لا کر نگاہیں چراتے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

اگلے برس شاہانہ ایک بیٹی کی ماں بن گئیں۔ بیٹی خوش قسمت تھی۔ طویل انتظار کے بعد سیف الدین کو اپنے محکمے سے ہاؤس بلڈنگ لون مل گیا۔ بیٹی کی پیدائش اور لون کی منظوری آگے پیچھے ہوئی۔ سیف الدین نے بیٹی کا نام فرحانہ رکھا۔ شاہانہ بیگم اور ان کے گھر والوں نے سیف الدین کو مشورہ دیا کہ ہاؤس بلڈنگ کی مد میں ملنے والے قرضے کی رقم سے اسلام آباد کے مضافات میں کسی پرائیویٹ ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہائشی پلاٹ خرید کر ڈال دیں تاکہ جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوں تو ریٹائرمنٹ کے وقت ملنے والے واجبات سے اپنے بال بچوں کے لیے اس پلاٹ پر مکان تعمیر کر سکیں کیونکہ ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری مکان تو انہیں بہرحال چھوڑنا ہوگا اور بچوں میں سے کوئی بھی ان کی ریٹائرمنٹ کے وقت اس لائق نہیں ہوگا کہ قواعد کے مطابق باپ کو ملی سرکاری رہائش گاہ اس کے نام الاٹ کی جا سکے۔

سسرالیوں کا مشورہ نہایت صائب تھا۔ سیف الدین نے دارالخلافہ کے مضافات میں نقشہ پاتی نئی آبادیوں میں اپنے بچوں کے محفوظ مستقبل کے لیے پلاٹ دیکھنا شروع کیے۔ اسلام آباد کے سیکٹرز میں تو ان جیسا کوئی آدمی اب پانچ مرلہ زمین کا ٹکڑا خریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پراپرٹی مافیا نے لاکھوں کی زمین کروڑوں تک پہنچا دی تھی۔ سرکاری ملازمین کو تھوڑی بہت آس ہاؤسنگ فاؤنڈیشن سے ہوتی تھی جو اپنی ناقص کارکردگی سے سفید ہاتھی بنا ہوا تھا۔ بڑی امیدوں اور جوش و خروش سے فاؤنڈیشن کی اسکیموں میں پیسا لگانے والے اپنا گھر بنانے کا خواب دیکھتے دیکھتے قبروں میں جا سوئے تھے اور فاؤنڈیشن زمین ہی واگزار نہ کرا پائی تھی۔

دفتر سے چھٹی کے بعد روزانہ سیف الدین پلاٹ کی تلاش میں نکل جاتے۔ ایک دو جگہیں پسند آئیں مگر پراپرٹی مافیا کے انویسٹرز ان کے پسند کردہ پلاٹوں کو یوں جھپٹ لے گئے جیسے چیل گوشت کو۔

سیف الدین پلاٹ دیکھتے ہی پھر رہے تھے کہ نائمہ کی سفارت کاری سے عائلہ کے لیے ایک ہم پلّہ رشتہ آ گیا اور ادھر طیف کی طرف سے خوشخبری ملی کہ ایک برٹش نیشنل گھرانے کی لڑکی سے شادی کرنے کے بعد وہ اپنے خاندان والوں سے دلہن کو ملوانے اور دعوتِ ولیمہ کے لیے پاکستان آنے کے لیے رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ سیف الدین نے پلاٹ دیکھنے کی مہم فوراً ترک کر دی۔ بس یہی آخری دو بہن بھائی تھے جن کی فکر انہیں اکثر مضطرب کر دیا کرتی تھی۔

پلاٹ کا کیا تھا وہ تو پھر بھی مل جاتا۔ صد شکر کہ مذکورہ رشتہ عائلہ کو خود بھی پسند آ گیا تھا۔ رشتے کی منظوری میں عائلہ کی پسند کے ساتھ نائلہ کا اسے یہ سمجھانا بجھانا بھی کام کر گیا تھا کہ بھائی اگر ہاؤس بلڈنگ لون کی رقم سے پلاٹ خرید بیٹھے تو بعد میں اگر کوئی دوسرا معقول رشتہ آیا بھی تو شادی کے اخراجات کون اٹھائے گا۔ عائلہ خود تو اتنی ہوشیار تھی کہ اس نے صاف اعلان کر رکھا تھا کہ اپنی شادی پر وہ اپنی جیب سے ایک پیسا بھی نہیں خرچ کرے گی۔ اسے رخصت کرنا بھائیوں کی ذمے داری تھی۔ ''بھائیوں'' تو وہ تکلفاً کہتی تھی۔ کیف اپنی زندگی میں مگن تھا، طیف حالانکہ جز وقتی ملازمت سے پاؤنڈز کما رہا تھا مگر کبھی پھوٹی کوڑی بھی نہ بھیجی تھی اس نے۔ لے دے کر سیف الدین ہی رہ جاتے تھے۔

عائلہ کا رشتہ منظور ہو گیا۔ شادی کی تیاریاں چھڑ گئیں۔ سیف الدین نے طیف سے بھی کہہ دیا کہ وہ اپنی دلہن کے ساتھ پاکستان آنے کی جلد تیاری کرے تاکہ عائلہ کی رخصتی اور اس کا ولیمہ ایک ہی تقریب میں نمٹ سکے۔

شاہانہ جو چوتھی بار ماں بننے والی تھیں، تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سیف الدین سے بولیں۔ ''کیا بات ہے، آپ پلاٹ نہیں دیکھ رہے ہیں؟''

''بھئی وہ..... عائلہ کی شادی اور طیف کا ولیمہ کرنا ہے۔ اگر پلاٹ خرید لیا تو ان کی شادی اور ولیمے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔''

''آپ ہی نے ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔ عائلہ خود بھی کماتی ہے اور طیف بھی وہاں پارٹ ٹائم جاب کرتا ہے۔ کچھ تو جمع پونجی ہو گی اس کے پاس..... دوسرے بہن بھائیوں سے کہیے وہ بھی کچھ ہاتھ بٹائیں۔''

''کوئی بات نہیں شاہانہ..... بس اب یہ آخری آخری ذمے داریاں ہیں۔'' سیف الدین نے نہایت رسان لہجے میں کہا۔

''کچھ اپنے بچوں کے لیے بھی سوچیں۔'' بیگم بولیں۔

''اللہ مالک ہے۔'' سیف الدین نے انہیں تسلی دی۔ وہ خاموش ہو رہیں۔ اولاً والد کی نصیحت کے باعث جو شادی کے بعد دو سال تک موقوف رہنے کے بجائے اب ان کی عادت ہی بن گئی تھی دوم اس لیے کہ سیف الدین ان کا اور بچوں کا بھی اسی قدر خیال رکھتے تھے جتنا اپنے بہن بھائیوں کا۔ شکایت انہیں تب ہوتی اگر وہ ان کی یا بچوں کی حق تلفی کرتے۔ وہ ایک اچھے شوہر اور اچھے باپ تھے۔

عائلہ کی شادی اور طیف کے ولیمے کے متوقع اخراجات کے پیشِ نظر سیف الدین نے اپنے جی پی فنڈ سے دوبارہ رقم نکلوانے کے لیے بھی درخواست دے دی۔ جی پی فنڈ سے گزشتہ لون کی رقم وہ اقساط میں واپس کر چکے تھے۔ اس مرتبہ چونکہ وہ پچاس سال کی عمر کو پہنچے ہوئے تھے لہٰذا اس مرتبہ انہوں نے جی پی فنڈ سے ناقابلِ واپسی رقم کی درخواست دی۔

ہاؤس بلڈنگ لون کی رقم سیف الدین کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں امید تھی کہ جی پی فنڈ سے لی جانے والی رقم اور ہاؤس بلڈنگ لون سے سارے اخراجات بخیر و خوبی نمٹ جائیں گے لیکن عائلہ کے سسرال والوں نے شادی سے دو دن قبل جہیز میں صرف بیڈروم فرنیچر نہیں، ڈرائنگ روم فرنیچر کی بھی فرمائش کر کے سیف الدین کو کشمکش سے دوچار کر دیا۔ اپنی عادت کے مطابق انہوں نے عائلہ کے جہیز کی ہر چیز نہایت عمدہ اور معیاری خریدی تھی۔ کافی خرچہ ہو گیا تھا، اب ان کا بجٹ عائلہ کے سسرال والوں کی فرمائش کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس اب اتنی رقم تھی جس سے وہ عائلہ کی برات اور طیف کے ولیمے کی دعوت ہی نمٹا سکتے تھے۔ دعوت کا انتظام بھی انہوں نے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کیا تھا۔ وقت کم تھا یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا کہ عائلہ کی سسرال کی طرف سے کی جانے والی فرمائش کون پوری کرے گا۔ سیف الدین کے سوا کوئی اس فرمائش کو سنجیدگی سے لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

''بڑے لالچی لوگ ہیں۔'' نائلہ تنک کر بولی۔

''عجیب بات ہے لوگ یوں بھی مانگتے ہیں۔'' کیف نے کہا۔

''فقیر کہیں کے۔'' شہلا نے ناگواری ظاہر کی۔

''باہر یہ سب کچھ نہیں ہوتا..... تھینکس گاڈ! میں یہاں سے نکل گیا ہوں۔'' طیف نے شانے اچکائے۔

''انہوں نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی، بھائی ان سنی کر دیں۔'' عائلہ نے کہا مگر ان سنی نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ

عزت کا معاملہ تھا اور سسرال میں عائلہ کے مستقبل کا بھی۔
سیف الدین کے دل میں تو یہ تھا کہ عائلہ کو صرف ڈرائنگ ہی نہیں ڈائننگ سیٹ بھی دیا جائے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے کیف سے ادھار مانگا۔

''بھائی! میرے تو اپنے حالات..... پتا نہیں کیسے اللہ عزت سے گزارہ کرا رہا ہے۔'' کیف نے لاچاری ظاہر کی۔

نائلہ سے بات کرنے سے پہلے سیف الدین کو بار بار شرمندگی کا احساس ہوا کہ وہ چھوٹی بہن سے قرض مانگنے جا رہے تھے۔ نائلہ کفایت شعار تھی۔ میاں بیوی دونوں کماتے تھے، خوشحال تھے۔ نائلہ نے ایک سرکاری ہاؤسنگ اسکیم میں اپارٹمنٹ بک کرا رکھا تھا جس کی سہ ماہی قسط بینک میں جمع کروانے کے لیے وہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے سیف الدین کی خدمات لیتی آ رہی تھی۔ ابھی دو دن پہلے ہی اس نے سیف الدین سے کہا تھا، اپارٹمنٹ کی اگلی سہ ماہی قسط کی رقم وہ ایک دو دن میں بینک سے نکلوا کر انہیں دے دے گی تا کہ وہ قسط اس بینک میں جمع کروا سکیں جو کہ ان کے دفتر کے نزدیک ہی واقع تھا۔ سیف الدین کو امید تھی کہ وہ انہیں رقم ادھار دے دے گی اور وہ قدرے تاخیر سے اپارٹمنٹ کی قسط جرمانے کے ساتھ ادا کر دیں گے مگر جب انہوں نے اس سے رقم ادھار مانگی تو وہ بولی۔ ''بھائی! میں نے تو قسط جمع کروا دی۔''

''اچھا۔'' سیف الدین چونکے۔

''ہاں..... میں نے سوچا آپ عائلہ کی شادی اور طیف کے ولیمے کے سلسلے میں ویسے ہی بہت مصروف ہیں۔ آپ کو کیا تکلیف دوں۔ اس لیے میں نے خود ہی جا کر قسط جمع کرا دی۔'' اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

عائلہ کے سسرال والوں کی فرمائش پوری کرنے کے لیے سیف الدین کو پریشان دیکھ کر ان کی بیگم نے اپنا زیور ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سیف الدین بیگم کا زیور نظر بھر کر بھی نہ دیکھتے مگر اس وقت عزت کا معاملہ تھا۔ سیف الدین نے عائلہ کو نہ صرف ڈرائنگ روم فرنیچر بلکہ ڈائننگ ٹیبل سیٹ بھی دیا۔ عائلہ عزت سے سسرال کی ہوئی۔ طیف اپنی بیوی کے ساتھ دعوتیں اڑا کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

سیف الدین کی اگلے گریڈ میں ترقی ہوئی تو بیگم نے ان سے نہایت لگاوٹ سے کہا۔ ''دیکھیے، میں نے شادی سے اب تک آپ سے کوئی فرمائش، کوئی ضد نہیں کی..... ہاؤس بلڈنگ لون سے آپ نے اپنا گھر بنانے کے لیے کوئی پلاٹ خریدنے کے بجائے بہن اور بھائی کو تھما دیا، میں کچھ نہیں بولی لیکن اب آپ کو بڑا گھر لینا پڑے گا۔ آپ انیسویں گریڈ کے افسر ہیں تو چودہ گریڈ کے مکان میں کیوں رہیں ہم۔''

''کیا فرق پڑتا ہے..... آج نہیں تو کل جب میں ریٹائر ہوں گا تو مکان چھوٹا ہو یا بڑا چھوڑنا تو پڑے گا..... بچوں میں کوئی اس وقت تک سرکاری نوکری میں نہیں ہو گا جو مکان اس کے نام کروا دیا جائے۔''

''اسی لیے تو کہتی ہوں چند سال ہم بھی سرکاری بنگلے میں رہنے کا مزہ اٹھا لیں۔ اتنا بڑا تو لان ہوتا ہے جی ٹائپ مکان میں کہ مہمان آ جائیں تو لان میں بیٹھ کر ہی چائے پی لی۔ وہیں دعوت کا بندوبست کر دیا۔ ایک نہیں دو دو تین تین گاڑیاں کھڑی دیکھی ہیں میں نے جی ٹائپ مکانوں میں۔''

سیف الدین دھیرے سے مسکرائے۔ ''ہمارے پاس تو موٹر سائیکل بھی نہیں پھر کیوں پریشان ہوتی ہو۔''

''آپ بڑا گھر تو لیں، گاڑی بھی آ جائے گی۔''

''کہاں سے؟'' سیف الدین بے اختیار چونکے۔

''میں نے سوچ رکھا ہے۔ بڑا گھر ہو گا تو گاڑی ضرور خریدنی ہے۔ میں نے کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ جب آپ بڑا گھر لیں گے تو میں کمیٹی لے لوں گی، بینک سے لیز پر گاڑی خرید لیجیے گا..... چودہ پندرہ گریڈ والے گاڑیاں دوڑائے پھرتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ انیس گریڈ کے افسر ہو کر بھی ویگنوں میں سفر کرتے ہیں۔''

''ارے بھئی تو اس میں کون سی کوئی شان گھٹ جاتی ہے میری۔'' سیف الدین نے کہا۔

''شان گھٹے یا بڑھے، اب گاڑی لینی ہے۔ بچے ترستے ہیں اپنی گاڑی کے لیے۔''

''اللہ دے گا..... ضرور دے گا۔''

''برائے مہربانی، آپ بڑے مکان کے لیے اپلائی کر دیں۔''

''دیکھو، یہاں نائلہ ہمارے نزدیک رہتی ہے۔ کیف کا گھر نزدیک ہے۔'' سیف الدین نے حسب عادت نہایت نرم لہجے میں کہا۔

''معاف کیجیے گا، اتنی زندگی تو آپ اپنے بہن بھائیوں کے لیے جی لیے۔ اب کچھ اپنے بچوں کے لیے بھی جی لیجیے!'' آخری فقرہ شاہانہ نے گڑگڑا کر ادا کیا۔

سیف الدین ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ کیا کمی تھی، بچوں کی زندگی میں۔ بہترین کھانا پینا، بہترین لباس، سرکاری مگر اچھی درس گاہیں، بیگم اور بچوں کی ہر ضرورت، ہر آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے وہ پھر بیگم کو ان سے کس بات کا گلہ تھا جو انہوں نے دبی زبان ہی سے سہی گلہ کیا تو تھا۔

''بچوں ہی کے لیے ہے شاہانہ۔'' وہ فقط اتنا ہی کہہ سکے۔

''بڑے گھر کی کوشش کریں...... اور ہاں، گاڑی بھی لیں بچوں کے لیے...... آپ کو بھی آسانی ہوگی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے گاڑی کے لیے للچاتے رہیں۔''

بیگم کی سیف الدین سے یہ دو فرمائشیں پہلی عند بھی تھی، آخری بھی۔ سیف الدین نے جی ٹائپ مکان کی الاٹمنٹ کے لیے نہ صرف درخواست داغ دی بلکہ کسی جی ٹائپ مکان اور اسے الاٹ کرانے کے لیے کسی تگڑی سفارش کی تلاش میں بھی لگ گئے۔

برس سوا برس تو لگا مگر سیف الدین کو وزارت ہاؤسنگ و تعمیرات میں اپنے ایک شناسا کے توسط سے ایک جی ٹائپ مکان بھی علم میں آگیا جو جلد ہی اپنے مکین کی ریٹائرمنٹ پر خالی ہونے والا تھا اور حسنِ اتفاق سے سیف الدین کو ایک تگڑی سفارش بھی میسر آگئی۔ مذکورہ مکان ''سبجیکٹ ٹو ویکیشن'' سیف الدین کو الاٹ کر دیا گیا۔ سیف الدین اپنی فیملی کے ساتھ جی ٹائپ سرکاری بنگلے میں منتقل ہو گئے۔ انہیں افسوس تھا تو یہ کہ نائلہ کا گھر اب ان کے گھر سے بہت دور نہیں تو پہلے کی طرح بہت نزدیک بھی نہیں رہا تھا۔ بہر حال بڑے گھر میں آ کر ان کی بیگم اور بچے بھی خوش تھے۔ مکان دو منزلہ تھا۔ سرونٹ کوارٹر اتنا بڑا تھا کہ ایک کنبہ بڑے آرام سے اس میں رہ سکتا تھا۔ وسیع اور سرسبز لان، کشادہ پورچ، صحن، برآمدے سبھی کچھ تو تھا اس گھر میں۔ مکان کی بالائی منزل پر ایک کمرا شاہانہ نے گھر آئے گئے مہمانوں کے لیے گیسٹ روم کے طور پر آراستہ کر دیا۔ ہمسایوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی اپنا سرونٹ کوارٹر کرائے پر اٹھانے کی بات کی تو سیف الدین نے کہا۔ ''یہ ناجائز اور غیر قانونی ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اپنے ملازمین کو جو مکان الاٹ کیے جاتے ہیں انہیں پورا یا کوئی حصہ کرائے پر چڑھانا غیر قانونی ہے اور اس سے حاصل ہونے والا کرایہ ناجائز رقم۔''

''گر آس پاس سبھی نے تو چڑھا رکھے ہیں اپنے اپنے سرونٹ کوارٹر کرائے پر۔'' بیگم نے سیف الدین سے کہا۔

''ہاں۔'' سیف الدین ان کی بات سے اختلاف نہ کر سکے۔ ''مگر ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کریں گے۔''

''آپ کی مرضی۔''

سرونٹ کوارٹر میں ایک غریب فیملی رکھ لی گئی۔ مرد محنت مزدوری کے ساتھ سیف الدین کے گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتا۔ عورت سیف الدین کی بیگم کا گھرداری میں ہاتھ بٹاتی۔

سیف الدین کا اب بھی اپنے بھائی بہنوں سے پہلے کی طرح مستقل رابطہ رہتا۔ بہانے بہانے سے وہ انہیں کبھی اکٹھے اور کبھی علیحدہ علیحدہ اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی بہن اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ان کے ہاں رک بھی جاتی۔ سیف الدین نے گاڑی بھی خرید لی تھی۔ ایڈوانس بیگم نے دیا، باقی بینک سے معاملات طے ہوئے۔ سیف الدین کو ماہانہ قسط ادا کرنا پڑتی۔ گاڑی بڑی تھی، زیرو میٹر بھی۔ سیف الدین کی افسری کے شایانِ شان تھی۔ انیس گریڈ کے افسر کو چھوٹی موٹی پرانی گاڑی کہاں زیب دیتی۔ بیگم اور بچے بہت خوش تھے اور ان کی خوشی سے سیف الدین بھی خوش تھے۔

☆☆☆

سیف الدین نے ساری زندگی فیاضی سے گزاری تھی۔ ماں، باپ، بہن بھائیوں کی ہر ضرورت، ہر خواہش کھلے دل سے پوری کی تھی۔ گو ان کے وسائل کبھی بھی بے بہا نہ رہے تھے مگر نیت کی راستی نے ان کے محدود وسائل میں غیر معمولی برکت دی تھی۔ گھر کی کوئی ضرورت، اہلِ خانہ میں سے کسی کی کوئی خواہش ہوتی ان کی جیب خالی ہوتی اور وہ یہ سوچ رہے ہوتے کہ یہ ضرورت کہاں سے پوری ہوگی، اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا۔ کوئی بڑا خرچہ سر پر کھڑا ہوتا والدہ فکرمند ہو رہی ہوتیں کہ یہ ضرورت کیونکر پوری ہوگی، غیب سے کوئی سبیل نکل آتی۔ سیف الدین کے کبھی رکے ہوئے واجبات مل جاتے۔ کبھی دفتر میں ڈالی ہوئی کمیٹی نکل آتی۔ کبھی کار ایڈوانس، کبھی ہاؤس بلڈنگ لون، کبھی جی پی فنڈ سے لی جانے والی رقم ضرورت پوری کرنے کا سامان بن جاتی۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد سیف الدین نے والدہ کا پرس کبھی خالی نہ رہنے دیا۔ زندگی کی روزمرہ ضرورتیں، بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات، بیماری، مہمان داری، تہوار، شادی بیاہ، لینا دینا سب کچھ اللہ نے بحسن و خوبی پورا کرایا۔ سیف الدین کا دل اور ہاتھ ہمیشہ کھلے ہی رہے۔ خست ان کی فطرت میں تھی ہی نہیں پھر

بھلا وہ اپنے بال بچوں کے معاملے میں خست کیسے دکھا سکتے تھے۔ بیگم کسی ایک چیز کی ضرورت ظاہر کرتیں، وہ دو لا حاضر کرتے۔ بچے ایک فرمائش کرتے، وہ اصرار کرکے ان سے تین فرمائشیں مزید اگلواتے۔

سیف الدین کے ہاں روزمرہ استعمال کی چیزوں کی ریل پیل رہتی۔ فریج اشیائے خورونوش سے بھرا رہتا۔ بن بلائے مہمان بھی گھر آجاتے تو بیگم کو ان کی خاطر تواضع کے لیے ہراساں نہ ہونا پڑتا۔ آئے دن بھائی بہنوں کی دعوتیں ہوتیں۔ انہیں اور ان کے بچوں کو لینا دینا ہوتا۔ آج اس کی سالگرہ تو اگلے مہینے کسی اور کا جنم دن۔ کوئی پاس ہو رہا ہے، کسی کو نیا موبائل درکار ہے، کبھی عیدی، کبھی بقرعیدی، غرض ایک نہیں سو طرح کے خرچے اور سیف الدین کا ہاتھ دینے کو تیار۔ رشتے داروں اور احباب واقارب کو دینے کے معاملے میں بھی سیف الدین اپنا دل کھلا رکھتے۔

ہر ماہ تنخواہ اکاؤنٹ میں آجانے کے بعد سیف الدین ماہانہ سودا سلف کی خریداری کے لیے بیگم کے ہمراہ اپنے پسندیدہ گروسری اسٹور جاتے اور ڈھیروں ڈھیر گروسری خرید لاتے۔ وہ چیزیں بھی جو گھر میں پہلے ہی موجود ہوتیں مزید خرید لیتے، بیگم ٹوکتیں۔ ''یہ ہے نا گھر میں۔''

''ارے بھئی کام آجائے گا...... جو گھر میں موجود ہے وہ ختم ہوجائے گا، تب بھی تو خریدو گی نا۔''

ماہانہ سودا سلف کی خریداری کے علاوہ ہر ہفتے اتوار بازار جانا بھی لازم تھا۔ سبزی، پھل، گائے، بکرے اور مرغی کا گوشت، مچھلی، انڈے اور جانے کیا کچھ۔ گاڑی کی ڈکی لدپھند جاتی۔ بیگم کو گزشتہ ہفتے کی باقی ماندہ سبزی اور پھل سرونٹ کوارٹر میں دینے پڑتے۔

''آپ ناحق اتنا کچھ خرید لیتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کی سبزی پڑی تھی نا، کیا ضرورت تھی مزید خریدنے کی۔ سرونٹ میں دینا پڑی۔'' بیگم کہتیں۔

''ارے بھئی ان کا بھی تو حق ہے نا ہم پر...... وہ بےچاری تمہارا ہاتھ بٹاتی ہے گھر کے کام میں۔''

''تو کیا ہوا، مفت رہتے بھی تو ہیں ہمارے سرونٹ میں...... آس پاس لوگوں نے کئی کئی ہزار کرائے پر اٹھا رکھے ہیں اپنے سرونٹ کوارٹر۔''

''غلط ہے۔''

سیف الدین بچوں کو شاپنگ کرانے لے جاتے تو ان کی موجیں ہوجاتیں۔ بچے جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتے خریدنا لازم ہوجاتا۔ بیگم کسی چیز کے مہنگی یا غیر ضروری ہونے پر معترض ہوتیں تو سیف الدین کہتے۔ ''کوئی بات نہیں، پسند ہے تو لینے دو۔''

خاندان میں کسی کی شادی بیاہ اور عید، بقرعید کے تہواروں پر سیف الدین اپنے پرس کا منہ پورا ہی کھول دیتے۔ بچوں کی پسند کے کپڑے، جوتے اور دوسری چیزیں۔ بیگم اپنے لیے کفایت سے خریداری کرنا چاہتیں تو سیف الدین خفا ہونے لگتے۔ ''ارے بھئی کوئی برانڈڈ سوٹ لو اپنے لیے۔''

''نہیں، بس یہی ٹھیک ہے۔'' بیگم کہتیں۔

''یہی ٹھیک نہیں ہے نا...... کنجوسی مت کرو...... میں آخر کماتا کس کے لیے ہوں۔'' سیف الدین سرگوشی کرتے۔

ماہانہ اور ہفتہ وار سودا سلف کے علاوہ بھی سیف الدین گروسری کی خریداری کے لیے ہفتے میں ایک آدھ چکر اپنی رہائش گاہ کے نزدیک واقع منی گروسری مارکیٹ کا بھی لگا لیتے۔ تھی تو چھوٹی سی مارکیٹ لیکن وہاں ایسی چیزیں بھی مل جاتیں جو ہفتہ وار بازار میں دستیاب نہ ہوتیں اور اگر ملتیں تو خالص نہ ہوتیں۔ سیف الدین اس مارکیٹ میں عموماً دیسی انڈوں، دیسی گھی، خالص مکھن اور اسٹور شدہ کسی بےموسمی سبزی یا پھل کی تلاش میں جاتے مگر غیر ضروری چیزیں بھی خرید لاتے۔ بیگم ان کی فضول خرچی پر معترض ہوتیں۔

''ارے بھئی کام آجائے گا۔'' سیف الدین کہتے۔

''کام آنے کا کیا ہے۔ انسان جتنا چاہے خرچ کر ڈالے...... کچھ آئندہ کے لیے بھی بچانا چاہیے۔''

''اللہ مالک ہے شاہانہ۔'' وہ بیگم کو تسلی دیتے اور انہیں سمجھاتے۔ ''دیکھو میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یا بچوں کو کسی چیز کی تنگی ہو۔''

ایک ایک وقت میں وہ پانچ پانچ سات سات کلو مچھلی خرید لاتے اور بیگم سے کہتے۔ ''ڈیپ فرائی کرنا، بچے شوق سے کھاتے ہیں۔''

بیگم جی ہی جی میں ان کے اسراف پر کڑھتیں۔ آئے دن وہ کسی نہ کسی بہانے کبھی نائلہ کو، کبھی شہلا اور کبھی عائلہ کو، کبھی کیف اور اس کی بیوی کو اور کبھی سب کو ایک ساتھ اپنے یہاں مدعو کر لیتے۔ کبھی حلیم کی دعوت، کبھی نہاری، کبھی پائے، کبھی مچھلی تو کبھی ساگ اور مکئی کی روٹی۔ عید، بقرعید پر تو سب کا سیف الدین ہی کے ہاں اکٹھے کھانا گویا نہایت ہی ضروری تھا۔ بیگم بظاہر سب سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتیں مگر انہیں سیف الدین کی شاہ خرچیوں پر بہت تاؤ آتا۔ مہینے کے آخر تک ساری تنخواہ ٹھکانے لگی ہوتی......

بچت صفر!

مگر سیف الدین کو تنخواہ ختم ہوجانے کا نہ ملال ہوتا نہ آئندہ کی فکر ستاتی۔ ہاتھ کھول کر کھلے دل سے خرچ کرنا ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ مستقبل کے لیے ان کی امید ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر کیموٹیشن کی مد میں ملنے والی یکمشت رقم اور ماہانہ پنشن تھی۔

ریٹائرمنٹ سے تقریباً دو سال قبل سیف الدین کی ترقی بیسویں گریڈ میں ہوگئی۔ گھر کے باہر نئی تختی لگ گئی۔

☆☆☆

دو سال پلک جھپکتے میں گزر رے۔ سیف الدین سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوگئے۔ ان کے چار بچوں میں سے ایک کالج میں پہنچ چکا تھا۔ باقی تین بچے اسکول کے مختلف درجوں میں تھے۔ چاروں میں سے کوئی بھی ابھی خود کفالت کی منزل کو نہ پہنچا تھا جبکہ سیف الدین سے چھوٹی دونوں بہنوں کے بچوں کی شادیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ نائلہ نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کر دی تھی، بیٹی کو بھی اس کے گھر کا کر دیا تھا۔ چھوٹا یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ شہلا نے اپنے چار بچوں میں سے دو کی شادی کر دی تھی۔ کیف کا ایک بیٹا انجینئرنگ کر رہا تھا، دوسرا کالج میں سالِ دوم کا طالب علم تھا۔ سیف الدین کے بچوں کی شادی، منگنی ابھی دور کی بات تھی۔ تاخیر سے شادی کرنے کے باعث سیف الدین گھاٹے میں رہ گئے تھے۔ ان کے بچوں میں سے کوئی ابھی سرکاری ملازمت کا اہل بھی نہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فقط چھ ماہ اور وہ سرکاری رہائش گاہ میں رہ سکتے تھے۔ پھر انہیں سرکاری اقامت گاہ چھوڑنا ہی چھوڑنا تھی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں سرکاری خزانے سے جو واجبات ملے، اس رقم سے اسلام آباد میں کوئی مکان خریدنا تو درکنار پانچ مرلہ قطعہ زمین بھی نہ خریدا جا سکتا تھا۔ کافی تلاش کے بعد مضافات میں واقع ایک چار مرلے کا مکان ملا جہاں نہ صاف پانی میسر تھا، نہ گیس کی سہولت، نہ نکاسیٔ آب کا مناسب بندوبست، نہ روزمرہ کچرا ٹھکانے لگانے کا انتظام۔ گھروں سے باہر پھینکا جانے والا کوڑا کرکٹ کچی گلیوں میں اڑتا بھٹکتا پھرتا۔ اس علاقے میں آکر سیف الدین کی بیگم اور بچوں کو دونوں سرکاری کوٹھی کی یاد ستاتی رہی۔

سیف الدین کی پنشن معقول مقرر ہوئی مگر کمرتوڑ مہنگائی اور بچوں کے ہوش ربا تعلیمی اخراجات نے ان کی پنشن کا منہ چڑا دیا۔ کبھی سیکڑوں میں ادا کی جانے والی فیسیں اب ہزاروں تک جا پہنچی تھیں۔ نائلہ، شہلا اور کیف کے بچے اچھے تھے جو سستے زمانے میں پڑھ لکھ گئے۔ اب تو یہ عالم تھا کہ سیف الدین کی آدھی سے زیادہ پنشن بچوں کی فیسوں اور دیگر تعلیمی اخراجات پر اٹھ جاتی۔ اگلے ماہ کی پنشن کا انتظار مشکل ہوجاتا۔

سیف الدین کی ریٹائرمنٹ کیا ہوئی، ان کا اور ان کے بال بچوں کی زندگی کا قرینہ ہی بدل گیا۔ اب نہ وہ پہلے کی سی شاہ خرچیاں رہیں، نہ بھائی بہنوں پر سیف الدین کے وہ اللّے تللّے۔ اپنا ہی گزارہ مشکل ہوگیا تھا۔ ایک بچے کی فیس جاتی تو دو کی سر پر آن کھڑی ہوتی۔ کسی کو یونیفارم کا دوسرا جوڑا درکار ہوتا تو کسی کا جوتا پھٹ گیا ہوتا۔ کسی کو شرح کی ضرورت ہوتی تو کسی کو سائنٹیفک کیلکولیٹر کی۔ کبھی چائے کی پتی کم پڑ جاتی، کبھی ٹیٹرا پیک دودھ مہینا ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجاتا۔ کبھی خوردنی تیل کم تو کبھی چولہے پر توا دھرا ہوتا اور گیس سلینڈر ہری جھنڈی دکھا جاتا۔ بیگم کو وقت بے وقت آتے مہمان برے لگتے تو سیف الدین گھر آئے مہمانوں کی آمد پر پہلے کی طرح ان کی خاطر مدارات نہ کر سکنے پر جُزبُز سے پھرتے۔ بیگم اور بچوں کے ساتھ بازار جانا پڑتا تو سیف الدین چپکے چپکے اپنی جیب ہی ٹٹولے جاتے۔ جب اپنے بچوں پر خرچ کرنے اور ان کی خواہشات وضروریات پوری کرنے کا اصل وقت آیا تو ان کی جیب ہی ہلکی ہوگئی تھی۔ بچے ان کا منہ تکتے اور وہ جھینپ کر نظریں چرا لیتے۔ جب بچے ناسمجھ تھے تو وہ ان کی ضرورتوں پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا کرتے تھے۔ اب جب وہ سمجھدار تھے تو وہ ان کی جائز ضروریات بھی کماحقہ پوری کرنے سے قاصر تھے۔

بہنیں، بھائی اور ان کے بچے جن پر سیف الدین نے بے دریغ اپنے مالی وسائل صرف کیے تھے، کبھی بھولے سے بھی سیف الدین کی عنایتوں کا ذکر نہ کرتے۔ وہ سب مطمئن اور خوش تھے۔ سیف الدین گھاٹے میں رہ گئے تھے۔ اگر انہوں نے بہن بھائیوں کے چکر میں تاخیر سے شادی نہ کی ہوتی تو آج ان کے بچے بھی نائلہ، شہلا اور کیف کے بچوں کی طرح اپنی اپنی منزلوں سے ہمکنار ہو چکے ہوتے یا منزلوں پر پہنچنے والے ہوتے۔

سیف الدین کی بیگم اب کبھی کبھی زبان کھول لیتی تھیں۔ ''آپ نے اپنے بچوں کے لیے بھی کچھ بچایا ہوتا تو آج ہمیں مشکل وقت نہ دیکھنا پڑتا۔'' وہ اکثر سیف الدین سے کہتیں۔

''کوئی بات نہیں گزر جائے گا یہ وقت بھی۔'' سیف الدین بیگم کو تسلی دیتے۔

"ہاں گزر تو جائے گا مگر کاش آپ نے بچوں کے مستقبل کے لیے بھی کچھ منصوبہ بندی کرلی ہوتی۔"

"ہوجائے گا انشاء اللہ سب ہوجائے گا۔"

"اچھے وقت میں کچھ بچت کرلی ہوتی تو آج کام آتی مگر آپ نے تو جو کمایا، اپنے بہن بھائیوں پر لٹادیا۔"

"ان کا مجھ پر حق تھا شاہانہ۔" سیف الدین تحمل مزاجی سے کہتے۔

"ایک بس آپ ہی پر حق تھا، کسی اور کی تو جیسے کوئی ذمے داری ہی نہیں تھی۔" بیگم کے مزاج میں اب تیزی کے ساتھ کچھ تلخی اور درشتی بھی آگئی تھی۔

"خدا سے چاہیے توفیق دے دے۔" سیف الدین کہتے۔

"ہونہہ!" بیگم اپنے سر کو جھٹکتیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتیں۔ کبھی سیف الدین کو یاد بھی دلاتیں۔ "عائلہ کی شادی پر یاد ہے نا کیسی خودغرضی دکھائی تھی آپ کے بھائی بہنوں نے۔"

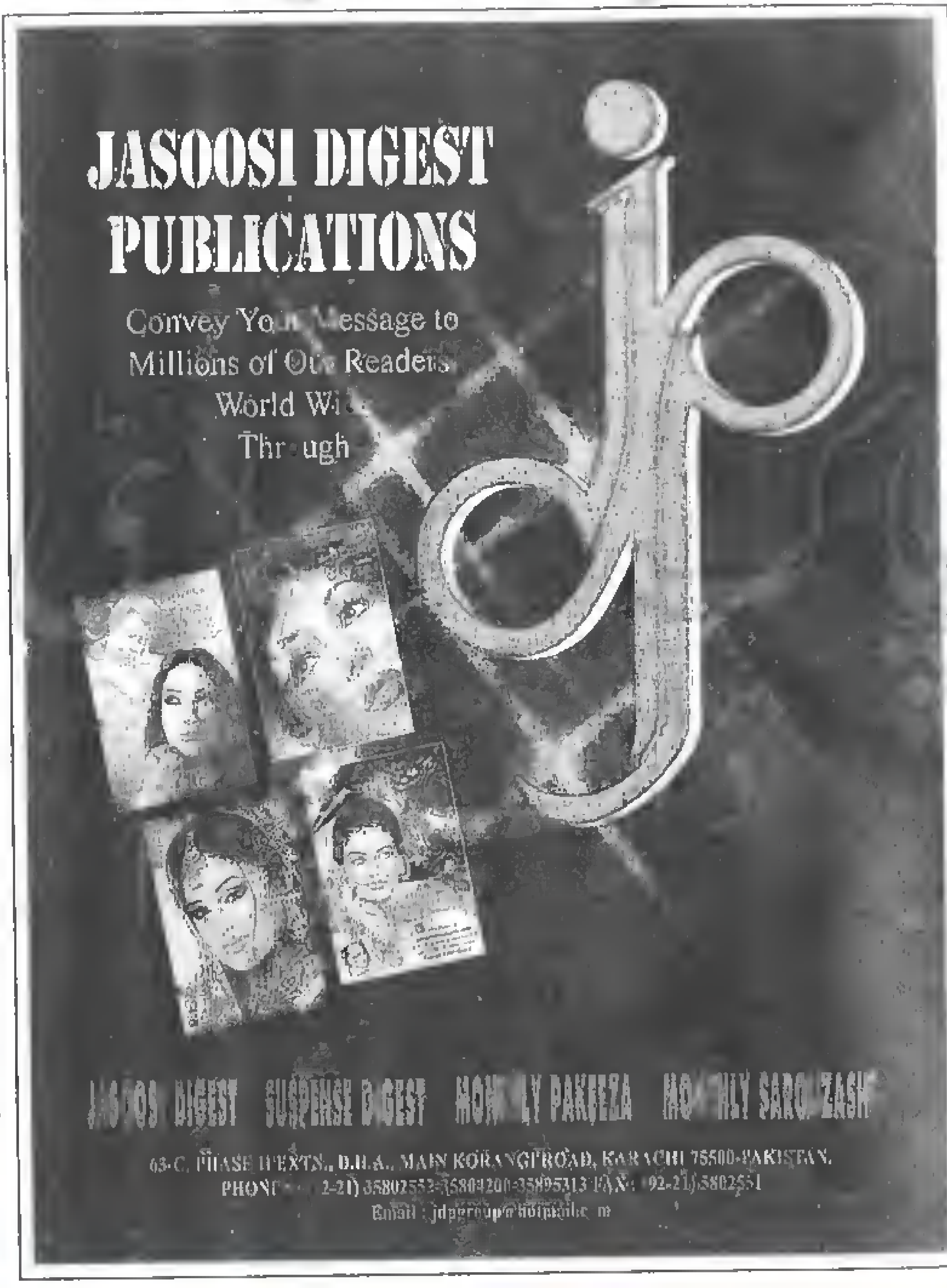
"کوئی بات نہیں۔" کہنے کو تو سیف الدین کہہ دیتے مگر عائلہ کے سسرال والوں کی فرمائش پر اسے جہیز میں ڈرائنگ، ڈائننگ فرنیچر بھی دینے کے لیے بیگم کا زیور بیچ دینے کا انہیں آج تک رنج تھا۔ نیت تھی کہ جیسے ہی ہاتھ پڑا انہیں نیا زیور بنوادیں گے مگر ہاتھ پڑا ہی نہ سکا اور اب تو یہ حال تھا کہ بال بچوں کے ساتھ بازار جاتے تو اکثر بچوں کی ضرورتیں کماحقہ پوری نہ کرسکنے پر جی مسوسے، نظریں جھکائے واپس آجاتے۔ پنشن کہنے کو تو ٹھیک ٹھاک مگر روزافزوں ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی تھی۔

اب سیف الدین کو اپنے وہ ساتھی اور احباب یاد آتے جو بچت اور مستقبل کے لیے پس اندازی اور منفعت بخش منصوبوں میں سرمایہ کاری کے چکر میں رہا کرتے تھے۔ کوئی مضافات میں سستی زمین خرید کر خوش ہوتا، کوئی ترنول کے آس پاس رقبہ لے کر پھولے نہ سماتا، کوئی بحریہ میں پلاٹ خریدنے کے لیے مرا جاتا تو کوئی ہائی وے پر پھیلتے پھولتے رہائشی منصوبوں میں ایک کے بعد دوسرا پلاٹ خریدنے کے لیے بیسی جماتا اور خود پہلی کمیٹی لے کر پھولے نہ سماتا۔ سیف الدین کے دفتر کے لوگوں میں چودہ، سولہ اور سترہ گریڈ میں سبکدوش ہونے والے ریٹائرڈ ملازمین بھی آج ان سے اچھے علاقوں اور تمام سہولیات سے مزین مکانوں میں رہ رہے تھے۔ ان کے بچوں کی ضروریات بھی خوب پوری ہو رہی تھیں اور وہ خود بھی مطمئن ومسرور تھے۔ بعضوں کے تو بچے انگلستان، آسٹریلیا اور کینیڈا چلے گئے تھے۔ پہلے تعلیم حاصل کرنے پھر مستقل وہیں کے ہو رہنے کے لیے۔ ماں باپ چھ مہینے ان کے پاس رہتے چھ مہینے یہاں اور وہاں گزارے جانے والے چھ مہینوں میں اپنی ای اوور ہالنگ کراکے آتے کہ یہاں گزارے جانے والے چھ مہینے بھی وہاں سے کم عیش میں نہ رہتے۔ جن کے بچے باہر نہ گئے تھے، یہیں تھے، وہ بھی اچھے اور سستے وقت میں والدین کی کفایت شعاری کے مزے لے رہے تھے۔ ایک مکان میں رہائش دوسرا کرائے پر۔ اتنی آمدن ہوجاتی جو باپ ہی نہیں بچوں بلکہ بعض کیسز میں تو بچوں کے بچوں کو بھی بزرگوار کی عاقبت اندیشی سے مستفید و مستفیض کرتی۔ بعض عاقبت اندیشوں نے تو پلازے کھڑے کرلیے تھے۔ نیچے دکانیں اوپر رہائش۔ ایک ایک دکان سے ہزاروں کی آمدنی ہوتی جو لاکھوں تک جا پہنچتی۔

کولیگز اور دوستوں سے قطع نظر سیف الدین کے اپنے بہن بھائی بھی کم فائدے میں نہ تھے۔ کیف کی اچھے وقتوں میں خاموشی سے کی گئی سرمایہ کاری آج کروڑوں کا حساب دیتی تھی۔ وہ بڑے فخر سے بتاتا تھا فتح جنگ میں چار کنال کا پلاٹ، بحریہ فیز ایٹ میں کنال کا پلاٹ، غوری میں دس مرلے کا مکان، آئی فورٹین میں پانچ مرلہ پلاٹ اور گوادر میں کوڑیوں کے مول خریدا ایک ایکڑ رقبہ!..... نائلہ نے پرائم منسٹر ہاؤسنگ اسکیم میں ایک اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔ سوان گارڈن میں دس مرلے کا پلاٹ، فراش ٹاؤن میں مکان جو کرائے پر اٹھا رکھا تھا اور خود جس سرکاری مکان میں رہ رہی تھی، اس کے صحن میں دو کمرے، کچن اور باتھ روم بنا کر پچھلے رخ پر دروازہ نکال کر اسے بھی کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔ عائلہ کا سسرالی گھر تو جی الیون میں تھا مگر اس نے اپنی جیب سے ایک نجی تعمیراتی منصوبے میں دس مرلے کا پلاٹ بک کرالیا تھا اور اب اس کی سہ ماہی اقساط ادا کررہی تھی۔ شہلا کا میاں تو تھا ہی کاروباری آدمی۔ وہ ہمیشہ ایک کے چار بنانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ ماشاء اللہ بڑی ریل پیل تھی۔ رہا لطیف تو وہ بھی مزے میں تھا۔ اسے برطانوی شہریت اور اس کے ساتھ بہت سی مراعات مل گئی تھیں۔

"ہینڈ ٹو ماؤتھ" تھے تو سیف الدین اور ان کے اہل خانہ۔

ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد سیف الدین کا زیادہ وقت گھر ہی میں گزرتا یا پھر پنج وقتہ نماز کے لیے قریبی مسجد میں۔ گاڑی اب ضرورتاً ہی استعمال کی جاتی۔ پنشن لینے کے لیے بینک جانے کو، کفایت کی خاطر بینک سے


JASOOSI DIGEST
PUBLICATIONS
SUSPENSE DIGEST
63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.

واپسی پر ماہانہ سودا سلف خریدتے ہوئے آنے کو، اتوار کے بجائے علاقے میں جمعے کو لگنے والے بازار سے ہفتہ وار سامان خریدنے کے لیے، خدانخواستہ اہلِ خانہ میں سے کسی کے بیمار ہونے پر ڈاکٹر کے ہاں یا اسپتال لے جانے کے لیے یا پھر کبھی کبھار کسی رشتے دار یا احباب کے ہاں جانے پر۔ سیف الدین، بیگم اور بچے اپنی عمومی ضرورتوں کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرتے۔

سیف الدین پنشن لینے کے لیے بینک جاتے تو بیگم اور کبھی کبھار کوئی بچہ بھی بشرطِ چھٹی ان کے ہمراہ ہوتا، پنشن لینے کے لیے سیف الدین اسی طرح تیار ہوکر جاتے جیسے دورانِ ملازمت دفتر جایا کرتے تھے۔ اس روز ان کا موڈ بھی غیر معمولی خوشگوار ہوتا۔ کبھی جو پنشن بروقت ان کے اکاؤنٹ میں جمع نہ ہوئی ہوتی تو وہ اور بیگم بڑے اداس سے گھر واپس لوٹتے۔ جیسے کسی میت کا پُرسہ دے کر آرہے ہوں۔ پنشن مل جاتی تو وہ ایک مخصوص سستے اسٹور سے ماہانہ سودا سلف خریدتے ہوئے گھر لوٹتے۔ ماہانہ سودا سلف کی خریداری بہت دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر کی جاتی۔ کوئی غیر ضروری یا اضافی خریداری نہیں بس بنا تلا سامان۔ ماضی کی طرح بیگم کو انہیں بار بار اسراف سے بچنے کی تلقین نہ کرنا پڑتی۔ ضرورت کی چیزیں بھی قیمت دیکھ کر خریدی جاتیں بلکہ بعض تو قیمت دیکھ کر واپس ہی رکھ دی جاتیں۔ بچوں کے لیے چاکلیٹ بھی سامان میں شامل کرنے کو بیگم ان سے دھیمی آواز میں خصوصی اجازت لیتیں۔ ''ہاں ہاں، لے لو بلکہ ایک اپنے لیے بھی لے لینا۔'' اس روز شام کی چائے کے لیے پلیٹ، اکیک بھی لیا جاتا۔ سودا لے کر گھر جاتے ہوئے راستے میں کسی ریڑھی بان پھل فروش سے پھل بھی خرید لیے جاتے۔ پنشن والا دن سیف الدین، بیگم اور بچوں سبھی کو نہایت خوشگوار لگتا۔ گھر پہنچ کر سیف الدین حساب کتاب لگانے بیٹھ جاتے۔ چار یا پانچ سو اخبار کا بل، تین سو کچرا اٹھانے والے آدمی کے، تین سو ٹیوب ویل سے پانی سپلائی کے...... باقی رقم وہ بیگم کے حوالے کردیتے۔ اس میں مہینے بھر گھر کے اخراجات، بچوں کے تعلیمی مصارف، دکھ، بیماری، کسی کو لینا دینا سب کچھ ہوتا۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے بیگم نے ایک صندوقچی رکھی ہوئی تھی۔ ہر ماہ مخصوص رقم اس میں رکھ دیتیں جب کسی بچے کی فیسیں وغیرہ دینا ہوتیں صندوقچی میں محفوظ رقم کام آتی۔ باقی پیسے بہت دیکھ دیکھ کر خرچ کیے جاتے۔ بچے اپنی ضرورتوں کا اظہار ماں سے کرتے۔ کبھی ایک کی ضرورت التوا میں رکھ کر دوسرے کی ضرورت پوری کردی جاتی۔ کبھی تیسرے کو اگلے مہینے کی آس دلا کر چوتھے کی تشفی کردی جاتی۔ مہینے کی ابتدائی تاریخیں اطمینان سے گزرتیں پھر بیگم اخراجات کے معاملے میں اپنا ہاتھ کھینچ لیتیں۔ آخری دن تو روتے بسورتے گزرتے۔ مگر صد شکر کہ اگلے ماہ کے آغاز پر پنشن امید بن کر آجاتی۔ سیف الدین کی روز بروز کم ہوتی جسامت دیکھ کر بیگم سوچتیں۔ خدا برے وقت سے بچائے، اگر بچوں کے خود کفیل ہونے سے پہلے خدانخواستہ سیف الدین نہ ہوئے تو وہ کیا کریں گی۔ خود سیف الدین بھی بیگم اور بچوں کے مستقبل کے بارے میں نہایت فکر مند رہتے۔ سرکار انہیں سرکاری ملازمت سے سبکدوش کرکے گھر بٹھا چکی تھی۔ بقول ان کے اپنا ''بیسٹ'' گزار کے اب وہ ''ریسٹ'' پر تھے۔ کیا پتا اجل کب انہیں زندگی سے بھی سبکدوش کردیتی۔

☆☆☆

سیف الدین کا اپنے بھائی بہنوں سے ملنا جلنا بھی ان کے دورِ ملازمت کے مقابلے میں برائے نام رہ گیا تھا۔ وہ خود ان کے ہاں جانے سے اس لیے گریز کرتے کہ جیب پہلے کی طرح لدپھند کر جانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ انہیں اپنے ہاں اس لیے زیادہ بلانے سے گریزاں رہتے کہ اب پہلے کی سی خاطر داریاں ممکن نہ تھیں۔ بھائی بہنوں کے اپنے پاس ان کے ہاں کم آنے کے لیے ایک ہی بہانہ تھا کہ وہ سب سے کٹ کر بہت دور جابسے ہیں۔

سیف الدین کو ریٹائر ہوئے پانچ برس گزر چکے تھے۔ ملازمت کا زمانہ تو جیسے یاد بن گیا تھا۔ وہ اکثر خاموش بیٹھے گزرے وقت کو یاد کرتے رہتے۔ ان کا دورِ افسری بھی کیا زمانہ تھا۔ دفتر جاتے تو ماتحت انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ دوست ملتے تو گرمجوشی سے۔ رشتے داروں میں جاتے تو خوب آؤ بھگت ہوتی۔ بھائی بہنوں کے ہاں جاتے تو ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے اور تو اور جن دکانوں پر ان کا اشیائے ضرورت کی خریداری کے سلسلے میں آنا جانا رہتا تھا، انہیں قدم رنجہ فرماتے دیکھ کر ان دکانداروں کی باچھیں کھل اٹھتی تھیں۔

اور اب یہ زمانہ تھا۔ شناسا دکانداروں کی دکانوں پر جانا ترک ہوچکا تھا۔ بھائی بہن خال خال ہی ملتے۔ رشتے داروں سے ملنا تقریباً موقوف۔ بہت ہوا تو کسی کی شادی کسی کی مرگ پر مل لیے۔ دوستوں کو نہ یہ بلاتے نہ وہ یاد کرتے۔ دفتر کا راستہ تو جیسے خواب ہی بن گیا تھا۔ اب تو سیف الدین تھے، گہری سوچیں، ٹھنڈی سانسیں، جینا عزت سے بتانے کی فکر۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایسی سسکتی رینگتی زندگی کا تو

سیف الدین نے تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔ انہیں اپنے دوست کی بات اکثر یاد آتی۔ ''دیر سے شادی کر کے آپ گھاٹے میں رہ گئے۔''

سیف الدین کو اپنے گھاٹے کی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو بچوں کے اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کی۔ بڑا بیٹا زوہیب ابھی یونیورسٹی میں تھا۔ بیٹی فرحانہ کالج میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ یونیورسٹی کی بھاری فیس نے اسے یونیورسٹی میں داخل کرانے کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ رودھو کر بی ایس سی کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ چھوٹا بیٹا شاہ زیب فرسٹ ایئر میں تھا۔ آخری اولاد دردانہ دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ انجانے لوگ سیف الدین کو ان کے آخری دو بچوں کا دادا باور کرنے میں دیر نہ کرتے۔

روز بروز اپنے وجود میں سرایت کرتی کمزوری کے باعث سیف الدین ہر نماز کے بعد اپنے رب کے حضور اپنی درازی عمر کے لیے گڑگڑاتے۔ اپنے دونوں ہاتھ بارگاہِ ایزدی میں بلند کر کے اور سر کو نہایت خشوع و خضوع سے جھکا کر وہ اپنے رب سے کہتے۔ ''پروردگار! جب تک دونوں بچے اپنے پیروں پر نہیں کھڑے ہو جاتے اور بچیاں اپنے اپنے گھر کی نہیں ہو جاتیں، مجھے ان کے سروں پر سلامت رکھنا میرے مولا!''

بیٹیوں کی انہیں بیٹوں سے بڑھ کر فکر تھی اور ان کی اس فکر سے ان کے بہن بھائی بھی بخوبی آگاہ تھے۔ نائلہ، شہلا اور کیف تینوں کے ہاں اس عمر کے بیٹے موجود تھے جن سے سیف الدین کی دونوں بچیوں کو نمٹایا جاسکتا تھا مگر تینوں میں سے کبھی کسی نے بھولے سے بھی عندیہ ظاہر نہیں کیا تھا حالانکہ اپنے پرائے سیف الدین کے تینوں ہی بھائی بہنوں کو فی سبیل اللہ یہ مشورہ دیتے رہتے تھے کہ جس بھائی نے ساری زندگی ان پر جان نچھاور کی، اس کی بیٹیوں کو گلے لگانے سے اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی مگر وہ سب ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے۔ سیف الدین کی بیگم کبھی کبھی حسرت و ملال سے کہتیں۔ ''آج ہمارے پاس دھن دولت ہوتی تو آپ کے بہن بھائی چوم چاٹ کر اپنے بچوں سے ہماری بچیوں کے رشتے مانگ لیتے۔''

''کوئی بات نہیں شاہانہ جہاں ان کا مقدر ہوگا یہ دھن دولت کے بغیر بھی چلی جائیں گی۔'' سیف الدین بیگم کو تسلی دیتے۔

''خود غرض ہیں آپ کے بہن بھائی۔''

''برا مت ماننا تمہارے بہن بھائیوں کے ہاں بھی تو بیٹے ہیں۔ انہیں بہن کی بچیوں کا خیال کیوں نہیں آتا؟''

''میں نے اپنے بہن بھائیوں کو کیا دیا ہے...... آپ نے تو اپنی زندگی دی ہے انہیں...... وقت پر شادی کی ہوتی آپ نے تو آج ہمارے بچوں کے بھی بچے ہوتے۔''

سیف الدین کو اپنے دوست کی بات یاد آئی۔ ''شادی وقت پر ہی اچھی...... دیر سے شادی کر کے آپ گھاٹے میں رہ گئے۔''

مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ وقت کا پہیا الٹا تو نہیں گھمایا جاسکتا تھا۔ سیف الدین کو قلق تھا تو فقط یہ کہ وہ ساری زندگی بھائی بہنوں اور ان کے بچوں کے لیے نہایت بے غرضی سے کام لیتے رہے مگر ان میں سے کوئی بھی ان کی بچیوں کے لیے بے غرضی سے سوچنے کو تیار دکھائی نہ دیتا تھا جبکہ وہ آج بھی بڑی اپنائیت سے سوچتے تھے۔ زوہیب کسی لائق ہو جائے تو اس کے لیے شہلا کی چھوٹی بیٹی کا رشتہ مانگنے کی ہمت کریں۔

☆☆☆

حسب روایت سیف الدین کے بھائی بہن مع اپنے اپنے اہل خانہ والدہ کی برسی پر انہیں ایصال ثواب اور اکٹھے کھانا کھانے کے لیے ان کے گھر میں جمع ہوئے۔ ظہر کے بعد قرآن خوانی ہوئی۔ عصر کے بعد چائے۔

مغرب کے بعد کھانا کھایا گیا پھر سبز چائے کے دوران عشا کی نماز کا وقت ہونے تک گپ شپ ہوتی رہی۔ نائلہ نے جو جلد ہی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے والی تھی، بصد افتخار حاضرین محفل کو بتایا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے نو تعمیر شدہ مکان میں شفٹ ہونے جارہی تھی۔ اس مکان کی اعلیٰ فنشنگ کے لیے اس نے اسلام آباد میں اپنا اپارٹمنٹ بھی فروخت کر دیا تھا۔ ''بھئی گھر روز روز تھوڑی بنتے ہیں۔ آدمی گھر بنائے تو ایسا کہ اس میں رہنے کا بھی مزہ آئے۔ گھر ایسا ہی بنوایا ہے میں نے بھی کہ جو دیکھتا ہے تعریف کرتا ہے۔'' نائلہ نے جو ساٹھ سال کی ہو کر بھی پچاس کی دکھتی تھی، اتراتے ہوئے بتایا۔

''اللہ پھپھو! ہمارے گھر میں تو نہ گیس ہے، نہ پراپر سیوریج سسٹم...... پانی ٹیوب ویل سے آتا ہے اور وہ بھی ایک دن چھوڑ کر۔'' سیف الدین کی چھوٹی بیٹی دردانہ نے اپنی بڑی پھوپی کی بات رشک سے سننے کے بعد قدرے درد سے اپنے گھر کا نوحہ پڑھا۔

نائلہ نے نظر ترچھی کر کے سیف الدین کو دیکھا اور بولی۔ ''برا مت مانیے گا بھائی۔'' سیف الدین تعجب سے اسے دیکھنے لگے کہ وہ انہیں کس بات کا برا نہ منانے کو کہہ رہی تھی۔ نائلہ کی نظر نیم دائرے میں گھومتی دردانہ پر آرکی اور

اس نے بردانہ پر اپنی نظر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ابا نے ہم سے کہیں زیادہ کمایا لیکن جو کمایا لٹا دیا.....ایک پراپر گھر تک نہیں بنا سکے تم لوگوں کے لیے۔''

سیف الدین دم بخود ہو کر نائلہ کو اور سیف الدین کے بال بچے انہیں دیکھنے لگے۔ ابھی یہ منظر برقرار ہی تھا کہ ایک جانب سے شہلا کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں واقعی بھائی نے فضول خرچی بہت کی ہے۔''

سیف الدین نے سٹپٹا کر شہلا کی طرف دیکھا۔

''ایسی ویسی! بھائی کا ہاتھ تو ان کی جیب سے باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔'' عائلہ بھی پیچھے نہ رہی، اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''انسان کو اچھی زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی پلاننگ کرنا پڑتی ہے...... ہم نے تو پلاننگ کی اور الحمدللہ بہت سکھی رہے۔'' نائلہ نے دانشوری جھاڑی پھر دوبارہ وردانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! تمہارے ابا بیس گریڈ کے افسر تھے، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم نے تو پرائیویٹ ہاؤسنگ سوسائٹی میں گھر بنایا ہے۔ ان کے گریڈ کے افسر تو اسلام آباد میں کوٹھیاں کھڑی کیے بیٹھے ہیں۔ تمہارے ابا نے آنے والے وقت کی پروا ہی نہیں کی، کمایا اور خرچ کر دیا بس...... ورنہ آج تم لوگوں کو اس گاؤں جیسی جگہ رہنے کے بجائے اسلام آباد کے کسی پراپر سیکٹر میں نہ سہی، کسی پرائیویٹ ہاؤسنگ اسکیم میں ہی سہی ساری سہولتوں والا گھر میسر ہوتا...... بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے آدمی کو اللّے تللّوں سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ اپنے دل کی بہت سی خواہشوں کو مارنا پڑتا ہے...... یہ نہیں کہ جو ہاتھ میں آیا خرچ کیا اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ایک پیسا دانتوں سے دبا کر رکھنا پڑتا ہے تب کہیں انسان اپنے بچوں کو اچھا مستقبل دے پاتا ہے...... تمہارے ابا نے تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں بنایا۔''

''آپا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' عائلہ نے تائید کی۔

''خرچ کرنے کا کیا ہے...... خرچ کرنے پر آؤ تو قارون کے خزانے ختم ہو جاتے ہیں۔'' شہلا نے کہا۔

سیف الدین نے کن انکھیوں سے بیگم اور بچوں کی طرف دیکھا۔ بچے جنہیں ان کی بیگم ان کے بچپن سے اب تک ان کے باپ کے اپنی بیشتر کمائی اپنے بہن بھائیوں پر لٹا دینے کے قصے سناتی رہی تھیں، ہکا بکا کبھی باپ کو کبھی اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے۔

کیف کی بیوی کبھی نندوں اور کبھی جیٹھ اور ان کے بال بچوں کا جیب جاب جائزہ لے رہی تھی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ محفل کی برخاستگی تک سیف الدین جو خود

پر بہنوں کی بے رحمانہ تنقید سن کر دل گرفتہ ہو گئے تھے اہل محفل پر اپنی دل گرفتگی قطعاً ظاہر کیے بغیر نہایت تحمل سے شریک محفل رہے۔ محفل برخاست ہوئی تو مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد بیگم اور دونوں بیٹیاں کچن کی صفائی ستھرائی میں لگ گئیں، دونوں بیٹے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سیف الدین جماعت کا وقت نکل جانے کے باعث گھر میں ہی عشا کی نماز پڑھ کر بستر پر لیٹ گئے۔ طبیعت نہایت بڑمردہ تھی۔ بہنوں کی باتیں اور بال بچوں کی نگاہیں انہیں رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں اور مضطرب کر رہی تھیں۔

بیگم کچن سے فارغ ہو کر کمرے میں آئیں تو انہوں نے یوں ظاہر کیا جیسے سو چکے ہیں۔ بیگم نے بتی بجھائی اور دھیرے سے ''ہائے'' کہتی بستر پر لیٹ گئیں۔ ان کے منہ سے ''ہائے'' نکلنا ان کی تھکن کا غماز تھا۔ گنجائش ہوتی تو سیف الدین بیگم کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک ملازمہ رکھتے اور انہیں تھکن نہ ہونے دیتے مگر اب اتنی گنجائش ہی نہ تھی۔

رات گئے تک سیف الدین بہنوں کی تنقید اور بال بچوں کی نگاہوں کے نرغے میں رہے۔ کبھی نائلہ، شہلا اور عائلہ کی باتوں کی بازگشت انہیں بے چین کرنے لگتی۔ کبھی بیگم اور بچوں کی متعجب اور سوالیہ نگاہیں انہیں کروٹ بدلنے پر مجبور کر دیتیں۔ آوازوں اور نگاہوں کی اس آنکھ مچولی میں ایک نوعمر لڑکا کبھی ماں کے ہاتھ کی توڑی اور سکھائی ہوئی مونگ اور مسور کی دال کی بڑیاں کپڑے کی ایک تھیلی میں ڈالے ایک بازار میں دکان در دکان جھانکتا یہ پوچھتا ان کے تصور میں ابھر آتا ''بڑیاں چاہئیں؟'' بعض دکاندار اس سے بڑیاں لے لیتے اور پیسے لینے کے لیے بعد میں آنے کو کہتے۔ بعض اسے دیکھتے ہی دھتکار دیتے۔ ''ابے چل نہیں چاہئیں بڑیاں وڑیاں۔''

کبھی یہ نوعمر بچہ لالٹین کی مدقوق روشنی میں اپنی جواں عمر ماں کے پاس بیٹھا نظر آتا جو ایک پرانی سلائی مشین پر جھکی تولیوں اور بنیانوں کو سلائی لگا رہی ہوتی اور وہ بچہ اپنا سبق یاد کرنے کے ساتھ ساتھ ماں کے سیے ہوئے تولیوں اور بنیانوں کو تہ لگا کر اوپر تلے رکھے جاتا۔

بے رحمی سے تنقید کرتی زبانوں اور حیرانی سے دیکھتی سوالیہ نگاہوں کو کیا معلوم کہ دکانداروں کی دھتکاریں کھاتے اور لالٹین کی مدقوق روشنی میں سلائی کرتی ماں کے پاس بیٹھے اس بچے نے اپنے آپ سے کیا عہد کیا تھا...... یہ کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی ماں کو سکھ دے گا...... اس کی ساری پریشانیاں دور کر دے گا...... اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو اس دکھ اس اذیت سے نہیں گزرنے دے گا جس سے وہ خود چھوٹی سی عمر

میں گزر رہا تھا۔

اس بچے نے اپنے آپ سے کیا ہوا عہد نبھانے میں ممکنہ حد تک کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی..... جوشِ تکمیل آرزو میں وہ اپنی حدوں سے گزر گیا تھا..... اور یہی اس کی غلطی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح ہفتہ واری تعطیل تھی۔ سیف الدین اور ان کے اہلِ خانہ اکٹھے ناشتا کرنے بیٹھے تو ناشتے کے دوران بیگم نے قدرے محتاط لہجے میں سیف الدین سے کہا۔ ''رات آپ نے اپنی بہنوں کی باتیں سنی تھیں؟''

''ہاں۔'' سیف الدین نے جواب دیا۔

''کچھ کہا نہیں آپ نے ان کی باتیں سن کر۔'' بیگم بولیں۔

''کچھ کہنے کو ہوتا تو کہتا۔'' سیف الدین نے بیگم اور بچوں سے نظریں چرا رکھی تھیں۔

''کہنے کو تو خیر بہت کچھ تھا۔'' بیگم نے کہا۔

''ہاں ابو۔'' بڑی بیٹی فرحانہ بولی۔ ''آپ کو کہنا تو چاہیے تھا ان لوگوں سے کہ انہیں اس مقام پر آپ ہی نے تو پہنچایا ہے۔''

''بری بات بیٹا..... پھوپی ہیں تمہاری۔'' سیف الدین نے بیٹی کو سرزنش کی۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

''یہ غلط تو نہیں کہہ رہی۔'' بیگم نے فرحانہ کی حمایت کی۔

''غلط وہ لوگ بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔'' سیف الدین نے بہنوں کی بابت کہا۔

''کیا مطلب؟'' بیگم نے نظریں ترچھی کر کے انہیں چونک کر دیکھا۔

''میں نے جو کمایا لٹا دیا۔'' سیف الدین نے اعترافِ جرم کے انداز میں کہا۔

''کس پر.....!'' بیگم نے پھر اسی طور سیف الدین کو دیکھا۔ ''کس پر لٹایا!'' ایک پل کے توقف کے بعد وہ مزید بولیں۔ ''اپنے بہن بھائیوں پر ہی نا..... انہی پر، جو رات بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں۔''

''تھوڑا بہت تو میں نے تمہارے اور بچوں کے لیے بھی کیا۔'' سیف الدین نے دبی زبان سے کہا۔

''مگر ہم احسان فراموش نہیں..... بچوں کو خود بھی یاد ہے اور میں بھی انہیں بتاتی رہتی ہوں کہ جب تمہارے ابا کا اچھا وقت تھا تو انہوں نے ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی..... اچھا کھلایا، اچھا پہنایا۔'' بیگم کا لہجہ اب جیسا تھا۔

''کوئی احسان نہیں کیا..... یہ میرا فرض تھا۔'' سیف الدین بولے۔

''مگر بہن بھائیوں کی ساری ذمے داری صرف آپ ہی کی نہیں تھی، باقی بہن بھائیوں کے بھی کچھ فرائض اور ذمے داریاں تھیں..... سب نے اپنی اپنی پوٹ باندھ کر رکھی بس آپ ہی کو قربانی کا بکرا بنائے رکھا..... نائلہ اور عائلہ نہیں کماتی تھیں کیا..... کیف اور طیف کی کوئی ذمے داری کچھ فرض نہیں تھا کیا..... عائلہ کی شادی کے موقع پر دیکھا تھا کیسے ہری مہندی دکھادی تھی سب نے اور خود عائلہ کے تو کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔''

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے عزت سے گزروادی..... افسوس مجھے یہ ہے کہ تمہیں زیور دوبارہ نہیں بنوا کر دے سکا۔''

''مجھے تو ذرا بھی افسوس نہیں۔''

سیف الدین نے انہیں کچھ اس طرح دیکھا جیسے ان کی بات کا یقین نہ کر پائے ہوں۔

''سچ کہہ رہی ہوں۔'' بیگم بولیں۔

''مجھے افسوس ہے کہ جب میرے اپنے بچوں کا وقت آیا تو میں انہیں وہ سب کچھ نہیں دے سکا جو ان کا حق تھا..... اور اب ضرورت ہے۔'' سیف الدین نے چھوٹے سے گھر کے طول و عرض میں نہایت حسرت سے نظریں دوڑائیں اور دل گرفتہ لہجے میں بولے۔ ''نائلہ ٹھیک تو کہتی ہے۔ ایک پرا پر گھر تک نہیں دے سکا میں اپنے بچوں کو۔''

سیف الدین کے بچوں نے اپنے باپ کو اتنا دل گرفتہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بیگم جو ساری زندگی ایک اچھی شریکِ سفر کی طرح سیف الدین کی ہم قدم رہی تھیں، انہیں آزردہ دیکھ کر ان کا بازو چھوتے ہوئے بولیں۔ ''ارے چھوڑیں..... آپ بھی دوسروں کی باتوں میں آگئے..... جیسا بھی ہے ہمیں تو اپنا گھر سب سے اچھا لگتا ہے۔''

''جانتا ہوں..... میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہو۔'' سیف الدین بڑے تھکے تھکے انداز میں مسکرائے۔

''اجی ہم آپ کا دل کیا رکھیں گے..... آپ کا دل تو آپ کے بہن بھائیوں کے پاس رکھا ہے۔'' بیگم کی بات میں معانی کی دنیا بسی تھی۔

''آدمی کو پورا نہ سہی تھوڑا خودغرض ضرور ہونا چاہیے۔'' سیف الدین کے لہجے میں ملال تھا۔

''بچوں کو الٹی پٹی مت پڑھایئے.....'' بیگم نے توقف کیا پھر بولیں۔ ''سچ کہیے، آپ نے بےغرض رہ کر جو کچھ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لیے کیا، اس سے آپ کے دل کو جو حاصل طمانیت کا کوئی مول ہو سکتا ہے؟''

سیف الدین چپ رہے۔

''اپنے بچوں کو اس طمانیت سے محرومی کا سبق کیوں پڑھانا چاہتے ہیں آپ؟''

''امی ٹھیک کہتی ہیں ابا۔'' زوہیب نے تائید کی۔ ''ہمارا گھر سب سے اچھا ہے!''

''جہاں نہ کسی ڈیم سے آتے صاف پانی کی لائن ہے نہ گیس...... نہ سیوریج سسٹم، نہ کچرا اٹھانے کا معقول بندوبست...... یہ جو کچرے والا کچرا لے جاتا ہے، آس پاس ہی کہیں لے جا کر پھینک دیتا ہے۔ فضا تو آلودہ ہوتی ہے نا۔''

''ارے بھئی محبت تو ہے اس گھر میں۔'' بیگم بولیں۔

''محبت سے ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔'' سیف الدین نے کہا۔

''ابا!'' بڑے بیٹے زوہیب نے کہا۔ ''ہماری ضرورت صرف آپ ہیں۔''

''یس!'' چھوٹے بیٹے شاہ زیب نے اپنی بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ سے مکا مارا اور سیف الدین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دی جسٹ نیڈ یو اینڈ وی لو یو ابا۔'' شاہ زیب نے اپنا بازو عموداً کھڑا کرتے ہوئے اپنے بھائی بہنوں کو معنی خیز اشارہ دیا۔ تینوں نے اسی کی طرح اپنے بازو عموداً بلند کرتے ہوئے ایک آواز میں کہا۔ ''وی آل لو یو ابا۔''

''میں تو اٹھتے بیٹھتے آپ کی درازیٔ عمر اور صحت کی دعا کرتی ہوں۔'' بیگم کا لفظ لفظ محبت کے جذبے میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے چند ثانیے توقف کیا پھر چاروں بچوں کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''بس ایک غلطی ہوئی تمہارے ابا سے۔''

سیف الدین چونک کر انہیں دیکھنے لگے کہ ہمیشہ ان کا دم بھرنے والی رفیقۂ حیات ان کی کس غلطی کا ذکر کر رہی تھیں۔

''کہیں کہیں اسراف کر گئے ہیں۔''

غلطی وہی تھی جس کی نشاندہی نائلہ، شہلا اور عائلہ نے کی تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ انہوں نے سیف الدین کے دل پر بے رحمی سے ضرب لگائی تھی۔ بیگم دل سوزی سے زخم کو چھیڑ رہی تھیں۔

''تمہاری امی ٹھیک کہتی ہیں۔'' سیف الدین نے سر جھکا کر اعتراف خطا کیا پھر ذرا حوصلے سے بولے۔ ''ہاں...... یہی غلطی ہوئی مجھ سے۔'' انہوں نے توقف کیا پھر مزید کہا۔ ''ہر آدمی زندگی کو اپنے تجربے کی عینک سے دیکھتا ہے۔ میں نے زندگی کو جس عینک سے دیکھا، وہ مجھے یہ سمجھاتی تھی کہ اپنے ماں، باپ، بہن بھائیوں کے لیے جو کر سکتے ہو بے غرضی سے کر جاؤ...... اپنی اس آرزو کی تکمیل کے جوش میں، میں اسراف کی غلطی کر بیٹھا۔'' سیف الدین کی نظریں چھوٹی بیٹی دردانہ پر جا رکیں۔ ''دردانہ بیٹی! اسراف کا مطلب جانتی ہو نا؟''

''جی ابو...... فضول خرچی۔'' دردانہ نے بتایا۔

''اپنی حد سے بڑھ کر زائد خرچ کرنا...... چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا۔'' سیف الدین نے مزید وضاحت کی پھر ایک گہری سانس کھینچ کر بولے۔ ''میری طرح اکثر لوگوں سے یہ غلطی ہوتی ہے...... اچھے وقت میں آئندہ کی فکر نہیں کرتے...... یہ نہیں سوچتے کہ آج اگر خوش حالی ہے تو کل کو خدانخواستہ تنگ دستی بھی آسکتی ہے...... ہم اپنے مسلمان ہونے کا شکر پیشانی کے بجائے آنکھوں سے سجدے کر کے ادا کریں تو بھی کم ہے...... دینِ اسلام بھی ہمیں اسراف سے بچنے اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے...... ضروری ہے کہ اچھے وقت میں کڑے وقت کی فکر بھی رکھی جائے...... ملازمت کے زمانے میں ریٹائرمنٹ کو بھی یاد رکھنا ضروری ہے، جب مراعات واپس لے لی جاتی ہیں۔ تنخواہ پنشن میں تبدیل ہو جاتی ہے...... وسائل گھٹ جاتے ہیں اور مسائل بڑھ جاتے ہیں...... ہم مستقبل نااندیش انسانوں سے تو کیڑے مکوڑے اچھے جو اچھے موسم میں سخت موسم کا سامنا کرنے کی تیاری رکھتے ہیں۔'' سیف الدین لمحہ بھر کو چپ ہوئے پھر انہوں نے اپنے بچوں کو دیکھتے ہوئے قدرے دل گرفتگی سے کہا۔ ''میں نے اپنی ملازمت کے دوران ریٹائرمنٹ کی فکر بھی رکھی ہوتی تو شاید میں تم لوگوں کو بہتر گھر اور بہتر سہولیاتِ زندگی فراہم کر سکتا تھا۔''

زوہیب، سیف الدین کا بڑا بیٹا ان کی دل جوئی کو اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور نہایت احترام سے بولا۔ ''اپنے لیے تو سبھی جیتے ہیں ابا! آپ تو اوروں کے لیے جیے ہیں...... وی فیل پراؤڈ آف یو۔''

سیف الدین نے گردن گھما کر نوجوان بیٹے کو دیکھا اور ملول سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''ٹھیک کیٹر...... فراخی اور کشادگی میں تنگی کی...... اور اچھے وقت میں برے وقت کی ضرور فکر کرنا۔''

بیگم نے سیف الدین کو بصد محبت دیکھا اور اپنے بچوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''سیف الدین صاحب! ہمارے بچوں کے لیے اس سے اچھا وقت اور کیا ہوگا کہ زندگی کو دیکھنے کے لیے ان کے پاس آپ کے تجربے کی عینک موجود ہے۔'' سیف الدین دھیرے سے مسکرا دیے۔